دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
2014

7 — **چینی، نکتہ چینی** — مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں، کج ادائیاں، نامے پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

14 — **خوں ریز** — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ہتھیار ملے، لیس دہشت کا بازار گرم کر دینے والے ہرکاروں کا ہولناک تماشا

59 — **رنگ باز** — امجد رئیس
شہزاد فردی کی سربراہی میں انجام پانے والا سراغرسی کا شاندار کارنامہ

67 — **بند مکان** — تنویر ریاض
الجھے حول... پراسرار مکان... اور محبت کے مکین کی مثلث...

79 — **چور اور مور** — جمال دستی
چوری اور نقب زنی کی وارداتوں کے پیچھے پوشیدہ ہاتھ کی تلاش و جستجو

84 — **جواری** — احمد اقبال
زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

131 — **پس پردہ** — بابر نعیم
کہانی در کہانی پھیلے کرداروں کے اسرار... جنہیں پہلی اور آخری چوٹ درکار تھی...

143 — **ہم زاد** — میمونہ عزیز
ذہانت کے رسیا کا مختصر احوال...... جس کے لیے ہر ذہن مرغوب غذا تھا

145 — **مردِ ناداں** — آصف ملک
ایسی بازی کا کھیل جو شاید اس کی زندگی کی آخری بازی تھی

158 — **گرداب** — اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چھپا بازی اور مقدر کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

195 — **رسیا** — سکندر علیم
ایک چالاک و جہاں دیدہ جادوگرنی کی نشست و برخاست کے ڈرامائی و سنسنی آمیز سلسلے

199 — **استادی** — طاہر جاوید مغل
آپ کے محبوب لکھاری کی تازہ بہ تازہ تحریر جو پھر آپ کے لبوں پر مسکان اور ذہن کو جکڑے رکھے گی

215 — **محافظ** — شہناز احمد
عادت کے طفیل زندگی کی بازی جیت لینے والے شخص کی ہوشیاری...

219 — **اشارہ** — بشریٰ امجد
اس مقتول کی حاضر دماغی جو مرتے مرتے اپنے قاتل کا سراغ دے گیا

222 — **غم گسار** — سلیم انور
میاں بیوی کی پرسکون زندگی میں در آنے والے طوفان کا شاخسانہ

228 — **تاریک سورج** — سرور اکرام
زمانۂ حاضر کے فریب پرستوں کے لیے امیدوں کے نئے در وا کرتی تیکھی تحریر

255 — **مہنگی بھول** — کاشف زبیر
اس مہنگی بھول کا نفع و نقصان...... جو یادداشت میں گرہ بن کر اٹک گئی تھی

000 — **تراشے خراشے** — ادارہ و قارئین
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کے لیے

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 44 • شمارہ 02 • فروری 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس (021) 35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

سال کا دوسرا شمارہ پیشِ خدمت ہے... سنا ہے کہ پاکستان کے معاشی حالات بتدریج بہتر ہو رہے ہیں... جاننے والوں کے گنا ہوں کا رونا رونے والوں کی زبان سے یہ خوش خبری بہت امید افزا ہے لیکن اب شدت سے انتظار ہے ان لمحات اور دنوں کا، جب یہ معاشی بہتری سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں سے گزر کر عوام یعنی آپ اور ہم تک پہنچے گی... فی الحال عوامی سطح پر سب کچھ جوں کا توں نظر آرہا ہے... قلیل آمدنی میں سفید پوش طبقے کے لیے اپنا بھرم قائم رکھنا دشوار تر ہوتا جارہا ہے... اشرافیہ کے خزانوں میں اضافہ ہو رہا ہے... بے چاروں کی بچت یہاں نہیں سماتی تو وہ اسے دساور بھیج دیتے ہیں... یہاں حساب کتاب کا جھنجٹ انہیں پریشان کیے رکھتا ہے... باہر یہ سارے اندیشے ہوا ہو جاتے ہیں... اربوں کمانے والے ہزاروں میں انکم ٹیکس دے کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ محاصل جمع کرنے والوں کا سارا قہر اسی طبقے پر نازل ہوتا ہے جو تنخواہ دار ہے اور جس کے لیے اپنی آمدن چھپانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے... حقیقی معاشی بہتری اسی وقت آئے گی جب عوام کے نچلے اور متوسط طبقوں کی زندگی کچھ آسان ہوگی۔ دوسری خوش خبری یہ سنائی دے رہی ہے کہ امریکا بہادر کے تیور ہمارے بارے میں کچھ نرم ہوئے ہیں... وہ ہماری بات ذرا دھیان سے سن رہا ہے... سب سے اہم خبر یہ ہے کہ آخر کار سرکار نے محاذ آرا گروہوں سے مذاکرات کے لیے ایک کمیٹی کا اعلان کر دیا... سرِ شام سوٹ پہن کر چینلوں کا چکر لگانے والے تجزیہ کار بقراطی انداز میں نت نئی نکتہ آفرینی کرکے قوم کو ہیجان میں ضرور مبتلا کریں گے لیکن ہمیں خوش گمان رہنا چاہیے کہ آخر کار ہماری سرزمین ہمارے لہو سے داغ دار نہیں ہوگی... اس خوش گمانی کے ساتھ... آئیے اب اس محاذ کا رخ کریں جہاں کچھ عجیب سا رن پڑا ہوا ہے۔

مظفر آباد آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی روداد "جنوری کے یخ بستہ دن اور سرد راتیں جاسوسی کے انتظار میں گزر رہی تھیں (کچھ اور کام بھی کر لیا کریں۔ کام کرنے سے سردی کم لگتی ہے) میرا گاؤں مظفر آباد شہر سے تھوڑے فاصلے پر ہے اور روزانہ بک اسٹال کا چکر لگانا انتہائی مشکل کام ہے، وہ بھی اس موسم میں۔ پھر بھی دو بار چکر لگا چکا تھا اور آج بھی جانے کا ارادہ تھا کہ ایک دوست کا پتا چلا کہ وہ شہر گیا ہوا ہے۔ فوراً کال ملائی اور جاسوسی کا پتا کروایا۔ یہ سن کر کہ جاسوسی مل گیا ہے کتنی خوشی ہوئی، بیان سے باہر ہے۔ (نہیں، وہ بھی بیان کر دیں۔ کوئی پابندی تھوڑی ہے) اب دوست کی آمد کا انتظار شروع ہو گیا۔ کئی بار موبائل اٹھایا کہ شاید میسج آیا ہو لیکن ندارد۔ کفر ٹوٹا آخر خدا خدا کر کے۔ شام پانچ بجے اس نے بتایا کہ نیچے بازار میں آؤ اور جاسوسی لے لو۔ بس پھر کیا تھا، کمبل اوپر سے پھینکا اور یاہو کا نعرہ لگاتے ہوئے نیچے بازار کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہمارا گھر اوپر پہاڑی پر یعنی تھوڑا اونچائی پر ہے اور بازار 15 منٹ نیچے کے فاصلے پر ہے۔ یہ 15 منٹ کا فاصلہ میں نے 5 منٹ میں طے کیا۔ پاؤں میں جو گرز پہننے کا ہوش بھی نہ رہا، سلیپر پہنے دوڑتا چلا گیا۔ بازار میں پہنچنے تک کئی قلابازیاں کھائیں۔ اگر گنتی کی جاتی تو گینز بک میں ورلڈ ریکارڈ درج ہو جاتا۔ قلابازیاں کھانے سے نقصان کم ہی ہوا کیونکہ ہر طرف نرم نرم برف تھی۔ سوجڑیاں محفوظ رہیں۔ البتہ فائدہ زیادہ ہوا کیونکہ ویسے بھی نیچے کی طرف ہی جانا تھا۔ سیدھے راستے چل کے جاتا یا الٹے طریقے قلابازیاں کھاتا، ڈائیو مارتا، پاؤں کے بل یا سر کے بل۔ (اوہو... بالآخر آپ نے اسے پالیا!) نئے سال کے جاسوسی کا ٹائٹل جگمگ جگمگ کرتا ہاتھوں میں تھا۔ سرورق بہترین تھا۔ شوخ و چنچل لڑکی کا شوخ انداز خوب بھایا۔ نکتہ چینی میں میرے فیورٹ دوست سید شکیل کاظمی پہلے نمبر پر تھے۔ جاندار اور جامع تبصرہ۔ بہت بہت مبارک کاظمی جی۔ بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ آپ پہلے نمبر پر آئیں۔ آج یہ انتظار ختم ہوا۔ بقیہ تبصرے بھی کافی اچھے تھے۔ جواری اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ چودھری فرید الدین، عرف خاور عرف ملک سلیم نے کافی حد تک اپنا مستقبل محفوظ کر لیا ہے لیکن پھر پکڑے جانے کا خوف اور نادر شاہ کی تلوار اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ ریشم اب حویلی کا حصہ بن چکی ہے۔ اب اس کا مستقبل بھی محفوظ ہو چکا ہے۔ نورین تاحال غائب ہے اب اس کی انٹری لازمی ہے۔ اینڈر پر انور کا غائب ہونا ایک معما بن گیا۔ وہ یقیناً نادیدہ سرنگ میں غائب ہوا ہوگا جو کسی سازش کا نتیجہ لگتا ہے۔ گرداب کی یہ قسط بہت زبردست رہی۔ شہریار بے چارے پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے گئے لیکن وہ بندہ پرور بھی ایک پہاڑ جیسا ہی ہے جسے توڑنا انتہائی ناممکن ہے۔ ادھر اسلم کی موت پر دلی رنج ہوا۔ اب ماہ بانو اور شہریار کے مستقبل میں یکجا ہونے کے آثار نظر آرہے ہیں۔ ایڈی کا کردار زبردست رہا۔ مجموعی طور پر یہ قسط سب پر بھاری رہی۔ ارض، فرض، قرض مریم کے خان نے دل جیت لیے۔ جرم و سزا پر مبنی، دل گداز کہانی دلوں کے تار چھوتی ہوئی گزر گئی۔ زبردست پلاٹ، ارض سے محبت، فرض کی ادائیگی، قرض سے خلاصی۔ عابد اور بلال جیسے لوگ ابھی اس دنیا میں پائے جاتے ہیں اور انہی لوگوں کی وجہ سے یہ ملک قائم و دائم ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ورنہ قادر حیات جیسے لوگ اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ زر، زمین کے جھگڑے پرانی بات ہے لیکن جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ مریم کے خان کو اتنی اچھی اسٹوری لکھنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ خواب، نجمہ مودی کی کہانی ایک سازش کے تانے بانے بن رہی ہے جو ایک ادیب کے گرد گھوم رہی ہے۔ نجمہ مودی کا نام میری میموری میں کہیں پایا جاتا ہے۔ بہت پہلے کہیں ان کی کہانی نظر سے گزر چکی ہے۔ بہت پرانی لکھاری ہیں۔ جلاد صفت کاشف زبیر کی مخصوص انداز میں لکھی گئی تحریر تھی۔ ہمیشہ کی طرح بہترین موضوع اور کرداروں سے انصاف۔ البتہ ایک کمی کی جو کہ اچھی بھی لگی۔ محمود اور صبا کی جوڑی بنا دی جاتی مگر نہ بنانا زیادہ مزے کی لگی۔ پروفیسر پر ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ یہ سارا کھیل اس کا پھیلایا ہوا ہے۔ صبا کی ذہانت اور دلیری قابلِ دید تھی۔ مجموعی طور پر یہ طویل کہانی بہت زبردست رہی۔ بدمعاملہ، بشریٰ امجد کی شارٹ اسٹوری، برے کام کا برا نتیجہ ثابت ہوئی۔ محمد تنویر اختر کی مختصر

فی درندہ صفت ٹولے پر مشتمل تھی۔ قتل خانہ، امجد رئیس کی مختصر کہانی تقریباً اچھی لگی۔ سونیا اپنے شوہر کی قاتل نکلی اور جرم خود بولتا ہے کے مصداق شطرنج مہروں نے اسے پکڑوا دیا۔ بدمقابل شہزاد فردی جیسے ایماندار پولیس والے ہوں تو مجرم کیسے بچ سکتا ہے۔ حساب برابر، لبنیٰ زبیر کی کہانی ایسے کو تیسا کی مثال ہوئے تھی۔ میرے خیال میں اس موضوع پر طویل کہانی یا ناول بھی لکھا جاسکتا تھا۔ لبنیٰ زبیر نے خاصا مسحور کیا۔ اچھی کہانی تھی۔ بقیہ مختصر کہانیاں بھی اچھی یں۔ اسکول سے چھٹیاں ہونے کی وجہ سے اس بار ڈائجسٹ مکمل کرلیا۔ ورنہ پورا مہینا لگ جاتا تھا۔"

رحیم یار خان سے منظر سلیم کی یاد آوری "جنوری کا جاسوسی طویل انتظار کے بعد 9 تاریخ کو ملا۔ خیر عرصۂ وصال کو غنیمت جانا اور لگے حظ اٹھانے۔ ورق کی دوشیزہ کا پستول کی گولی دکھانے کا انداز ایسا ہے جیسے نرس مریض کو کیپسول دکھاتے ہوئے ہدایت کرتی ہے کہ وقت پر کھا لیجیے گا۔ اشتہارات پر تی ہوئی نگاہ ڈال کر ہم محفلِ یاراں میں پہنچے تو آپ کا اداریہ دعوتِ مطالعہ دے رہا تھا۔ ہر بار اداریہ پڑھنے کے بعد ایک سوال ہمارے احساس کو کچوکے نے لگتا ہے کہ آخر حکمرانوں کی ترجیحات کیا ہیں؟ خطوط میں ہمارے بہترین دوست سید شکیل حسین کاظمی مسندِ صدارت پر تمکنت کے ساتھ موجود تھے۔ بھئی کاظمی صاحب...! آپ کا حسنِ استدلال ہمیشہ سے عمدہ رہا ہے جو اس ماہ کے آپ کے صدر منتخب ہونے کی دلیل ہے مبارکاں۔ آگے بڑھے تو زویا اعجاز یرِ اعظم کی کرسی پر بیٹھی نظر آئیں۔ ان کی طرف سے بھی نوک جھونک کا آغاز ہو گیا ہے لگتا ہے حساب برابر کرنے آئی ہیں۔ بہرحال تبصرہ پڑھ کر محظوظ ے، احسان سحر، کاظمی صاحب کو بڑھاپے کا احساس دلانے سے پہلے اپنی کنپٹیوں پر سفید ہوتے ہوئے بالوں کو آئینے میں دیکھ لیں، یقیناً آپ خود کو بھی ل نظر آئیں گے۔ احسان اینڈ احسن زمان کا تبصرہ پڑھتے ہوئے یوں لگا کہ کسی کنجوس بادشاہ کے دربار میں داخل ہو گئے ہوں۔ شایان سعید نے تو گویا حد کر ی۔ آفتاب نصیر اشرفی کے مقابلے میں اپنا چار سطری تبصرہ ملاحظہ کر کے انہیں یوں گھور رہے تھے جیسے میڈیکل کے اسٹوڈنٹ خوردبین آنکھوں سے لگا کر رثومے کو دیکھتے ہیں۔ باقی قارئین کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جواری پڑھی۔ حالیہ قسط سے کہانی کا جمود کچھ ٹوٹا ہے۔ حویلی میں ونے والے پراسرار واقعات نے کہانی میں دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ چودھری انور کی ریشم میں دلچسپی تشکیک میں مبتلا کر رہی ہے۔ سراغ رسانی و ہیبت کے تناظر یں لکھی گئی کہانی پنچایت نے سوچ کے دریچے وا کر دیے۔ سمجھ نہیں آتی ہر زبردست زیر پر ظلم کرتے ہوئے پیش کو کیوں بھول جاتا ہے؟ لبنیٰ زبیر کی حساب برابر چھی کاوش تھی۔ شیبا نے پولیس والے کو زلفوں کے جال میں الجھا کر چال چلی مگر مات اس کا مقدر ٹھہری۔ سرورق کے رنگوں میں مریم کے خان کا رنگ ارض، قرض، قرض پہلے رنگ پر بھاری رہا۔ تجسس میں مبتلا کرتی اس کہانی میں بلال مصطفیٰ کا کردار اچھا لگا۔ نجمہ مودی کی تحریر پہلے رنگ کے طور پر سامنے آئی۔ خواب میں منصور احمد منصوری نے اپنی صلاحیتوں کے بل پر اظفر عالم کے قتل کا معاملہ حل کیا۔ اب آتے ہیں اس مہینے کی سب سے بہترین کہانی جلاد صفت کی طرف۔ ابتدائی صفحات کی اس کہانی میں محمود اور صبا کا کردار پاور فل رہا۔ کہانی پڑھنے کے دوران کہیں بھی محسوس نہیں ہوا کہ پروفیسر ہی مصنف ہوگا۔"

مانسہرہ سے سید اکبر شاہ کی پریشانی "اس دفعہ جاسوسی 8 تاریخ کو ملا۔ سرورق بس گزارے لائق تھا، سوائے ٹائٹل گرل کی کلائی پر چمکتے کڑے کے۔ شکیل بھائی کو اول پایا۔ مبارک ہو۔ ہمایوں اب تو علم ہو گیا نا کہ پڑوسن کاظمی کا قلمی کردار ہے۔ خیال رکھیے جناب۔ ابرار وارث، تبصرہ اچھا تھا لیکن وضاحت کریں گے کہ ماما ایمان کون تھی؟ میرے خیال میں تو ایک لڑکی تھی۔ بابر اینڈ مسز بابر کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ اس بار پوری محفل میں شاذ ہی کوئی صنفِ نازک موجود تھی۔ اچھی تبدیلی ہے۔ اسما قادری کی گرداب کھولی۔ لیکن ٹائٹل پکچر دیکھ کر ماتھا ٹھنکا۔ وجۂ حیرت یہ تھی کہ جب ہم شروع میں بلا جھجکے کہانیاں پڑھا کرتے تھے، اسی وقتوں میں سلسلہ وار کہانی دیوی کی ٹائٹل پکچر دیکھی تھی۔ دونوں میں واضح مماثلت پائی جاتی ہے۔ (تو اس میں کھٹکنے کی کیا بات ہے؟) گرداب اس بار ایکشن سے بھرپور تھی۔ اسلم کی موت پر دکھ ہوا۔ دوسری طرف شہریار کا را کے ٹارچر برداشت کرنا خوب رہا۔ بہت اچھے میرے وطن کے شیر۔ اینڈ میں ہمیشہ کی طرح ایک سراب پایا لیکن حل نکالا جائے گا... اگلی قسط میں۔ جواری بھی اچھی رہی۔ اینڈ پڑھ کر شک گزرا کہ پراسراریت کا سماں بندھنے جارہا ہے۔ بعدازاں سرورق کے رنگوں میں رنگنے لگے۔ منصور احمد نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھ کر قتل کا معاملہ حل کر دیا۔ دوسرا رنگ ارض، فرض، قرض پڑھا تو بے اختیار کہنا پڑا کہ دوسرا پہلے سے بازی لے گیا۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی گئی، پڑھنے میں مزہ آنے لگا۔ بلال کا کردار قابلِ ستائش تھا۔ لبنیٰ زبیر کی حساب برابر میں شرافت نے شیبا سے بدلہ لے ہی لیا۔ اچھی تحریر تھی۔ قتل خانہ میں سونیا کی بے وقوفی ہی ان کی گرفتاری کا پروانہ ثابت ہوئی۔ باقی ہیرو، چشم دید، بالادست بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ پہلی کہانی جلاد صفت کاشف زبیر کی نادر تحریر تھی۔ پروفیسر اختر شادی مصنف ہوگا، ہمارے گمان میں بھی نہ تھا۔"

آزاد کشمیر سے ثاقب ظہیر کی تعریفیں "جنوری کا جاسوسی 6 تاریخ کو ہی مل گیا۔ محفلِ یاراں میں پہنچے تو ملکی حالات اور معیشت کے متعلق آپ کا تبصرہ پڑھا۔ امید پر دنیا قائم ہے اور ہم بھی اسی امید پر قائم ہیں کہ ایک دن ہمیں بھی اچھی قیادت مل ہی جائے گی۔ شکیل حسین کاظمی کرسیِ صدارت پر جلوے بکھیر رہے تھے۔ جناب بہت بہت مبارک ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب کا مطالعہ کیا۔ گرداب کی قسط بہت مختصر ہوتی ہے، پتا ہی نہیں چلتا اور ختم ہو جاتی ہے۔ شہریار کی مدد کے لیے حسبِ توقع سلو پہنچ آیا اور یقیناً قید سے بھی نکالنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر ہی لے گا۔ اسلم کی موت کا سن کر افسوس ہوا۔ جواری ابھی تک کوئی خاص متاثر نہیں کر سکی۔ نورین کی موت کے آثار تو نظر آرہے ہیں تاہم یقین نہیں آتا کہ ہیرو صاحب کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کرنے والی اتنی جلدی داغِ مفارقت دے جائے گی۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر کی جلاد صفت ایک عمدہ تحریر تھی۔ ابتدا میں محمود پر شک تھا پھر فاخر مشکوک ہوگیا اور آخر میں خلافِ توقع پروفیسر شاد مصنف نکلا۔ سرورق کی پہلی کہانی خواب کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ ارض، فرض، قرض مریم کے خان کی ایک عمدہ تحریر تھی اور جاسوسی کے مزاج کے مطابق سسپنس لیے ہوئے تھی اور ایکشن سے بھرپور تھی۔"

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی چہلیں "جاسوسی اس مرتبہ بھی 7 کو ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھا۔ سید شکیل کاظمی، کرسیِ صدارت مبارک ہو۔ شکیل بھائی آپ نے پڑوسن کو یاد کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس لیے ہم نے یاد کرلیا۔ راجا اسلم حیات آپ نے کس کو مخاطب کیا ہے۔ مجھے یا

شکیل کاظمی کو؟ پلیز وضاحت کیا کریں۔ سید محی الدین اشفاق و نیلم بیگ یار، کہاں غائب تھے؟ زویا خان تم نے پارٹی بدل دی ہے کیا؟ ہمایوں کی چمچی بن گئی ہو۔ تبصیر عباس بابر اور احسن زمان کے تبصرے نے ماما ایمان کی یاد دلا دی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ ماہ بانو کی قسمت پر دکھ ہوتا ہے۔ اسلم کی موت افسردہ کر گئی۔ جواری بہت بور کر رہی ہے۔ اس ماہ کاشف زبیر نے جلاد صفت لکھ کر پہلا نمبر حاصل کیا۔ محمود کی تنہائی اُف... مریم کے خان نے بہت اچھا لکھا۔ لہٰذا اس کو ہم نے دوسرا نمبر دے دیا۔ ہوس کے مارے رشتے داروں پر مبنی اس کہانی نے بے حد متاثر کیا۔ تیسرے نمبر پر ہمیں لبنیٰ زبیر کی حساب برابر نے نمبر دینے پر مجبور کر دیا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ مجھے میری سالگرہ مبارک ہو ہاہاہا۔" (آپ کو اپنی سالگرہ کا دن مبارک ہو، بہت بہت۔ اس بات پر کیک کھلادیں)

لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی فرمائش "سرورق پر موجود حسینہ مبارک باد دے رہی تھی مگر ساتھ ہی کوئی شخص اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ سید شکیل کاظمی مبارک باد۔ زویا اعجاز خود ہی اپنی تعریفیں کرتی نظر آئیں۔ محسن کمال ایک اچھے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ محمد متین اشرف کی گرداب میں کرداروں کی بھرمار ہے تو میں بھی متفق ہوں۔ (سلسلے وار کہانی چند کرداروں کے گرد گھومتی... آؤٹ جاوٹ لگی رہتی ہے) جواری میں خاور، نورین کے خیالوں میں گم رہا۔ انور اور ریشم کی جوڑی فٹ ہوگئی ہے۔ تاہم مشکلات میں اضافہ جاری ہے۔ قبرستان میں اچانک انور اور خاور کا گرنا یا ناک آؤٹ ہو جانا، ثابت کرتا ہے کہ دوسرے بھائی کا وار چل چکا ہے۔ ماہ بانو بالآخر خطرناک دشمنوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئی مگر اس کو بچاتے ہوئے اسلم مارا گیا جبکہ ادھر شہریار بھی جہاز گر کے شدید تشدد کا شکار ہو کر ماہ بانو کے بارے میں خواب دیکھ رہا تھا۔ لگ رہا ہے کہ محترم رائٹر صاحب کو رحم آگیا ہے اور وہ ہیرو، ہیروئن کو ملانے لگی ہیں۔ نجمہ مودی صاحبہ کی کہانی اچھی لگی۔ مصنف تو یوں لگا گویا ان کے شوہر محمود احمد مودی ہی تھے۔ خیر ایک بلی کے کارٹون کے ذریعے سے اظفر عالم کی سیکریٹری کے قاتل ہونے کا پتا چل گیا۔ لبنیٰ زبیر کی واپسی زبردست لگی۔ شیبا نے شرافت کو بے وقوف بنایا جبکہ آخر کار شرافت نے چالاکی سے اس کے اکاؤنٹ سے پیسے اڑا لیے۔ لبنیٰ زبیر صاحبہ آتی رہا کریں۔ اس مرتبہ کترنیں بہت زبردست لگیں۔"

لاہور سے زویا اعجاز کی پسندیدگی "جاسوسی نے نئے سال میں بھی اپنی سابقہ روایت برقرار رکھتے ہوئے پانچ جنوری کو شرفِ دید بخشا۔ سرما کی نرم گرم دھوپ اور رات کو لحاف میں جاسوسی پڑھنے کا مزہ ناقابلِ بیان ہے۔ ٹائٹل نے ایک ہی نظر میں پسندیدگی کی سند حاصل کرلی تاہم بیک گراؤنڈ میں دانت نکوستا وجود خلائی مخلوق تھا یا زکوٹا جن؟ یہ تاحال واضح نہیں ہوسکا۔ صدر محفل اس بار کاظمی صاحب منتخب ہوئے اور کیا خوب ہوئے۔ بہت مبارکاں وڈے شاہ جی۔ ابرار وارث صاحب! اتنا حیران مت ہوں، ایسے چھوٹے موٹے ریکارڈ ہمارے کریڈٹ پر بے شمار ہیں۔ بابر عباس صاحب! ہم پاگل ہونے والوں میں سے نہیں، پاگل بنانے والوں میں سے ہیں۔ تحاریر میں اس بار ایک سے بڑھ کر ایک مصنفین کے نام نظر آئے۔ آغاز اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی جلاد صفت سے کیا جو ملکی اداروں میں کرپشن کی جڑوں اور میڈیا کے کردار کو آشکار کرتی بے حد تھرلنگ اسٹوری آف دی منتھ رہی۔ ہمارے زیرو زیرو سیون مائنڈ نے پہلے ہی اشارہ دے دیا تھا کہ پروفیسر شادی ہی مصنف ہوگا۔ محمود اور صبا کے مثبت کردار اچھے لگے۔ انجام بھی بہت منطقی تھا۔ گرداب کے اسپیکچر بہت عمدہ تھے۔ گرداب روزِ اول سے اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ملکی حالات کے تمام تر عکس اس میں واضح نظر آتے ہیں۔ اس ماہ کی قسط بھی بہترین تھی۔ جواری میں کچھ پراسراریت نظر آئی۔ باقی ماندہ لوازمات اس بار اناڑی جیسے ہی رہے۔ سرورق کے دونوں رنگ خوب تھے۔ نجمہ مودی کی خواب میں تجسس نے اینڈ تک جکڑے رکھا۔ مریم کے خان کی ارض، فرض، قرض اپنے عنوان ہی کی طرح زبردست تھی۔ قتل خانہ میں سونیا کی حماقت نے پرویز کا لہو رائیگاں نہ جانے دیا۔ مترجم کہانیوں میں شکارگاہ، بدمعاملہ، ہیرو اور جعلساز پسند آئیں۔ کترنیں بھی کمال تھیں۔ مجموعی طور پر 2014ء کا پہلا شمارہ مکمل انٹرٹینمنٹ کا پیکج ثابت ہوا۔"

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی تجزیہ نگاری "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری جاسوسی سے نئی نئی آشنائی ہوئی تو میں چن چن کر تین یا چار صفحات والی کہانیاں پڑھتا تھا کیونکہ طویل کہانیاں پڑھنا اس وقت کوئی معرکہ سر کرنے سے کم نہیں لگتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اب توجہ صرف طویل کہانیوں کی طرف زیادہ ہوگئی۔ شاید اسی کو ذہنی ارتقا کہتے ہیں۔ جنوری کی سات تاریخ کو جاسوسی ڈائجسٹ قریبی بک اسٹال سے لیا۔ حالانکہ بک اسٹال والا سمجھ رہا تھا ہم کسی اور چکر میں ہیں۔ محلِ وقوع کے اعتبار سے اس کا اسٹال تین چار لیڈیز بوتیک کے عین مقابل واقع ہے۔ سرورق اس دفعہ زیادہ متاثر کن نہیں تھا اس لیے فوراً سے پہلے چیچی تک چھنگلی کا رخ کیا۔ مدیرِ اعلیٰ نے معاشیات اور سیاسیات پر بہت اچھی تحریر لکھی جس سے صد فیصد متفق ہوں۔ زویا اعجاز نے اچھا تبصرہ لکھا اور ہمارے شیکسپیئر کو دادِ تحسین دی، ہم دونوں کی طرف سے شکریہ۔ احسان سحر صاحب! عمر کوئی بھی ہو، شوق اور ترجیحات نہیں بدلنی چاہئیں۔ ویسے آپ کی پوتے پوتیوں والی بات دل کو لگی ہے، امید ہے جلد شادی کرنے کی کوشش کروں گا۔ کھاریاں سے بابر عباس اور مسز بابر عباس آپ کو جو تصویر بھیجی تھی، وہ میری نہ ہونے والی پڑوسن کی تھی اور امید ہے وہ ابھی تک آپ نے سنبھال کے رکھی ہوگی۔ عبادت کاظمی کو ایک دفعہ پھر ہلکا سا خوش آمدید، کیونکہ زیادہ گرم جوشی سے کیا تو وہ پھر تین چار ماہ کے لیے غائب ہو جائیں گے۔ راجا اسلم حیات آپ نے بجا فرمایا۔ اتنی گہرائی تک تو آپ جیسا صاحبِ بصیرت ہی پہنچ سکتا ہے۔ غالب جیسے عظیم سائنس دان نے بھی کہا ہے کہ "تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے" ابرار وارث برادر میری بہت سی باتیں مجھے خود بھی سمجھ نہیں آتیں۔ خیر، اس مقولے کا مطلب یہ تھا کہ ہر اک کی سوچ اس کی ہمت یا استطاعت کے مطابق ہی ہوتی ہے۔ کہانیوں کی طرف بڑھے تو گرداب میں الجھ کر رہ گئے۔ یعنی اس کہانی نے بہت سے قارئین کی توجہ سمیٹ لی ہے۔ جس نہج پر یہ پہنچ چکی ہے اب اس کے کرداروں کو سمیٹا جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ جلد بازی میں ختم کرنی پڑی تو بہت سے پہلو تشنہ رہ جائیں گے۔ جواری میں احمد اقبال صاحب نے ہمیشہ کی طرح کہانی در کہانی والی روایت برقرار رکھی۔ اس لیے بعض اوقات اصلی کہانی اور اندر کی کہانی کے مندرجات اور واقعات باہمی اختلاط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہماری ذہنی کم پختگی اس فعل کی مرتکب نظر آتی ہے۔ ریشم اور انور علی کا تعلق پروان چڑھنا اچھی بات ہے۔ اب خاور کو نورین کی تلاش میں نکلنے میں آسانی ہوگی۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر صاحب جلاد صفت کے

ساتھ رونق افروز ہوئے۔ کہانی بھی اچھی اور بہترین پلاٹ پر لکھی گئی تھی۔ اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے پروفیسر نے غلط راستہ چنا۔ پہلے آغاز میں مجھے محمود ایاز پر ہی منصف ہونے کا گمان ہوا تھا جو نصف کہانی کے بعد پروفیسر کی طرف مڑ گیا اور حسبِ توقع وہی ہوا۔ سرورق کے پہلے رنگ میں نجمہ سودی صاحبہ نے مقصود احمد مقصودی کو پیش کیا۔ اظفر عالم کی پراسرار شخصیت اور حرکتوں پر تھوڑی وضاحت ہو جاتی تو زیادہ مزہ آتا۔ اور آصف ہی ممکنہ قاتل ہوگا یہ اندازہ تب ہی ہو گیا تھا جب مقصودی صاحب اس کے کمرے میں اظفر عالم یعنی آصف سے ملاقات کر کے آئے تھے۔ جبکہ سرورق کا دوسرا رنگ مریم کے خان کا ارض، فرض، قرض سب سے عمدہ رہا۔ بہت اچھی کردار نگاری اور واقعات کی ترتیب تھی۔''

بالاکوٹ سے ساحل امان کے نادر خیالات ''اس مرتبہ تو جاسوسی نے محبوبیت کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ یعنی محبوب کی طرح دیر سے آنے کے۔ اقبال تو دیر سے آتا ہی ہے لیکن جاسوسی کیوں؟ ٹائٹل گرل اس بار میرے بجائے کسی اور چیز کو گھورے جا رہی تھی۔ (یعنی آپ کوئی چیز ہیں؟) جس کا ہم نے قطعی برا نہیں منایا اور محفل کی جانب چل دیے جہاں جاتے جاتے کارواں تو بن گیا پر ہم ہی نہ رہے اس کارواں میں، یعنی محفل میں نہیں تھے۔ خود کو بلیک لسٹ میں نہ پا کر ہمارا وہ حال ہوا جو اکثر صنفِ نازک کا آئینہ دیکھ کر ہوتا ہے۔ ایک بات یاد رہے کہ اس میں بنا میک اپ کی شرط لازم ہے۔ محفل اس بار پھیکی پھیکی سی رہی۔ وجہ صاف ظاہر ہے ہم جو رونقِ محفل نہ بنے تھے۔ ماہا ایمان! جب سے محفل کی تمام توپوں کا رخ آپ کی جانب ہوا ہے، آپ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح ہی غائب ہو گئی ہیں۔ مسز شکیل صاحب آپ کی پڑوسن سے تو پوری محفل ہی متاثر لگتی ہے جیسے سب کو پڑوسن فوبیا ہو گیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب آپ دعا دے رہے ہیں یا... کہانیوں میں صرف ایک کہانی پڑھی ہے اور وہ ہے جواری (کیا؟) اس بار قسط دلچسپ رہی۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے لیکن امید ہے ہمیشہ کی طرح لاجواب ہوگا۔''

سہراب گوٹھ کراچی سے سراج الحق چترالی کے مشورے ''اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ حسبِ معمول 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی ٹائٹل گرل بہت پسند آئی لیکن بیک گراؤنڈ میں منحوس شکل کا آدمی اب بھی رات کو ڈراتا ہے۔ سرورق کی ٹائٹل گرل کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ آج کل لپ اسٹک کی قیمت نمک سے بھی کم ہو گئی ہے۔ خیر بہرحال ہمت کر کے محفلِ یاراں میں دیکھا تو سید شکیل حسین کاظمی کو صدارت کرتے ہوئے پایا، مبارک ہو (نمک لگا کے)۔ پھر جب اپنے خط کو دیکھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ ردی کی باسکٹ نے ہمیشہ کی طرح دوستی نبھائی ہے۔ محفلِ یاراں میں بابر عباس اور مسز بابر عباس کی ملی جلی باتیں دل کو بھا گئیں۔ ڈاکٹر عمران فاروق کو میری طرف سے سواگت ہے (خیر نال)۔ اب دوڑ لگائی اپنی پسندیدہ کہانی گرداب کی طرف تو پتا چلا کہ شہریار ابھی بھی پھنسا ہوا ہے۔ اسما قادری کچھ تو ہمارے جذبات کا خیال کریں۔ کاشف زبیر صاحب کی کہانی جلاد صفت کافی سنسنی خیز تھی اور کہانیوں میں آصف ملک کی کہانی ہیرو کو پڑھ کر پتا چلا کہ دوستی اسی کو کہتے ہیں۔ بابر نعیم صاحب کی کہانی بالادست کافی دلچسپ رہی۔ رنگوں میں آخری رنگ بہت بہت پسند آیا۔ مریم کے خان خالہ آپ کو دل سے مبارک باد۔ اس طرح دلچسپ کہانی لکھیں، باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔''

شیخوپورہ سے محمد شایان سعید کی شمولیت ''سید عبادت کاظمی کو سالگرہ مبارک ہو مگر انہیں افسوس بھی ہونا چاہیے کہ ان کی زندگی کا ایک سال مزید گزر چکا ہے۔ کھاریاں کے عباسی خاندان، میرا مطلب مسٹر اور مسز بابر سے عرض ہے کہ میری عمر ابھی شوخیاں کرنے کی ہے۔ آخر ساڑھے سولہ سال بھی کوئی عمر ہے سنجیدہ رہنے کی۔ اس مرتبہ کہانیاں بہت چٹ پٹی تھیں۔ خصوصاً گرداب تو چھا گئی۔ جواری کا تسلسل بھی چل نکلا ہے۔ سرورق کی کہانیاں کچھ خاص نہیں تھیں۔ البتہ ولایتی کہانیاں مزیدار تھیں۔ ابرار وارث نے درست فرمایا ہے اگر ہم ذکر نہ کرتے تو مصنف صاحب مشابرم خان کو نہ لاتے۔'' (یقیناً آپ کی رائے، تجاویز مصنف سب پڑھتے ہیں ان سے کہانی آگے بڑھانے میں کافی سہولت ہو جاتی ہے)

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی تفصیلی رپورٹ ''5 جنوری کو جاسوسی ڈائجسٹ 2014ء موصول ہوا۔ یہ کیا، صنفِ کرخت مکمل صفحے پر براجمان تھے مگر تکلیف میں نظر آ رہے ہیں۔ اس کی حالت کی ذمے دار صنفِ نازک ہی ہے جو منہ کھولے اس سے مخاطب ہے اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ یہ گولی منہ کے اندر ہوگی۔ بہرحال جاسوسانہ انداز تھا جاسوسی کا۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے انکل کی باتیں سنیں۔ کرسیٔ صدارت پر سید شکیل حسین کاظمی کو دیکھا ان کا تبصرہ اچھا تھا، مبارک ہو۔ ضرور بتایئے انعامی تبصرے پر اب کیا انعام دے رہے ہیں، اعزازی پرچے دے رہے ہیں یا نہیں، ضرور بتایئے (نہیں)۔ بابر عباس مسز بابر عباس! میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ پرانی باتیں بھلا دینی چاہئیں ورنہ باتیں ختم ہی نہ ہوں۔ عروج ناز! کامیابی مبارک ہو۔ صفدر معاویہ! آپ کو شادی مبارک ہو پھر تو صفدر ہمایوں سے سبقت لے گئے۔ ہمایوں صاحب آپ بھی کروا لیں شادی کہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔ عبادت کاظمی! آپ کو سالگرہ کی پیشگی مبارک۔ لگتا ہے محمد متین اشرف بڑے غور سے صفحات دیکھتے ہیں۔ واقعی ان کا سوال درست ہے۔ بھئی مدیر اور مدیر اعلیٰ ہیں تو یہ رسالہ کامیابی سے چل رہا ہے، ہمارے انکل زندہ باد۔ چلیں جی کہانیوں کی طرف۔ ایک تیر دو شکار، سلیم انور خوب صورت انداز میں ڈراپ سین کیا۔ پنچایت ڈتو اور اس کی بیوی پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ آج بھی غریب کی شنوائی ہے۔ امیر ہر ظلم توڑے اس کو کچھ نہیں کہا جاتا۔ قتل خانہ سونیا نے ہوشیاری تو دکھائی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ قاتل کوئی نہ کوئی سراغ ضرور چھوڑ دیتے ہیں۔ حساب برابر میں شرافت نے خوب صورت انداز میں حساب برابر کر دیا۔ سام نے بالادست ہونے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے لیکن مارگریٹ اس کے حواسوں پر چھائی رہی اور مرنے کے بعد بھی اس کو گرفتار کروا گئی۔ عورت ہونے کے ناتے مردے مرنے کے بعد بالادست دکھا گئی۔ شکارگاہ، ولسن خود کو باہوشیار رکھتا تھا۔ لارا اس سے دو ہاتھ آگے نکل گئی۔ ولسن غلط فہمی میں ہی مارا گیا۔ بدمعاملہ میں فلیچر کو قاتل ثابت کرنے کے لیے گلوریا کے دوستوں نے بڑی عقل مندی سے اس کا راز افشا کر دیا۔''

اٹک سے عبدالغفور خان ساغری خٹک کی شکایت اور الجھن ''5 کو جاسوسی ڈائجسٹ ملا۔ سالِ نو کے ٹائٹل کی بات کر اگر اس کے ساتھ یہ ہاف

چہرہ نہ ہوتا تو ٹائٹل خوب صورت ہوتا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ کہانی اچھی جا رہی ہے لیکن مزے کی بات کہ میں جو ڈائجسٹ لے کر آیا تھا۔ صفحہ نمبر 130 تک پڑھا تو آگے جواری انور کی کہانی شروع صفحہ نمبر 163 تھا۔ وہ تبدیل کیا تو اس کے بعد پھر جواری کہانی تھی۔ وہ پڑھی کہانی کچھ سست رفتار جا رہی ہے، مزہ نہیں آیا۔ سرورق پڑھنے لگا تو اس میں آدھی کہانی تھی۔ باقی پر سرگزشت کے اوراق لگے تھے تو کہانی مکمل نہیں کر سکا۔ ابھی تک 2 کہانیاں پڑھ سکا ہوں۔ یہ ادارے کو واپس جاسوسی ڈائجسٹ ارسال کر رہا ہوں۔ صدارت کی کرسی پر اس دفعہ جناب شکیل صاحب بیٹھے تھے۔ محفل خطوط کی تعداد 23 تھی اور بلیک لسٹ کی تعداد 11 تھی۔ ویسے جاوید بھائی تلہ گنگ کو میرا اسلام۔ ادارے کی ترقی کے لیے دعا گو رہوں گا، باقی زیرِ مطالعہ ہے۔''

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی منظر کشی ''6 جنوری کو جاسوسی ملا۔ سرورق پر ہمایوں سعید اپنی اصل شکل (جو قیامِ پاکستان سے پہلے یقیناً اچھی حالت میں ہوگی) کے ساتھ براجمان تھے اور اب تک جتنی کڑیوں سے دل تڑوایا، لتر کھائے وہ سارے رنگ لیے مخصوص ہنسی (تھی تھی کی باہر نکالے) کے ساتھ 2014ء کی کم سن حسینہ کو تاڑ رہے تھے۔ زندہ باد ڈاکر صاحب! کیا منظر کشی کی ہے۔ اپنی محفل میں وارد ہوئے تو سید شکیل حسین کاظمی سرِمحفل اپنے خوب صورت اندازِ بیاں کے ساتھ موجود تھے۔ محفل کی بلبل ماہا ایمان کے بغیر محفل سونی ہے۔ جس ماہ قدرت اللہ نیازی، تفسیر یا ہمایوں سعید نظر آ گئیں تو دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ بلے گلے میں کہیں خرچ نہ ہو گئے ہوں۔ میرا مطلب ہے... چلو چلو کسی دھرنے میں شامل ہو کر۔ آخر چھڑے باز جو ٹھہرے۔ محمد احسان زماں، ڈاکٹر نعیم اکبر سحر، بابر عباس، ابرار وارث، راجا اسلم حیات، آفتاب احمد تفسیر اور خاص کر زویا اعجاز، بشریٰ افضل، احسان سحر کے تبصرے دلچسپ تھے۔ سحرش افضل کو انگریز نام والی کہانیاں نہیں بھاتیں مگر فل ایکشن، اسٹائل، بور، اسٹرانگ اور نو کمنٹس جیسے انگریزی لفظ بھاتے ہیں اور اب کچھ کہانیوں کے بارے میں۔ گرداب، اسما قادری کی بہترین تحریروں میں سے ایک ہے اور جب بھی کتابی شکل میں آئی تو اپنے ریکارڈ میں رکھوں گی ان شاء اللہ۔ اسلم کی موت نے انتہائی افسردہ کیا جتنا ماہ بانو کی اسلم سے شادی نے کیا تھا۔ اگلی قسط میں بھتا گر کا بدانجام دیکھنے کی تمنا ہے۔ جواری سے جب نورین غائب ہوئی تو کہانی بے جان ہو گئی۔ ریشم سے بھی کام نہ بنا مگر اب کہانی نے موڑ لیا ہے۔ آخر قلم ہمارے احمد اقبال کا ہو اور کہانی میں جان نہ ہو، کیسے ہو سکتا ہے۔ دل موہ لینے والے رائٹر آصف ملک کی ہیرو حاصلِ مطالعہ رہی۔ تنویر ریاض کی جعل ساز خوب تھی جبکہ ایک تیر سے دو شکار، قتل خانہ، شکارگاہ، بالادست، بدمعاملہ گزارے لائق تھیں۔ محمد تنویر اختر کی پنچایت کا فیصلہ کچھ بھی ہو ختو کا بدلہ قدرت نے ملک سونہارے سے لے لیا۔ لیتی زبیر کے حساب برابر میں کہیں سے حساب برابر نظر نہیں آیا البتہ کردار میں شرافت، شیبا برابر نکلے۔ ارض، فرض، قرض میں ایک عام کہانی کو مریم کے خان کے کمال نے خاص رنگ بخشا۔ سرورق کا سارا عکس لیے یہ بہترین تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی جلاد صفت اور نجمہ سودی کے خواب ابھی نہیں دیکھے، اس امید کے ساتھ کہ بلیک لسٹ میں نہیں رکھیں گے۔''

طاہرہ گلزار کی ناراضی پشاور سے ''ادارے کو اور میرے کھٹے میٹھے کچھ بے مروت دوستوں کو نیا سال عیسوی کو مبارک ہو۔ جاسوسی آخر 9 کو ملا بہت خوشی ہوئی۔ جاسوسی کا سرورق بڑا دلچسپ اور جاسوسی کے مطابق لگا۔ زویا اعجاز ہاتھ میں 2014ء کا کڑا اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں ایک عدد کارتوس پکڑ کے جی قدرت اللہ نیازی کو دھمکی دے رہی ہیں کہ یہ آپ کے لیے ہے۔ آگے سے قدرت اللہ بتیسی نکال کے ہنس رہے ہیں کہ کیا کر لو گی۔ شکیل حسین صاحب ہو سکتا ہے وہ سرورق والی خاتون کو آپ کا پڑوسن سے ملنا پسند آیا ہو۔ زویا اعجاز ذرا آغا فرید کے لیے ہاتھ ہولا رکھیے۔ میرا یہ بھائی بہت نازک مزاج ہے۔ احسان سحر آپ کا خط اس ماہ کا بھی بہت زبردست ہے۔ سید عبادت کاظمی! آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ میری طرف سے خیر سے کتنے سالوں سے ماں باپ کو تنگ کر رہے ہو ہاہاہا۔ بھائی محمد متین! میں بھی آپ سے متفق ہوں کہ اب گمراہ، مجاہد، شکاری، مداری، آدھا چہرہ اور زنداں میں پھول اور موت کے سوداگر جیسی کہانیاں کہاں۔ وارث جی تو کیا آپ کو پتا ہے کہ ماہا جی کون ہے۔ تفسیر بھائی، شیر علی خان، قدرت اللہ اور جاوید بلوچ آپ لوگ کہاں چھپ گئے ہو؟ حاضر ہو، کچھ نہیں کہا جائے گا۔ پہلے گرداب پر تبصرہ ماہ بانو کو ایڈی نے بچایا اور اسلم کی موت ہو گئی۔ اب ہیروئن آزاد، سلو کا رائے گھر دو اور شہر یار کا انڈیا کے ظلم سہہ کر بھی زبان بندی۔ واہ مردِ مجاہد شہریار جی ویلڈن، کاش میرے ملک کے سارے افسر شہریار بن جائیں۔ گرداب کے بعد جلاد صفت پڑھی۔ کاشف زبیر کا نام نظر آئے تو پھر اس کی کہانی کو نہ پڑھنا تو ایسا ہے جیسے نعمتوں سے انکار۔ جلاد صفت بہت پسند آئی۔ آخر تک سسپنس رہا کہ منصف کون ہے۔ جب منصف کا پتا چلا تو میں حیران رہ گئی کہ وہ پروفیسر ہے جو خود محمود اور صبا کے ساتھ مل کر مجرم کو تلاش کرتا رہا۔ جواری میں صرف اتنا فرق آ گیا ہے کہ اب خاور کی بونگیاں کچھ زیادہ ہی تنکے پتر کی طرح لگنے لگی ہیں۔ پلیز احمد اقبال صاحب سے گزارش ہے کہ کچھ چٹ پٹا مسالا مکس کریں تاکہ جواری بھی گرداب کے پیچھے بھاگ لے ورنہ دی اینڈ کر لیں۔''

عروج ناز، شہر تلہ گنگ سے لکھتی ہیں ''جاسوسی اس دفعہ معمول سے کچھ لیٹ یعنی آٹھ تاریخ کو جان لیوا انتظار کے بعد موصول ہوا۔ حسینہ جاسوسی کی کلائی میں جگمگاتا 2014ء کے ہندسوں سے سجا کنگن دل کو بہت بھایا۔ مجموعی طور پر ٹائٹل منفرد اور عمدہ تھا۔ کاظمی صاحب کو حادثاتی طور پر کرسیٔ صدارت ملنے پر مبارک باد۔ آپ کا لمبا چوڑا تبصرہ اس دفعہ آپ کے انداز سے کچھ ہٹ کے لگا۔ محترم جناب بابر عباس آپ کے تبصرے کے کیا کہنے، واہ۔ آپ جیسے بوگے ہمارا تبصرہ پڑھتے ہی کیوں ہیں۔ معاویہ برادرز کا شکریہ۔ سالگرہ بتانے کا مقصد فقط یہ تھا کہ اب ہم بھی بڑوں کی لسٹ میں شامل ہو گئے ہیں سو ہمیں چھوٹا سمجھ کے ہم سے پنگا نہ لیا جائے۔ اسلم حیات صاحب! آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ابرار وارث صاحب! آپ کی بھی تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ کہانیوں میں ابتدا کی گرداب سے۔ اسما جی، یہ کیا کر دیا؟ آپ نے اسلم کو مار دیا۔ گو شہریار کا رقیب تھا مگر ماہ بانو کی وجہ سے ہمیں عزیز بھی تھا۔ شہریار اور سلو چوہے دان میں پھنس چکے ہیں دیکھتے ہیں کہ وہ اس چوہے دان سے کیسے رہائی حاصل کرتے ہیں۔ کاشف زبیر کی جلاد صفت متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ مریم کے خان کی ارض، فرض، قرض بھی پسند آئی۔ بلال کا کردار بہت پسند آیا جس نے کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی عابد کی مدد کی۔ نجمہ سودی کی خواب کچھ خاص رنگ نہ جما سکی۔ چھوٹی کہانیوں میں بدمعاملہ، جعل ساز اور بالادست پسند آئیں۔ امجد رئیس کی قتل خانہ بھی عمدہ تھی۔''

صفدرآباد سے مہک صابر کی خواہش ''میں دوسری جماعت میں پڑھتی ہوں۔ میرا بھائی آپ کے ڈائجسٹ ہر ماہ لاتا ہے۔ میں ابھی بچوں کی

کہانیاں پڑھتی ہوں۔ میں ابھی اس میں سے لطیفے پڑھتی ہوں جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو کیا میں بھی پڑھ سکتی ہوں؟ میرا بھائی آپ کے ڈائجسٹ میں خط لکھتا ہے۔ اب آپ میرا خط شائع کریں ورنہ میں نہیں پڑھوں گی اور سب لوگ مجھے ویلکم کریں۔'' (ویلکم... ویلکم ننھی منی قاری صاحبہ)

سدھلیاں والی کے ابرار وارث + تیمور عاطف کا ڈر خوف ''جاسوسی نے اس دفعہ پھر لیٹ ہونے کا ریکارڈ برقرار رکھا اور سات جنوری کو بمشکل ملا۔ ٹائٹل مجموعی طور پر کچھ خاص تاثر نہ دے سکا۔ جلدی سے فہرست کی طرف نگاہ دوڑائی تو ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار پایا۔ فیصلہ نہیں کر پائے کہ کیا پڑھیں۔ سب سے پہلے محفلِ یاراں میں قدم رنجہ فرمایا۔ آپ کا اداریہ پڑھا اور صرف سوچ ہی سکے کہ شاید ہی کوئی حکمران ایسا آئے جو ہم سے چھنی ہوئی عزت شہرت اور کالا دھن ملک میں واپس لا سکے۔ شکیل حسین کاظمی کو اول قرار دیا گیا۔ تبصرہ پڑھا، آپ کی آخری لائنوں سے میں متفق ہوں کہ پچھلی دفعہ سرورق کے دونوں رنگوں نے بور کیا۔ زویا اعجاز کا تبصرہ بھی بہترین تھا، خاص کر آغا فرید بھائی کا نام جو انہوں نے رکھا۔ احسن زمان کیا آپ دودھ پیتے بچے ہو کیوں خوف کے مارے اتنا تھر تھر کانپے جا رہے ہو۔ کہانی میں اب ایسی بھی کوئی دہشت نہیں تھی آپ کا تبصرہ دہشت اور خوف کی داستان تھا، حوصلہ رکھو یار... عمران فاروق بھی بڑے ہی باتونی نکلے۔ کسی کہانی پر کوئی بھی کمنٹس نہیں دیا۔ مانسہرہ سے ڈاکٹر نعیم اکبر سحر آپ ابھی تک سحر کو نہیں دیکھ پائے اور جواری واقعی ہی بورنگ ثابت ہو رہی ہے۔ شایان سعید! آپ 1990ء کے جاسوسی کو دیکھ کر حیران کیوں ہوئے یہ تو 1970ء سے جاری ہے خیر امید ہے حیرت دور ہو گئی ہوگی آپ کی۔ سنز یار + بابر کا تبصرہ سب سے بہترین تھا۔ عبادت کاظمی کا تبصرہ بھی بہتر تھا۔ محسن کمال کی ناپسندیدگی سے میں بھی سو فیصد متفق ہوں۔ دسمبر کا شمارہ کسی کام کا نہیں تھا، ہاں اس دفعہ ساری کسریں پوری ہوئی ہیں۔ راجا اسلم حیات سرورق کو دیکھ کر جو آپ نے بات کی وہ پوری نہ ہوگی۔ کوہسار بھیا آئے ہی نہیں تھے۔ بقول ان کے مصروفیت تھی ان کو بہت۔ اسلم بھائی آپ کی بات پھر پوری نہیں ہوئی۔ صفدر آباد والوں کا شوشا اس دفعہ بھی پورا نہ آیا۔ مشابرم خان ہر جگہ لیٹ ہی پہنچ رہا ہے۔ ہاں سلو والی خواہش تو آپ کی پوری ہو گئی ذرا دیر سے ہی سہی۔ ہمایوں سعید لگتا ہے شادی کی مصروفیات میں وقت نہیں نکال پائے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں پر۔ حسب معمول آغاز گرداب سے ہی کیا۔ گرداب کب ختم ہوئی پتا ہی نہ چلا شکر ہے کہ سلو واپس آ گیا ورنہ شہر یار بے چارہ تو مکمل طور پر بے بس ہو گیا تھا غیرے تو صحیح معنوں میں اس وقت رونگٹے کھڑے ہو گئے جب شہر یار کو اذیت دی جاتی لیکن ہمت ہے اس مجاہد کی ایک لفظ اپنے بارے میں نہیں بتایا۔ دوسری طرف ماہ بانو شکر ہے محفوظ ہاتھوں میں چلی گئی۔ مشابرم خان پہنچ تو گیا لیکن افسوس کہ ایڈی کو بھی نہ بچا سکا۔ کاشف زبیر کی جلاوطنی پڑھی۔ شروع شروع میں تو بہت بورنگ لگی لیکن آخر میں جا کر کچھ پسند آئی۔ مریم کے خان اور نجمہ مودی کی کہانیاں یقیناً دل سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ بلیک لسٹ کے ڈر سے انتہائی لکھ رہا ہوں شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔''

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی پسندیدگی ''نئے سال کا نیا جاسوسی کچھ تاخیر سے یعنی اعلان کردہ تاریخ سے دو دن لیٹ 5 جنوری کو ملا۔ جہاں ٹائٹل گرل انگلی اور انگوٹھے کے درمیان پکڑی بلٹ کو بہت حیرانگی سے دیکھ رہی ہے۔ پس منظر میں ایک چہرے کا خاکہ ہے۔ اندر کے صفحات پر چھپی نکتہ چینی میں اداریے میں تلخ حقیقتوں کا ادراک ہوا۔ واقعی میں حقیقت ہے کہ اختیار والے اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو گئے ہیں اور بے حسی سے قوم کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ سرِ فہرست سید شکیل حسین کاظمی کو مبارک باد و شکریہ۔ دیگر دوست بھی محفل میں حاضر ہیں اور سرد موسم میں گرما گرم ماحول ہے۔ سب ہی دوستوں کو نئے سال کی ڈھیر ساری مبارک باد۔ سب سے پہلے کاشف زبیر کی جلاوطنی پڑھی۔ بہترین کہانی تھی اور جیسے حالات تھے اور ہیں، موقع محل کے اعتبار سے بہت اچھی تھی۔ جواری بھی تسلسل سے جاری ہے جس میں کہانی در کہانی کا بھی سلسلہ چل رہا ہے۔ گرداب بھی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ہیرو میں کرسی نے اچھا فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کو بلوتی کی اصلیت نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔ چشم دید میں مارشل کی سوچ منفی تھی انجام کار اپنی جان سے گیا۔ شکارگاہ میں ولسن جیسا گھاگ شکاری، شکاری کا خود ہی شکار ہو گیا۔ لارا نے اسے شکار کر لیا۔ بدمعاملہ میں ہوشیاری سے جرم کرنے کے باوجود کوئیک کے ہاتھوں بے نقاب ہو گیا۔ ایک تیر دو شکار بھی اچھی رہی۔ جعل ساز بھی دلچسپ رہی۔ پنچایت میں غریب کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بختو کے ساتھ ہوا کہ عزت بھی گئی۔ پنچوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا۔ قبل خانہ میں سونیا اور حبیب کی سازش نے غلط مال کی وجہ سے انہیں پھنسا دیا۔ حساب برابر نے اچھا تاثر دیا۔ آخری صفحات کی کہانی میں منصور احمد منصوری نے بڑی ذہانت سے اظفر کے قتل کا معاملہ حل کر دیا۔ زرا اور زرن نے آصف کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اس نے زرینہ کے ایما پر قتل کر دیا۔ دوسری سرورق کی کہانی بھی بہت اچھی رہی۔''

کراچی سے محسن کمال کا سوال ''لگتا ہے جاسوسی نے کمال کرنے میں مجھے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ آپ تو سالوں سال کمال کرتے ہیں... اس بار بھی جاسوسی 4 تاریخ کو ہی ملا۔ سرورق عمدہ تھا، خاص طور پر گولڈن کڑے میں کندہ 2014ء بے حد جاذب نظر لگا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آغاز گرداب سے کیا۔ اسما قادری کہانی کو بڑی خوب صورتی سے سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ماہ بانو کی واپسی سے دل خوش ہوا تھا کہ اسلم کے مرنے کی خبر سن کر اداس ہو گیا۔ لگتا ہے اب ماہ بانو کی شہر یار کی زندگی میں واپسی قابلِ عمل ہو رہی ہے۔ خیر۔ اس بار جواری پڑھنے کا جی ہی نہیں چاہا کہ کہانی بالکل بھی جاسوسی کے صفحات سے میل نہیں کھاتی۔ نجمہ مودی کی خواب بھی اچھی تحریر تھی مگر پلاٹ کافی گھسا پٹا تھا۔ ارض، فرض، قرض مریم کے خان کی عمدہ تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی جلاوطنی پڑھتے پڑھتے جاسوسی میں پڑھا ہوا ایک چٹکلا ذہن میں آ گیا جس میں ایک عورت اپنی سہیلی سے کہتی ہے کہ اس کہانی میں مصنف نے کمال کر دیا۔ آخر میں قاتل وہی نکلا جس پر شروع سے شک تھا۔ جلاوطنی کے تبصرے بیچ سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مصنف کون ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں تبصرہ نہیں کر سکتا۔ انکل مجھے یہ بتا دیں کہ جو سلسلہ جاسوسی میں شروع کرتا تھا، طاہر جاوید مغل کا اس کے لیے آپ نے سسپنس کا انتخاب کیوں کیا؟''

جھنگ سے عائشہ اسلم کی جسارت ''ہمیشہ کی طرح جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ اس مرتبہ ڈاکٹر انکل نے صنفِ نازک کو 2014ء کے 14 چاند لگا دیے۔ دلنشین آنکھیں، گلاب ہونٹ، خوب صورت کلائی، 2014ء کا حسن کارکردگی کا ایوارڈ اور صنفِ کرخت کو بارود دکھا کر جتنے پر مجبور کرتا۔ واہ جی واہ، کیا بات ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کی داد دینی پڑے گی، ڈاکٹر انکل کو دوبارہ سے۔ مختصر اشتہارات پھر آگے پڑاؤ مدیر اعلیٰ صاحب کی شوگر مل جا کر کیا۔ اداریہ پڑھا، ذہن میں فوراً گونجا ''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔'' یہ اللہ کا نظامِ کائنات ہے کہ جیسی قوم ویسے حکمران کیونکہ آنے والا موسم بہار کا ہے تو ہم بھی تمام دوستوں، بہنوں، بھائیوں کی محفل کو محفلِ بہاراں میں لیے چلتے ہیں۔ بھائی شکیل کاظمی کو صدارت کے لیے مبارک باد۔ آپ کا تبصرہ مختصر لیکن اچھا لگا۔ بہن زویا اینڈ احسان سحر کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ احسن زمان آپ کو محفلِ بہاراں میں موسٹ ویلکم۔ ڈاکٹر عمران صاحب کا چٹکلوں بھرا تبصرہ جاندار تھا پڑھ کر مجھے بھی چائے کی طلب ہوئی ہاہاہا۔ بھائی بابر عباس اینڈ بھابی جی، اس مرتبہ آپ نے باتیں کم مرچیں زیادہ چبائی ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ بابر بھیا تبصرہ خود لکھا کرو ہاہاہا۔ بھائی صفدر معاویہ حسنین معاویہ آپ نے بتایا نہیں کہ شادی کس بھائی کی ہو رہی ہے۔ بہرکیف پیشگی مبارک باد۔ مرغا بننے کے لیے قبول فرمائیں ہاہاہا۔ سید عبادت کاظمی! آپ کی زندگی کا ایک اور سال کم ہو گیا پھر بھی آپ خوش ہو رہے ہو ہاہاہا۔ بڑے بھائی محمد تحسین اشرف! ہم سب کو امید ہے کہ کوئی معیاری کہانی بہت جلد پڑھنے کو ملے گی (انشاء اللہ تعالیٰ) ٹوٹل 15 کہانیوں میں سے 11 پڑھ لی ہیں۔ مجموعی طور پر جنوری 2014ء کا رسالہ بہت اچھا رہا۔ مختصر کترنوں نے مزہ دوبالا کیا۔ آخر میں میری بھی دعا ہے ان تمام بہنوں، بھائیوں کے لیے جو قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ پاک سب کو رہائی عطا فرمائے، آمین۔ اور بھائی عمران بلوچ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی مصروفیت ''شمارہ حسب معمول 6 کو مل گیا۔ سرورق پر ماڈل ہاتھ میں گولی اور بازو میں کڑا پہن کر کھلی آنکھوں، کھلے منہ کے ساتھ بھی خوب صورت نظر آ رہی ہے اور ساتھ ہی کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ ساتھ اس بندے کو دیکھ کر آپ کا اداریہ پڑھا۔ بہت ہی بے تکے لفظ تھے۔ کاش کہ ایسا ہو جائے اور واقعی نیلسن منڈیلا ایک عظیم راہنما تھا۔ ایسے لیڈر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں لیکن ہمارے پاس تو ایک ایسی شخصیت کے قول و اقوال، تعلیمات اور روشن راستہ ہے جس پر چل کر نہ صرف ہم دنیا بلکہ آخرت میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ جی ہاں میں بات کر رہا ہوں عظیم رہبر عظیم پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ کی جس کے راستے پر چل کے پاکستان سمیت دنیا بھر میں جہاں جہاں مسلمان رہتے ہیں وہ دنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں لیکن ہم طریقے سے ہٹے اور دنیا میں برباد ہو گئے اور آخرت میں بھی رسوا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اپنی محفل میں وارد ہوئے تو محترم بھائی شکیل حسین صاحب کو کرسیٔ صدارت پر قلقاریاں مارتے دیکھا۔ تبصرہ بھی اچھا تھا مبارک ہو جی۔ زویا اعجاز بھی لفظوں کا بہترین استعمال کرتی نظر آئیں۔ محمد احسن زمان بھی لفظوں کا خوب صورت جال بچھاتے نظر آئے۔ سحرش افضل، سردار ظفر اقبال، آفتاب احمد، محمد شایان سعید، بشریٰ افضل صاحبہ مختصر مگر جامع تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ جلاوطنی ایک پُراثر اور سبق آموز کہانی تھی لیکن پروفیسر شاد سے یہ امید نہیں تھی۔ گرداب کی قسط نہایت ہی اچھی رہی اور شہر یار کے ساتھ اتنا ظلم نہیں کرنا تھا۔ جواری کی تو ابھی تک کوئی سمجھ نہیں آ رہی کہ کہانی کدھر جا رہی ہے۔ سرورق کی پہلی کہانی خواب میں منصوری صاحب نے کیا معاملہ سلجھایا ہے، کیا طریقہ اختیار کیا ہے محمد آصف نے لیکن بے چارہ بلی کو ہٹانا بھول گیا اور پھنس گیا۔ ارض، فرض، قرض میں بھی پڑھنے کا مزہ آیا، کس طریقے سے مریم کے خان نے کردار کو آپس میں ملایا۔ کہانی کافی جاندار تھی۔ باقی سب کہانیاں بھی ونڈرفل تھیں۔ رسالہ مجموعی طور پر بیسٹ رہا کیونکہ شادی کے ماحول میں خط بڑی مشکل سے لکھ پایا ہوں اور جن ساتھیوں نے مجھے مبارک باد دی ہے، ان کو پیشگی خیر مبارک۔''

محمد اقبال کی آمد کراچی سے ''جاسوسی ڈائجسٹ 4 جنوری کو مل گیا تھا۔ نئے سال کے جاسوسی کا ٹائٹل اپنی آب و تاب کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ چنچل سی لڑکی کا شوخ انداز خوب بھایا۔ اس سے نگاہ چراتے ہوئے پہنچے نکتہ چینی میں جہاں سید شکیل کاظمی پہلے نمبر پر تھے۔ جناب کے تبصرے عمدہ تھے اور واقعی کرسیٔ صدارت پر براجمان ہونا ان کا حق تھا۔ اسٹارٹ ہم نے گرداب سے کیا اور اسما قادری کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس قسط میں تھیو تیز کیا اور ہیرو شہر یار کو بھتا گر کے حوالے کر کے اپنے اوپر کی گئی اپنے استاد کی محنت جنہوں نے ان کی ٹریننگ کر کے انہیں اس قابل بنایا، اس کی آزمائش میں پورے اترنے کا موقع دیا اور ثابت کر دیا کہ ان پر کی گئی محنت ضائع نہیں گئی اور ساتھ ہی حب الوطنی کے جذبے کے تحت شہر یار نے بھتا گر کو زچ کر کے رکھ دیا۔ شہر یار کی برداشت نے عمو (للکار کے ہیرو بھائی) کی یاد تازہ کر دی۔ سلوکی را کے ہاتھوں ٹریننگ کا اب بھتا گر کو سامنا کرنا پڑے گا۔ بھتا گر کا باپ بھتا گر کو میاؤں کر کے نکل جائے گا اور امید ہے کہ اپنے استاد کو بھی ٹھکانے لگا کر اس کا صفایا کر دے گا۔ گرداب پڑھ کر باقی کہانیوں سے معذرت کرتے ہوئے ڈائجسٹ سے ایک ہفتے کی چھٹیاں لے کر اپنے برادر نسبتی (دو) خالد عزیز اور کاشف رفیق کی شادیوں کی تقاریب میں شرکت کے لیے کوٹری شہر جانا ضروری تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ آپ شادی کی تمام تقاریب میں شریک ہوں گے تو ہم سہرا باندھیں گے ورنہ بغیر سہرے کے شادی ہوگی اور یہ ہماری زوجہ محترمہ کو منظور نہ تھا سو نوکری کی تو نخرا کی کے مصداق بصد شوق تمام تقاریب میں بھرپور شرکت کی۔ شادیوں کی گہما گہمی سے فارغ ہو کر کراچی آنے کے بعد جواری سے سلسلہ شروع کیا اور چودھری صاحب کی حویلی میں جو تانے بانے الجھے ہوئے ہیں، ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہانی کب ختم ہوئی پتا نہ چلا اور ہماری تشنگی باقی رہ گئی کہ آئندہ پھر اس سلسلے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جو سر سے گزر گیا ہے کہ کب کہانی سمجھ میں آنی شروع ہوگی۔ سرورق کی پہلی کہانی خواب میں منصوری صاحب نے کیا معاملہ سلجھایا ہے، عمدہ طریقہ اختیار کیا ہے اسے سلجھانے میں۔ ارض، فرض، قرض میں بھی پڑھنے کا مزہ آیا۔ کس طریقے سے مریم کے خان نے کردار کو آپس میں ملایا۔ کہانی کافی عمدہ تھی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ انہیں پڑھ کر تبصرہ کرنے کی کوشش کرتا تو شاید بلیک لسٹ میں بھی جگہ نہ مل سکے اسی ڈر سے ان کا ذکر ڈراپ کرتے ہوئے خط پوسٹ کر رہا ہوں۔ آئندہ اس سلسلے کو جاری رکھنے کی کوشش کروں گا۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

انصار احمد، کراچی۔ حرا صابری، حیدر آباد۔ ناہید فیاض، میرپور خاص۔ وقار حسین، کوٹری۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔ شہناز اقبال، کراچی۔ شگفتہ گلزار، حیدر آباد۔

خوں ریز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انسان کی حرص... بھوک اور اس کا جارحانہ مزاج... کمزور و ناتواں پر حکومت کرنے کا غرور... اب اس دنیا کا دستور بن چکا ہے... انسان ازل سے رائج اس ہار جیت کے تماشے سے آگے بڑھا ہی نہیں... جنگ اور خون ریزی اس کا شغل رہا... اور مالِ غنیمت سرور و شباب کی گھڑیاں... زندگی کو کشت وخون سے لبریز کردینے والوں کی داستان۔ ان کے نزدیک انسانی جاں ساحل پر دم توڑدینے والی لہروں کے مانند تھی۔ قانون کے آہنی شکنجوں کو توڑ کر اپنی گھناؤنی دنیا آباد کرنے والے مجرم... جو صرف خون کی ہولی کا کھیل... کھیلنا جانتے تھے۔

ہتھیاروں سے لیس دہشت کا بازار گرم کردینے والے ہرکاروں کا ہولناک تماشا.....

باھو چوک اڈے پر اس وقت سب کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔

ایک پستہ قد، مضبوط جسم کا مالک شخص مارے طیش کے بل کھا رہا تھا۔ اس کے غصے میں پریشانی کی جھلک اور آنے والے خطرے کی تشویش کا عنصر غالب تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سے زیادہ تھی۔ سر گنجا تھا۔ رنگ کالا اور آنکھیں سیاہ بیل کی طرح موٹی اور ابھری ہوئی تھیں۔

غصے اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات نے اس کی صورت کو مزید خوفناک بنا دیا تھا۔ وہ بار بار اپنے بدہیئت ہونٹوں اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتا اور بڑبڑاتا جاتا۔

''یہ... کیا ہو گیا...؟ کیسے ہو گیا...؟ میرا بازو کٹ گیا... میرا بازو کاٹ دیا گیا... مم... مگر یہ... کیسے ممکن ہوا...؟ کیسے...؟''

اب وہ غصے سے دہاڑا اور اپنے سامنے کھڑے آدمیوں سے پوچھا۔

''تم سب کہاں مر گئے تھے؟ ہمارے گبرو شیر کو کس نے اتنی آسانی سے کاٹ کر بھرے چوراہے میں بوری میں ڈال کر پھینک دیا اور... تم... تم... تف ہے تم پر...'' مارے غضب کے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

اس وقت موجود ان ساتھیوں کی تعداد نو تھی۔ وہ سب اپنے باس کی قہرناکی پر اندر سے لرزاں تھے مگر خاموش تھے۔

یہ عمارت دو منزلہ تھی، تمام لوگ اس وقت دوسری منزل پر موجود تھے۔ "سلطانہ منزل" کے نام سے موسوم یہ عمارت پہلے موچی پاڑے کے ناتا رحیم کی ملکیت تھی۔ مگر اب اس پر ظاہر شاہ کا قبضہ تھا۔ چند روز قبل اس کے ایک اہم آدمی آصف کریکر کو کسی نے بیدردی سے ٹارچر کرنے کے بعد ہلاک کر ڈالا تھا اور اس کی لاش بوری میں بند کر کے باحو چوک پر پھینک دی تھی۔

ظاہر شاہ کو یوں لگا جیسے اس کا دایاں بازو کاٹ دیا گیا ہو۔ ظاہر شاہ کے دیدہ و نادیدہ دشمن... ظاہر شاہ سے زیادہ اس کے اہم ترین کارپرداز... آصف کریکر کے نام سے لرز جاتے تھے۔ وہ غضب کا خونی اور بے رحم درندہ صفت آدمی تھا۔ وہ اپنے باس ظاہر شاہ کا حکم پاتے ہی کسی روبوٹ کی طرح حرکت میں آتا اور آناً فاناً اپنے شکار کو نہایت بیدردی اور سنگ دلی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

دو بڑی اہم سماجی شخصیات اور ایک سیاسی تنظیم کے رہنما کے قتل کا الزام بھی اس کے سر تھا۔ اس کے علاوہ تین بینک ڈکیتیوں کی وارداتیں بھی کر چکا تھا اور ایک اہم پولیس افسر کو بھی قتل کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔ وہ ایک خطرناک اور ٹارگٹ کلر تھا۔

پولیس انتظامیہ نے اس کے سر کی پچیس لاکھ قیمت مقرر کر رکھی تھی مگر وہ تو چھلاوا تھا، کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ وہ چھ فٹ لمبا اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ بلا کا پھرتیلا اور چالاک تھا۔

ظاہر شاہ کے بڑے بڑے خطرناک دشمنوں نے محض آصف کریکر کی بربریت سے بچنے اور اس کے خوف سے ظاہر شاہ کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ ان میں سب سے اہم دشمن موچی پاڑے کا ناتا رحیم تھا۔ اگرچہ اسے بھی اپنے دو آدمیوں عارف جنگی اور نوید لمبا پر بڑا گھمنڈ تھا مگر آصف کریکر نے اس کے ان دونوں قابلِ فخر سپوتوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ تب سے ناتا رحیم کے دل و دماغ میں ظاہر شاہ کی ایسی دہشت بیٹھی تھی کہ اس نے فوراً اپنے دو اہم اڈے "تحفتاً" اس کے حوالے کر ڈالے تھے۔ ایک یہ سلطانہ منزل، دوسرا اڈا عیسیٰ ناکا والا تھا۔

عیسیٰ ناکا والا اڈا آصف کریکر کے حوالے تھا۔ وہیں اس نے ٹارچر سیل بھی بنا رکھا تھا اور مغویوں کو وہاں لا کر ان سے ضروری پوچھ گچھ کرنے کے بعد بیدردی سے ہلاک کر دیتا اور ان کی لاش کو بوری میں بند کر کے دشمنوں کے علاقے میں پھنکوا دیتا۔ یہاں سے آصف نے دو مزید اڈوں کی بھی داغ بیل ڈالی تھی۔

گگری ٹاؤن والے علاقے میں قبضہ کرنا آصف کے چند بڑے کارناموں میں سے ایک تھا۔ وہاں اس سے پہلے نبیل دادا کا قبضہ تھا جو جرائم پیشہ دنیا کا بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا۔ حالانکہ اسے ایک بڑی سیاسی تنظیم کی خفیہ پشت پناہی حاصل تھی مگر وہ بھی آصف کی وجہ سے ظاہر شاہ سے ٹکر نہ لے سکا اور آصف کے بے رحم ٹولے کا اگرچہ اس نے بھی جم کر مقابلہ کیا مگر بالآخر مارا گیا۔

پورے سات برسوں تک آصف کریکر کی دہشت چھائی رہی اور اس کی آڑ میں ایک بڑی اہم سیاسی شخصیت نے بڑے بڑے فائدے حاصل کیے۔ وہ ایسی شخصیت تھا جس کے آگے نہ صرف آصف بلکہ ظاہر شاہ بھی اپنا سر جھکاتا تھا۔ اس شخصیت کا نام جہانداد خان تھا۔ تاہم آصف کو "دریافت" کرنا ظاہر شاہ کا ہی کارنامہ تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ آصف جیسے چھلاوا، بے رحم، طاقتور اور خطرناک ٹارگٹ کلر کو کس نے ہلاک کیا۔ اس کا قتل ابھی تک راز میں تھا جو خود ظاہر شاہ کے لیے ہی نہیں بلکہ انتظامیہ کے لیے بھی معما بنا ہوا تھا۔ دشمنوں تک کو جہاں آصف کے مرنے کی خوشی تھی، اس سے زیادہ اس بات پر حیرانی تھی کہ آخر وہ جی دار اور مائی کا لال تھا کون؟ جس نے آصف جیسے "موذی جن" کو ایک ہی ہلّے میں پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

دراز قد اور چھریرے جسم کا مالک ناتا رحیم کا پورا وجود اس وقت لرز رہا تھا۔ یہ کسی خوف کے باعث نہ تھا بلکہ بے پایاں مسرت اس پر غالب تھی۔ آصف کریکر کی موت یا قتل کی خبر سن کر پہلے تو اسے اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔ اس پر تو جیسے شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اگرچہ ظاہر شاہ نے آصف کی موت کی خبر کو سردست راز میں رکھنے کی پوری کوشش کی تھی... تاکہ جب تک وہ خود "سنبھالا" لے لے... مگر تین روز بعد ہی یہ خبر ایک ویڈیو ٹیپ کے ذریعے چہار دانگ پھیل گئی اور ہر طرف سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

اس ویڈیو ٹیپ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے پوری مربوط پلاننگ کر کے پہلے آصف کریکر جیسے چھلاوے کو بڑی جی داری کے ساتھ اغوا کیا اور پھر اس پر بالکل اس انداز سے تشدد کیا گیا جس طرح وہ اپنے دشمنوں پر کرتا تھا پھر بڑی بیدردی سے اس کی شہ رگ کاٹ کر ہلاک کر دیا۔

ناتا رحیم کے پاس خوش خبری لانے والا قادر بخش عرف کادرا تھا جس کے شانوں کو نہ جانے کتنی بار ناتا رحیم نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر پوچھا تھا۔

"کادرے! سچ بول، کک... کیا واقعی اس موذی... آصف کریکر کا خاتمہ ہو گیا ہے؟"

"ہاں استاد! بھلا اتنی بڑی اور اہم خبر میں آپ کو غلط کیسے سنا سکتا ہوں؟" قادر بخش نے کہا۔

"اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔" ناتا رحیم نے اپنے دائیں ہاتھ کی چٹکی بجا کر خود کلامی کی۔ اس کا اشارہ ظاہر شاہ کی طرف تھا پھر اپنے سیل فون پر ایک نمبر پنچ کیا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں... روشن خان؟"

رابطہ ہوتے ہی ناتا رحیم نے کہا۔ مسرت و خوشی سے اس کی آواز... لرز رہی تھی۔

"خبر غلط ہوتی تو یوں جنگل کی آگ کی طرح نہ پھیلتی ناتا..." دوسری جانب سے کھردری آواز ابھری۔ "میرا بس نہیں چل رہا کہ میں یہ کارنامہ انجام دینے والے کے ہاتھ چوم لوں، اپنا تاج اتار کے اس کے سر پر پہنا دوں۔"

"بالکل روشن خان! بالکل... وہ جی دار اور بہادر اس لائق ہے۔" ناتا رحیم نے بھی اس کی تائید کی۔

"کیا تم نے وہ ویڈیو دیکھی ہے؟"

"نہیں ابھی تو نہیں دیکھی مگر دیکھنے کی تمنا ہے۔" دوسری طرف سے روشن نے کہا۔ "لیکن مجھے پورا یقین ہے اگر اس ویڈیو کلپ کو عام کر دیا جائے تو یہ کسی باکس آفس پر کامیاب ثابت ہونے والی فلم کی طرح سپر ہٹ قرار دی جائے گی۔" کہتے ہوئے روشن خان کا فاتحانہ قہقہہ بھی ابھرا۔ جواباً ناتا رحیم نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا پھر بولا۔

"کوشش کرو یار روشن خان! کسی طرح اس ویڈیو کی ایک کاپی حاصل ہو جائے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں۔"

"ہاں، تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں نے ایک آدمی کو یہ ذمے داری سونپ دی ہے۔ اب یہ بتاؤ... ظاہر شاہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اس کو اب مل کر خوب اچھی طرح بھون کر کھائیں گے۔" ناتا رحیم نے دانت نکوس کر کہا۔ "بدبخت نے آصف کریکر کے بل بوتے پر ہمارے اہم اڈے اور بھتا خوری کے علاقے تک ہتھیا لیے تھے، وہ سب واپس لیں گے۔"

"آ جاؤ پھر میرے اڈے پر... منصوبہ بناتے ہیں۔ اور ہاں... ایک بات تو میں پوچھنا بھول گیا۔"

دوسری جانب سے روشن خان نے کہا۔ "دیکھو ناتا! ہم دوست ہیں اور ایک دوسرے کے رازدار بھی... کہیں یہ کارنامہ تم نے تو..."

یہ کہتے ہوئے روشن خان نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو دوسری جانب سے ناتا رحیم ہنستے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں یار! بھلا میری ایسی قسمت کہاں..." پھر رک کر اس سے بھی مستفسر ہوا۔ "کہیں... تم نے تو...؟"

"میرا جواب بھی وہی ہے جو تمہارا ہے۔" روشن خان نے بھی اسی لہجے میں کہا اور دونوں نے مشترکہ قہقہہ لگاتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

ظاہر شاہ اب خود کو بے آسرا محسوس کرنے لگا تھا۔ بالکل تہی دست اور کمزور... جب ایک انسانی جسم کمزوری کے نرغے میں آتا ہے تو بیشتر جراثیم کے علاوہ سوئے ہوئے اور چھپے ہوئے جراثیم بھی جاگ کر کمزور صحت جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں اور یوں نت نئی جان لیوا بیماریوں کا موجب بنتے ہیں۔ ظاہر شاہ کا بھی یہی معاملہ تھا۔ اس کے "کمزور" پڑتے ہی نہ صرف بڑے دشمن... بلکہ ادھ موئے پڑے مخالفین بھی بھوکے لکڑبھگوں کی طرح دانت نکوسے اس کے سامنے آنے والے تھے۔ اس کا اندازہ ظاہر شاہ کو بھی بہ خوبی تھا۔ اس کی مثال گیدڑ والی ہو گئی۔ شامت آئی تو اس نے سیدھا "شان پیلس" کا رخ کیا۔

جب وہ اپنی لمبی چوڑی کار میں شان پیلس نام کی اس عظیم الشان کوٹھی پر پہنچا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ اس کے ہمراہ صرف دو آدمی تھے۔ ایک کار چلا رہا تھا، دوسرا عقبی نشست پر چوکس بیٹھا تھا۔

گیٹ کے دائیں جانب سنگِ مرمر کے ستون پر براس پلیٹ پر ایم پی اے جہانداد خان کا نام چمک رہا تھا۔

ایک خاص کمرے میں صرف ان دونوں کی یہ خفیہ ملاقات پہلے سے طے شدہ تھی۔

"پہلے یہ ویڈیو دیکھ لو... ذرا غور سے... پھر بات کرتے ہیں۔"

معاً صوفے پر بیٹھے ہوئے جہانداد کی گمبھیر آواز ابھری۔ وہ پچپن کے پیٹے میں تھا۔ صحت اچھی تھی اور رنگ قدرے سانولا تھا۔ بال اور گھنی مونچھوں پہ خضاب کیا ہوا تھا۔ وہ بیش قیمت اور نفیس قسم کے سلیپنگ گاؤن میں تھا۔ ہاتھ میں سگار سلگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ بلا کی سنجیدگی تھی۔

جہانداد خان بنیادی طور پر ایک جاگیردار تھا اور اس کا علاقہ ایک بڑا سیاسی ووٹ بینک رکھتا تھا۔ تاہم وہ عام

انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑتا تھا اور ہمیشہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوتا تھا۔ پھر جب کوئی پارٹی .... عنانِ حکومت سنبھالتی تو یہ اس کے ساتھ مل جاتا۔ جہاں مفادات پر زد آتی، وہ لوٹا کریسی اختیار کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

بیوی بچے اس کے علاقے میں ہی رہتے تھے۔ خود وہ اکثر شہر میں اپنی اس عظیم الشان کوٹھی میں نوکروں اور مسلح محافظوں کے ہمراہ رہتا تھا۔ کمرا کشادہ اور شاہانہ طرز کا تھا۔ دونوں ایک صوفے پر براجمان تھے۔ سامنے دیوار پر لگی اکتالیس انچ کی پروجیکٹر ایل سی ڈی پر ان کی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ اسکرین کے سامنے میز پر لیپ ٹاپ رکھا تھا جس کا ویڈیو کنکشن ساتھ رکھے ملٹی میڈیا کے ساتھ منسلک تھا... ظاہر شاہ اسکرین پہ آنکھیں جمائے بیٹھا تھا۔ اس کا دل گویا سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑک رہا تھا۔ کسی بھی لمحے وہ اپنے سپوت (آصف کریکر) کی موت کا منظر دیکھنے والا تھا۔

اسکرین پہ جھماکا ہوا۔ منظر ابھرا، مگر تاریکی سے لبریز... پھر کسی کی تیز تیز سانسوں کی آوازیں سنائی دیں... تاریکی چھٹنے لگی مگر پوری طرح ابھی روشنی کی زد میں نہیں آئی تھی۔ شاید ایسا دانستہ کیا گیا تھا... کرسی پر ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس طرح کہ... اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ سر جھکا ہوا تھا، جسم نیم برہنہ تھا۔ جسم پر تشدد کے متعدد نشانات نظر آرہے تھے۔ پھر اس منظر میں ایک اور شخص نمودار ہوا۔ کیمرے کو ایک ہی منظر پہ فوکس کر کے نصب کیا گیا تھا اور دوسرا شخص اس کے پس منظر سے ہی پیش منظر میں ابھرا تھا۔

صوفوں پر خاموش بیٹھے جہانداد اور بالخصوص ظاہر شاہ، اس شخص کو بڑے غور سے دیکھنے لگے مگر اسے "دیکھنے" سے قاصر ہی رہے۔ کیونکہ اس شخص نے خود کو سیاہ پوش چادر اور اسی رنگ کے نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ ہاتھوں تک میں سیاہ دستانے تھے۔

سیاہ پوش... کرسی پر رسیوں میں جکڑے شخص کے عقب میں آیا پھر اس نے اس کے سینے کی طرف ڈھلکے ہوئے سر کو بالوں سے پکڑ کر کیمرے کی آنکھ کے سامنے کر دیا۔ وہ چہرہ... آصف کریکر کا ہی تھا۔ مقصد یہی تھا کہ دیکھنے اور پہچاننے والے آصف کریکر کی موجودگی کا یقین کر لیں۔

چوڑے جبڑے اور چوڑی پیشانی والا ایک خونی ٹارگٹ کلر... جس کے نام سے لوگ ایک بے رحم موت کو اپنے بالکل قریب محسوس کر کے کانپ جاتے تھے۔ جو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا... جو پل کے پل دشمنوں کے خطرناک گروپ سے بھڑ جایا کرتا تھا اور گاجر مولی کی طرح انہیں کاٹ پیٹ کر رکھ ڈالتا تھا... اس وقت وہ سراپا بے بسی و بے چارگی کی تصویر بنا اس حقیقت کی تفسیر پیش کر رہا تھا کہ سیر کو سوا سیر بھی ہوتا ہے۔ تاہم مغلوب ہونے اور اپنی "یقینی موت" کو سامنے دیکھنے کے باوجود اس کی آنکھوں میں کسی قسم کے خوف کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔

"کھٹاک" کی آواز ابھری اور سیاہ پوش کے دوسرے ہاتھ میں گراری دار چاقو کا تیز پھل چمکتا نظر آیا جس کی دھار اس نے آصف کریکر کی گردن پہ رکھ دی۔ اب کسی بھی لمحے وہ اس کی شہ رگ کاٹ سکتا تھا۔ صوفے پر ہکا بکا بیٹھے ظاہر شاہ کا جی چاہا کہ وہ اس بدبخت سیاہ پوش کی آگے بڑھ کر گردن دبوچ لے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے سیاہ پوش نے آصف کریکر کو ذبح کر دیا۔ خون کا فوارہ اچھلا اور سیاہ پوش نے آصف کو چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر گر کر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ جس وقت سیاہ پوش دوبارہ پس منظر میں جانے لگا تو جہانداد نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ اسکرین پر وہ منظر رک گیا۔

دفعتاً کمرے میں جہانداد کی آواز گونجی۔ وہ ظاہر شاہ سے مخاطب تھا۔

"میں نے تمہیں یہ سب دکھانے کے لیے ویڈیو نہیں دکھائی کہ تم آصف کی ہلاکت کا منظر دیکھو، ظاہر شاہ!" جہانداد کے لہجے میں عجیب سا اسرار تھا۔ "اس سیاہ پوش کو غور سے دیکھو اور پہچاننے کی کوشش کرو... ذرا..."

"لل... لیکن... بس... سائیں! اس مردود نے تو سر سے پاؤں تک سیاہ لبادہ اوڑھ رکھا ہے، پہچاننے میں ہی نہیں آرہا۔" ظاہر شاہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تم بالکل گدھے ہو۔" جہانداد نے برہمی سے کہا۔ "مزید غور سے دیکھو... لو... میں اسی منظر کو ری وائنڈ کرتا ہوں۔" کہتے ہوئے جہانداد نے دوبارہ ری وائنڈ کیا اور پھر پلے کر دیا۔ ظاہر شاہ اب نظریں سکیڑے بہ غور سیاہ پوش کو دیکھنے لگا۔ جب اس سیاہ پوش نے ذبح ہوتے آصف کو کرسی سے دھکا دے کر فرش پر گرایا اور پس منظر کی طرف بڑھنے لگا تو دفعتاً ہی جہانداد اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر چلایا۔

"ادھر... اسٹاپ کرو..."

منظر "اسٹل" ہو گیا۔

"نظر آیا کچھ...؟" کمرے کی دھڑکتی خاموشی میں

جہانداد کی آواز ابھری۔

"وہ... وہ... دیکھو..." ظاہر شاہ نے انگلی کا اشارہ کر کے کہا۔ اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

"ٹھہرو، اب اس منظر پر نظر رکھنا۔ میں اسے دوبارہ ری وائنڈ کر کے اس بار سلو موشن میں دکھاتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے جہانداد نے ریموٹ سے حرکت کی۔ ظاہر شاہ پلک جھپکائے بغیر سیاہ پوش کو پس منظر میں جاتے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی آصف ذبح ہو کے فرش پر گرا اور جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا تو اس کا ایک پاؤں پس منظر کی طرف بڑھتے ہوئے سیاہ پوش کے لبادے سے ٹکرایا جو فرش کو چھو رہا تھا۔ فرش پر تڑپتے ہوئے آصف کریکر... کا ایک پاؤں لگنے سے لبادہ لمحہ بھر کے لیے اٹھا تھا اور ادھر ہی اس منظر کو جہانداد نے روک دیا۔

ظاہر شاہ اب پھٹی پھٹی نظروں سے گورے اور خوب صورت سڈول پیروں میں ہلکے سرخ رنگ کے سینڈل دیکھ رہا تھا۔ "فوراً پرنٹر آن کر کے اس کی کاپیاں نکال کر مجھے دو سائیں۔" ظاہر شاہ بولا۔ جوش سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں" کہتے ہوئے جہانداد نے اسکرین آف کر دی اور ایک لفافہ قریب رکھی میز سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے اندر تین پوسٹ کارڈ تصویریں تھیں جو اسی منظر کی تھیں پھر وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور ظاہر شاہ سے بولا۔

"کیا سمجھے؟ کیا تمہیں یقین آتا ہے کہ..."

"ناممکن... قطعی ناممکن..." ظاہر شاہ فوراً اس کی بات کاٹ کر بولا۔ جہانداد نے زہرخند مسکراہٹ سے کہا۔

"مگر یہ ممکن ہو چکا ہے، ظاہر شاہ! ہمارے اہم آدمی نے محض ایک عورت سے مار کھالی اور جان سے گیا۔"

"یقین نہیں آتا سائیں! ہمارا شیر ایک عورت سے مار کھا گیا۔"

"اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" جہانداد گمبھیر لہجے میں بولا۔ اس کی نظریں ظاہر شاہ کے الجھے ہوئے چہرے پر مرکوز تھیں۔ "سوچو... وہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ ایک سرا ہمارے ہاتھ لگا ہے۔"

"ایک ہی عورت کا نام ذہن میں آتا ہے اور شاید آپ کے..." اس نے جہانداد کے پُرسوچ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں! میرے ذہن میں بھی اسی عورت کا نام آتا ہے... مگر... وہ ملک ہی چھوڑ کر جا چکی ہے۔ دوسرے یہ کہ... مجھے نہیں لگتا کہ اتنا بڑا کارنامہ... وہ لڑکی تن تنہا انجام دے سکے۔ اگر وہ اتنی ہی جی دار اور بہادر ہوتی تو ہمارے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کر کے ملک چھوڑ کر نہیں بھاگتی۔ یہ کسی اور ہی عورت کی کارستانی لگتی ہے... بلکہ اس کی پشت پر پورا گینگ بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں سائیں!" ظاہر شاہ تھوڑا کسمسایا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ لوٹ آئی ہو اور..."

"باوجود اس کے وہ اس قدر جرأت اور ہمت کا کام نہیں کر سکتی۔" جہانداد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ اب اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس موضوع سے بیزاری محسوس ہو رہی ہے۔

ظاہر شاہ جب شان پیلس سے لوٹ رہا تھا تو صبح کاذب نمودار ہونے لگی تھی۔ اس پر نیند کا غلبہ ہوا تو وہ سو گیا۔ دوپہر دو بجے وہ جاگا تو اس کے ایک آدمی منظور نے اسے مطلع کیا۔

"استاد! نانا رحیم اور روشن خان کے جنگی ٹولے نے ہمارے آدمیوں پر حملہ کر کے عیسیٰ ناکا والا اڈا اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور اب وہ نگری تاؤن..." یہ بتاتے ہوئے اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ظاہر شاہ کے حلق سے اس اطلاع پر خوفناک غراہٹ ابھری۔

"بابو بھولے سے رابطہ کرو اور اس سے کہو کہ فوراً عیسیٰ ناکا والے اڈے پر آدمیوں سمیت پہنچے... تم اسی وقت اپنے آدمی ہتھیاروں سمیت تیار کرو... ہمیں آج ہی عیسیٰ ناکا والا اڈا دشمنوں کے قبضے سے چھڑانا ہوگا۔"

"جو حکم استاد۔" منظور نے کہا اور الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

ظاہر شاہ کا چہرہ قہر و غضب سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خود کلامی انداز میں بڑبڑایا۔

"ہمارا شیر کیا مرا کہ لکڑ بگھوں نے بھی ہمیں آنکھیں دکھانا شروع کر دیں۔ نانا رحیم... میں تمہارا بہت بُرا حشر کروں گا۔"

اس کے بعد اس نے اپنے سیل فون پر جہانداد سے رابطہ کیا اور اسے موجودہ صورتِ حال سے مطلع کرنے کے بعد ملتجی لہجے میں بولا۔

"سائیں! مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میرے پاس آدمی کم ہیں آپ کی جاگیر میں آدمیوں اور اسلحے کی کمی نہیں، اگر آپ..."

"ظاہر شاہ!" دفعتاً دوسری جانب سے جہانداد کی

سخت آواز ابھری۔ "میں فی الحال اس معاملے سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ جنرل الیکشن ہونے والے ہیں۔ تم جانتے ہو ان حالات میں میرے اپنے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ مجھے اگلے انتخابات میں پارٹی ٹکٹ سے محروم کر سکتی ہے۔"

"مگر... سائیں...!" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"ابھی یہ معاملہ خود نمٹانے کی کوشش کرو... عیسیٰ ناکا والے اڈے پر آدمیوں کو روانہ کر دو... اور تم بھی جاؤ۔ تمہاری موجودگی سے ساتھی حوصلہ پکڑیں گے۔ باقی میں سنبھال لوں گا، تم فکر نہ کرو۔"

"بالکل سائیں! میں بھی جا رہا ہوں ساتھ۔" ظاہر شاہ جوش سے بولا۔ "نانا رحیم کو تو میں اپنے ہاتھوں سے سبق سکھاؤں گا مگر سائیں! آپ کا ہاتھ ضروری ہے۔"

"میرا ہاتھ ہر وقت تمہاری پشت پر ہی ہوتا ہے، ظاہر شاہ۔" جہانداد بولا۔

"بس سائیں! میری تسلی ہو گئی۔" ظاہر شاہ نے خوش ہو کر کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

رابطہ منقطع ہونے کے بعد جہانداد نے اپنے ہونٹ سکیڑ کر سیل ایک طرف صوفے پر پھینکا پھر خدمت گار کو آواز دی۔

"جی سائیں!" ایک خدمت گار فوراً حاضر ہو گیا۔

"سامان لگاؤ۔"

"حاضر سائیں۔"

چند منٹوں میں اس کے سامنے ایک میز پر "سامان" سج چکا تھا۔

شراب کی بوتل، آئس کیوبس سے بھرا شیشے کا باؤل اور ایک پلیٹ میں ادھ کٹے لیمو۔

جہانداد نے اپنے لیے ایک پیگ بنایا پھر پلیٹ میں سے ادھ کٹا لیمو... کا ایک ٹکڑا شراب میں ڈالنے کے بعد ایک گھونٹ لیا۔ پھر ہاتھ باندھے کھڑے خدمت گار کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے سیل فون پر نمبر پنچ کر رہا تھا۔

"ہیلو بابا! ایس پی صاحب۔ جہانداد خان بول رہا ہوں۔ ایک اطلاع نوٹ کرو۔"

"جی سائیں... بولیں۔" دوسری جانب سے ایس پی چودھری مشتاق کی آواز ابھری۔

"عیسیٰ ناکا کے علاقے ریڈ زون میں ٹارگیٹڈ آپریشن کی تیاری کرو۔ نانا رحیم اور ظاہر شاہ پر ہاتھ ڈالنا ہے... نانا رحیم کی پروا نہیں مگر ظاہر شاہ زندہ نہیں بچنا چاہیے... نام یاد رکھو ظاہر شاہ..."

"ٹھیک ہے سائیں! ایسا ہی ہوگا... اور حکم؟"

"مہربانی بابا!" کہتے ہوئے جہانداد نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے چہرے پر اب زہریلی مسکراہٹ تھی۔ وہ ہولے ہولے زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

"بس، ظاہر شاہ! اب تمہارا کھیل ختم... اور یہ کہانی بھی..."

☆☆☆

دو سال پہلے:

وہ اپنی سیکنڈ ہینڈ بائک پر دفتر سے گھر لوٹ رہا تھا۔ ابھی وہ اپنے گھر کی گلی سے ذرا فاصلے پر تھا کہ مکرم قریشی نے اسے روک لیا۔ محمود نے مسکرا کر بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد قریشی صاحب بولے۔

"محمود میاں! ذرا فارغ ہو کر تھوڑی دیر کے لیے میرے ہاں آجانا اور لوگ بھی آئیں گے۔"

"بالکل آجاؤں گا۔ کیا اسی معاملے کے سلسلے میں..." محمود نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو قریشی صاحب گہری سانس لے کر اور اپنی باریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"ہاں بیٹا! ہم شریفوں کے محلے میں یہی داغ آن لگا ہے جسے ہم سب نے مل کر دھونا ہے... مغرب کے بعد تک آجانا، خدا حافظ..." کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ محمود چند ثانیے کچھ سوچتا رہا پھر بائک آگے بڑھا دی۔ گھر پہنچا تو ثوبیہ اور سب سے زیادہ گڑیا کو اپنا بے چینی سے منتظر پایا۔ وہ "پپا" کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"آج آپ کو دیر ہو گئی۔" ثوبیہ نے آہستہ سے پوچھا۔ شوہر کو جب بھی دفتر سے واپسی پر دیر ہو جاتی، وہ اسی طرح فکر مند ہو جاتی تھی۔ وہ چوبیس پچیس سال کی دبلی پتلی سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ گڑیا ان کی اکلوتی اولاد تھی، اس کا نام کلثومہ تھا۔ پیار سے میاں بیوی اسے گڑیا ہی کہتے تھے۔ عمر گیارہ سال تھی۔ محمود، گڑیا کو پیار سے چومتے ہوئے بیوی سے بولا۔

"وہی ٹریفک کا ازدحام... تمہیں تو معلوم ہی ہے، شام میں کس قدر ٹریفک ہو جاتا ہے۔ پھر کیوں پریشان ہو جاتی ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گڑیا کو گود سے اتارا، چپس اور بسکٹ کا پیکٹ اسے تھما کر ثوبیہ کے فکر مند چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ وہ پریشانی سے بولی۔

"شہر کے حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں آج کل۔ آپ کو ذرا بھی دیر ہو جاتی ہے تو دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگتے ہیں۔" محمود پیار بھری مسکراہٹ سے بولا۔

"اللہ سے ہر وقت خیر اور بہتری کی دعا کرتی رہا کرو۔ اچھا اب جا کر اچھی سی چائے بناؤ، تب تک میں نہا لیتا ہوں۔ قریشی صاحب راستے میں ملے تھے، انہوں نے بلایا ہے۔" یہ کہہ کر محمود نے کمرے کا رخ کیا۔

محمود ایک اٹھائیس سالہ خوبرو نوجوان تھا۔ اس نے بی سی ایس کیا تھا اور اب ماسٹرز کر رہا تھا۔ ایک بڑی کمپنی میں اچھی نوکری کرتا تھا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد وہ اس کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہو جاتا۔ دو کمروں کا یہ مکان کرائے کا تھا۔ اچھی گزر بسر تھی۔ پڑھا لکھا شریف اور سمجھ دار ہونے کی وجہ سے محلے میں اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ محلہ کمیٹی میں اس کی نائب کی حیثیت تھی۔ بعد مغرب محلے کے چند شرفا قریشی صاحب کے مکان کی کشادہ بیٹھک میں اکٹھے ہو گئے، محمود بھی پہنچ گیا تھا۔

"بھائیو! کسی گندی بات کو دہرانا بھی گندگی کے زمرے میں آتا ہے۔ باقی باتیں تو آپ سب کے علم میں ہیں۔ اب آج آخری فیصلہ کرنا باقی ہے۔ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ ہمارے بچوں اور بچیوں پر اس گندگی کا غلط اثر پڑ رہا ہے۔ پھر اس وجہ سے محلے میں اوباش لوگوں کا بھی آنا جانا رہنے لگا ہے... میرا تو خیال یہی ہے کہ اب متعلقہ تھانے میں اس کی خبر کر دینی چاہیے۔" سب نے ہم آواز ہو کر قریشی صاحب کے اس فیصلے پر صاد کیا سوائے محمود کے، وہ بولا۔

"مگر ہم تھانے جا کر پولیس کو کیا بتائیں گے؟ وہ ہم سے ثبوت مانگے گی۔ قانون کے عمل کرنے کا اپنا ایک طریقۂ کار ہوتا ہے... کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر وہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے گریز کرتی ہے۔"

"ثبوت تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے محمود صاحب۔" چالیس سالہ محمد رمضان نے کہا۔ محلے میں اس کی ایک بڑی کریانے کی دکان تھی۔ وہ آگے بولا۔ "اس ناپاک بیوہ عورت نفیسہ نے اپنے گھر کو اچھا خاصا عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے... جس کی سرپرستی آصف جمال کرتا ہے۔"

"میں وہی بات کر رہا ہوں۔" محمود بولا۔ "مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بات وہ نہیں ہے جو ہم سمجھ رہے ہیں۔" اس کی بات پر سب حیرت سے محمود کا چہرہ تکنے لگے۔

"میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا موقف ہی غلط ہے اور لنگڑے لولے موقف کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔"

"محمود میاں! ذرا کھل کے کہو، آپ کہنا کیا چاہتے ہو؟" قریشی صاحب نے گویا وہاں موجود لوگوں کی مستفسرانہ نظروں کی ترجمانی کرتے ہوئے محمود سے کہا تو وہ قدرے صراحت سے بولا۔

"ہمیں سب سے پہلے اپنا موقف درست کرنا چاہیے۔ نفیسہ ایک نوجوان بیوہ عورت ہے۔ وہ ...... آصف جیسے ایک اوباش آدمی کی محبت ہے۔ اس کا گھر آصف اور اس کے قبیل کے لوگوں کی بیٹھک کا کام کرتا ہے۔"

"تو میاں! اس بات کو ہم فحاشی کے اڈے کا رنگ دیں گے تو ہمارا موقف مضبوط ہوگا نا۔ اب اتنی تفصیل ہم کس کس کو بتاتے پھریں گے۔"

کلرک انور شاہ نے درمیان میں کہا تو قریشی صاحب نے اسے ٹوکا۔ "ابھی شاید محمود میاں کی بات پوری نہیں ہوئی ہے۔ باری باری سب اپنا موقف پیش کریں گے، اس کے بعد ہی ایک متفقہ فیصلے پر قائم ہوں گے۔" پھر انہوں نے محمود کو اپنی بات جاری رکھنے کا کہا، وہ بولا۔

"میں یہی تو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، ابھی پولیس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ہمیں خود نفیسہ خاتون کو سمجھانا ہوگا اور آصف کو بھی۔ وہ اگر پھر بھی نہ مانیں تو..."

"رہنے دو میاں! وہ اوباش لوگ ہیں۔ ان کے منہ کون لگے گا۔ ہمیں سیدھا پولیس کو ہی جا کر ان کی شکایت کرنا ہوگی۔"

قاسم بابو نے کہا۔ "تمہاری تو ابھی کوئی اولاد جوان نہیں ہے مگر ہمارے بچے بچیاں جوان ہیں۔ ان پر خراب اثر پڑ رہا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ اب بات سمجھانے کی نہیں ہے، عمل کرنے کی ہے۔" وہاں موجود سب نے قاسم بابو کی بات پر اتفاق کر لیا۔ بالآخر سب متحد ہو کر تھانے جا پہنچے، محمود کو بھی ساتھ ہونا پڑا۔

تھانہ انچارج ایس ایچ او وزیر خان نے قریشی صاحب اور محمود کی بات سننے کے بعد ایک پرچہ آگے بڑھا دیا۔

"آپ اپنا بیان اور موقف اس پر اپنے نام اور دستخط کے ساتھ لکھ دیں۔ بعد میں ہم جانیں اور ہمارا کام۔" موٹی توند والے انسپکٹر کی بات پر عمل کرتے ہوئے قریشی صاحب اور محمود نے اپنا بیان اور نام وغیرہ لکھ دیا۔

محمود جب گھر پہنچا تو خاصا فکر مند تھا۔ ثوبیہ نے شوہر کی پریشانی بھانپ لی۔ وہ فکر مندی سے بولی۔

’’خدانخواستہ کہیں آپ پر تو کوئی مشکل نہیں آن پڑے گی؟ آپ پریشان نظر آرہے ہیں۔‘‘

’’یہ سب میری مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ اسی بات کی فکر ہے۔‘‘ محمود تھکا تھکا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ گڑیا ایک طرف کھیلنے میں مصروف تھی۔

ثوبیہ بولی۔ ’’تو پھر آپ کو ان لوگوں کے ساتھ تھانے نہیں جانا چاہیے تھا۔‘‘

’’کیسے نہیں جاتا، ثوبیہ!‘‘ محمود قدرے جھلا کر بولا۔ ’’میں محلہ کمیٹی کا نائب ہوں مگر اتنی جلدی یہ قدم اٹھانے کی میری مرضی نہ تھی۔ ہمیں پہلے مل کر آصف وغیرہ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اگر وہ نہ مانتا تو رنگے ہاتھوں قانونی کارروائی کے ذریعے ان کا صفایا کر دیا جاتا۔‘‘

’’تو اب کیا ان اوباش لوگوں سے آپ دشمنی مول لیں گے؟ میں نے تو سنا ہے آصف بہت خطرناک آدمی ہے، اس کے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔‘‘ ثوبیہ نے متفکر لہجے میں کہا۔

یہ خدشہ جو ثوبیہ کے دل میں تھا، وہی محمود کے دماغ میں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف محلے والے پولیس کے پاس آصف کی شکایت کرنے چلے گئے جبکہ تحریری بیان اور موقف پر قریشی صاحب اور اس کے نام اور دستخط بھی کروالیے گئے تھے۔ محمود زود فہم اور بالغ نظر تھا۔ آصف جیسے لوگوں کے خلاف سوچ سمجھ کر کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ پولیس کا کیا حال تھا، یہ بھی وہ جانتا تھا۔ اس کے خیال میں اس طرح پولیس کے پاس جا کر آصف وغیرہ کی شکایت کرنے کا مطلب معاملے کو بڑھانے والی بات تھی۔

دو روز گزرے تھے کہ قریشی صاحب کا مرڈر ہو گیا۔ پھر تو یکلخت جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ کہاں کی محلہ کمیٹی اور کہاں کا شرفا اتحاد۔ محلے کے لوگ سب بھول بھال کر گھروں میں دبک گئے۔

محمود نے بہت کوشش کی کہ لوگوں کو ساتھ ملا کر متعلقہ تھانے جا کر آصف کے خلاف قریشی صاحب کے قتل کا پرچہ کٹوائے مگر کسی نے ساتھ نہ دیا۔

بے چاری ثوبیہ کی تو جیسے جان نکلی ہوئی تھی۔ یہ خوفناک خیال بار بار اس کے ڈرے سہمے دل میں لرزتا تھا کہ کہیں اب قریشی صاحب کے بعد... اس کے شوہر کی باری تو نہیں... وہ خوف سے رو پڑتی۔ محمود پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔ محلے والوں نے اس کا ساتھ چھوڑا تو وہ سیدھا قریشی صاحب کے گھر جا پہنچا اور قریشی صاحب کی بیوہ سے ملا۔ ان کا ایک جوان بیٹا اور بچی تھے۔

’’نہیں بیٹا! ہم شریف لوگ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ شوہر کے بعد میں اب اپنے بچوں کو نہیں کھونا چاہتی۔ آپ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ ہم نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔‘‘

محمود کی نظروں نے نہ صرف قریشی صاحب کی بیوہ بلکہ ان کے دونوں بچوں کے چہروں سے خوف بھانپ لیا۔ سمجھ گیا کہ انہیں خاموش رہنے کی ’’خاموش‘‘ دھمکی دی جا چکی ہے۔

وہ قریشی صاحب کے گھر سے مایوس لوٹ رہا تھا تو مغرب کی اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ لوگوں کی آمدورفت کم تھی۔ آصف اپنے تین اوباش لڑکوں کے ساتھ اس کے سامنے آگیا۔

’’میرا نام آصف ہے... آصف کریکر... کیا سمجھے؟‘‘ محمود اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ تن کر بولا۔

’’کیا چاہتے ہو تم؟‘‘

’’صرف تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اب خود کو اپنی خوب صورت بیوی اور بچی تک محدود کر لو اور بس!‘‘ آصف نے اسے گھور کر زہرناک لہجے میں کہا۔ وہ محمود کا ہم عمر ہی تھا مگر ڈیل ڈول میں اس سے سوا تھا۔ اس کے باقی تین ساتھی بھی محمود کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔

’’زبان سنبھال کر بات کرو... سمجھے تم۔‘‘ محمود کو بھی غصہ آگیا۔ ’’میں تمہاری گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔‘‘

’’او...‘‘ آصف نے طنزیہ کہا۔ پھر ٹی ٹی نکال کر سرعام اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے تنبیہی انداز میں بولا۔ ’’شاید تم قریشی صاحب کا انجام بھول گئے۔ تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہیے کیونکہ قریشی صاحب کے ساتھ تم بھی تھانے میں میرے خلاف ان کے ساتھ تھے... مگر تم ابھی زندہ ہو۔ اس لیے کہہ رہا ہوں، باز آجاؤ ورنہ...‘‘ کہتے ہوئے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اسے گھورتا ہوا ساتھیوں سمیت پلٹ گیا۔

محمود کی سمجھداری اور معاملہ فہمی اپنی جگہ مگر ناانصافی اسے کبھی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک نڈر اور پُرعزم جوان تھا۔

مکرم علی قریشی اپنی جان سے گئے، باقی محلے کے لوگ ان کے قتل سے مارے دہشت کے دبک کر بیٹھ رہے۔ سوگواران کو دھمکی دے کر مزید کسی قانونی کارروائی کرنے سے خوف زدہ کر دیا گیا۔ باقی معاملات جوں کے توں رہے۔ نفیسہ کا بھی کچھ نہ بگڑا، نہ ہی آصف المعروف آصف کریکر کا کچھ بگڑا بلکہ اب تو اس کے اندر مزید دیدہ دلیری آگئی اور وہ محلہ ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کے دکان داروں اور کاروباری افراد سے باقاعدہ بھتا بھی لینے لگا تھا۔ اس کے ساتھی فقط اتنا کرتے کہ کسی سے بھتا لینا ہوتا تو وہ ایک پرچی میں بھتے کی رقم لکھ کر اسے ایک پلاسٹک کی چھوٹی تھیلی کے ساتھ نتھی کر کے کسی ساتھی کے ذریعے دکان دار تک پہنچا دیتے۔ پلاسٹک کی تھیلی کے اندر ایک ٹی ٹی کی گولی رکھی ہوتی۔ جس کا مطلب سمجھانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ محلے والوں پر یہ نئی افتاد پڑی تو وہ پھر متحد ہونے لگے اور محمود کے پاؤں پکڑ لیے۔

اس روز محمود اپنی بائک پر ثوبیہ اور گڑیا کو کہیں سے سیر کروا کے رات گئے گھر لوٹا۔ انہیں گھر پہنچے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ محمود نے دروازہ کھولا اور چونک پڑا۔ سامنے قریشی صاحب مرحوم کا انیس سالہ لڑکا خرم کھڑا تھا۔

’’خرم! تم... خیریت ہے؟ آجاؤ اندر...‘‘ محمود اسے اندر لے آیا۔ ثوبیہ دوسرے کمرے میں گڑیا کے کپڑے بدل رہی تھی۔

’’ہاں، اب کہو تم ٹھیک تو ہو نا؟ امی اور بہن کیسی ہیں؟‘‘ محمود نے اس کے کھوئے کھوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’وہ سب ٹھیک ہیں محمود بھائی!‘‘ خرم بولا۔ پھر اپنی جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔

’’ابو کے قتل سے پہلے یہ کاغذ آصف کے ایک ساتھی نے مجھے ہی تھمایا تھا، ابو کو دینے کے لیے۔ اس میں دھمکی دی گئی تھی کہ... اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ... ورنہ... جان سے جاؤ گے۔‘‘

’’پرچہ میں نے ابو کو دیا تھا، اس کے دو روز بعد انہیں گولی مار دی گئی۔ یہ پرچہ اس وقت دیا گیا تھا جب ابو آپ سب لوگوں کے ساتھ تھانے میں آصف کریکر کے خلاف رپورٹ درج کروانے کے لیے گئے تھے۔‘‘

محمود کاغذ کو بغور پڑھنے اور دیکھنے لگا... یہ کھلی دھمکی تھی... ظاہر ہے، دھمکی دینے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

’’تمہیں یہ کاغذ کس نے تھمایا تھا؟‘‘ کسی خیال کے تحت محمود نے پوچھا۔ خرم بولا۔

’’محمود بھائی! یہ کاغذ مجھے آصف نے ہی دیا تھا۔ زبانی کلامی بھی مجھے یہی پیغام ابو کو پہنچانے کا کہا تھا۔‘‘ تھوڑے توقف کے بعد اس نے آگے بتایا۔ ’’محمود بھائی! ابو کے مرنے کے بعد بھی آصف کے ایک ساتھی نے ہمیں یہ دھمکی دی تھی کہ ہم نے ان کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوائی تو تمہارا انجام بھی باپ سے مختلف نہ ہو گا مگر محمود بھائی! ابو کا چہرہ سوالیہ نشان بن کر ہر وقت میری نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ وہ بہت بہادر انسان تھے۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ میں بھی انہی کا بیٹا ہوں۔ میں آپ سے کوئی مدد لینے تو نہیں آیا لیکن شاید ابو سے یہی غلطی ہو گئی تھی کہ انہوں نے ہم سب کے اصرار کے باوجود اس دھمکی کے بارے میں آپ کو یا کسی اور کو بتایا تک نہیں۔ میں اب پولیس میں آصف اور اس کے ساتھیوں کے خلاف رپورٹ کروانے اور آصف پر ابو کے قتل کا مقدمہ کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’بس! میں یہی کہنے آیا تھا۔‘‘ وہ جانے لگا۔

محمود نے اسے روک لیا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر توصیفی لہجے میں بولا۔ ’’شاباش بیٹا! تم نے بالکل ٹھیک سوچا ہے۔ اگر ہم سب اسی طرح ان جرائم پیشہ لوگوں سے ڈرنا چھوڑ دیں تو یہ لوگ واقعی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں یقین سے کہتا ہوں، ہم عام لوگ ضرور ہیں مگر ہمارا اتحاد ہی ہمیں مضبوط بناتا ہے۔ یہ مٹھی بھر جرائم پیشہ افراد محض اسلحے کے زور پر دہشت پھیلاتے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ ہمارے ہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ قانون بھی ہماری مدد سے کتراتا ہے لیکن اگر عوام متحد ہو جائے تو پولیس بھی دباؤ میں آجاتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کل بعد دوپہر مجھ سے ملنا... میں لوگوں کو اکٹھا کرتا ہوں... تم یہ کاغذ مجھے دے دو۔‘‘

خرم چلا گیا۔ ثوبیہ نے ساری باتیں سن لی تھیں۔ یوں بھی وہ تمام حالات سے آگاہ تھی۔ خرم کے جاتے ہی وہ شوہر کے سامنے آگئی۔ ’’یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ہم آصف جیسے جرائم پیشہ افراد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قریشی صاحب کے قتل کے بعد تب سے مجھے آپ کی جان کا خوف کھائے جا رہا ہے۔‘‘

محمود نے مسکرا کر ثوبیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ’’ثوبی!

ہمیں صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے بلکہ یوں سمجھو ہمیں اللہ ہی نے موقع دیا ہے کہ ہم آصف جیسے بدمعاش کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکیں۔ تم بس دعا کرو۔۔۔“

مگر ثوبیہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ اس بار رو دی۔ ”پلیز محمود! آصف سے دشمنی مت لو۔ اپنا نہیں تو۔۔۔ گڑیا کا خیال کرلو۔ اللہ اور تمہارے بعد ہمارا کون ہے اس دنیا میں۔۔۔“

اس وقت گڑیا وہاں آن پہنچی اور معصومیت بھری نظروں سے کبھی باپ اور کبھی ماں کو تکنے لگی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر۔۔۔ وہ ناراض ہو کر باپ سے بولی۔

”پپا! آپ نے میری مما کو رلا دیا۔“ محمود نے بے اختیار گڑیا کو گود میں اٹھالیا اور اس کا گال چوم کر بولا۔

”نہیں میری پیاری گڑیا۔۔۔ جتنا میں تم سے پیار کرتا ہوں، اتنا ہی میں تمہاری مما سے بھی کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے محمود نے شرارتی نظروں سے سامنے کھڑی آنسو پونچھتی ثوبیہ کو دیکھا اور دوسرا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ثوبیہ مسکراتی ہوئی اس سے جا لگی۔ گڑیا نے خوش ہو کر باپ کو چوم لیا۔ تینوں مسکرانے لگے۔

☆☆☆

خرم کی شکل میں انہیں آصف وغیرہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ خرم کی ہمت اور محمود کے اکسانے پر دیگر لوگوں نے بھی آصف وغیرہ کے خلاف ہمت و حوصلہ پکڑا جو خود بھی بالخصوص ان لوگوں کو اپنی محنت و حلال کی کمائی سے بھتا دیتے دیتے تنگ آ گئے تھے۔ وہ سب متعلقہ تھانے پہنچے۔ علاوہ ازیں انتظامیہ کے بالا افسران سے بھی ملے۔ آصف وغیرہ کے خلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی گئی۔ بالآخر اسے قریشی صاحب کے قتل کے شبے اور بھتا خوری کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

محلے میں اب امن اور سکون ہو گیا۔ محمود نے بھی ماسٹرز کرلیا اور اسے من پسند عہدہ بھی مل گیا۔ اچھی تنخواہ کے ساتھ اسے مراعات بھی ملیں تو اس نے یہ علاقہ بھی چھوڑ دیا اور نسبتاً اچھے علاقے میں اپنا ذاتی گھر خرید کر بیوی اور بچی کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے سے نکل کر باہر جانے کے لیے ڈرائنگ روم سے گزرنے لگی تو دفعتاً ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

”ارے جناب! پسند تو آپ ہمیں بھی آ گئے ہیں، جب ہی تو آپ سے سلسلۂ کلام جاری رکھے ہوئے ہیں۔“

اپنی سوتیلی ماں شہناز بیگم کے انہی الفاظ نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کیا تھا۔ اسے اس طرح چھپ کر بات سننا برا لگتا تھا مگر یہ بات ہی ایسی تھی اور پھر گھر میں آج کل جس قسم کے حالات تھے، اس کے پیش نظر بھی وہ کان لگانے پر مجبور تھی۔ باقی کی باتیں بھی کم و بیش اسی طرح تھیں مگر وہ یہ نہ جان سکی کہ شہناز بیگم آخر کس کے ساتھ التفات بھری گفتگو کر رہی تھی۔ تاہم صاف ظاہر تھا کہ دوسری طرف سے کوئی منظورِ نظر ”غیر مرد“ ہی تھا۔ ظاہر ہے ایک شادی شدہ عورت کا کسی غیر مرد سے اس طرح کی گفتگو کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔۔۔ وہ سوچنے لگی پاپا سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر تھا، ان سے تو وہ تلخ لہجے میں باتیں کرتی تھیں۔ اس طرح پیار بھری لگاوٹ سے کم از کم پاپا سے باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ نویرا دفتر سے آج جلدی لوٹ آئی تھی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر بیٹھی تھی کہ ایڈیٹر سلمان زیدی کا فون آ گیا۔

”ایک کور اسٹوری ہے۔۔۔ جو تمہیں ”لائیو“ کرنی ہے۔ پتا بتا رہا ہوں۔ فوراً وہاں پہنچو۔ تفصیل سے تمہیں شہزاد آگاہ کر دے گا۔ وہ کیمرا مین اور گاڑی کے ساتھ تمہارے گھر کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔“

وہ جلدی جلدی اپنا ساز و سامان سمیٹنے کی تیاری میں لگ گئی۔ ایسے ہی متوقع اور اچانک حالات کے لیے پہلے بھی اس کے ”لوازمات“ تیار ہی رہتے تھے، بہر حال اسے تیاری میں چند منٹ لگے تھے کہ اسے شہزاد کا فون آ گیا کہ وہ اس کی کوٹھی کے باہر موجود ہیں۔

نویرا چوبیس سالہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ پُروقار اور دلکش شخصیت کی مالک۔۔۔ آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ خم ٹھونک کر کسی عزم صمیم پر ڈٹ جاتی تو پھر اسے پورا کر کے چھوڑتی۔ دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے چار پانچ سال چھوٹی ہی نظر آتی تھی۔ بال گھنے اور بھورے مائل تھے جو شانوں تک آتے تھے، رنگ صاف تھا اور جلد میں عجیب طرح تازگی اور کشش تھی۔

اس نے صحافت میں ماسٹر کیا تھا۔ وہ رپورٹر تھی، اور رپورٹنگ کے علاوہ غضب کی سیاسی تجزیہ کار بھی تھی۔ دو بڑے اخبار اور اس کے ایک نجی ٹی وی چینل سے وابستہ تھی۔ اس کے اندر موضوع اور چبھتے ہوئے سوالات ”داغنے“ کی بڑی زبردست صلاحیت تھی۔ بڑی بڑی سیاسی شخصیات کا براہِ راست تجزیے کرتی کہ انہیں دانتوں پسینا آ جاتا۔

اس کے علاوہ وہ ایک مشہور اخباری تنظیم اور الیکٹرانک میڈیا جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی نائب صدر بھی رہ چکی تھی۔

ان سب باتوں سے قطع نظر وہ اپنی ایک مضبوط ذاتی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ وہ ایک بڑے باپ کی اکلوتی لاڈلی اولاد تھی۔ سیٹھ جواد نثار ایک بڑے بزنس مین تھے۔ وہ بیٹی سے محبت کرتے تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا، نویرا اس وقت گیارہ سال کی تھی۔ انہیں اپنی بیوی عاصمہ سے بھی محبت تھی جسے وہ بھلا تو نہیں پائے تھے مگر جب نویرا بالغ عمر کو پہنچی تو اسے اپنے ہینڈسم پاپا کی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ اب سمجھ دار ہو گئی تھی، جانتی تھی اس کے پاپا نے اب تک کیوں دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ایک روز بالآخر اس نے اپنے پاپا کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال کر انہیں دوسری شادی کے لیے رضامند کرہی لیا۔

”مائی سویٹ پاپا! آپ میری فکر نہ کریں اب۔ میں دوسری مما سے انڈر اسٹینڈنگ کرلوں گی۔۔۔ میرا وعدہ ہے۔“

ایک بزنس تقریب میں شہناز بیگم سے سیٹھ جواد کی ملاقات ہو گئی۔ وہ پینتیس سالہ بھرپور عورت تھی۔ وہ ایک بڑے ریٹائرڈ سرکاری افسر کی بیوہ بہن تھی جس سے سیٹھ جواد کے دوستانہ تعلقات تھے۔ شہناز بیگم کا کوئی بچہ نہ تھا۔ پہلی شادی اس کی ایک فوجی افسر سے ہوئی تھی۔ پانچ سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی اور پھر اچانک ایک روڈ حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

درمیانے قد، صحت مند اور بردبار کامیاب بزنس مین کے روپ میں سیٹھ جواد، شہناز بیگم کو پہلی ہی نظر میں بھا گیا تھا۔ سلسلہ جنبانی کی ابتدا بھی شہناز بیگم ہی کی طرف سے ہوئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے چلے گئے۔

نویرا کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی محبت سے شہناز بیگم کو قبول کیا تھا اور اسے اپنی سہیلی سمجھنے لگی تھی۔ مگر شادی کے محض چند مہینوں بعد ہی اس طرح کے ”سوتیلے پن“ کے رشتوں کی روایتی حقیقتیں کھلنے لگیں۔ شہناز بیگم کو یہ حسد ہونے لگا کہ اس کے شوہر کی محبت اور توجہ بٹی ہوئی ہے۔ اگرچہ سیٹھ جواد نے بیٹی اور بیوی کے ساتھ سلوک میں ایک توازن رکھا تھا مگر انا کی ماری۔۔۔ شہناز بیگم کو یہ توازن بھی کھلنے لگا۔۔۔ یوں نوبت لڑائی جھگڑے تک آنے لگی۔ نویرا کی بھی شہناز بیگم سے تکرار ہو جاتی۔

اب وہ اچانک پچھلے چند روز سے سیٹھ جواد سے طلاق لینے کی بھی باتیں کرنے لگی تھی۔

چنانچہ۔۔۔ آج جب ایک کور اسٹوری لینے کے لیے وہ آن دی اسپاٹ ہونے کے لیے کوٹھی سے نکل رہی تھی تو اس نے ڈرائنگ روم میں شہناز بیگم کو کسی سے ہنستے مسکراتے ہوئے پیار بھری باتیں کرتے سنا۔

دفتر کی وین میں سوار ہوتے وقت بھی اس کے دل و دماغ میں۔۔۔ یہی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

شہزاد نے اسے مذکورہ کور اسٹوری کے بارے میں تفصیل بتا دی۔ نویرا خود بھی ”اپ ڈیٹ“ رہتی تھی، اسے اس خبر کے بارے میں علم تھا۔

کسی ظالم اور سفاک آدمی نے ایک گیارہ سالہ بچی کو اغوا کرنے کے بعد زیادتی کر کے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا تھا۔ اس خبر کی اہم بات یہ تھی جس کے لیے نویرا کو لائیو کوریج کے لیے بھیجا جا رہا تھا کہ ملزم کی نہ صرف شناخت ہو گئی تھی بلکہ وہ گرفتار بھی ہو گیا تھا لیکن پھر ایک بااثر سیاسی شخصیت جہانداد خان کے درمیان میں پڑنے سے اس سفاک ملزم کی ضمانت ہو گئی۔ معصوم مقتولہ بچی کا نام عرفیت کے حوالے سے گڑیا بتایا جا رہا تھا، جس کا بدنصیب باپ محمود ریاض ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ گڑیا اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ ملزم کا نام آصف کریکر بتایا جا رہا تھا۔۔۔ جو اس سے پہلے بھی قتل، بھتا خوری اور دیگر جرائم میں گرفتار کیا جا چکا تھا۔

وطن عزیز میں یوں تو ایسی خبریں معمول کا حصہ بن چکی ہیں۔ مگر جو واقعہ زیادہ شدت اختیار کرنے لگتا ہے، بالخصوص نجی ٹی وی والے آن دی اسپاٹ اس کی براہِ راست کوریج کیا کرتے تھے۔

ملزم آصف کریکر کی ضمانت پر رہائی پر اس کے بدنصیب باپ محمود ریاض نے بڑا پُرشور احتجاج کر رکھا تھا۔ نویرا اور اس کی اخباری ٹیم اس سے ملنے کے لیے جا رہی تھی۔

انصاف ملے یا نہ ملے۔۔۔ مگر اب جرم چھپتا نہیں تھا، اس کی تشہیر ضرور ہوتی تھی۔ یہ جرم بھی اگرچہ سنگین تھا اور انصاف کا متقاضی بھی۔۔۔ مگر اس کے برعکس انصاف کی دھجیاں بکھیر دی گئی تھیں۔ گیارہ سالہ بچی گڑیا کے ساتھ زیادتی کرنے والے شیطان صفت آصف کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔

بچی کا بدنصیب باپ محمود غم سے نڈھال تھا کیونکہ اس جانکاہ صدمے کے باعث اس کی بیوی۔۔۔ جس کا نام ثوبیہ

تھا، اس دلدوز واقعے کے بعد جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

محمود نے جب اپنی بچی اور بیوی کے قاتل کے ضمانت پر رہا ہونے کی خبر سنی تو وہ پاگل ہو گیا۔

نویرا جب اپنی خبر رساں ٹیم کے ساتھ محمود کے پاس پہنچی تو وہ جیسے پھٹ پڑا۔ کیمرے کے سامنے مائیک پر جوش غضب و غم سے بولنے لگا۔

''جہانداد خان نامی ایک سیاسی راہنما جو بنیادی طور پر ایک جاگیردار ہے... درحقیقت ایک کرمنل آدمی ہے۔ اس نے میری معصوم بچی کے قاتل کو بالآخر ضمانت اور اپنے اثر رسوخ کے بل بوتے پر قانون کے شکنجے سے چھڑا لیا ہے... نہ صرف یہ بلکہ وہ مجھے بھی دھمکیاں دے رہا ہے کہ اگر میں نے ان کے خلاف احتجاج بند نہ کیا تو... وہ مجھے بھیانک انجام سے دوچار کرے گا... مگر مجھے اب اپنی زندگی کی پروا نہیں ہے... پروا ہے تو صرف اس بات کی کہ... اپنی معصوم بچی کے سفاک قاتل آصف کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں لیکن اس کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ... ہم جیسے معمولی حیثیت کے انسانوں کو اس سماج میں، اس ملک میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہاں صرف دولت مندوں کی بات سنی جاتی ہے۔ ہم جیسوں کو تو ناانصافی کے اندھیروں میں خاموشی سے گم کر دیا جاتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں، ایک دن میں بھی دھمکی دینے والوں کی گولی کا شکار ہو جاؤں گا مگر میں اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹوں گا، کیونکہ ظلم سہہ کر خاموش بیٹھنے والا بھی ظالم ہی کے زمرے میں آتا ہے... آخر میں، میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں، مجھے اگر انصاف نہ ملا تو میری اپنی پہلی کوشش یہی ہو گی کہ مجھے جب بھی موقع ملا، میں آصف کو اپنے ہاتھوں سے انجام تک پہنچاؤں گا۔''

اس نوجوان کی دادفریاد اور پُرعزم گفتگو پر نویرا بھی دکھی ہو گئی۔ پھر خود اس نے بھی محمود ریاض کی حمایت میں اپنے ٹی وی چینل کے مائیک پر آن ایئر کیمرے کے سامنے اچھا خاصا مستعد، ٹھوس اور قابلِ غور تبصرہ کر ڈالا۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے بعد جب وہ اپنے گھر پہنچی تو کافی دیر تک اس نوجوان کی باتیں اس کے دل و دماغ میں گونجتی رہیں۔ اس کے بعد وہ کمپیوٹر ٹیبل پر آ کر اس خبر کی رپورٹ ٹائپ کرنے لگی۔ رپورٹ مکمل کر کے اس نے ای میل کر دی اور تحریری طور پر ایک کاپی پرنٹر سے نکال کر اپنے پاس ریکارڈ کر لی۔ محمود نے جہانداد کا نام لیا تھا اور یہ نام... نویرا کے دل و دماغ میں گونج رہا تھا... ایک مستعد اور فعال رپورٹر کی حیثیت سے وہ جہانداد کے نام اور تھوڑے بہت بیک گراؤنڈ سے واقف تھی۔ ماضی میں وہ دو پارٹیاں چھوڑ چکا تھا اور چڑھتے سورج کا پجاری تھا۔ چونکہ وہ ایک جدی پشتی جاگیردار تھا اور اپنے علاقے میں اثر رسوخ رکھتا تھا اور پورا ایک ووٹ بینک رکھتا تھا۔ آج کل وہ ایک بڑی سیاسی پارٹی کا راہنما کہلاتا تھا اور اس پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر رکھی تھی۔

نویرا کو ایک نئی ذمے داری سونپ دی گئی۔ اسے جہانداد خان سے اپنے ٹی وی چینل پر ٹیلی فونک آن ایئر رابطہ کر کے سوال پوچھنے تھے اور محمود ریاض کو بھی ٹی وی اسکرین پر ٹیلی فونک رابطے پر پیش کرنا تھا۔

جب اس سلسلے میں جہانداد خان سے رابطہ کیا گیا تو اس نے بہانہ بنا کر انکار کر دیا مگر نویرا پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ دال میں کچھ بلکہ بہت کچھ کالا ہے۔ اس نے محمود ریاض کے احتجاج اور اس پر ہونے والے ظلم کو بہت کوریج دی۔ نہ صرف یہ بلکہ اخبار میں فیچر اور دھواں دھار کالم بھی لکھ ڈالے۔

نویرا کی نگاہ اپنے گھر پر بھی تھی۔ اسے اپنے پاپا سے بہت محبت تھی۔ ان کی تنہائی بانٹنے کے لیے ہی اس نے... بہ اصرار انہیں دوسری شادی پر مجبور کیا تھا مگر اب وہ خود شرمندہ تھی۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ آیا پاپا کو حقیقت بتا دے جو اس روز اس نے ڈرائنگ روم کے کمرے سے گزرتے ہوئے... شہناز بیگم کے منہ سے سن لی تھی... یہ معمولی بات نہ تھی۔ پاپا کو اس بات سے شدید صدمہ پہنچ سکتا تھا۔ گھر میں بڑا بھونچال بھی آ سکتا تھا۔ مگر نویرا ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس شخص کا کھوج لگانا چاہتی تھی جو شہناز بیگم کا منظورِ نظر تھا۔ آخر وہ تھا کون...؟

اس روز اس کے سیل پر ایک انجانے نمبر کی کال موصول ہوئی۔

''ہیلو!'' اس نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''تم نویرا ہو، رپورٹر؟'' دوسری جانب سے عجیب سی آواز ابھری۔

''جی ہاں، آپ کون؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم تو اپنا عملی تعارف کرواتے ہیں مگر ضرورت پڑنے پر...'' دوسری جانب سے عجیب سے لہجے میں کہا گیا جس میں تہدید بھی پوشیدہ تھی۔ پھر وہ یک دم بھاری لہجے میں بولا۔

''بس لڑکی! اب تک تم نے جو کیا سو کیا، اب باز آ جاؤ اور محمود ریاض کو اس کے حال پر چھوڑ دو... ورنہ... تمہارا حشر اس سے بھی زیادہ خراب ہو گا۔''

اس کھلی دھمکی پر یکلخت نویرا کے پورے وجود میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ اسے اپنا حلق اور ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہونے لگے مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کے اندر کی جری اور حوصلہ مند عورت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور وہ درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

''میں اب تک صرف اپنا فرض اور ڈیوٹی نبھا رہی ہوں، میری کسی سے دشمنی نہیں ہے۔''

''زیادہ چالاک بلی بننے کی ضرورت نہیں ہے... اس فون کو ہمارا احسان سمجھو... ورنہ تو ہم بولی سے پہلے گولی چلانے کے عادی ہیں۔'' دوسری جانب سے یہ کہتے ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ نویرا ہونٹ چباتی رہی، اس نے یہ نمبر محفوظ کر لیا۔

☆☆☆

وہ قیامت ہی تو تھی جو اس پر گزر گئی تھی۔

وہ اپنی بیوی ثوبیہ اور پیاری سی بیٹی گڑیا کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد اسے کمپنی میں عہدہ بھی اچھا مل گیا تھا اور وہ کرائے کے گھر سے نسبتاً بہتر علاقے میں بیوی بچوں سمیت منتقل ہو گیا تھا۔ دن بہت ہنسی خوشی کٹ رہے تھے۔ اگرچہ ثوبیہ قریشی صاحب کے ٹارگٹ کلنگ والے واقعے اور آصف اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کو نہیں بھولی تھی... جب اس نے دیکھا کہ قریشی صاحب مرحوم کے بیٹے خرم اور دیگر محلے والوں کے ساتھ مل کر اس کے شوہر نے آصف کے خلاف کارروائی کر کے بالآخر اسے گرفتار کروا دیا تھا تو جب بھی وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ ثوبیہ کے اعصاب پر آصف کسی خوفناک خواب کی طرح سوار ہو چکا تھا، جو علاقہ بدلنے کے باوجود بھی اس کے متوحش دل و دماغ سے نہیں اترا تھا۔

پھر وہی ہوا۔ خاموشی کسی بھیانک طوفان کا ہی پیش خیمہ ہوتی ہے۔ گڑیا کو کسی نے اسکول سے واپسی پر اغوا کر لیا۔ ثوبیہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ محمود بھی تشویش زدہ ہو گیا۔ ثوبیہ رو رو کر محمود کو کہتی کہ یہ حرکت آصف کریکر کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی، وہی ہمارا دشمن تھا اور اس نے تم سے دشمنی میں انتقام لیا ہے، وغیرہ۔ ثوبیہ کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ محمود کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آصف یہ کام کیسے کر سکتا ہے کیونکہ وہ تو جیل میں تھا۔ بھاگ دوڑ کر کے اس نے پتا کروایا تو معلوم ہوا کہ چند روز قبل ہی ضمانت پر پولیس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ تب اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سب سے پہلے نفیسہ کو گرفتار کروایا اور اس کے ذریعے جب آصف کے ٹھکانے پر چھاپا مارا گیا تو... دیر ہو چکی تھی۔ وہ معصوم گڑیا کی بےحرمتی کرنے کے بعد اس کا گلا دبا کر ہلاک کر چکا تھا اور اب اسے کسی ویران جگہ پر دفنانے کی تیاری میں تھا کہ پولیس نے اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔

مگر محمود اور ثوبیہ کی زندگی گڑیا کے بغیر اندھیر ہو گئی۔ ثوبیہ نے تو یہ غم ہی دل پہ ایسا لیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکی۔ یوں محمود کی ہنستی بستی جنت اجڑ کر رہ گئی۔ ایک جیتے جاگتے انسان کے لیے یہ معمولی حادثہ نہ تھا۔ محمود کا دل ہی جانتا تھا کہ جس کرب ناک و جاں گسل گھڑی میں پہلے اس نے اپنی معصوم لختِ جگر گڑیا کو قبر میں اتارا اور پھر چند روز بعد بیوی ثوبیہ بھی اس غم میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور بعد میں اس نے بیوی کو بھی لحد میں اتار دیا۔

مجرم آصف گرفتار تھا، اس پر مقدمہ چلنا باقی تھا۔ محمود نے اب اپنی زندگی کا مقصد ہی یہی بنا لیا تھا کہ جب تک آصف کریکر کو پھانسی نہیں لگ جاتی وہ چین سے نہیں بیٹھے گا اور اس نے شہر کے اچھے وکیل کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں مگر مخالف گروہ بھی کم طاقتور نہ تھا جو آصف کو سزا سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر اس دوران میں اس کی ضمانت ہو گئی۔ محمود نے صدائے انصاف بلند کی جو نقار خانے میں طوطی کی صدا ثابت ہوئی۔

تب پھر نویرا نام کی رپورٹر کے ہمدردانہ جذبات اور کوشش سے اسے امید ہوئی کہ شاید اب اس کی فریاد پر اربابِ اختیار کو توجہ دینے کا خیال آ جائے۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے نویرا نے محمود کی فریاد، ملک کے کونے کونے تک پہنچا دی جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور آصف کی نہ صرف ضمانت منسوخ کر دی گئی بلکہ اسے عدالت نے پھانسی کی سزا سنا دی۔ محمود حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ اس کے غم کا بوجھ تو ہلکا نہیں ہو سکتا تھا مگر اپنی خرمن ہستی کو آگ میں جھونکنے والے دشمن کو سزائے موت سنائے جانے پر اس کے سینے کی آتشِ انتقام ضرور سرد ہوئی تھی۔

محمود اپنی اس ہمدرد محسنہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ پھر دفعتاً ہی ایک خیال نے اسے تشویش زدہ کر دیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

''سائیں! آصف کو بچالو سائیں... کسی بھی طرح آصف کو پھانسی چڑھنے سے بچالو... وہ بہت کام کا آدمی ہے اور بے جگر بھی...''

ظاہر شاہ اس وقت شان پیلس میں موجود جہانداد کے پاؤں پکڑے گڑگڑا رہا تھا۔ اسے جیسے ہی علم ہوا کہ آصف کو عدالت نے پھانسی کی سزا سنا دی ہے... وہ حواس باختہ ہو گیا اور فوراً شان پیلس دوڑ پڑا اور جہانداد کے قدموں میں جا بیٹھا۔

''میرے لاڈلے کو پھانسی کی سزا کیا ہوئی کہ... نانا رحیم اور کبیل دادا جیسے لکڑ بھگوں نے مجھے آنکھیں دکھانا شروع کر دی ہیں۔''

جہانداد بڑی شان سے صوفے پر براجمان تھا۔ ایک ہاتھ میں سگار تھا۔ اس نے آہستگی سے ظاہر شاہ کا کاندھا تھپتھپایا تو ظاہر شاہ اٹھ کر خاموشی سے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔

جہانداد نے خاموشی سے اپنے سیل فون پر کسی کا نمبر پنچ کیا اور کسی سے آصف کریکر کے سلسلے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ سامنے بیٹھے ہوئے ظاہر شاہ کی طرف گھورتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''آصف کی میں نے بڑی مشکلوں سے ضمانت کروائی تھی۔ تمہیں چاہیے تھا کہ اسے کچھ عرصے کے لیے منظرِ عام سے ہٹا دیتے مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔''

جواباً ظاہر شاہ بولا۔ ''سائیں! مجھے کیا پتا تھا کہ اس کی ضمانت اتنی کمزور ہوگی۔ وہ اس وقت میرے دشمنوں کا صفایا کرنے میں مصروف تھا اور پھر آپ کے ایک سیاسی مخالف راہنما کو بھی تو اس نے ہی راستے سے ہٹایا تھا...'' یہ کہتے ہوئے ظاہر شاہ نے دزدیدہ نظروں سے جہانداد کی طرف دیکھا۔

اس پر جہانداد دانت پیس کر بولا۔ ''یہ سارا کھیل اس چھوکری... نویرا نے بگاڑا ہے۔''

''معاف کرنا سائیں! سمجھ میں نہیں آتا آپ نے اس دو ٹکے کی رپورٹر کو کیوں اتنی ڈھیل دے رکھی ہے۔ آپ کا حکم نہ ہوتا تو آصف اب تک اس لڑکی کا حشر بگاڑ چکا ہوتا۔'' ظاہر شاہ چور سے لہجے میں بولا تو جہانداد... سگار کا ایک طویل کش لے کر راکھ میز پر کانچ کی نفیس ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بولا۔

''ہر جگہ زور زبردستی کا کھیل کامیاب نہیں ہوتا ظاہر شاہ! اس لڑکی نویرا نے میڈیا کے ذریعے ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑ ڈالے تھے۔ اس نے براہِ راست ہمیں ٹارگٹ کرنا شروع کر دیا تھا... تم جانتے ہو... اس کا مجھے کتنا نقصان ہوا۔ پارٹی نے میرا ٹکٹ منسوخ کر دیا مگر... اب...'' اس نے سنسنی خیز اور اسرار بھرے انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''سائیں! آپ اب اس کے ساتھ کچھ بھی سلوک کریں، وہ بعد کی بات ہے... آصف کے لیے کچھ فوری طور پر کریں سائیں!'' ظاہر شاہ کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔

''ہو جائے گا آزاد وہ... مگر خیال رہے اسے پس منظر میں رکھنا جب تک اس کا کیس سرد خانے کی نذر نہ ہو جائے۔'' جہانداد خان نے کہا۔

''ٹھیک ہے سائیں... ٹھیک ہے۔'' ظاہر شاہ خوش ہو گیا پھر وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد جہانداد کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔

''ہیلو...''

''یار محمد نے ابھی مجھے بتایا تھا کہ آپ نے مجھے یاد کیا تھا۔'' دوسری طرف سے آواز ابھری۔

''ہاں... یار... ایک کام ہے تم سے...''

''حکم کرو سائیں!''

''یار! ایک آدمی ہے۔ پھانسی کی سزا ہو گئی ہے اسے۔ بڑے کام کا آدمی ہے، اسے نکالنے کی کوئی صورت نکالو۔''

''فکر ہی نہ کرو سائیں!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''تھوڑی تفصیل بتا دو تو میں کوئی صورت نکالتا ہوں۔''

جہانداد اسے بتانے لگا۔ مزید گفتگو کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ سیل فون ابھی اس کے ہاتھ میں تھا کہ اچانک اس کی بیل دوبارہ گنگنائی۔

''ہیلو، شین ڈارلنگ!'' سیل کان سے لگاتے ہی وہ لہجے میں محبت کا خمار سموتے ہوئے بولا۔ اسکرین پر اس نے شہناز بیگم کا نام پڑھ لیا تھا۔

''جہانی ڈیئر! ہماری آواز سنے بغیر آپ نے ہمیں پہچان لیا؟'' دوسری جانب سے شہناز بیگم کی چہکتی ہوئی آواز ابھری۔

''آپ کے موبائل سے آنے والی رابطے کی بیل آپ کی خوشبو سے لپٹی ہوتی ہے۔''

''اب بنائیں مت... میرا اب اس خشک کاروباری آدمی سے گزارہ نہیں ہوتا... کب میری اس سے جان چھڑا رہے ہو؟''

''طلاق کے مطالبے پر کیا کہتا ہے وہ...؟'' جہانداد نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''کہتا ہے خلع لے لو، طلاق نہیں دوں گا۔''

''بہت چالاک آدمی ہے... تمہیں خالی ہاتھ رخصت کرنا چاہتا ہے۔''

''ہاں، وہ سب اپنی بیٹی نویرا کے نام کرنا چاہتا ہے... اپنی وصیت لکھوانے والا ہے۔ کسی رانا جمشید نامی ایڈووکیٹ کو بلایا ہے اس نے... کل...'' شہناز کے لہجے میں تشویش تھی۔ جہانداد بھی چونکا۔

''شینی ڈارلنگ! تم اس کی فکر نہ کرو... میں سب سنبھال لوں گا... کچی گولیاں میں بھی نہیں کھیلا ہوا۔'' اس نے کہا پھر وہ تھوڑی دیر اور باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

''اب آصف کو باہر آجانا چاہیے۔ بہت کام لینے ہیں اس سے...'' سیل فون آف کرنے کے بعد وہ سرسراتے لہجے میں بڑبڑایا۔

وہ پہلے ہی اس حقیقت سے واقف تھا کہ نویرا... سیٹھ جواد کی سگی اور شہناز بیگم کی سوتیلی بیٹی ہے۔ وہ اب یہ سوچ رہا تھا کہ شہناز بیگم کے کردار کو اس سارے گورکھ دھندے میں کہاں فٹ کرے؟ اور کس طرح اسے اپنی دشمن نویرا کے خلاف استعمال کرے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ جائے...

☆☆☆

نویرا کی محمود ریاض کیس میں اس کے ساتھ ہمدردی اپنی جگہ تھی مگر اس کی ذاتی دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ تھی ظاہر شاہ... وہ جانتی تھی کہ ظاہر شاہ... جہانداد خان کا دستِ راست ہے اور خود جہانداد درپردہ کیا تھا، یہ بھی اسے معلوم تھا۔ نویرا نے ظاہر شاہ کو اپنے سیاسی فیچرز اور کالموں میں نشانہ بنایا تھا جو ایک بڑا دہشت گرد تھا اور زیرِ زمین کئی ناجائز دھندے چلا رہا تھا مگر انتظامیہ اس پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر تھی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ظاہر شاہ کی پشت پر جہانداد کا ہاتھ تھا جو خود ایک بڑی سربرآوردہ سیاسی شخصیت ہی نہیں، جاگیردار بھی تھا۔

سیاسی پارٹیاں کبھی بھی کسی غریب یا عام آدمی کو اپنے ساتھ شامل نہیں کرتیں۔ اپنے پارٹی ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے لیے ان کی پہلی ترجیح جہانداد جیسے جدی پشتی جاگیردار ان کا پہلا انتخاب ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہوتی کہ ان کے ساتھ ایک بڑی ''رعایا'' ہوتی ہے بلکہ وہ ''رعایا'' ان کے قابو میں ہوتی ہے۔ جس لیڈر کے لیے اپنی رعایا کو زندہ باد کا نعرہ لگانے کو کہیں گے، وہ اس کی آنکھ بند کر کے تعمیل کریں گے۔ یوں ایک پارٹی راہنما یا لیڈر مقبولیت پاتا ہے۔

نویرا کی ملکی سیاست پر گہری نظر تھی۔

بہرحال... جب جہانداد نے آصف کی ضمانت کروا دی تو نویرا بھی تیزی کے ساتھ اس کے خلاف حرکت میں آ گئی۔ اس نے محمود کی نوعمر بچی کلثوم کے ساتھ زیادتی کی اس قدر میڈیا کوریج دی کہ بالآخر آصف کی ضمانت منسوخ کر دی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس حوالے سے ظاہر شاہ اور جہانداد کا نام بھی خوب اچھالا۔ جس کا نقصان ظاہر شاہ کو ہوا سو ہوا، مگر جہانداد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور آئندہ ہونے والے جنرل الیکشن میں پارٹی نے اسے ٹکٹ دینے سے انکار کر ڈالا۔

وطنِ عزیز میں انتشار و تخریب کاری اور ٹارگٹ کلنگ کی ایک بڑی وجہ ایسے ''ناراض راہنما'' بھی ہوتے ہیں۔ جہانداد کے پاس جس وزارت کا قلمدان تھا، وہ بھی اس سے ''استعفے'' کی صورت میں چھین لیا گیا تھا۔

یہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں نویرا کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی مگر اس کامیابی نے نویرا کی اپنی زندگی کو راہِ پرخار بنا دیا۔

نویرا کے لیے بظاہر حالات معمول پر تھے اور اب وہ اپنے تئیں سکون کے ساتھ اس آدمی کا کھوج لگانا چاہتی تھی جو اس کی سوتیلی ماں کو ورغلا رہا تھا۔ اس کا کھوج لگانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شہناز بیگم کے معمولات کی نگرانی کرتی۔

سیٹھ جواد صبح دفتر چلے جاتے۔ نویرا بھی دس گیارہ بجے تک نکل جاتی تھی۔ شہناز بیگم کوٹھی میں اکیلی ہوتی۔ شام تک وہ کہاں ہوتی، کیسے وقت گزارتی، دونوں باپ، بیٹی یہ نہیں جانتے تھے۔

اس روز نویرا بظاہر تیار ہو کر کوٹھی سے اپنی گاڑی لے کے نکل گئی مگر وہ کوٹھی کے قریب گاڑی کھڑی کر کے منتظر رہی۔ یہ کام اسے دو تین روز تک کرنا پڑا۔ چوتھے روز اس نے شہناز بیگم کو اپنی ذاتی گاڑی پر کوٹھی سے نکلتے دیکھا تو وہ چونک پڑی۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اسی شخص سے ملنے جا رہی ہو، شاپنگ یا کسی اور غرض سے بھی جا سکتی تھی کیونکہ دو روز قبل بھی وہ ایسی ہی کسی جگہ جا چکی تھی۔ بہرحال اس نے تعاقب

شروع کر دیا اور اس وقت وہ چونکے بنا نہ رہ سکی جب اس کی گاڑی شہناز بیگم کا تعاقب کرتی ہوئی، ایک پوش علاقے میں داخل ہوئی۔ یہاں سب سے نمایاں وسیع و عریض رقبے پر جو رہائش گاہ تھی وہ "شان پیلس" تھی، یہ جہانداد کی ملکیت تھی۔

شہناز بیگم کو نویرا نے اسی رہائش گاہ میں گاڑی سمیت داخل ہوتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔

واپس لوٹتے وقت اس نے اپنے دانت اور ہونٹ دونوں ہی بھینچ رکھے تھے۔ اسے جہانداد اور شہناز بیگم کے بیچ اس خفیہ تعلقات کے پس منظر میں کسی گہری سازش کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

وہ وہاں سے اپنے دفتر کی جانب پلٹ رہی تھی کہ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ ایک موٹر سائیکل سوار اس کے تعاقب میں ہے۔ وہ ایک بار پہلے بھی اسے اپنے تعاقب میں دیکھ چکی تھی مگر اس نے توجہ نہ دی۔ اس بار دوبارہ وہی بائیک سوار شخص اسی طرح اپنے تعاقب میں آتا دکھائی دیا تو وہ چونکے بنا نہ رہ سکی۔

وہ کوئی جوان مرد تھا جس نے آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ چہرے پر ہلکی داڑھی اور مونچھیں تھیں۔

اسے دیکھتے ہی نویرا کو سیل فون پر ملنے والی دھمکی دینے والے گمنام شخص کے الفاظ یاد آگئے جس کی اس نے کوئی خاص پروانہ کی تھی کیونکہ وہ جس پروفیشن سے تعلق رکھتی تھی، اس قسم کی گمنام دھمکی آمیز کالز کی وہ عادی ہو چکی تھی جو بعد میں محض گیدڑ بھبکی کے سوا کچھ نہ ہوتی۔ لیکن اب جبکہ اس نے اپنے تعاقب میں بھی اس پراسرار شخص کو دوبارہ دیکھا تو اسے کچھ تشویش ہوئی۔

"یہ کون ہو سکتا تھا؟"

دفتر میں اپنے کیوبیکل روم میں بیٹھنے کے بعد وہ اس پراسرار شخص کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کے بعد وہ کام میں مصروف ہو گئی۔

شام کو فارغ ہو کے جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوئی تو اس نے دوبارہ اس بائیک سوار کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھا۔ اس کے پورے وجود میں لمحے بھر کو خوف کی سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اپنے طور پر بڑے لرزہ خیز اندازے قائم کرنے لگی کہ ظاہر شاہ یا جہانداد نے اس کے پیچھے ہلاک کرنے کے لیے کوئی ٹارگٹ کلر لگا رکھا تھا۔

وہ محتاط ہو گئی۔ تاہم ایک بات پر اسے حیرت ضرور ہو رہی تھی کہ اس پراسرار بائیک سوار مرد نے اس پر کوئی قاتلانہ حملہ نہیں کیا تھا... مگر کیوں؟ کئی مقامات پر ایسے مواقع بھی آئے تھے کہ وہ بہ آسانی اس پر فائرنگ کر کے اسے موت سے ہمکنار کر سکتا تھا مگر ایسا اب تک ہوا نہیں تھا...

وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے ابھی تک اس پر حملہ تو کجا اس سے بات تک نہ کی تھی جسے دھمکی وغیرہ پر محمول کیا جا سکتا۔ پھر وہ ہر وقت بھی نظر نہ آتا تھا۔ اچانک ہی نویرا کی اس پر نگاہ پڑ جاتی تو وہ غائب ہو جاتا۔ کئی بار نویرا نے خود اس کو ٹریس کرنے کی بھی کوشش کی مگر وہ اس کے پہنچنے سے قبل ہی کسی آسیب کی طرح اِدھر اُدھر ہو کے کہیں گم ہو جاتا۔ وہ واقعی نویرا کے لیے ایک آسیب ہی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جسے اب وہ اپنے گھر، اپنے کمرے میں، اپنے بالکل قریب محسوس کرنے لگی تھی۔ ہر بار ایسا ہوتا جب بھی وہ تنہا ہوتی، اسے یوں لگتا جیسے وہ ملک الموت کی طرح اس کے سر پر اچانک نمودار ہو کر اسے جان سے مار ڈالے گا۔

اس پراسرار آدمی کے بارے میں پہلا خیال نویرا کے دل و دماغ میں یہی ابھرا کہ وہ اس کے دشمنوں کا کارندہ ہے، جسے اس کی جان لینے کے لیے مامور کیا گیا ہے۔ ان دشمنوں میں ظاہر ہے سرفہرست ظاہر شاہ اور جہانداد بھی ہو سکتے تھے۔ اچانک ایک اور دشمن کا بھی نام اس کے ذہن میں ابھرا۔ "آصف" مگر پھر یہ خیال اسے جھٹکنا پڑا۔ کیونکہ وہ جیل میں تھا، اگرچہ اس کا بھی شمار اس کے جانی دشمنوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسی کی کوششوں کے باعث اس کی ضمانت منسوخ ہوئی تھی اور اب وہ جیل میں تھا۔

آصف کا خیال آتے ہی نویرا نے تصدیق کی خاطر اس جیل کا رخ کیا جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے بتایا گیا کہ جیل کی کچھ بیرکوں کی مرمت کے باعث بہت سے قیدیوں کو دوسری مختلف جگہوں پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ تاہم یہ بھی اسے معلوم تھا کہ اسے عدالت کی طرف سے پھانسی کی سزا سنا دی گئی تھی جو سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کے بعد عمر قید میں بدل دی گئی تھی۔ مگر اسے تسلی نہ ہوئی کیونکہ آصف کے لیے جس علاقے کی جیل میں منتقل کرنے کا بتایا گیا تھا، وہ وہاں بھی نہیں پایا گیا۔

نویرا کو اپنے وجود میں بھیانک سنسنی کا احساس ہوا۔ پہلا خدشہ جو اس کے ذہن میں ابھرا وہ یہی تھا کہ آصف کہیں جیل سے فرار تو نہیں ہوا یا فرار کرا دیا گیا ہو؟

آصف کا معاملہ اس کی ضمانت اور پھانسی کی سزا

سنانے کے بعد دب کر تقریباً ختم ہو چکا تھا اور لوگ بھی اسے بھول بھال گئے تھے مگر نویرا چپ بیٹھنے والی نہ تھی۔ اس نے جب دوبارہ میڈیا پر آصف کا معاملہ ابھارنے کی جستجو کی تو سب سے پہلے اس کے اپنے چیف ایڈیٹر نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"مس نویرا! اگر اس طرح گڑے مردے اکھاڑنے لگے تو نئی خبریں کون دے گا؟ اس خبر سے جتنا کھڑتیل نکلنا تھا نکل گیا۔ ہمیں اپنی پالیسی کو بھی مدِنگاہ رکھنا ہوتا ہے۔ آگے دیکھو ہمیشہ... جو پیچھے رہ گیا اسے چھوڑو۔"

نویرا نے کوئی بحث نہ کی، شاید اسے بھی ان باتوں کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ آگ کیا ہوتی ہے، دھواں کیا ہوتا ہے۔ خبر سے جب آگ ختم ہو جائے اور دھواں باقی رہ جائے تو پھر اس میں کچھ نہیں بچتا... مگر وہ پیچھے ہٹنے والی کب تھی۔ وہ تو "سرپھری" تھی۔ اس نے ذاتی طور پر اپنی سی کوشش شروع کر دی۔

وہ... اپنے طور پر اس سلسلے میں کیا کر سکتی تھی... اس بارے میں ایک مضبوط و مربوط لائحہ عمل تیار کرنے لگی۔ اب اسے کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا کہ اس کا تعاقب کرنے والا یقیناً آصف ہی ہو سکتا ہے مگر حیرت کی بات تھی کہ وہ محض اب تک اس کا تعاقب ہی کیوں کر رہا تھا... یا پھر اس کا مقصد کچھ اور تھا۔

دفتر سے واپسی پر وہ اپنی گاڑی میں لوٹ رہی تھی۔ اپنی اس نئی پریشانی میں وہ اپنے پاپا کی پریشانی بھی بھول گئی تھی لیکن وہ اس کے خیال میں ایک معمولی مسئلہ تھا جس کا حل اس کی نگاہ میں یہی تھا کہ پاپا کو شہناز بیگم کو طلاق دے دینی چاہیے۔ یہ ایک آسان حل تھا۔ اس بات پر اسے خود بھی حیرت تھی کہ آخر کیا بات تھی کہ پاپا نے ابھی تک شہناز بیگم کو "فارغ" نہیں کیا تھا اگر وہ ایسا کر دیتے تو شاید آج وہ زندہ ہوتے۔

دفعتاً وہ خیالات سے چونک پڑی۔ ایک کار برق رفتاری کے ساتھ اس کے بالکل قریب سے زناٹے کے ساتھ گزری اور آگے جا کر اس کے ٹائر سمع خراش آواز سے چرچرائے۔ وہ اب اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ غیر ارادی طور پر نویرا نے بھی بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ عام شاہراہ تھی، ہر قسم کی ٹریفک رواں دواں تھی۔ دوسری کار سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ اس کی کار کی طرف بڑھا۔ نویرا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

نویرا کے ماؤف ہوتے دماغ میں پہلا خیال "ٹارگٹ کلر" کا ہی آیا۔ یہ جان لیوا خیال بہت پہلے سے اس کے لاشعور میں پل رہا تھا۔ معصوم کلثوم کیس کے سلسلے میں ظاہر شاہ سے اس کی کھلی دشمنی ہو گئی تھی۔

پستول بدست تیزی کے ساتھ اس کی ڈرائیونگ سائڈ پر آیا اور پستول کی نال نویرا کے منہ میں گھسیڑ دی اور خوف ناک غراہٹ سے بولا۔ "مرنے سے پہلے پہچان لو مجھے کتیا! میں وہی ہوں جس کی تم نے ضمانت منسوخ کروا ڈالی اور بالآخر مجھے پھانسی کی سزا ہو گئی۔ دیکھ لو مجھے اپنی ان خوف سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے۔ میں آصف ہوں... آصف کریکر..." یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ ٹھیک اسی وقت وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی جانب گیا مگر پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں۔ دہشت زدہ نویرا کو یوں لگا جیسے کسی غیبی قوت نے موت کے اس سفاک ہرکارے کو عقب سے کھینچ لیا ہو۔

آصف اس اچانک افتاد پر ذرا بھی بدحواس نہ ہوا، عقب سے شرٹ کا کالر پکڑ کر کھینچنے والے کی طرف وہ وحشت ناک انداز میں پلٹا اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، اس نے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کر دیا۔ ساتھ ہی اس کی ایک ٹانگ بھی حرکت میں آئی جو آصف کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ نتیجتاً پستول ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔ سہمی ہوئی نویرا کار میں بیٹھی یہ سب خونی ڈراما دیکھ رہی تھی اور ساتھ ہی یہ دیکھ کر بری طرح ٹھٹکی تھی کہ اس کی جان بچانے والا وہی پراسرار آدمی تھا جسے وہ ہر وقت اپنے تعاقب میں دیکھا کرتی تھی۔ زیادہ سوچنے کا یہ وقت نہ تھا۔ نویرا کے اندر کی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر کار سے اتری اور سیدھی سڑک پر پڑے پستول کی جانب دوڑی۔

ٹریفک بہ دستور رواں تھا۔ دیکھنے والوں نے یہ سب دیکھا ہوگا۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں پہلے ہی ہراس زدہ بنی ہوئی تھیں۔ لوگ محض دو افراد کو بھی بحث میں الجھتا دیکھ کر انجانے خوف سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ یہ تو باقاعدہ لڑائی تھی، خطرہ محسوس کر کے گاڑیاں تیزی کے ساتھ دائیں بائیں سے گزر جاتیں یا راستہ تبدیل کر دیتیں۔

آصف اس آدمی کے مقابلے میں زیادہ جنگجو اور طاقتور نظر آتا تھا۔ گھونسا کھانے کے باوجود وہ وحشت ناک غراہٹ کے ساتھ اس پر پل پڑا اور پستول کی جانب پلٹا۔ اس کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ ادھر نویرا سڑک سے پستول اٹھا

کر سیدھی کھڑی ہوئی تھی کہ آصف ملک الموت کی طرح دوبارہ اس کے سر پر تھا۔ خونی بھیڑیے کے سے انداز میں اس نے نویرا پر جھپٹ کر حملہ کیا اور اپنا پستول دوبارہ قبضے میں لے کر اس کا رخ نویرا کی طرف کرتے ہی ٹریگر دبا دیا۔

گولی چلنے کا دھماکا ہوا مگر گولی نویرا کے بجائے اسے دھکا دے کر پرے دھکیلنے والے جی دار نوجوان کو لگی جو اس وقت نویرا کا نجات دھندا بننے کی جان توڑ کوشش میں لگا ہوا تھا... کیونکہ اس نے سنبھلتے ہی جب نویرا کو خطرے میں دیکھا تو اس کی جان بچانے کا اس کے پاس یہی راستہ تھا کہ وہ نویرا کو دھکا دے اور یہی اس نے کیا۔ گولی بھی چل چکی تھی مگر وہ گولی نویرا کے بجائے اس نوجوان کو لگ چکی تھی۔

ٹھیک اسی وقت پولیس سائرن کی آواز گونجی۔ ایک پولیس موبائل آندھی طوفان کی طرح اس طرف آرہی تھی۔ دھکا لگنے سے نویرا جہاں گری تھی، وہاں اس کی اپنی کار کی آڑ تھی، وہ پھرتی سے تڑپ کر مزید عقب میں ہوگئی۔ آصف کو سردست بھاگنے کی پڑی تھی کیونکہ موبائل سر پر پہنچ چکی تھی۔ یہ رینجرز کی موبائل تھی جنہیں آج کل کسی بھی ٹارگٹ کلر کو دیکھتے ہی گولی مارنے کے احکامات صادر ہوئے تھے۔

☆☆☆

نویرا کو اس پر شدید حیرت تھی کہ بالآخر وہی پراسرار شخص جو ہر وقت اس کے تعاقب میں رہتا تھا اور جسے وہ اپنی جان کا دشمن سمجھے ہوئے تھی، اس کی نجات کا باعث بنا تھا مگر شدید حیرت کا ایک اور جھٹکا اس وقت لگا جب اس نے اس پراسرار آدمی کو پہچان بھی لیا۔ یہ محمود ریاض تھا۔ معصوم کلثومہ کا وہ بدنصیب باپ جس کا آصف جیسے درندہ صفت سفاک انسان نے پورا گھر ہی اجاڑ کر رکھ دیا تھا لیکن... نویرا کے سمجھنے اور اس کی الجھن دور کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہ تھا۔ اب بھی کچھ باتیں جواب طلب تھیں۔

محمود کے دائیں شانے پر گولی لگی تھی۔ اس کی زندگی بچ گئی تھی اور اسے زخمی حالت میں پولیس موبائل پر ہی قریبی اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ نویرا بھی ساتھ تھی۔ جب محمود کو ذرا ہوش آیا تو پولیس کو بیان قلمبند کروانے کے بعد نویرا سے اس کی بات چیت ہوئی۔

’’میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تم سے کیا پوچھوں...؟‘‘

کچھ دیر تک بستر پر دراز محمود کے چہرے کو بہ غور دیکھنے کے بعد نویرا گوگو لہجے میں بولی تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ’’کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے مس نویرا! بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خود ہی سمجھ میں آ[جاتی] ہیں۔‘‘ اس کی بات پر نویرا نے ایک گہری سانس لی [اور] بولی۔

’’کیا تمہیں واقعی مجھ پر قاتلانہ حملے کا اتنا ہی [شبہ تھا] کہ...‘‘

’’شبہ؟‘‘ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ’’یقین [کر] لیں... کمال ہے، آپ کو معلوم نہیں تھا کہ جن لوگوں [سے] آپ نے ٹکر لی ہے وہ آپ کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟‘‘

’’مگر تم نے میری خاطر اپنی جان کو کیوں خطر[ے] میں ڈالا؟ مجھے بچانے کی خاطر تمہاری جان بھی تو جا [سکتی] تھی؟‘‘ کہتے ہوئے نویرا کے لہجے اور آنکھوں میں [ایک] گہرائی سی اتر آئی جس میں کئی سوال پنہاں تھے۔

وہ بولا۔ ’’میرے پاس اب زندگی میں کرنے [کو] لیے رہ ہی کیا گیا ہے مس نویرا! سوچا تھا میری بیوی اور معص[وم] بچی کے سفاک قاتل خود مجھ سے دو دو ہاتھ کریں گے اور [میرا] بھی اب یہی مقصد تھا کہ کم از کم آصف جیسے درندہ صف[ت] انسان کو کیفرِ کردار تک پہنچا دوں، چاہے میری جان ہی کی[وں] نہ چلی جائے... مگر ایسا اب تک نہ ہو پایا۔ اس کی وجہ آ[پ] تھیں۔‘‘

’’میں؟‘‘ نویرا کے لہجے میں حیرت تھی۔

’’ہاں، مس نویرا... آپ!‘‘ وہ بولا۔ ’’اس لیے جس طرح آپ نے مجھ پر ہونے والے ظلم کی میڈ[یا] زبردست کوریج کی تھی اور بالآخر آصف کی نہ صرف ضما[نت] منسوخ ہوگئی بلکہ اسے سزائے موت بھی ہوگئی۔ اس کے [بعد] میرے دشمنوں کی توپوں کا رخ آپ کی طرف ہوتا محسوس [کر] کے میں نے آپ کو ٹریس کرنا شروع کردیا۔ بالآخر [وہی] ہوا۔ اصل دشمن سے میری مڈبھیڑ ہوگئی مگر بدقسمتی سے وہ [مجھے] زخمی کر کے بچ نکلا۔ اس لیے نویرا صاحبہ! آپ اپنے [دل و] دماغ پر میری طرف سے کسی احسان مندی یا صلہ رحمی کا [بوجھ] نہ لیں، اس میں میرا اپنا مفاد بھی تھا۔‘‘

نویرا کو محمود کی یہ صاف گوئی اچھی لگی لہٰذا وہ درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

’’اس کا مطلب ہے ہم دونوں ایک ہی کشتی کے [سوار] ہیں لیکن پھر بھی اگر آپ کا یہی مقصد تھا تو پھر میرا تعا[قب] کرتے رہنے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘

’’میں اب بھی یہی کروں گا۔‘‘ وہ بڑے سکون [سے] بولا۔ ’’اس لیے کہ آپ اب دشمنوں کا پہلا ہدف ہ[یں]۔ میرے چہرے پر نقلی داڑھی مونچھیں ہونے کی وجہ [سے] خبیث مجھے پہچان تو نہیں پایا ہوگا... لیکن یہ اسے تشویش ضرور ہوگی کہ اس کے خطرناک ارادے کے بیچ میں کود پڑنے والا کون تھا؟‘‘

نویرا ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ’’شاید تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اس طرح تمہاری جان کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔‘‘

اس کی بات پر محمود نے مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور جب بولا تو اس کے لہجے میں پختہ عزم کے ساتھ نویرا کے لیے ممنون بھرے جذبات کی آمیزش بھی تھی۔ ’’اور آپ نے جو اپنی جان میری خاطر خطرے میں ڈال رکھی ہے... تو ایسے میں میرا پیچھے ہٹ جانا بزدلی نہ ہوگا؟ آصف درحقیقت میرا دشمن ہے۔‘‘

’’میں نے اپنا فرض نبھایا تھا۔‘‘ نویرا نے آہستہ سے کہا۔

’’تو پھر میں بھی اپنا فرض نبھا رہا ہوں، اپنے دشمن کو انجام تک پہنچانے کے ساتھ تمہاری جان کا تحفظ کرنا بھی میری اولین ذمے داری ہے۔‘‘

وہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ محمود نے بھی اس کے چہرے سے اپنی نظریں نہیں ہٹائیں۔ نظروں کے اس تصادم میں دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے ہوئے پیغامات کا تبادلہ کرتے رہے۔ شاید سمجھ رہے تھے کہ ان حالات میں ان دونوں کا تعلق... جو ابھی تعلق خاطر نہ سہی، کسی نہ کسی طور قائم ضرور ہو چکا ہے۔ نویرا کے دل و دماغ میں محمود کے لیے ہمدردی اور رحم کے جذبات ہی سہی، تاہم وہ اس بات پر متاثر ضرور ہوئی تھی کہ محمود نے اسے خونخوار اور خطرناک دشمنوں کے درمیان تنہا نہیں چھوڑا۔ ادھر محمود بھی نویرا کو اپنی محسنہ کے روپ میں ہی دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ لڑکی تھی جس نے اس پر ہونے والے ظلم پر آواز بلند کی تھی۔ یہاں تک کہ بالآخر اس کی معصوم بچی کے قاتل کو... دوبارہ جیل کی ہوا کھانی پڑی نہ صرف یہ بلکہ آصف کو پھانسی کی سزا بھی دلوا کر چھوڑی۔

نویرا نے کچھ مایوس ہو کر خود کلامی کی۔ ’’شاید میری محنت اکارت گئی جس کا واضح ثبوت آصف کا جیل سے باہر ہونا ہے۔ لگتا ہے اس کی پشت پر واقعی طاقتور لوگوں کا ہاتھ ہے۔‘‘

’’بالکل نہیں۔‘‘ محمود بولا۔ ’’آپ نے بہرحال آصف اور ظاہر شاہ جیسے مجرموں کو بے نقاب تو ضرور کیا ہے۔ دراصل آصف، ظاہر شاہ کا خاص آدمی ہے اور آصف میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔‘‘

نویرا اس کی بات پر چونکی اور بولی۔ ’’کیا تم آصف کو پہلے سے جانتے تھے؟‘‘

’’ہاں، وہ ہمارے محلے میں ہی رہتا تھا۔‘‘ محمود مختصراً اسے ماضی کے واقعات بتانے لگا۔

محمود اتنا بتا کر چپ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ نویرا کا دل بھی بوجھل ہونے لگا۔ ایک سرد آہ بھر کے محمود نے یہ دل گیر موضوع لپیٹتے ہوئے نویرا سے کہا۔ ’’اب تو میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا ہے۔ آصف کو کیفرِ کردار تک پہنچانا۔‘‘

☆☆☆

نویرا کو محمود کا ’’لائن آف ایکشن‘‘ اچھا لگا۔ اس لیے وہ اس کی تسلی تشفی کر کے اسپتال سے گھر لوٹ آئی۔ چند ہی دن گزرے تھے کہ نویرا کو ایک جانکاہ صدمہ سہنا پڑا۔ اس کے پاپا سیٹھ جواد کا کار ایکسیڈنٹ ہوگیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے۔

نویرا نے ان حالات میں بھی صبر و ہوش مندی کا دامن نہ چھوڑا۔ کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ سازش کا ایک خطرناک جال اس پر ڈالا جارہا ہے اور اب اس میں اسے بھی لپیٹنے کی جلد یا بدیر کوشش کی جائے گی اور سازش کے تانے بانے اس کی سوتیلی ماں شہناز بیگم کے ہاتھوں سے بُنے گئے تھے... جبکہ اس جال کے سرے جانداد خان کے ہاتھوں میں تھے۔ شہناز بیگم، اب نویرا کو نادیدہ دشمنوں ہی کے ایک خطرناک آلۂ کار کے طور پر نظر آنے لگی تھی۔ جانتی تھی کہ رونے دھونے سے دشمنوں پر کمزوری ثابت ہوگی۔ باپ کے مرنے کا دکھ اپنی جگہ... مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اسے یقین کی حد تک شبہ تھا کہ اس کے باپ کو سوچی سمجھی سازش کے تحت ٹریفک حادثے کے ذریعے راستے سے ہٹایا گیا ہے... مگر کیوں؟ وہ باریک بینی سے غور کرنے لگی۔ ’’شہناز تو پاپا سے طلاق لینے پر مصر تھی، پھر انہیں اس طرح ہلاک کرنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے، سازشوں کے گورکھ دھندے میں کوئی ’’سودمند‘‘ ترمیم کی گئی ہو۔‘‘ نویرا نے سوچا اور اس کا خیال صحیح بھی ثابت ہوگیا۔

شہناز نے فوراً ہی سیٹھ جواد کی بیوہ کی حیثیت سے کوٹھی پر ہی نہیں بلکہ اس کے کاروبار پر اور دیگر جائداد اور بینک بیلنس پر اپنا حقِ ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ اس گہری سازش کے اسرار و رموز اس وقت پوری طرح نویرا کی نظروں کے سامنے کھل گئے، جب اس کے پاپا کے وکیل

ایڈووکیٹ رانا جمشید نے اسے یہ بتایا کہ سیٹھ جواد اپنی حادثاتی موت سے ایک دن پہلے رانا جمشید کو فون کر کے اپنی رہائش گاہ آنے کا وقت لے چکے تھے اور وصیت لکھنا چاہتے تھے۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ شہناز جانتی تھی، سیٹھ جواد سب سے پہلے اپنی لاڈلی بیٹی کے وسیع تر مفاد میں ہی وصیت لکھوائیں گے جبکہ شہناز بیگم جس کا کردار پہلے ہی سیٹھ جواد کے سامنے آشکار ہو چکا تھا اسے ایک جائز حد تک اپنی جائداد وغیرہ میں حصہ دار بنائیں گے۔ نویرا کو یہ بات واضح ہو گئی کہ سازش کی ترمیم بھی اسی وقت کا شاخسانہ تھی جب شہناز کو یہ پتا چلا تھا کہ اس کا شوہر سیٹھ جواد وصیت کرنا چاہتا ہے۔ یقیناً اس نے جہانداد کو اس بات سے آگاہ کیا ہو گا اور پھر اس نے شہناز کو ایک دولت مند بیوہ اور اپنی معشوقہ کے روپ میں دیکھتے ہوئے، سیٹھ جواد کا خاتمہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس نے طلاق کا مشورہ ترک کر کے سیٹھ جواد کو ہی ٹریفک حادثے کا شکار بنا دیا۔

مفت میں ہاتھ آئی دولت کسے بری لگتی ہے، حالانکہ جہانداد خود کم دولت مند نہ تھا مگر زن اور زر کی ہوس بجھنے کا نہیں، مزید بھڑکنے اور بڑھنے کا نام ہے۔

نویرا تنہا تھی۔ اس کے مقابلے میں شہناز ایک گھاگ اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے عورت تھی۔ اس پر مستزاد اس کی پشت پر جہانداد خان جیسے بااثر آدمی کا ہاتھ بھی تھا اور اب نویرا جانتی تھی کہ اس نے اس کا تنہا ہی مقابلہ کرنا ہے۔ ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عمل کے مقابلے میں ردِعمل زیادہ شدید ہوتا ہے۔ شہناز نے جہانداد کے ساتھ مل کر ایک سفاک منصوبے پر عمل کیا۔ نویرا کے دل میں اس کے لیے نفرت کا شدید جذبہ آگ بن کر سینے میں بھڑک اٹھا اور شدید ردِعمل کے طور پر ابھرنے کو تھا۔ اس نے بھی پختہ عزم کر لیا تھا کہ وہ اکیلی ضرور ہے مگر میدان نہیں ہارے گی اور وہ بھی شہناز جیسی ناگن سے جس نے اس کے پیار کرنے والے شفیق باپ کو راستے سے ہٹا دیا تھا اور اسے باپ جیسے شفیق سائے سے محروم کر دیا تھا۔ اب وہ اس کے مال پر بھی قابض ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

تنہائی کے مایوس کن اندھیروں میں کسی کے نام کی اچانک جوت جاگی تو بے اختیار اس کے لبوں پر محمود کا نام آ گیا۔

محمود تب تک صحت یاب ہو کر اسپتال سے اپنے فلیٹ منتقل ہو چکا تھا۔

نویرا وہیں جا پہنچی۔ وہ دشمنوں کی طرف سے بھی محتاط تھی اس لیے بڑی رازداری کے ساتھ گھر سے نکلی۔ محمود اپنے فلیٹ پر ہی موجود تھا۔ نویرا کو یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر اپنے فلیٹ کے دروازے پر دیکھ کر مجری طرح ٹھٹکا پھر اسے فوراً اندر بلا لیا۔

نویرا نے اسے ساری بات وضاحت سے بتا دی۔ اس کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے تاثرات ابھرے، مگر فوراً ہی وقت کی ضرورت کو محسوس کر کے خود کو سنبھالا اور نویرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں یہ بات اتنے ہی یقین سے کہہ رہا ہوں، جتنا کہ اس وقت مجھے اس بات پر یقین ہے کہ تم اس وقت میرے فلیٹ پر موجود ہو کہ تم ایک حوصلہ مند اور بہادر لڑکی ہو۔ آج میں تمہیں یہ حقیقت بتا رہا ہوں نویرا کہ جب میری ہنستی بستی جنت اجڑ کر رہ گئی اور یہ فلیٹ... جہاں اس وقت تم موجود ہو، میری بیوی اور بچی کے بغیر مجھے کھانے کو دوڑا کرتا تھا تو میں مایوسیوں اور ناکامیوں کے اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ میں اس قدر کم حوصلہ ہو گیا تھا کہ میں اپنی زندگی اپنے ہاتھوں ختم کرنے پر تل گیا تھا لیکن پھر اچانک ایک ہستی نے مجھے حوصلہ دیا، ہمت دی اور مجھے یہ باور کرایا کہ وہ عورت ہو کر اور غیر ہو کر... محض انسانی ہمدردی اور ایک ناانصافی کے مارے فریادی کو انصاف دلانے کے لیے اتنے جتن کر رہی ہے۔ جس کا تعلق جس کا رشتہ نہ مجھ سے تھا، نہ میری بیوی اور بچی سے... مگر پھر بھی وہ محض حق کی خاطر باطل سے جنگ پر تلی بیٹھی ہے تو یقین کرو، نویرا... اس عورت کی اس پامردی نے میرے اندر کے مرے ہوئے مرد کو یکدم زندہ کر دیا۔ جانتی ہو... وہ ہستی کون تھی... وہ تم ہو... ہاں نویرا... تم..." وہ چند ثانیوں کے لیے تھمنے کے بعد بولا۔

"آج یہی وقت تم پر بھی آن پڑا ہے تو خود کو تنہا مت سمجھو۔ یہ سارے واقعات ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہارے پاپا کو سوچے سمجھے منصوبے اور سازش کے تحت قتل کروایا گیا ہے جس کی ابتدا تمہاری سوتیلی ماں شہناز بیگم سے ہی ہوئی۔ تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تمہیں حادثے کی تحقیقات کروانی ہوں گی کہ تمہارے پاپا کی کار کس طرح حادثے سے دوچار ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں وہ سارے کاغذات اپنے ہاتھوں میں کرنے ہوں گے جن پر تمہارا نام ہے، پھر اپنے وکیل رانا صاحب سے ملنا ہو گا لیکن..." وہ کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہو گیا۔ نویرا کی زود فہمی نے محمود کے یوں

بولتے بولتے خاموش ہو جانے کا مطلب بھانپ لیا تھا۔ اس لیے اس نے کچھ نہ پوچھا اور اپنا سر جھکا لیا۔ دفعتاً ہی محمود نے نویرا کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ نویرا نے چونک کر سر اٹھایا اور محمود کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ پل کے پل ہی نویرا کو اس کا یوں کہتے کہتے یکدم خاموش ہو جانے اور فوراً ہی اس کا ہاتھ تھامنے کا مطلب سمجھ میں آ گیا اور اس نے بھی سر جھکا لیا۔

☆☆☆

دو افراد کے درمیان حالات و واقعات کی سنگینی بالآخر ایک تعلق کو جنم دے دیتی ہے۔ یہ حالات کی مجبوری نہیں ہوتی... تقاضا ضرور ہوتا ہے اور دونوں نے ہی ایک دوسرے کی ضرورت کے تقاضے کو محسوس کر لیا تھا۔ متاثر تو وہ ایک دوسرے سے پہلے ہی تھے پھر ایک کشتی کے سوار بھی بن گئے۔

بڑی سادگی سے دونوں نے شادی کر لی۔ اب ایک اور ایک گیارہ تھے... یہ اجزائے ترکیبی بہت طاقتور ثابت ہوئی۔ شہناز کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ محمود نے ایڈووکیٹ رانا صاحب کے ساتھ مل کر شہناز کی حیثیت کو محدود کر کے رکھ دیا۔ شہناز نے عدالت میں اس بات پر واویلا کیا مگر نویرا کی محتاط پسندی اور پروفیشنل مستعدی نے اسے مات دے دی۔

جن دنوں شہناز اپنے مرحوم شوہر سیٹھ جواد سے جھگڑا کرتی تھی اور اس سے طلاق کا مطالبہ کرتی تھی تو نویرا اپنی "صحافیانہ" عادت کے مطابق اس کی گفتگو کو ریکارڈ کر لیا کرتی تھی اور یہی ویڈیو ٹیپ کی ریکارڈنگ عدالت میں پیش کرنے کے بعد شہناز کے حقِ ملکیت کے سارے دعوے جھوٹے قرار دے دیے گئے۔

شہناز نے بظاہر شکست تسلیم کر لی اور خاموشی اختیار کر لی۔ اب نویرا اور محمود کوٹھی میں تنہا رہنے لگے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ایک دوسرے کو پا کر بھی اور پہلے مرحلے میں دشمنوں کے دانت کھٹے کر کے بھی۔ محمود پڑھا لکھا اور کاروبار کا بھی تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے نویرا کے مرحوم باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ یوں انہوں نے اپنی سیکیورٹی کا بھی خاطر خواہ بندوبست کر لیا جبکہ نویرا نے جہانداد سمیت ظاہر شاہ اور آصف کریکر کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا لیا۔

☆☆☆

شہر کے ایک پوش علاقے میں "شان پیلس" کے نام کی یہ عظیم الشان کوٹھی ایک ہزار گز کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ سیاسی شخصیت کی ملکیت ہونے کی وجہ سے اس عمارت میں سیکیورٹی کے انتظامات بھی غیر معمولی ہی تھے۔

اس وقت وہ دونوں اپنے شاہانہ طرز کے آرام دہ... بیڈروم میں موجود تھے۔ کمرے میں اے سی کی خنکی ماحول کو خوشگوار بنا رہی تھی۔ دونوں مرد، عورت ہلکے پھلکے بیش قیمت ریشمی سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھے۔ جہازی سائز کا بیڈ خالی تھا اور یہ دونوں اس کے قریب ہی دو آرام دہ کرسیوں پر براجمان تھے۔ ان کے درمیان ٹیبل پر اعلیٰ درجے کی انگلش ریڈ وائن موجود تھی۔ شیشے کے ایک خوب صورت باؤل میں آئس کیوبس رکھے تھے۔ ایک چھوٹی سی ٹرے میں ادھ کٹے لیمو... بھی تھے، دونوں کے ہاتھوں میں جام تھے۔

مرد... بلاشبہ جہانداد خان تھا اور بھرپور اور دلکش عورت شہناز بیگم تھی۔ دونوں کے چہروں پر شکست خوردگی کے آثار نمایاں تھے۔

"اس دو ٹکے کی لڑکی نے آئندہ ہونے والے الیکشن میں میری پوزیشن اس قدر ناکارہ بنا دی کہ بالآخر پارٹی کو مجھے الٹی میٹ کرنا پڑ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ ان میڈیا والوں نے تو ہماری رعایا ہم سے چھین لی ہے۔ ہمارے طاقتور ہاتھوں کو کمزور بنا کر رکھ دیا ہے۔" جہانداد آبِ ارغوان کا ایک گھونٹ بھر کے بڑبڑایا۔

"تم نے اب تک اسے ڈھیل دے رکھی ہے۔" شہناز نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے منہ بسور کر کہا۔ "تمہارے پاس ظاہر شاہ جیسے بہترین گینگسٹر اور آصف کریکر جیسے ٹارگٹ کلر ہونے کے باوجود تم ایک معمولی لڑکی سے شکست کھا بیٹھے۔ بقول تمہارے کہ وہ شروع ہی سے تمہارے لیے خطرے کا پیغام لا رہی تھی تو..."

"یہی تو مشکل تھی۔" جہانداد فوراً اس کی بات کاٹ کر بولا۔ اس کے لہجے اور آواز میں خونخواری کے ساتھ بے بسی اور جھلاہٹ تھی۔ "اس لڑکی نے بڑی چالاکی سے ابتدا میں ہی سانپ کو گردن سے دبوچ لیا تھا کہ ہم اس کے بارے میں سوچتے رہ گئے۔"

"اس کمینی نے تو مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے مگر میں بھی اتنی آسانی سے شکست تسلیم کرنے والی نہیں ہوں۔" شہناز بیگم نے اس کی بات کا مطلب سمجھے بغیر کہا۔

"تمہارا مسئلہ معمولی ہے۔ میں نے کل بیرسٹر راجا مشتاق سے بات کی ہے۔" جہانداد خان بولا۔ "تم اب بھی سیٹھ جواد کی بیوہ کی حیثیت رکھتی ہو۔"

’’مگر وہ ٹیپ...‘‘

’’سپریم کورٹ میں اس کی کوئی اہمیت تسلیم نہیں کی جائے گی کیونکہ سیٹھ جواد نے تمہیں طلاق بہر حال نہیں دی تھی۔ باقی کاغذی پوائنٹ جو تمہارے خلاف جاتے تھے، انہیں ایڈووکیٹ رضا مراد بڑی مہارت سے باطل قرار دے دے گا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ دفعتاً چونکا جیسے اچانک ہی کوئی بات اس کے ذہن میں ابھری ہو، وہ بولا۔ ’’ایک بار تمہارا کیس جیت سے ہمکنار ہو جائے اور تم دوبارہ سیٹھ جواد کی بیوہ کی حیثیت سے سہی اس کی کوٹھی اور کاروبار میں اپنا عمل دخل...‘‘

’’ایسی جیت مجھے قبول نہیں... ڈیئر جہانی جس میں میری حیثیت صرف کٹھ پتلی جیسی ہو۔ تصرف تو سب پر پھر بھی نویرا کا ہی ہوگا۔‘‘ شہناز نے اس کی بات کاٹ کر تلخی سے کہا اور پھر پلیٹ سے ادھ کٹا لیمو... کا ٹکڑا اپنے پیگ میں ڈال دیا۔

’’یہی بات تو تمہیں سمجھ نہیں آرہی ہے شہنی ڈارلنگ!‘‘ جہانداد اپنا نصف پیگ بھی حلق میں انڈیلنے کے بعد بولا۔ ’’دشمن کے ٹھکانے میں تمہارا عمل دخل ہی ہمارے منصوبے کی پہلی کڑی ہوگا، اس کے بعد تم دیکھتی جانا میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہیں سپریم کورٹ میں ہی نہیں، میڈیا میں بھی مظلوم ظاہر کروں گا۔ جس ہتھیار سے دشمن نے ہم پر وار کیا ہے، وہی ہتھیار اب ہم بھی استعمال کریں گے۔ پیسا لے کر ہمارے حق میں لکھنے والے ایسے زرد کالم نویسوں کی کمی نہیں۔‘‘

شہناز نے غور کرنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

سازش کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ وقت سے پہلے نہیں کھلتی مگر جب آشکار ہوتی ہے تو پھر اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوتا ہے۔

جہانداد خان ایک زہریلی سیاست کھیلنے والا انسان تھا جو ذاتی مفادات کی خاطر اپنوں کو بھی قربان کرنے سے نہیں چوکتے... شہناز کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ جہانداد اس کے ساتھ کیسی سیاست کھیل رہا تھا جبکہ شہناز اس بات پر خوش اور مطمئن تھی کہ... کیا ہوا جو اسے اپنے مرحوم شوہر سیٹھ جواد کی ملکیت سے کچھ نہ ملا تو... جہانداد خان اس سے زیادہ معتبر، دولت مند اور بااثر شخص ہے۔ وہ اس کی بیوی بن کر پہلے سے زیادہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزار سکتی تھی مگر اسے الجھن اس بات کی تھی... جہانداد خان آخر اس سے شادی کرنے کے معاملے کو طول کیوں دے رہا ہے؟ لہٰذا جب پینے پلانے کا دور ختم ہوا اور وہ سونے کے لیے بیڈ پر آئے تو شہناز بڑی محبت سے اس کے سینے کے بالوں پر اپنی نرم و نازک انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

’’جہانی ڈیئر! ہم کب تک اس طرح بغیر کسی تعلق کے ایک ساتھ رہیں گے؟‘‘

جواباً گھاگ مگرمچھ نے جبڑے پھیلا کر اپنے لہجے میں چھپی خونخواری کو محبت میں سموتے ہوئے کہا۔

’’شہنی ڈارلنگ! تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ ہمارے درمیان مضبوط تعلق تو اس دن سے ہی قائم ہو چکا ہے جب تم سیٹھ جواد کی بیوی تھیں۔‘‘

’’میں سماجی تعلق کی بات کر رہی ہوں جو ایک شریف عورت کو ایک مقام، مرتبہ اور عزت عطا کرتا ہے۔‘‘ شہناز نے وضاحت کی۔

’’شیور مائی ڈارلنگ شہنی!‘‘ وہ مکاری سے بولا۔ ’’شادی ہی ہمارا اصل بندھن ہوگا لیکن ڈارلنگ! تمہیں پہلے تھوڑا وقت اور حالات سے ابھی سمجھوتا کرنا پڑے گا... اس لڑکی نویرا سے ہمیں ذرا نمٹ لینے دو اور عام انتخابات بھی ہونے والے ہیں کیونکہ اس نویرا نے تمہیں اور مجھے آج کل میڈیا کے ذریعے ہائی لائٹ کر رکھا ہے۔‘‘

شہناز ہمیشہ کی طرح اس کی باتوں سے بہل جاتی تھی۔ اب بھی اس نے خوش اور مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔ جہانداد خان فصلی بٹیر تھا۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ شہناز جانتی تھی، جہانداد کی بیوی، بچے جاگیر پر رہتے تھے۔ الیکشن کے دنوں میں پارٹی ٹکٹ کی دوڑ دھوپ کے لیے وہ شہر آکر ’’شان پیلس‘‘ میں رہتا تھا۔ یوں بھی زیادہ وقت وہ ادھر ہی گزارتا تھا۔

شہناز کی فوری رہائش کا اس نے دوسری جگہ بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ اپنے بھیانک مقصد کی خاطر... شہناز اور اپنے تعلقات کو خفیہ رکھے ہوئے تھا اور بہت کم یا اس کی ضد سے مجبور ہو کر وہ شہناز کو سیاہ شیشوں والی کار میں شان پیلس بلا لیا کرتا تھا اور صبح کاذب نمودار ہونے سے پہلے اس کا ایک آدمی شہناز کو واپس اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ آتا تھا۔ جہانداد نے اسے سی ویو کے قریب ایک کرائے کا فلیٹ لے کر دے رکھا تھا۔ اس میں بھی اس کی چال اور حکمت پوشیدہ تھی۔

جہانداد جیسے آدمی کے لیے خوب صورت لڑکیوں اور عورتوں کی کوئی کمی نہ تھی جبکہ شہناز کے ساتھ اس نے چارے کے طور پر راہ و رسم بڑھائے تھے۔

شہناز اب تک اس کی سفاک حقیقت سے واقف نہ تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ اسی وقت دہشت زدہ ہو کر شان پیلس سے بھاگ جاتی۔

وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ جو بے رحم شخص اس کے شوہر سیٹھ جواد کو کار ایکسیڈنٹ میں ہلاک کروا سکتا ہے، وہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق... شہناز نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی تھی جبکہ جہانداد خان خود کو ظاہر کیے بغیر خفیہ طور پر شہناز کی سپورٹ کر رہا تھا۔

نویرا کی محمود سے شادی کے بعد شہناز نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس کا شوہر سیٹھ جواد معمولی حیثیت کے حامل محمود سے اپنی بیٹی نویرا کی شادی پر رضامند نہیں تھا اور محمود نے ہی نویرا کے ساتھ منصوبہ بندی کرتے ہوئے کار حادثے میں سیٹھ جواد کو راستے سے ہٹایا تھا اور پھر شہناز کو بے دخل کر دیا گیا۔

اس موقف سے شہناز کو عدالت میں یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ یہ کیس شکوک و شبہات میں پڑ گیا اور ممکن تھا کہ اگلی چند پیشیوں میں شہناز کے حق میں کورٹ کم از کم یہ فیصلہ تو دے دیتی کہ شہناز بیگم سیٹھ جواد کی بیوہ کی حیثیت سے وہاں رہائش اختیار کر سکتی ہے۔

اگرچہ یہ خود شہناز کے مفاد میں نہ تھا مگر جہانداد نے اسے ایسا ہی کرنے کا کہا جو اس کے خفیہ منصوبے کا حصہ تھا جبکہ شہناز تو یہ قصہ ختم کرنا چاہتی تھی... تاہم جہانداد نے اسے یہ کہہ کر بہلا رکھا تھا کہ کیس جیتنے کے بعد... نویرا کو شکست دینے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ یعنی شہناز اپنے مرحوم شوہر کی پراپرٹی وغیرہ میں اپنی حصے داری قائم کرنے کی کوشش کرے۔

پہلی پیشی امید افزا ہوتے دیکھ کر اسی رات جہانداد نے شان پیلس میں ظاہر شاہ کو طلب کر لیا۔

’’آصف کریکر سے کہو اب خود کو ذرا کنٹرول میں رکھے۔ نویرا کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہم نے جامع منصوبہ بندی کر لی ہے۔‘‘

’’سائیں! آپ فکر ہی نہ کریں۔ آصف حکم کا غلام ہے۔‘‘ جواباً ظاہر شاہ بولا۔

’’ہم جانتے ہیں۔‘‘ جہانداد گمبھیر لہجے میں بولا۔ ’’مگر اس کی نویرا اور محمود سے ذاتی دشمنی بھی ہے۔ اس لیے اسے سمجھا دینا، وہ ابھی ان دونوں کو ٹارگٹ نہ کرے۔‘‘

’’بالکل سائیں! ایسا ہی ہوگا۔‘‘ ظاہر شاہ فدویانہ لہجے میں بولا اور پھر واپس لوٹ آیا۔

سلطان منزل پہنچ کر اس نے فوراً آصف کریکر کو طلب کیا اور اسے جہانداد خان کا پیغام پہنچا دیا۔

’’جو حکم استاد! مگر ان دونوں کو کب تک راستے سے ہٹانا ہوگا؟‘‘ اس نے پوچھا تو ظاہر شاہ نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے آصف کی آنکھوں سے جھلکتی سفاکی کی چمک صاف نظر آگئی تھی پھر وہ اس کے شانے کو تھپتھپا کر بولا۔

’’میں جانتا ہوں تم اپنے اس دشمن جوڑے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہو مگر جہانداد کا حکم بھی یاد رکھنا اور اس کا احسان بھی... اس نے جیل کی بیرک کو آگ لگا کر پانچ قیدیوں کو جلا کر بھسم کروا دیا تھا اور تم بھی مردہ قرار دے دیے گئے تھے۔‘‘

’’جہانداد سائیں کا یہ احسان سر آنکھوں پر... اور ان کا حکم بھی، آپ فکر نہ کرو استاد۔‘‘

ظاہر شاہ نے ایک بار پھر اس کا کندھا تھپک کر شاباش دی اور پھر اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے کہا۔ ’’تانا رحیم کا کیا بنا؟‘‘

’’میں نے نوید لمبا اور عارف جنگی کی گردنیں اس کے سامنے ادھیڑ کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب عیسیٰ ناکا اور نگری ٹاؤن کے اڈوں پر ہمارے آدمیوں کا قبضہ ہے۔‘‘ آصف نے سفاکی سے جواب دیا۔

’’شاباش۔‘‘ ظاہر شاہ خوش ہو کے بولا پھر دوسرے ہی لمحے اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’مگر اس کے باوجود تانا رحیم کی طرف سے غافل مت رہنا۔ زیر ہونے کے بعد دشمن... زخمی سانپ بن کر کسی وقت بھی ڈس لیتا ہے۔‘‘

’’اس بارے میں بے غم ہو جاؤ استاد۔‘‘ آصف بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ’’ایسا ہونے سے پہلے میں سانپ کا پھن کچل ڈالوں گا۔‘‘

’’کمیل وادا کا کیا بنا؟‘‘

’’اسے سبق سکھانے کے لیے میں اور منظور جا رہے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے مگر محتاط رہنا... اس بار پولیس کے ہتھے چڑھنا... تمہارے لیے ہی نہیں، ہمارے لیے بھی

خطرناک ہوگا۔"

"آصف کریکر کبھی کچا کام نہیں کرتا۔" اس نے کہا اور ظاہر شاہ کے بدہیئت ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ گبیل دادا اس کا آخری دشمن تھا اور آصف کے ذریعے وہ اسے بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

آصف کریکر سے مڈبھیڑ ہونے اور نانا رحیم والے واقعے کے علاوہ چند دیگر بڑی ٹارگٹ کلنگ اور اغوا برائے تاوان وغیرہ کی وارداتوں کے بعد ایک بار پھر آصف کریکر کا چرچا ہونے لگا۔

اسی دوران میں جب آصف نے اس روز نویرا پر قاتلانہ حملہ کیا تو تعاقب میں رہنے والے محمود کی بھی اس سے مڈبھیڑ ہوئی جس کے نتیجے میں وہ نویرا کی جان بچاتے ہوئے آصف کریکر کے پستول سے زخمی ہوا اور جس پر پولیس انسپکٹر نے اس کا بیان قلم بند کیا۔ اس کا نام انسپکٹر وجاہت تھا۔ وہ پچیس چھبیس سالہ ایک خوبرو، باعزم اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔

محمود اور نویرا کے منہ سے آصف کا نام سن کر وہ بھی چونکے بنا نہ رہ سکا۔

"کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ شہر میں ایک تواتر سے ہونے والی ٹارگٹ کلنگ، بھتا خوری اور اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں کون سا گروہ ملوث ہے؟" محمود نے قدرے طنزیہ لہجے میں انسپکٹر وجاہت سے کہا تو وہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے پہلے نویرا اور پھر محمود سے جواباً بولا۔

"نہیں، خیر ایسی بات بھی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ سب ظاہر شاہ کا گروہ کروا رہا ہے۔ ہم اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"ظاہر شاہ بذاتِ خود کوئی اتنی بڑی طاقت نہیں ہے انسپکٹر صاحب!" اس بار نویرا نے انسپکٹر وجاہت سے کہا۔ "اس کی اصل طاقت آصف کریکر ہی ہے جبکہ ظاہر شاہ کی پشت پناہی جہانداد خان کر رہا ہے۔"

"مگر آصف کریکر تو... جیل میں ہے۔ اسے پھانسی کی سزا ہوگئی تھی۔"

"آپ کی معلومات مستند نہیں ہیں انسپکٹر صاحب؟" محمود نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

اس پر انسپکٹر وجاہت کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

"میرا خیال ہے آپ کو تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ سزا ہونے کے بعد اسے کون سی جیل میں رکھا گیا تھا؟" محمود بدستور انسپکٹر کو نشانہ بنائے ہوئے تھا۔

انسپکٹر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "آپ پلیز مجھے چند گھنٹوں کی مہلت دیں، میں آصف کریکر کے سلسلے میں تازہ معلومات حاصل کرکے آپ سے فون پر رابطہ کرتا ہوں۔"

"آپ کیا معلومات حاصل کریں گے انسپکٹر صاحب!" محمود کا غصہ جوں کا توں تھا۔ "ہم آپ کو بتا رہے ہیں کہ آصف کو ایک منصوبہ بندی کے تحت جیل سے باہر نکالا گیا ہے اور وہ بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتا پھر رہا ہے....... وہ نویرا پر بھی قاتلانہ حملہ کرچکا ہے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔ میں خود اس کی پستول کی چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہوچکا ہوں اور وہ اب بھی ہمارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔"

"دیکھیں محمود صاحب! میں آپ کی پریشانی سمجھتا ہوں مگر آپ بھی ذرا صبر سے کام لیں اور مجھے آصف کے سلسلے میں تازہ معلومات..."

"چلو نویرا! اٹھو یہاں سے۔" معاً ہی محمود نے انسپکٹر کی بات کاٹتے ہوئے نویرا سے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ صاحب ابھی اس خونی ٹارگٹ کلر کے سلسلے میں معلومات اکٹھی کریں گے پھر اس کے خلاف کسی ضروری کارروائی کے بارے میں فیصلہ کریں گے، تب تک وہ سفاک انسان نہ جانے کتنے لوگوں کو موت کی نیند سلا چکا ہوگا۔" محمود نے آخر میں غصے سے اور طنز سے کہا۔ پھر نویرا کا بازو پکڑے تھانے سے باہر آگیا۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا محمود!" تھانے کے احاطے میں کھڑی اپنی کار میں سوار ہوتے وقت نویرا نے محمود سے شکایتی لہجے میں کہا۔ "انسپکٹر وجاہت ہمارے ساتھ مخلص ہے۔ وہ ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔"

"رہنے دو نویرا! میں ان رشوت خور پولیس افسروں کو خوب جانتا ہوں۔" محمود کار اسٹارٹ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں بولا۔ "یہ سب راتب خور ہوتے ہیں۔ سب کچھ جانتے ہیں اور کچھ نہ جاننے کا ڈھونگ رچا کے الٹا مجرموں کو تحفظ دیتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ انسپکٹر وجاہت ایسا نہیں ہے۔" نویرا نے اس کی حمایت جاری رکھی تو محمود اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ بولا۔ "تمہیں اس میں ایسے کون سے سرخاب کے پر نظر آگئے ہیں نویرا صاحبہ... جو اس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو؟"

"یہ تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو محمود؟"

نویرا کا لہجہ بھی تلخ ہوگیا۔

"کیا غلط کہہ رہا ہوں میں؟" وہ کار آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ابھی تک اس الو کے پٹھے کو یہی پتا نہیں ہے کہ آصف کریکر کو کس جیل میں رکھا گیا ہے؟ نہ ہی وہ اب تک اس مفرور ڈرائیور کا کھوج لگا سکا ہے جس کے ٹرک نے تمہارے پاپا کی کار کو ٹکر ماری تھی۔"

نویرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ محمود کے بارے میں سوچ رہی تھی جو روز بروز تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ شاید اس کا قصور بھی نہیں تھا۔ اس پر آصف نے ظلم بھی تو کیا تھا... تو کیا وہ ابھی تک اپنی بیوی اور بچی کو بھول نہیں پایا ہے؟ نویرا کے دل و دماغ میں عجیب و غریب خیالات آنے لگے مگر وہ یہ بھی نہیں بھول پائی تھی کہ ان مخدوش حالات میں محمود ہی نے اس کا ساتھ دیا ہے اور اس دن اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچائی تھی مگر...... ذہن کے عمیق گوشے میں یہ خیال ضرور ابھرتا تھا کہ محمود کی اس سے شادی میں محبت کا کتنا دخل تھا اور ضرورت کا کتنا؟

محمود کی مجھ سے شادی میں ضرورت کا کیا دخل ہوسکتا تھا؟ وہ اس نکتے پر غور کرنے لگی۔

کیا وہ اس کے ذریعے سے آصف سے اپنی بیوی ثوبیہ اور بچی کلثومہ کا انتقام لینا چاہتا ہے؟ کیونکہ شادی سے پہلے اسے محمود کے وہ الفاظ یاد تھے جب وہ اس کا خفیہ تعاقب اور نگرانی کیا کرتا تھا تو آصف کریکر سے خوفناک مڈبھیڑ ہونے کے بعد اس نے بتایا تھا کہ آصف کا ٹارگٹ اب وہ خود یعنی نویرا تھی۔

محبت اور ضرورت کے دوراہے میں نویرا پھنس سی گئی تھی اور پہلی بار وہ محمود کی محبت میں بال آتا محسوس کرنے لگی جبکہ انسپکٹر وجاہت حسین کی نیت میں فتور نہ تھا۔ وہ واقعی نیک نیتی سے ان کی مدد کے لیے کوشاں تھا۔ اس روز انسپکٹر وجاہت نے نویرا کے سیل فون پر رابطہ کیا جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ سچا آدمی ہے۔

"نویرا صاحبہ! میں معذرت خواہ ہوں آپ کی... اور آپ کے شوہر محمود صاحب کی بات بالکل درست تھی۔ میں نے اپنے طور پر پتا چلایا ہے کہ آصف کریکر کو جس جیل میں رکھا گیا تھا، وہاں آتشزدگی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ جس بیرک میں آصف کو رکھا گیا تھا، وہاں چار اور قیدی بھی تھے۔ بتایا یہی گیا تھا کہ بیرک کے ساتھ باورچی خانہ تھا اور غلطی سے گیس کھلی رہ جانے کے باعث آگ بھڑک اٹھی اور آصف سمیت پانچ قیدی جل کر بھسم ہوگئے اور نا قابلِ شناخت بھی... لہٰذا آصف کو مردہ قرار دے دیا گیا تھا۔"

"تو آپ نے کیا اندازہ قائم کیا اب؟" نویرا نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے اس کا خیال جاننا چاہا جو اس کی اس اطلاع پر آصف کے سلسلے میں اس کے ذہن رسا میں نمو پا چکا تھا۔

جواباً انسپکٹر وجاہت بولا۔ "بات صاف ظاہر ہے، آتشزدگی کا یہ واقعہ منصوبہ بندی کا ہی حصہ لگتا ہے تاکہ آصف کو فرار کرایا جاسکے۔"

"آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں سب انسپکٹر صاحب! میرا بھی یہی خیال تھا کہ اس سفاک آدمی کو باقاعدہ گراؤنڈ بنا کر فرار کروایا گیا ہے۔"

"لیکن نویرا صاحبہ!" وہ شستہ لہجے میں مگر پُرعزم ہو کے بولا۔

"قانون کا ہاتھ بھی دراز ہوتا ہے۔ آصف کو پکڑنا اب میرے لیے ایک چیلنج ہے۔ بہت جلد میں اس سے آہنی ہاتھوں سے نمٹوں گا۔" نویرا نے کوئی جواب نہ دیا، تھوڑی دیر بعد اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

آصف اپنے قریبی ساتھی منظورا اور پانچ آدمیوں کے ٹولے اور جدید اسلحے کے ساتھ گبیل دادا کے اڈے پر پہنچا۔

آصف اب حکم کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ ایسا اس وقت ہوا تھا جب ظاہر شاہ نے جہانداد خان کے ساتھ مل کر آصف کو ایک کامیاب منصوبہ بندی کے تحت جیل میں آتشزدگی کا واقعہ بنا کر فرار کروایا تھا۔

آصف کریکر جس کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی تھی، باہر آنے کے بعد وہ اور زیادہ حکم کا غلام بن گیا تھا مگر وہ اس رپورٹر نویرا کو سب سے پہلے اپنی بربریت کا نشانہ بنانا چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی اجیرن کر ڈالی تھی اور میڈیا کے ذریعے اس پر اس قدر دھواں دھار حملے کیے تھے کہ اس کی نہ صرف ضمانت منسوخ ہوگئی تھی بلکہ اسے سزائے موت بھی سنادی گئی تھی۔ دشمن تو وہ اپنا محمود کو بھی سمجھتا تھا مگر اس کی دشمنی ایک ردعمل کا نتیجہ تھی کیونکہ اس کی گیارہ سالہ معصوم بچی کو اس نے زیادتی کے بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا اور ایک پرانی دشمنی کی آگ سرد کر ڈالی تھی مگر اس... رپورٹر نویرا نے بعد میں اس کا جینا دوبھر کردیا تھا۔

مگر وہ دوبارہ نویرا پر قاتلانہ حملے کی حسرت ہی کر کے رہ گیا جب ظاہر شاہ نے اسے جہانداد کے حکم کے بارے میں مطلع کیا۔

چنانچہ آصف کو یہ حکم تسلیم کرنا پڑا۔

کبیل دادا اس وقت اپنے زبردست حلیف... روشن خان سے فون پر آصف کے متعلق ہی بات کر رہا تھا۔

اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ گونجی اور ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اپنے اڈے کی دوسری منزل پر تھا۔ ایک آدمی نے ہانپتے ہوئے آ کر اسے بتایا کہ آصف نے اپنے آدمیوں سمیت اڈے پر حملہ کر دیا ہے۔

کبیل دادا پر یوں بھی آصف کریکر کی دہشت طاری تھی کیونکہ وہ نانا رحیم کا حشر دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ کبیل دادا کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ موت سر پر پہنچنے سے پہلے اڈا چھوڑ کر بھاگ جائے۔

آصف، منظورا اور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کبیل دادا کے دیگر آدمیوں کو بیدردی سے گولیوں کا نشانہ بنا رہا تھا کہ آصف کی سماعتوں میں دوسری طرف گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ فائرنگ کا یہ دوسرا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اس طرف لپکا جہاں وہ اپنے تین ساتھیوں کو کبیل دادا کے ممکنہ فرار ہونے کی جگہ پر تعینات کر چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ ٹھٹک گیا۔ کبیل دادا اپنے ایک ساتھی کی مدد سے وہاں اس کے تینوں ساتھیوں کو گولیوں سے چھلنی کر چکا تھا۔

اپنے ساتھیوں کی خون میں لت پت پڑی لاشوں کو دیکھ کر آصف کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس نے کبیل پر اپنی گن سیدھی کی ہی تھی کہ اس کے ساتھی نے پستول سے اس پر تلے اوپر دو تین فائر کر ڈالے۔ ایک گولی آصف کے گن والے ہاتھ پر لگی اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نہتا ہوتے ہی آصف خود بھی جلدی سے ایک دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ کبیل دادا کا ساتھی اپنے پستول سے مستقل اس پر گولیاں برسا رہا تھا اور آصف کے لیے دیوار کی آڑ سے نکلنا دوبھر ہو گیا اور پھر جب دشمن کی چالاکی اسے سمجھ میں آئی تو وہ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ دفعتاً ایک طرف سے گولیوں کی باڑ آئی اور اسے کبیل دادا کے ساتھی کی کریہہ انگیز چیخ سنائی دی۔ یہ منظورا تھا جو آصف کے پیچھے نکل آیا تھا اور اس نے ہی اپنی گن سے کبیل دادا کے ساتھی کو نشانہ بنایا تھا۔

آصف جلدی سے دیوار سے نکل کے منظورے سے بولا۔

”کبیل دادا... فرار ہو گیا ہے۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ تم اڈے پر قبضہ جمانے کی کوشش کرو... ضرورت پڑنے پر اور ساتھیوں کو بلوا لو۔“ یہ کہتے ہی وہ باہر کی طرف اس راستے سے دوڑا جدھر اس کا خیال تھا کہ کبیل دادا نکلا ہوگا... وہ سرپٹ دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تو دیکھا کبیل دادا... کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ غصے سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ دفعتاً اس کی ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ایک مخصوص آواز ٹکرائی۔ یہ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز تھی۔

کبیل دادا کا یہ اڈا... نسبتاً ویران علاقے میں تھا جو انڈسٹریل ایریا کہلاتا تھا۔ گودام طرز کی نظر آنے والی اس عمارت میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ کبیل دادا کے دو جوئے کے اڈے بھی تھے۔ ایک ریلوے یارڈ کے قریب مزدوروں کی بستی میں تھا، دوسرا بنگالی پاڑے میں۔ وہیں کبیل دادا کی ذاتی رہائش گاہ بھی تھی۔ اس نے اپنی کار میں بیٹھتے ہی وہیں کا رخ کیا تھا۔

آصف نے اس کے تعاقب میں جانے کے لیے اپنی جیپ کا رخ کیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے کبیل دادا کے تعاقب میں لگ گیا۔ کبیل دادا کو اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا تھا... اور اس بات کا بھی کہ آصف کریکر موت کا ہرکارہ بنا ہوا ہے... تھوڑی دیر گزری تھی کہ اسے لگا کہ...... وہ آصف کو جل دینے میں کامیاب ہو گیا ہے تو اس نے اپنے بنگالی پاڑے والے ٹھکانے کا رخ کیا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ کار سے اترا... یہاں اس کا ایک ساتھی دلاور خان یہ اڈا سنبھالتا تھا اور جوئے کے علاوہ منشیات کا کاروبار بھی چل رہا تھا۔ اس کی دوسری منزل پر کبیل دادا کی رہائش تھی۔ دلاور نے جو اپنے استاد کو یوں حواس باختہ دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا۔

”کیا بات ہے استاد... خیریت تو ہے؟ کیا پولیس پھر بگڑ گئی ہے ہم پر؟ مال تو انہیں برابر پہنچ رہا ہے... یا پھر کوئی نیا افسر آیا ہے اپنا ٹیکا جمانے؟“ وہ باتونی تھا۔

کبیل دادا نے اس دوران میں سوچ لیا کہ اسے کیا کرنا ہے؛ وہ دلاور سے بولا۔ ”ظاہر شاہ نے اپنے آدمی آصف کریکر کے ذریعے اڈا نمبر تین پر حملہ کر دیا ہے اور آصف میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔“

”مگر کیوں؟ ہم نے تو ظاہر شاہ کا کچھ نہیں بگاڑا؟“ دلاور چونک کر بولا۔

کبیل دادا اس کے فضول سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے فقط اتنا بولا۔ ”مجھ سے اس کے کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی غلطی ہو گئی تھی۔ تم ایسا کرو فوراً روشن خان کی طرف اپنا کوئی آدمی مدد کے لیے بھیجو، جلدی کرو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اوپری منزل کی طرف دوڑا۔

آصف جس قدر سفاک اور بے رحم تھا، اسی قدر مکار

اور چالاک انسان بھی تھا۔ اس نے کمیل دادا کے تعاقب کے دوران اندازہ لگا لیا کہ کمیل دادا اپنی جان بچانے کے لیے اس وقت کچھ بھی کرسکتا ہے اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اس کے تعاقب میں ہے اور وہ اپنی جان بچانے کی خاطر پولیس تک بھی جاسکتا ہے چنانچہ اس نے ایک موڑ پر اپنی جیپ موڑلی تاکہ کمیل دادا کو یہ باور کراسکے کہ وہ اسے تعاقب کے دوران جل دینے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

جس سڑک پر کمیل دادا اپنی کار دوڑا رہا تھا، آصف جانتا تھا کہ اس کا اختتام کون سی سڑک پر ہوگا۔ وہ اپنی جیپ آندھی طوفان کی طرح دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا تو اسے کمیل دادا کی دوڑتی ہوئی کار دکھائی دے گئی۔ اب وہ محتاط ہوکر اس کے تعاقب میں تھا۔

کمیل دادا، آصف کریکر کی چالاکی سے بے خبر اوپری منزل پر پہنچا ہی تھا کہ نیچے آصف بھی آن پہنچا۔ اس نے ایک ہوائی فائر کیا تو اڈے میں جواری تتر بتر ہوگئے۔ دلاور خان اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ آصف نے تین کو ختم کرڈالا۔ باقی دو زخمی ہوگئے۔ آصف پر خون سوار تھا۔ اس نے دلاور خان کو چھاپنے کی کوشش کی مگر وہ اسے جل دے کر غائب ہوگیا۔ آصف اوپری منزل پر پہنچا اور دروازے کو زوردار لات رسید کردی۔ سامنے کمیل دادا ایک خوب صورت عورت کے ساتھ موجود تھا جو جلدی جلدی تھوڑا بہت سامان باندھنے میں مصروف تھی۔ دروازہ ٹوٹنے کے دھاکے پر دونوں چونک کر مڑے۔ کمیل دادا کے ہاتھ میں پہلے سے پستول موجود تھا۔ اس نے شاید نیچے ہونے والی فائرنگ سن لی تھی اور اب وہ عورت کے ساتھ عقبی کھڑکی کے راستے فرار ہونے کے لیے پرتول رہا تھا۔ آصف کو دیکھتے ہی اس نے اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کرکے گولی چلادی جو آصف کے دائیں بازو پر لگی۔ حالانکہ فائرنگ کی زد میں کمیل دادا تھا مگر آصف مار کھا گیا۔ اس کی اہم وجہ تھی۔ عورت کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بری طرح ٹھٹک گیا تھا اور وہ عورت بھی اسے دیکھ کر کچھ ثانیوں کے لیے بت سی بن گئی تھی۔ بیک وقت دونوں کے چہروں پر شناسائی کا تاثر ابھرا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کمیل دادا نے آصف کریکر پر گولی چلادی جو اس کے بازو پر لگی پھر آصف نے بھی سنبھلنے میں دیر نہ لگائی اور کمیل دادا کے پستول والے ہاتھ پر فائر کھول دیا۔ کمیل دادا کا پستول والا ہاتھ چھلنی ہوگیا۔ وہ کراہ کر زمین پر گرا۔ آصف اپنی گن تانے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس وقت اس عورت نے آصف کے پاؤں پکڑ لیے۔

''آصف! خدا کے لیے میرے شوہر کی جان بخش دو۔'' وہ گڑگڑائی۔

''شوہر...'' آصف قدرے چونک کر زیرلب بڑبڑایا پھر عورت کو خوف ناک نظروں سے گھورا۔ عورت کے اس جملے نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور پھر آصف نے اپنی گن کا ٹریگر دبا دیا۔ کمیل دادا چھلنی ہوگیا۔

عورت ہسٹریائی انداز میں چیخی اور آصف پر زخمی شیرنی کی طرح جھپٹی مگر آصف نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور خوف ناک انداز سے بولا۔ ''فاحشہ کتیا! تو تُو نے مجھے چھوڑنے کے بعد شادی رچالی تھی۔ تجھے تو موت سے بھی بھیانک سزا دوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے تیز دھار گراری والا چاقو نکالا اور عورت کی ناک کاٹ ڈالی۔ وہ تڑپنے لگی۔ کٹی ہوئی ناک سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کا حسین چہرہ، بغیر ناک کے انتہائی بدنما اور کراہیت آمیز نظر آنے لگا پھر آصف نے عورت کو چارپائی پر گرادیا اور اس کا منہ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس کے منہ میں گھسیڑ کر عورت کی زبان باہر کھینچ لی اور چاقو سے کاٹ ڈالی۔ عورت کی چیخ بہت کربناک تھی۔ دفعتاً باہر پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی تو آصف عقبی کھڑکی کی طرف لپکا۔

☆☆☆

شہناز اپنے بھیانک انجام سے بے خبر جہانداد کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ اس نے سپریم کورٹ میں اپیل کرتے ہوئے اپنی سوتیلی بیٹی نویرا اور اس کے شوہر محمود ریاض کے خلاف مقدمہ کردیا اور موقف اختیار کیا کہ اسے ان دونوں سے اپنی جان کا ڈر ہے۔ بالخصوص نویرا کے شوہر محمود سے اسے زیادہ جان کا خطرہ ہے، جس نے اس کے شوہر سیٹھ جواد کو ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اب وہ ان دونوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور برابری کا حصہ لے کر ان سے الگ ہوجانا چاہتی ہے۔

جہانداد کا مقصد... زیادہ سے زیادہ سوتیلی ماں بیٹی کی اس جنگ کو ''ہائی لائٹ'' کرنا تھا۔ اس نے خود کو پس منظر میں رکھتے ہوئے شہناز کی ایڈووکیٹ رضا مراد کے ذریعے قانونی سپورٹ کی اور شہناز کو عدالت میں ہی نہیں بلکہ میڈیا کے ذریعے عام لوگوں میں بھی مظلوم ظاہر کیا... یہی نہیں... پہلی پیشی کے بعد اس نے ظاہر شاہ کے آدمیوں کی مدد سے شہناز پر جعلی قاتلانہ حملہ بھی کروایا۔ اگرچہ اس کے بارے

میں جہانداد پہلے ہی شہناز کو ''بریف'' کرچکا تھا۔

نویرا اور محمود بھی اپنے وکیل ایڈووکیٹ رانا جمشید کے ذریعے اپنی صفائی پیش کرنے اور شہناز کو جھوٹا قرار دینے میں مصروف تھے اور یہ ایک سنسنی خیز صورت حال تھی کہ دونوں ہی فریقین اس بھیانک حقیقت سے غافل تھے کہ ان کی اس قانونی جنگ کے پیچھے کیسی خوفناک سازش پروان چڑھ رہی ہے۔

جہانداد کے علاوہ ایڈووکیٹ رضا مراد بھی جانتا تھا کہ یہ مقدمہ طویل ہوسکتا ہے مگر جیت ان کا مقدر نہیں تھی۔ لیکن جہانداد کا مقصد سرے سے ہار جیت تھا ہی نہیں، وہ تو محض سوتیلی ماں بیٹی کی اس جنگ کو مشہور کرنا چاہتا تھا اور موقع کا منتظر تھا۔

چوتھی پیشی میں جہانداد کو موقع ہاتھ آگیا۔ اس پیشی میں شہناز کا پلڑا بھاری رہا۔ جہانداد نے فوراً ظاہر شاہ سے رابطہ کیا۔ اب اس بھیانک سازش کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا وقت آگیا تھا۔

☆☆☆

''تمہاری ماں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ اس کے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا...'' محمود نے نویرا سے کہا۔

''اسے میری ماں مت کہو، وہ ناگن ہے۔ ایک زہریلی ناگن...'' نویرا ڈریسنگ اسٹول سے اٹھتے ہوئے تلخی سے بولی۔

''ویسے کیا تمہیں پورا یقین نہیں ہے کہ وہ یہ سب جہانداد خان کے بہکاوے میں آکر کررہی ہے؟'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب ہے اس میں شہناز کی اپنی مرضی کا بھی تو دخل ہوسکتا ہے۔''

''ہاں، وہ یہ سب اسی چالباز انسان کے کہنے پر کررہی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے...'' وہ آخر میں پرسوچ لہجے میں بولی۔ ''شہناز کا کم از کم اس مقدمے میں مرضی کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تو پاپا کی زندگی میں ہی ان سے طلاق لے کر جہانداد سے شادی رچانے کو تیار بیٹھی تھی۔''

''مجھے تو جہانداد اور شہناز والا آپس کا معاملہ بھی الجھا ہوا لگتا ہے۔'' محمود اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

''کیا تم بھی وہی بات محسوس کررہے ہو جو...'' نویرا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اسی وقت نچلی منزل میں گولی چلنے کی آواز ابھری۔

''مائی گاڈ! یہ گولی چلنے کی آواز...'' نویرا دہشت زدہ سی رہ گئی۔ محمود بھی بوکھلا گیا۔ پھر وہ دونوں بدحواسی میں سیڑھیاں اترنے لگے اور شہناز کے بیڈروم میں پہنچے تو وہاں بیڈ پر اس کی لاش ان کا منہ چڑا رہی تھی۔

شہناز کی پیشانی پر سرخ روشن دان بنا ہوا تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ نویرا کا پورا وجود سائیں... سائیں... کررہا تھا۔

☆☆☆

مقدمے بازی کے دوران اگر فریقین میں سے کوئی ایک قتل ہوجائے تو لامحالہ دوسرے پر شبہ کیا جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات گرفتاری بھی عمل میں آتی ہے۔

محمود ریاض اور نویرا کو دشمنوں کی یہ سازش اس وقت سمجھ میں آئی جب عین مقدمے کے عروج پر شہناز کا قتل ہوگیا اور شبہے کی بنیاد پر پولیس نویرا کو گرفتار کرکے لے گئی۔

نویرا ہراساں تھی اور محمود پریشان تھا۔ اس نے نویرا کی ضمانت وغیرہ کے لیے دوڑ دھوپ شروع کردی اور ایڈووکیٹ رانا جمشید سے بھی ملاقات کی۔

شاہد نامی ایک شخص نے مقتولہ شہناز کا سگا بھائی ہونے کا دعویٰ کیا اور اس نام نہاد بھائی نے نویرا کے خلاف اپنی بہن کے قتل کی ایف آئی آر کٹوائی تھی۔

اسی دوران میں پیسا لے کر مرضی کے کالم لکھنے والوں نے اس معاملے میں نویرا کے خلاف خوب کیچڑ اچھالا۔ نویرا سات روز کے ریمانڈ پر تھی اور اس سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ اسے وومن پولیس کے حوالے کردیا گیا تھا۔ وومین پولیس انسپکٹر عارفہ شاتی خرانٹ عورت تھی اور سخت گیر بھی۔ خوب کھل کر رشوت لیتی تھی، نویرا کے منہ سے یہ ناکردہ جرم منوانے یا اگلوانے اور تشدد کرنے کے لیے اسے ایک خفیہ ہاتھ کے ذریعے ایک بڑی رقم پہنچادی گئی۔

ایک بڑی رقم کی نئی نکور گڈیاں ملتے ہی انسپکٹر عارفہ نے نویرا کو چھت کے پنکھے سے الٹا لٹکا دیا اور نیم برہنہ کرکے اس پر اس قدر انسانیت سوز تشدد کیا کہ وہ نیم بے ہوش سی ہوگئی۔ صرف وہی یہ حقیقت سمجھ رہی تھی کہ اس پر یہ ظلم جہانداد سے دشمنی کے نتیجے میں کیا جارہا تھا جبکہ نویرا نے ایسا کسی ذاتی دشمنی کے باعث نہیں کیا تھا۔ سچ کو سچ ظاہر کرنے اور فریادی کو انصاف دلانے کی خاطر کیا تھا اور آج وہ خود سرتاپا مظلومیت اور بے انصافی کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔

صحافی برادری نے نویرا کی گرفتاری پر خانہ پُری کی حد تک احتجاج کیا تھا...

محمود کو اپنی بیوی سے بھی نہیں ملنے دیا جارہا تھا۔ رانا

جمشید، نویرا کے سلسلے میں اپنی سی کوشش کر رہے تھے اور یہ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ محمود کی بالآخر نویرا سے ملاقات کروادی گئی۔

سلاخوں کے عقب میں اپنی بیوی نویرا کی حالتِ زار دیکھتے ہی محمود کے اندر کرب کی ایک لہر سی اٹھی۔

''نویرا...! یہ... یہ... تمہاری حالت... مم... میں... اس پولیس انسپکٹر کو نہیں چھوڑوں گا...'' وہ غم و غصے سے پاگل ہونے لگا۔ نویرا کی دلکش آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ بال بکھرے بکھرے نظر آرہے تھے۔ چہرے، ہاتھوں اور پیروں پر نیل کے نشان اور آنکھیں متورم تھیں۔ وہ سلاخوں کے پیچھے اکھڑے ہوئے پلاستر والے فرش پر نڈھال سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں کیا بلکہ جسم میں بھی کھڑے ہونے کی سکت نہ رہی تھی۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز بھی نقاہت سے کپکپا رہی تھی۔

''مم... محمود...! کیا سچائی کی راہ پر چلنے والوں کی آواز کو اسی طرح ظلم اور ناانصافی کی چکی میں پیس دیا جاتا ہے... تو پھر سچ کون بولے گا؟''

اسے اس قدر مایوسی کی باتیں کرتے پا کر محمود کا جگر چھلنی ہو گیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے، سلاخوں کے ساتھ ٹکے ہوئے نویرا کے سر کو محبت سے تھام کر بولا۔

''نویرا... پلیز! خود کو سنبھالو... تم تو بڑی حوصلے والی تھیں اور پھر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ تمہیں دیکھ کر تو میں نے حوصلہ پکڑا تھا۔ ورنہ دیکھو... دشمنوں نے تو میرا سب کچھ مجھ سے چھین لیا تھا... مگر... نویرا اس بار... میں انہیں اپنی خرمنِ ہستی کو اجاڑنے نہیں دوں گا۔''

محمود کے لہجے میں عزمِ صمیم کی جھلک تھی اور کرب ناک لمحوں کی بازگشت بھی... نویرا نے نیم مردہ آنکھوں سے محمود کے چہرے کی طرف دیکھا اور کمزور سی آواز میں کہا۔ ''محمود! تم شاید ان کا مقابلہ نہ کر سکو... میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی... مم... مجھے... یوں لگتا ہے... شش... شاید اب میرے بعد تمہاری باری ہے۔''

محمود اس کی مایوسانہ گفتگو پر لمحے بھر کو ششدر رہ گیا۔ وہ جو نویرا کو آج سے پہلے ایک حوصلہ مند اور پُرجوش لڑکی کے روپ میں دیکھتا آیا تھا، اب یوں اسے مایوس اور بے حوصلہ پا کر اسے بے حد ملال ہوا۔ وہ بدستور اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تم میری فکر نہ کرو نویرا! تم جانتی ہو کہ میں نے تو بہت پہلے ہی سے اپنے سر پر کفن باندھ لیا تھا مگر یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ خود کو سنبھالو... ظلم کی اس اندھیری رات کے بعد سویرا ضرور ہوتا ہے۔''

اس کی بات پر نویرا کے پژمردہ ہونٹوں پر بے تاثر مسکراہٹ ابھری پھر وہ ایک بے رحم حقیقت عیاں کرتے ہوئے بولی۔ ''مگر ظلم کی یہ اندھیری رات ہم سے بہت کچھ چھین بھی تو لیتی ہے۔''

''نویرا! رانا صاحب ہماری مدد کر رہے ہیں۔'' محمود نے ماحول کی کڑواہٹ دور کرنے کی غرض سے کہا۔

''انہوں نے امید دلائی ہے کہ ثبوت کی عدم دستیابی کے باعث شک کا فائدہ دیتے ہوئے تمہاری رہائی بہت جلد عمل میں آجائے گی۔'' نویرا نے پُرامید نظروں سے سلاخوں کے پار محمود کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی قابلِ رحم حالت پر محمود کے حلق میں ہی نہیں، آنکھوں میں بھی رقت اتر آئی اور اس نے بڑی محبت سے سلاخوں کے اندر سے نویرا کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ اسی لمحے ایک سنتری نے سیلن زدہ فرش پر ڈنڈا مار کر ملاقات ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔

☆☆☆

کمیل دادا سے شادی کرنے سے پہلے ہی دلاور خان نے نفیسہ کو اپنی بہن بنا لیا تھا۔ وہ ایک تاریک برستی ہوئی رات تھی جب نفیسہ نے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور جیسے ہی دلاور خان نے دروازہ کھولا، نڈھال سی نفیسہ ''بھائی! اپنی بہن کی مدد کرو...'' کہتے ہی... اس کی چوکھٹ پر قدموں کے قریب گر پڑی تھی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ دلاور خان کو اپنی بہن بانو یاد آگئی تھی جو اس کی ایک ہی بہن تھی اور ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ بہر طور... نفیسہ کو اس نے نہ صرف سہارا دیا بلکہ پناہ بھی دے دی۔

نفیسہ کو تب تک خود پر فخر تھا، جب آصف کریکر نے اس کی محبت میں پورے محلے والوں سے دشمنی مول لے رکھی تھی۔ نفیسہ کی قسمت ہی ایسی تھی کہ اس کا شوہر شادی کے محض تین سال بعد ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر چل بسا تھا۔

پھر اس کی آصف سے دوستی ہو گئی۔ نفیسہ ویسے ہی گھر سے بھاگی ہوئی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ تنہا ہو گئی تھی۔ گھر بھی واپس نہیں جا سکتی تھی ایسے میں آصف ہی اسے آخری سہارا محسوس ہوا۔ آصف نے بھی اسے شادی کا آسرا دے رکھا تھا۔ اس کا سارا خرچ بھی اس نے اٹھا رکھا تھا... دونوں میں ناجائز تعلقات بھی پروان چڑھ چکے تھے۔ مجبوری میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کے انہی تعلقات کی بنا پر محلے والوں کو یہ دونوں سخت ناپسند تھے،

بلکہ وہ انہیں محلہ بدر کرنے کے لیے متحد ہو گئے تھے۔ قریشی صاحب اور محمود ریاض نے سب سے زیادہ نفیسہ اور آصف کے ناجائز تعلقات پر شدید مخالفت کی تھی۔ آصف کے اوباش ساتھیوں کا بھی نفیسہ کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آصف سارا دن نفیسہ کے مکان میں ہی ہوتا تھا۔ وہیں اس نے بیٹھک بنا رکھی تھی۔ نفیسہ یہ سب کچھ محض آصف کی وجہ سے برداشت کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے آصف کے بارے میں پتا چل گیا کہ وہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے مگر خود نفیسہ کیا تھی۔ مجبوری اور ذلت کی تصویر... اور آصف اس کی اسی مجبوری سے کھیل رہا تھا۔

اس دوران میں نفیسہ کے علم میں یہ بات آتی رہی کہ آصف کی قریشی صاحب اور محمود سے بڑی گہری دشمنی ہو گئی ہے اور پھر جب آصف نے قریشی صاحب کا مرڈر کیا تو نفیسہ بھی دہل گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ مجبوری اور نامساعد حالات نے اسے ایک غلط آدمی کی جھولی میں پھینک دیا ہے مگر وہ اب کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ ایک بند گلی میں کھڑی تھی۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آصف نے انتقام کی آگ میں مغلوب ہو کر محمود نامی اس شخص کی گیارہ سالہ معصوم بچی کلثوم کو اغوا کے بعد زیادتی کا نشانہ بناتے ہوئے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا ہے تو نفیسہ کو اس سے نفرت ہو گئی۔ پھر یہ نفرت اس وقت شدید ہو گئی جب آصف کو اس جرم میں پولیس گرفتار کر کے لے گئی تو آصف... نفیسہ کو اپنے ساتھی منظورے کے حوالے کر گیا۔ یوں وہ کھلونا بن کر رہ گئی۔

اسے اپنی اس زندگی سے اور آصف سے بھی کراہیت آنے لگی پھر وہ ایک برستی ہوئی رات میں خود ہی اپنا گھر چھوڑ کر بے منزل بھاگ کھڑی ہوئی اور سوئے اتفاق گرتی پڑتی کمیل دادا کے خاص آدمی دلاور خان کے در پر آن پڑی۔

تقدیر کو شاید اس بار اس پر رحم آ ہی گیا اور اسے دلاور خان کی صورت میں ایک باعزت سہارا مل گیا۔ اگرچہ دلاور خان کا بھی تعلق کمیل دادا جیسے جرائم پیشہ افراد سے تھا مگر بہر حال وہ دلاور خان کی بہن بن کر عزت کی زندگی گزارنے لگی۔

دلاور خان، کمیل دادا کے قریبی ساتھیوں میں سرفہرست تھا اور گروہ میں نمبر دو کی حیثیت رکھتا تھا۔ آگے چل کر حالات کچھ ایسے نہج پر آئے کہ کمیل دادا کی شادی نفیسہ سے ہو گئی۔

مگر تقدیر نے پھر پلٹا کھایا اور نفیسہ کا ایک بار پھر آصف کے ساتھ سامنا ہوا اور ایسا بھیانک سامنا ہوا کہ اس کا شوہر کمیل دادا آصف کریکر کے ہاتھوں مارا گیا بلکہ اس سنگ دل انسان نے انتقاماً نفیسہ پر بھی ستم ڈھا دیا اور اس کی ناک اور زبان کاٹ ڈالی۔

اب ایک بار پھر وہ قابلِ رحم حالت میں دلاور خان کے پاس تھی اور دلاور خان کمیل دادا کے مرنے کے بعد آصف کے ڈر سے کسی اور جگہ جا چھپا تھا۔

☆☆☆

''سائیں! سارا کام مکمل طریقے سے ہو گیا ہے... اور کوئی حکم؟'' ظاہر شاہ نے جہانداد کو فون پر بتایا۔

جہانداد نے کہا۔ ''ابھی ایک آخری کام رہتا ہے۔ تم میرے پاس آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے سائیں! یہ غلام حاضر ہو جائے گا۔'' ظاہر شاہ نے خوشامدی انداز میں کہا۔

تھوڑے دنوں بعد... نویرا کی ضمانت ہو گئی۔ رانا جمشید اور محمود کی کوششیں رنگ لائیں۔ ثبوت کی عدم دستیابی کے باعث وکیل نے یہ امید دلائی تھی کہ نویرا بہت جلد بری بھی ہو جائے گی۔

انسپکٹر وجاہت حسین نے خاص طور پر اس کی کوٹھی آکر نویرا کو رہائی کی مبارک باد دی۔ محمود کو اس کی آمد ناگوار گزری۔ وہ سارے پولیس والوں کو ایک جیسا ہی سمجھتا تھا۔ حالانکہ وجاہت حسین ایسا نہیں تھا۔ خرانٹ انسپکٹر عارفہ کو اس نے ہی ناک میں نکیل ڈالی تھی اور نتیجے میں اسے معطل کر دیا گیا تھا۔ اسے نویرا سے ذاتی طور پر انسانی ہمدردی تھی کیونکہ وہ اس کے حالات سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ نویرا کیسے کیسے جگادر دشمنوں سے نبرد آزما تھی۔

محمود نے تو اس سے سیدھے منہ بات نہ کی البتہ نویرا نے وجاہت کے ساتھ دورانِ گفتگو اس کا شکریہ ادا کیا اور آخر میں کہا۔

''انسپکٹر صاحب! میری یہ جیت میرے لیے خوشی کا مقام ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی بے چینی بھی محسوس ہوتی ہے... دل و دماغ انجانے خوف کا شکار رہتے ہیں۔ میرے ساتھ بہت کچھ ہو چکا ہے اور لگتا ہے شاید اب بھی میرے ساتھ بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ بس مجھے یہی خوف رہتا ہے۔''

انسپکٹر وجاہت نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، محمود بھی موجود تھا۔ درمیان میں شیشے کی میز پر چائے کے ساتھ کیک اور بسکٹ وغیرہ رکھے تھے۔

محمود، انسپکٹر سے بولا۔ ''میرے نزدیک سوال یہ

پیدا ہوتا ہے کہ آخر شہناز قتل کیس میں پولیس نے اب تک کیا کیا ہے؟ جبکہ آصف کریکر کے محض ڈیتھ وارنٹ جاری کر کے تمہاری پولیس آرام سے سو رہی ہے۔"

نویرا کو درمیان میں محمود کا بولنا... اچھا نہ لگا تھا حالانکہ وہ خود ہی اس موضوع کی طرف آرہی تھی۔

انسپکٹر وجاہت نے بڑے تحمل سے محمود کی بات سنی پھر چائے کا آخری گھونٹ بھرنے کے بعد خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے ہموار لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں، پولیس میں کچھ خرابیاں ہیں لیکن میں ذاتی طور پر اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ آصف پر ہاتھ ڈالوں اور اسے زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کروں... کیونکہ ظاہر شاہ کے لیے وہی آخری پھندا ثابت ہوسکتا ہے۔"

"یہ سب پولیس کے ٹوپی ڈرامے ہیں انسپکٹر صاحب! یہ ہو جائے وہ ہو جائے۔" محمود تلخی سے بولا۔ "آصف کریکر دوبارہ گرفتار ہوا اور پھر باہر ہو گیا۔ اب گرفتار ہوا تو پولیس کون سا تیر مارے گی؟ اصل بات یہ ہے کہ اس کی پشت پناہی کرنے والوں پر ہاتھ ڈالا جائے جن کے بل بوتے پر وہ ٹارگٹ کلنگ اور کھلی بربریت کا مظاہرہ کرتا پھر رہا ہے۔"

"یہ کیس اب میرے سپرد کر دیا گیا ہے محمود صاحب!" انسپکٹر نے محمود کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا، اوہو... مجھے نہیں معلوم تھا۔" محمود نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ کہا جیسے کہہ رہا ہو... کہ اب تم کون سا تیر مار لو گے انسپکٹر وجاہت حسین۔

نویرا کو محمود کا انسپکٹر وجاہت سے بہ دستور یہ طنزیہ رویہ سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو ٹوکنے والی تھی کہ انسپکٹر وجاہت نے محمود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "محمود صاحب! میں آپ کی اس تلخی کی وجہ جانتا ہوں اور مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں پوری دیانت داری کے ساتھ آصف سمیت ظاہر شاہ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کوشاں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کچھ مشکلات کا ہمیں سامنا ہے مگر آپ کے تعاون سے یہ مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔" اس کی بات پر محمود سر جھٹک کر خاموش ہو گیا۔ نویرا، محمود سے کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر وہ بھی خاموش رہی پھر انسپکٹر وجاہت... ہولے سے کھنکھار کر نویرا کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں، آپ اپنے کچھ خدشات کا اظہار کرنا چاہتی تھیں؟" جواباً نویرا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ محمود اٹھ کر وہاں سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ ان کی باتوں کا بُرا مت مانیے گا پلیز... وہ دراصل..."

"اٹس او کے، کوئی بات نہیں۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میں ان کی تلخی کی وجہ جانتا ہوں اور بہ خدا میں نے محمود صاحب کی کسی بات کا بُرا نہیں منایا۔ ان کے ساتھ واقعی ایک طرف بڑا ظلم ہوا تو دوسری طرف انہیں انصاف بھی نہیں ملا۔ ایسا انسان بے چارہ لامحالہ تلخ اور کڑوا ہو جاتا ہے۔" انسپکٹر وجاہت نے فراخ دلی سے کہا۔ نویرا اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"انسپکٹر صاحب! پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ دشمن مرحلہ وار مجھے نشانہ بنا رہے ہیں۔ میں ان کے ایک حملے سے ابھی سنبھل بھی نہیں پاتی ہوں کہ وہ مختلف انداز سے مجھ پر اگلا حملہ داغ دیتے ہیں اور قانون ان کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں اگر سوچتی ہوں تو محمود کی قانون پر بداعتمادی حق بہ جانب لگتی ہے۔"

نویرا کی گفتگو پر انسپکٹر وجاہت بہ غور اس کے چہرے کو تکتا رہا پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ "ایک زاویے سے آپ کی بات غلط بھی نہیں ہے نویرا صاحبہ! قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں کمزور نہیں۔ کچھ مجبوری کے باعث قانون کہیں کمزور بھی پڑنے لگتا ہے۔ اب دیکھیں نا، کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتیں۔ آپ قانون پر بھروسا کریں اور بالخصوص مجھ پر بھی... میں آپ سے کچھ ضروری باتیں پوچھنا چاہوں گا۔ میں بلند و بانگ دعوے تو نہیں کرتا مگر بہرحال میں آپ کے تعاون کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔" اس کی بات پر نویرا نے اپنے سر کو پُرسوچ انداز میں تفہیمی جنبش دی۔

☆☆☆

جیل سے رہائی اور ضمانت کے بعد نویرا نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جن زرد کالم نویسوں نے اس کے خلاف لکھا تھا، اس کے جواب میں اس نے دھواں دھار تردیدی کالم اور مضامین لکھنے شروع کر دیے۔

اس کے اپنے اخبار کے ایڈیٹر سلمان زیدی نے خانہ پُری کے لیے محض ایک آدھ مضمون اداریے کی شکل میں اس کے حق میں لگایا تھا مگر پھر اس نے نویرا سے معذرت کر لی تھی۔ نویرا نے بھی اس اخبار اور اس کے نجی ٹی وی چینل سے استعفا دے دیا تھا۔ وہ اب فری لانسر رائٹر کے طور پر لکھنے لگی تھی... مگر جلد ہی اخبارات کے ایڈیٹرز اسے "ذاتی جنگ" کا نام دے کر اس کے کالم شائع کرنے سے معذرت کرنے لگے۔

نویرا کو اس بات کا شدید دکھ پہنچا تھا کہ اس کے سچ اگلنے والے قلم کو "زردی" نے نگل لیا تھا۔ قلم کا ساتھ چھوٹا تو اس نے عملی میدان میں قدم رکھا اور انسپکٹر وجاہت حسین کے ساتھ مکمل تعاون کرنے لگی۔ محمود کاروبار سنبھالے ہوئے تھا اور نویرا کے اصرار پر اس نے دو گن مین رکھ لیے تھے۔

محمود نے پہلے اشاروں کنایوں میں اور پھر واضح الفاظ میں نویرا پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ اب کاروبار پر توجہ دے اور اس جنگ سے ہٹ جائے جس کا اب کوئی فائدہ نہیں۔

نویرا، محمود کے منہ سے آخری الفاظ سن کر پہلے تو ششدر رہ گئی پھر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"یہ... یہ تم کہہ رہے ہو محمود...؟" اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ "مگر... تم نے اس عزم کے ساتھ مجھ سے شادی کی تھی کہ ہم دونوں ایک اور ایک گیارہ ہو کر دشمنوں سے نمٹیں گے... مگر تم تو..."

"ہاں، مجھے یاد ہے یہ سب..." محمود نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

اس وقت وہ دونوں اپنے آفس میں ہی تھے۔ ایک اہم بزنس میٹنگ کے نتیجے میں محمود نے نویرا کو دفتر سے جانے نہیں دیا۔ اب دونوں فارغ ہو کر اپنے آفس روم کے صوفوں پر براجمان تھے... سامنے تپائی پر چائے کی ٹرے رکھی تھی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ دونوں بھی نکلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ محمود نے یہ بات چھیڑ دی تھی۔

"مگر مجھے اندازہ ہونے لگا ہے کہ ہمارے ملک میں طاقتور برتر اور کمزور کم تر ہی رہے گا۔"

"نہیں محمود! پلیز ایسا مت کہو۔" نویرا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"قلم نے تو میرا ساتھ چھوڑ ہی دیا مگر تم... نہیں محمود..." وہ سسک پڑی۔ محمود کو اس لمحے بے اختیار نویرا پر پیار آگیا اور اس نے محبت پاش انداز میں نویرا کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں نویرا! اس جنگ سے ہمیں سوائے نقصان کے اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں... میں... درحقیقت ڈرتا ہوں کہ کہیں میں تمہیں کھو نہ دوں۔"

نویرا نے اس کے شانے پر دھیرے سے سر رکھ دیا اور بولی۔ "یہی خوف مجھے تمہاری طرف سے بھی لگا رہتا ہے۔ مجھے تو اس بات کا اظہار کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ محمود! آج تم نے یہ کہا تو میں نے بھی کہہ ڈالا لیکن محمود! کیا پھر ہم یہ جنگ ہار دیں؟ اور کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح دشمن ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے؟" وہ اس کے بازو پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"تم بھی صحیح کہتی ہو۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دونوں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"یس۔" محمود نے قدرے بلند آواز سے کہا۔ دروازہ کھلا اور دبلی پتلی لڑکی اندر داخل ہوئی۔

یہ سیکریٹری نوشین تھی۔ "سر! آپ لوگ ابھی تشریف رکھیں گے؟"

"ہاں، تم جاؤ۔" محمود کے بجائے نویرا نے اس سے کہا۔

وہ بولی۔ "سوری میڈم! مجھے آپ کے بعد جانا چاہیے تھا مگر مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے تو امی پریشان ہو جاتی ہیں۔"

"نہیں... نہیں... اوکے... تم جاؤ۔" محمود نے اسے جانے کی اجازت دی اور وہ "تھینکس" کہہ کر چلی گئی۔

"چلو، اب باقی باتیں گھر چل کے کرتے ہیں۔" محمود نے مسکرا کر کہا تو نویرا بھی مسکرا کے اٹھ کھڑی ہوئی پھر دفعتاً محمود نے نویرا کا نرم و نازک ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اسے مخمور نظروں سے تکتا ہوا اس کی طرف جھکا۔ نویرا نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔

"آئی لو یو... نویرا۔"

"آئی لو یو ٹو۔" نویرا نے بھی ہولے سے کہا۔ محمود نے تھوڑی مزید جسارت کرنا چاہی تو وہ ہنس کر بولی۔

"نہیں... دفتر میں نہیں۔"

دونوں ہنس پڑے اور پھر باہر آکر اپنی گاڑی میں آبیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ محمود نے سنبھالی۔ آمدِ سرما کے باعث دن چھوٹے اور راتیں بڑی تھیں۔ سرِ شام ہی اندھیرا سا ہونے لگتا تھا۔ "آف ٹائم" ہونے کے باعث سڑکوں پر ٹریفک کا اژدحام ہوتا تھا کہیں کہیں تو دو تین کلومیٹر تک گاڑیاں ٹریفک جام ہونے کے باعث چیونٹی کی طرح رینگتی تھیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔

محمود نے مرکزی شاہراہ سے گاڑی دائیں جانب موڑی۔ آگے پوش علاقہ تھا۔ سڑک کے کنارے لائٹس

روشن تھیں، شاید ذیلی سڑک ہونے کے سبب یہاں اکا دکا ہی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔

علاقے میں داخلے کے لیے جیسے ہی محمود نے ایک اور ذیلی سڑک کی طرف کار گھمائی... گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ کار کا اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ نویرا کے حلق سے چیخیں خارج ہو گئیں۔ محمود بدحواس ہو گیا۔ کار سیمنٹ کے چبوترے سے ٹکرا کر رک گئی۔ نویرا کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ ٹھیک اس وقت دو افراد تاریکی سے کار کے دروازوں کے قریب نمودار ہوئے۔ دونوں پستول بدست تھے۔ بیک وقت دونوں نے دروازے کھول کر انہیں بازوؤں سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ یہاں صرف ایک اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ محمود اور نویرا کی دہشت زدہ نظروں نے آصف کریکر کو پہچان لیا۔ دوسرا اس کا ساتھی منظورا تھا۔

''بڑی حسرت تھی مجھے اپنے ہاتھوں تجھے تڑپا تڑپا کر مارنے کی۔'' آصف نے محمود کی پیشانی سے پستول کی نال لگاتے ہوئے خوفناک غراہٹ سے کہا۔ ''مگر افسوس کہ مجھے تجھ پر فقط ایک گولی تیری کھوپڑی میں اتارنے کا حکم ملا ہے۔''

''نن... نہیں... خدا کے لیے... اسے مت مارو۔'' نویرا چیخی۔ وہ منظورا کے ہاتھوں میں مچل رہی تھی مگر آصف نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی نے محمود کا بھیجا اڑا ڈالا۔ نویرا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''افسوس تجھے زندہ چھوڑنا پڑ رہا ہے۔'' کہتے ہوئے آصف اس کی طرف گھوما۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ نویرا غش کھا کر گر پڑی۔

☆☆☆

ماحول پر جمود سا طاری تھا۔ دونوں کو جیسے ایک سنگین خاموشی نے جکڑ رکھا تھا... شاہانہ طرز کے اس کشادہ کمرے میں وہ دونوں گداز صوفوں پر دھنسے بیٹھے تھے۔ رات دس بجے کا عمل تھا۔ دونوں کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ان کے درمیان موجود شیشے کی نفیس میز پر مشروب خبیثہ کے لوازمات سجے ہوئے تھے۔

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی سائیں!'' ظاہر شاہ نے ذرا جھک کر پلیٹ میں سے ادھ کٹا لیمو... اور ایک آئس کیوب اپنے پیگ میں ڈال کر سامنے بیٹھے جہانداد سے کہا۔ ''اس لڑکے کے ساتھ نویرا کا بھی کام تمام کر دینے میں کیا مضائقہ تھا؟''

''یہ سیاست کے کھیل ہیں، مار اماری سیاست کے انداز میں چلے تو اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔'' جہانداد نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیگ سے ایک گھونٹ لے کر کہا۔

''نویرا اس وقت میری ذات کے لیے بھڑکتا شعلہ بنی ہوئی ہے۔ براہ راست اسے نشانہ بنانا ہمارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔'' جواباً ظاہر شاہ نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور بلوریں پیگ کو اپنے بدہیت ہونٹوں سے لگا لیا۔

''خبردار! تم نے نویرا کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا ہے۔'' دفعتاً جہانداد نے اس کی طرف نظریں مرکوز کرتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''اس کی کڑی نگرانی جاری رکھنی ہے۔''

''ٹھیک ہے سائیں... سمجھ گیا۔'' ظاہر شاہ بولا اور خالی پیگ میز پر رکھا ہی تھا کہ ایک خدمت گار نے اندر داخل ہو کر جھک کے جہانداد خان کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ پھر ظاہر شاہ سے بولا۔

''میری ایک اہم ملاقات آئی ہے، تم جا سکتے ہو۔ اور ہاں، یہ لفافہ اٹھا لو۔'' کہتے ہوئے جہانداد نے اپنے قریب صوفے پر رکھا ہوا ایک بڑا سا پھولا ہوا لفافہ اٹھا کر اس کی جھولی میں پھینک دیا۔ ظاہر شاہ کی آنکھوں میں مخصوص چمک ابھری۔ لفافہ تھامتے ہی اسے اندر سے نوٹوں کی خوشبو آ گئی۔

ظاہر شاہ کے جاتے ہی ایک سوٹ پوش شخص اندر داخل ہوا۔ وہ دراز قامت اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ چہرہ کلین شیو اور قدرے لمبوترا تھا۔ بال کریو کٹ تھے اور ان میں جیل لگی ہوئی تھی۔ جہانداد نے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔

''انگلش رم۔'' سوٹ پوش نے مصافحہ کر کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا بریف کیس تھا جو اس نے اپنے قریب صوفے پر رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ عجلت میں لگتا تھا۔

جہانداد نے خدمت گار سے کچھ کہا۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے انگلش رم کی ایک بوتل میز پر رکھ دی۔ جہانداد نے اس کے لیے انگلش رم کا ایک پیگ بنایا پھر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''پارٹی کا کوئی فیصلہ سنانے آئے ہیں سر؟'' جہانداد نے یہ کہتے ہوئے مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' مخاطب نے ایک گھونٹ بھر کے مختصراً کہا۔ اس کی نظریں جہانداد کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں سے جہانداد کو بجلی کے شرارے پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے سے ہی نہیں بلکہ

آواز سے بھی موت کی سرسراہٹ مترشح محسوس ہوئی۔

''پارٹی کو بلیک میل کرنا چھوڑ دو جہانداد خان! یہ میرا تمہیں دوستانہ مشورہ ہے۔''

اس کی بات پر جہانداد کی پیشانی پر ایک سلوٹ ابھری اور وہ بولا۔

''کیا پارٹی کو میری وفاداری پر شبہ ہے؟''

''تم گروہ بندی کی داغ بیل ڈال رہے ہو۔ پارٹی کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا مگر تم ایجنسی والوں کی نظروں میں آ جاؤ گے اور پھر...''

''آخر ایسی کیا بات ہوئی ہے... آپ کھل کر بات کریں۔''

''تم سب جانتے ہو، کھل کر کہنے کا میرے پاس وقت نہیں۔'' کہتے ہوئے سوٹ پوش نے خالی پیگ میز پر رکھا اور اپنے پہلو میں رکھا بریف کیس اٹھا کر میز پر رکھا اور ایک فائل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ''اس پر دستخط کر دو۔''

جہانداد کی آنکھوں میں الجھن سی تیرنے لگی۔ اس نے فائل لے کر کھولی اور جائزہ لینے لگا۔

''وہ... یہ... یہ... کیا...؟''

''ان حالات میں ہم سب کے لیے یہی بہتر ہے۔''

''لل... لیکن... میں تو... اگلے انتخابات کی... تیاری...''

''یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تمہیں محترم لیڈر کا یہ حکم ماننا پڑے گا۔'' سوٹ پوش نے اس کی طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے مستعفی ہونے کے بعد...''

''میں تمہیں پھر وہی مشورہ دوں گا کہ پارٹی کو بلیک میل کرنا چھوڑ دو۔''

''یہ بلیک میلنگ نہیں ہے سر، حقیقت ہے۔ ایک بڑی تعداد پارٹی سے متنفر ہو جائے گی۔''

''ہونہہ۔'' سوٹ پوش نے اس کی بات پر ایک طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''یہ بات تم سے بہتر ہم جانتے ہیں۔ دستخط کرو۔'' آخر میں اس کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ جہانداد کی آنکھوں سے برہمی کا اظہار ہونے لگا مگر وہ چپ رہا۔ سوٹ پوش نے اسے قلم تھما دیا تھا۔ بالآخر جہانداد ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''ٹھیک ہے پھر میں دستخط کیے دیتا ہوں مگر میں چاہوں گا کہ مجھے پارٹی ٹکٹ دینے یا نہ دینے کے بارے میں پہلے آگاہ کر دیا جائے تاکہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ آئندہ ہونے والے انتخابات مجھے کس حیثیت سے لڑنا ہوں گے، تاہم آزاد امیدوار کی حیثیت سے میں اب بھی مضبوطی رکھتا ہوں۔''

''آگاہ کر دیا جائے گا تمہیں۔'' کہتے ہوئے سوٹ پوش اٹھ کھڑا ہوا... جہانداد نے ''جبری'' نوعیت کا استعفا لکھ کر فائل اس کے حوالے کر دی۔

سوٹ پوش رخصت ہو گیا۔ جہانداد ہونٹ بھینچے چند ثانیے کچھ سوچتا رہا پھر کچھ سوچ کے اس نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور اپنے لیے ایک پیگ بنانے لگا۔

☆☆☆

اپنوں اور پیاروں کا ساتھ چھوٹ جانے سے انسان کا ذہن ہی نہیں، اس کے ارادے بھی متاثر ہونے لگتے ہیں۔ نویرا کے ساتھ بھی معاملہ ایسا مختلف نہ تھا۔ مرد چاہے کسی روپ میں ہو، عورت کو کسی نہ کسی حوالے سے تحفظ کا احساس ضرور دلاتا ہے۔ باپ نے ساتھ چھوڑا تھا تو نویرا نے خود کو بے یارو مددگار اور اکیلا محسوس کیا پھر حالات کی کچھ مثبت انداز کی کروٹ سے محمود اس کی زندگی میں آیا اور اس کی تنہائی کا ساتھی بنا تو اس کا ساتھ بھی ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ نویرا اب ایک بار پھر تنہا تھی۔

دشمن اسے تنہا کرنا چاہتا تھا۔ شاید یہی ان کا مقصد تھا... نویرا کو اس حقیقت کا اب اندازہ ہونے لگا تھا مگر دشمن جب تک زندہ تھا نویرا کو اس سے اپنی جان کا خوف لاحق رہتا۔ تاہم اتنا وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنی ذات سے کسی اور کو نہتی نہیں کر سکتی۔ جب انسان کا سب کچھ چھن جائے، اپنے پیارے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں تو پھر انسان کے اندر کا ڈر اور خوف بھی جانے لگتا ہے۔ جب سرمایہ حیات اور متاع جسم و جان ہی نہ رہے تو بھلا پھر کس بات کا ڈر اور کس شے کا خوف۔ وہ بھی اس طرح کے ڈر اور خوف سے عاری ہو چکی تھی۔

محمود کے سوئم کے بعد نویرا نے خود کو کاروبار میں مصروف کرنے کی کوشش کی مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ دشمن کو فراموش کر بیٹھی تھی... جہانداد، ظاہر شاہ اور آصف کریکر اسے یاد تھے۔ اس نے اپنے ان تینوں دشمنوں کو زیر کرنے کی ہر طرح سے کوشش کی مگر وہ تینوں زبردست ثابت ہوئے تھے۔ نویرا کے پاس سردست ان تینوں دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں تھا۔ وہ بظاہر چپ سادھ گئی تھی یا پھر ذہنی طور پر اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔

شام چار بجے وہ دفتر میں ایک میٹنگ میں گھنٹا بھر مصروف رہی۔ اختتام پر پانچ بج گئے۔ اس نے چائے منگوا

کر لی اور چند فائلوں کا معائنہ کرتی رہی۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے اس کی میز پر رکھا انٹرکام گنگنایا۔

''ہاں، نوشین! کیا بات ہے؟'' اس نے ریسیور اٹھانے کی زحمت گوارا کیے بغیر وائڈ اسپیکر کا بٹن دبا کر اپنی سیکریٹری سے کہا۔

''میڈم! کوئی انسپکٹر وجاہت حسین ہیں... آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اسپیکر میں نوشین کی آواز ابھری۔ وجاہت کی آمد کا سن کر نویرا کے چہرے پر کچھ دبا دبا سا رنگ ابھرا پھر اس نے کہا۔

''او کے، اندر بھیج دو انہیں۔''

دروازے پر دستک ہوئی۔

''تشریف لائیں انسپکٹر صاحب۔'' نویرا نے کہتے ہوئے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ دستک ہوتے ہی دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ گرے پینٹ شرٹ میں وہ خاصا خوبرو نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر موقع کی مناسبت سے بے تاثر مسکراہٹ تھی۔

محمود کی ٹارگٹ کلنگ کے بعد نویرا کی ایک بار انسپکٹر وجاہت سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ دوسری ملاقات تھی۔ ''تشریف رکھیے۔'' نویرا نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خود بھی دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہو گئی۔

''کیا آج آپ ڈیوٹی پر نہیں ہیں؟ پہلی بار آج آپ کو بغیر وردی میں دیکھ رہی ہوں۔'' نویرا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میں چھٹیوں پر ہوں۔'' اس نے مختصراً کہا تو نویرا چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

''اچھا! کیوں خیریت؟ کیا فیملی کے ساتھ کہیں باہر تفریح پر جا رہے ہیں؟''

نویرا کے استفسار پر وجاہت حسین نے ایک گہری نگاہ نویرا کے چہرے پر ڈالی پھر بولا۔

''آج آپ نے مجھ سے فیملی کے بارے میں پوچھا تو بتائے دیتا ہوں۔ میری کوئی فیملی نہیں ہے اور میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتا ہوں۔'' نویرا کے لیے یہ انکشاف کچھ چونکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔

''پھر یہ لمبی چھٹیاں آرام کے لیے ہیں؟''

''نہیں، ایک خفیہ مشن کو پورا کرنے کے لیے ہیں۔''

''خفیہ مشن؟'' نویرا چونکی۔

''جی، خفیہ مشن۔''

''لیکن اس کے لیے چھٹیاں لینے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو آپ آف ڈیوٹی رہ کر بھی پورا کر سکتے تھے۔''

نویرا کی بات پر وجاہت کے چہرے پر عجیب سے تاثرات کی رمق ابھری پھر بولا۔ ''نویرا صاحبہ! نہ جانے کیوں مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جو وردی میں نے پہن رکھی تھی، وہ ایک زنجیر تھی۔ ایک ایسی زنجیر جو ڈیوٹی کرنے پر تنخواہ تو دلا دیتی ہے مگر فرائض کی انجام دہی کے معاملے میں روڑے اٹکاتی ہے۔''

نویرا، انسپکٹر وجاہت حسین کے منہ سے آج پہلی بار اس قسم کی گفتگو سن رہی تھی، وہ بولی۔

''ایک عجیب تبدیلی آج میں آپ کے اندر دیکھ رہی ہوں، انسپکٹر صاحب! کیا اس کی وجہ جان سکتی ہوں؟'' یہ پوچھنے کے دوران نویرا کو احساس ہوا تھا کہ اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکا سا طنز در آیا تھا۔

جواباً انسپکٹر وجاہت بولا۔ ''نویرا صاحبہ! اس کی وجہ سادہ اور سمجھ میں آنے والی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ میں نے ظاہر شاہ اور آصف کریکر کی بیخ کنی کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ جب بھی میں ظاہر شاہ کی گردن تک پہنچنے کی کوشش کرتا... مجھ پر محکمہ جاتی حکم نافذ ہو جاتا اور کسی دوسرے عام کیس میں مجھے الجھا دیا جاتا۔ پھر آپ کے شوہر محمود کی ٹارگٹ کلنگ کے واقعے پر تو میں نے استعفا تک دینے کا سوچ لیا تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ اس طرح جو تھوڑے بہت اختیارات میں رکھتا ہوں، ان سے بھی جاؤں گا۔ سو چاکہ چھٹی لے کر کوئی مربوط لائحہ عمل تیار کروں... اس کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

اس کی صراحت بھری گفتگو پر نویرا نے قدرے چونک کر اس کی طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں اور پھر... اب رہ ہی کیا گیا ہے کچھ کرنے کو۔''

وجاہت کو اس کے لہجے کی اتھاہ مایوسی کا احساس ہوا۔ وہ بولا۔ ''کیا آپ نہیں چاہتیں کہ آپ کے پاپا... آپ کے شوہر کے قاتلوں اور آپ کے دشمنوں کو...''

''وجاہت صاحب!'' نویرا نے اچانک اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''دشمن جب زبردست ہو جائے اور قانون کو زیردست کر ڈالے تو... پھر ہمارا اس قسم کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہونا اپنی جانوں کے زیاں کے سوا کچھ نہیں۔'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ نے بھی تو بالآخر مجرموں کی بالادستی کو قبول کرتے ہوئے اس نوکری سے ہی مستعفی

ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب بھلا آپ بغیر وردی کے مجرموں کا کیا بگاڑ لیں گے؟''

وجاہت کو نویرا کے لہجے کی تلخی کا صاف احساس ہوا۔ وہ نویرا کے چہرے پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے ایک راستے کی بات کی تھی۔ اس طرح کے طاقتور اور بااثر مجرموں سے دوسرے طریقے سے بھی تو نمٹا جا سکتا ہے... بالکل اس طرح جیسے زہر کو زہر اور لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔''

اس بات پر نویرا نے پہلی بار چونک کر وجاہت کا چہرہ دیکھا۔

''باہر میری ذاتی کار موجود ہے۔ کیا ہم کہیں اور اچھی جگہ پر بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں؟'' نویرا نے وجاہت کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بہ غور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے... ان آنکھوں میں اس عزم کی جھلک دکھائی دی جو خود نویرا کے دل و دماغ کے کسی عمیق گوشے میں بے بسی کے پتھر تلے دبا ہوا تھا۔ یعنی... دشمنوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم۔

☆☆☆

آج شام سہانی تھی۔

دونوں ساحلِ سمندر کے کنارے واقع ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ کے ٹیرس پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''آخر آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' نویرا نے چائے کی پیالی کے کناروں پر اپنی مخروطی انگلیاں مس کرتے ہوئے پوچھا۔

وجاہت کو نویرا کے ساتھ اس شام یہاں کھلی فضا اور کھلے ماحول میں بیٹھنا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی طبیعت میں جو تکدر تھا وہ جانے لگا تھا۔ نویرا کے سوال پر وہ جواباً بولا۔ ''میں پسِ پردہ رہ کر ظاہر شاہ اور آصف کریکر کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہوں۔'' اس کے عزائم جان کر ایک لمحے کو نویرا کی آنکھوں میں خوف کی جھلک نمایاں ہوئی۔

''کیا آپ قانون کے محافظ ہو کر... قانون شکنی کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''کیا آپ بھول گئیں کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اور زہر کو زہر...'' وہ اس کی دلکش آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''نہیں وجاہت صاحب! میں آپ کو اس راستے پر چلنے کا مشورہ نہیں دوں گی اور نہ ہی کسی قسم کا تعاون کروں گی آپ کے ساتھ۔''

وجاہت دھیرے سے مسکرایا۔ اس کا انداز نویرا کے لیے لمحہ بہ لمحہ پراسرار ہوتا جا رہا تھا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں کہ... آپ کے ہاتھ میں پستول تھما کر اپنے ساتھ اس مہم میں شریک کروں گا؟ نہیں نویرا صاحبہ! مجھے آپ سے صرف اس حد تک مدد چاہیے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کرتی رہیں اور بس...''

''میں آپ کی باتیں نہیں سمجھ پا رہی ہوں وجاہت صاحب!'' نویرا نے الجھ کر کہا۔ ''بلکہ میں آپ کو یہی مشورہ دوں گی کہ آپ کسی قسم کی قانون شکنی کی مہم میں پڑنے کے بجائے اپنی والدہ کو لے کر کسی پُرفضا مقام پر چلے جائیں... اور سب بھول جائیں... جس طرح میں بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی پھر لمحہ بھر کو رکی اور وجاہت سے آخر میں نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''وجاہت صاحب! ایک مشورہ اور آپ کو دوں گی۔ میں دشمنوں کا ہدف ہوں مگر... مجھ سے زیادہ وہ لوگ ان کا ٹارگٹ ہوں گے جو مجھ سے کسی قسم کا ناتا یا رشتہ جوڑنے کی کوشش کریں گے۔ آپ شاید میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ اس لیے آئندہ مجھ سے ملنے کی زحمت گوارا نہ کیجیے گا۔ میں اپنے حال میں خوش اور مطمئن ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑ گئی۔

ساحلِ سمندر سے آنے والی ہوائیں، کرسی پر ہکا بکا بیٹھے وجاہت حسین کے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی قدرت نے عورت کو ایسا نسوانی وجدان عطا کیا ہے جو وہ مرد سے ایک ہی ملاقات میں سب کچھ بھانپ لیتی ہے؟

☆☆☆

وجاہت نے دوسری ملاقات میں اس بار ذومعنی لہجہ اختیار کرنے کے بجائے واضح لفظوں میں حوصلہ افزائی کے لیے اس کا ساتھ مانگنے کو... شادی کے پروپوزل پر بالآخر منتج کیا تو نویرا نے صاف انکار کر ڈالا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وجاہت بھی اس کے دشمنوں کا شکار ہو جائے اور ایک بوڑھی ماں کا سہارا اس سے چھن جائے۔ وجاہت نے اسے ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر نویرا جانتے بوجھتے... اپنی ذات سے اب کسی اور مرد کو نتھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ دشمن اسے صرف تنہا دیکھنا چاہتے تھے۔ اسے ڈپریشن کا شکار بنا کے نفسیاتی مریضہ بنانا چاہتے تھے یا پھر ان کا مقصد اب بھی کچھ اور تھا... اس کے ان اندیشوں کی اس وقت تصدیق ہو گئی جب اسے ایک گمنام کال موصول

ہوئی۔ بولنے والے کی آواز نویرا فوراً پہچان گئی تھی۔ یہ وہی تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے بھی اس کے پرسنل نمبر پر اسے دھمکی دی تھی اور اس بار اس نے اس کے دفتر کے لینڈ لائن کے نمبر پر رابطہ کیا تھا۔

”تم ہر لمحہ ہماری نظروں میں ہو رپورٹر صاحبہ! اب کیا تم نے اس نوجوان انسپکٹر وجاہت سے پینگیں بڑھانا شروع کر دی ہیں؟ کیا تم چاہتی ہو وہ بھی کسی گمنام گولی کا شکار ہو جائے... وہ بھی محض تمہاری وجہ سے؟“

”چپ ہو جاؤ... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔

”تمہارے لیے یہی سزا تو تجویز کی گئی ہے رپورٹر صاحبہ۔“ یہ کہتے ہوئے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

☆☆☆

عمارت بنانے میں ایک طویل عرصہ لگتا ہے اور اسے ڈھانے میں چند دنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نویرا نے بھی چند دنوں میں سب کچھ بڑی خاموشی سے وائنڈ اپ کیا اور ایک غیر ملکی کمپنی میں انویسٹمنٹ کر کے اپنی امیگریشن کروالی اور لندن چلی گئی۔

اس بارے میں ایک مختصر خبر اخبار میں چھپی تھی کہ معروف سیاسی تجزیہ کار، اینکر پرسن اور دلیر رپورٹر نویرا غیر معینہ مدت کے لیے بیرونِ ملک جا چکی ہیں۔

یہ اخبار... انسپکٹر وجاہت کے ہاتھوں میں تھا اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ وہ اس وقت اپنے سرکاری بنگلے کے لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اسے نویرا کے یوں خاموشی سے چلے جانے کا دکھ تو تھا مگر وہ اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ اسے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور جسے وہ اپنی سوچوں کے ذریعے تاویلات سے دوبارہ جوڑنے کی سعی بھی کیے جا رہا تھا پھر... دفعتاً ہی وہ زیر لب بولا۔

”نویرا! تم ایک روز واپس لوٹ کر آؤ گی۔ ہاں اس وقت جب سویرا ہوگا... لیکن کاش! تم نے مجھ پر بھروسا تو کیا ہوتا۔ میرے زورِ بازو کو آزما کر تو دیکھا ہوتا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون اٹھایا۔

نمبر ڈائل کیے اور دوسری جانب سے رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔

”میں پہنچ رہا ہوں... کیا تم دونوں موجود ہو؟“

”ہم آپ کے ہی منتظر ہیں سر!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ لہجے میں احترام تھا۔

”اوکے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر وجاہت نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر وجاہت عام لباس میں مگر مکمل تیاری کے ساتھ... اپنی ذاتی کار میں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کمیل دادا کو آصف کریکر کے ذریعے مروانے کے بعد اب ظاہر شاہ کا تین نئے علاقوں میں قبضہ قائم ہو چکا تھا۔ اب وہاں بھتے کی پرچیاں صرف ظاہر شاہ کے آدمیوں کی چلتی تھیں۔ آصف نے مذکورہ علاقوں میں اپنی دہشت قائم کر رکھی تھی۔ کچھ بڑے تاجروں نے ابتدا میں بھتا دینے سے انکار کیا تھا... آصف نے منظورے کے ساتھ مل کر ایک تاجر کو گولی مار کر ہلاک کر ڈالا تو باقی سب سیدھے ہو گئے تھے۔

نگری ٹاؤن والے علاقے میں آصف اپنے یارِ غار منظورے کے ساتھ مستقل سکونت پذیر تھا۔ وہ اس وقت اپنے ٹھکانے میں منظورے کے ساتھ موجود تھا۔ بازارِ حسن سے بک کی ہوئی دو حسین طوائفوں کے ساتھ انہوں نے رات گزاری تھی۔ ان میں ایک طوائف شہزادی نے آصف کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ اس ”پسندیدگی“ میں کسی جمالیاتی حس کا تعلق نہ تھا۔ ہوس و عیاشی کی ہر حد سے گزرنے کا جو حیوانی جنون تھا، وہ عیش پسند آصف کو بہت بھایا تھا۔ صبح ہونے تک اس کا سحر... آصف کے دل و دماغ میں چھایا رہا اور اس نے شہزادی سے اس کا سیل نمبر حاصل کر لیا تھا۔ تاہم اس نے منظورے سے یہ بات پوشیدہ رکھی تھی کہ اسے شہزادی پسند آ گئی ہے۔ یہ بات آصف کی شان کے خلاف تھی کہ وہ ایک طوائف پر فریفتہ ہو گیا تھا۔

رازداری میں مزہ بھی ہوتا ہے، فتنہ بھی... فتنہ ساز نے سازِ فتنہ چھیڑ دیا تھا۔ اب تماشا ہونا باقی تھا۔ کوئی ایسا تھا جو جانتا تھا کہ آصف جیسے سنگ دل اور بے رحم درندے کی ناک میں کیسے نکیل ڈالی جا سکتی ہے۔ کوئی ایسی چیونٹی تھی جو ناک کے راستے ہاتھی کے دماغ تک پہنچ چکی تھی اور اسے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ شہزادی ہی تھی۔ دوسرے دن ہی بے قرار ہو کر آصف نے شہزادی سے سیل فون پر رابطہ کر لیا۔

”آ جاؤ جانِ من! دل بہت بے قرار ہو رہا ہے تمہارے لیے۔ ایک ہی رات میں تم نے میرا سکون لوٹ لیا ہے۔“ گھسے پٹے اور تیسرے درجے کے فلمی مکالمے بولنے کے بعد وہ چپ ہوا تو شہزادی بولی۔

”سچی بات کہوں گی آپ سے۔ گاہک تو بہت آئے اور چلے گئے۔ ہر ایک سے یہ شہزادی بھی ایک پروفیشنل سی

رہی مگر آپ کی خلوت کا تو مزہ ہی اور تھا۔ یہی سبب تھا کہ آپ کے ساتھ میں ہر حد سے گزر گئی۔“ شہزادی کی ان باتوں نے ہوس کی آگ اور بھڑکا دی۔

”تو پھر آ جاؤ ابھی۔“ آصف نے بے چین ہو کے کہا۔

”آ جاؤں گی مگر سچ پوچھو تو مجھے تمہاری رہائش پسند نہیں آئی۔ وہ گھر نہیں ہے ایک اڈا ہے جہاں اور بھی تمہارے ساتھی ہوتے ہیں۔ بے شک وہ تمہارے تابع سہی مگر... وہاں تنہائی کا وہ مزہ نہیں آتا۔“

”کسی بڑے ہوٹل میں کمرا بک کروا دوں؟“ آصف بولا۔

شہزادی نے فوراً انکار کر دیا۔

”جب اس کنیز کا اپنا ذاتی غریب خانہ موجود ہے تو پھر بازار میں جانے کا کیا فائدہ؟ ہوٹل کا کمرا تو مجھے ایسا ہی لگے گا جیسے بھرا چوراہا۔ گھر کی اور بات ہے۔“

وہ چند ثانیے اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی اور آصف کو مست خرام کرتی رہی غرضیکہ وہ اس کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ گھر معمولی اور آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ آصف اپنی بائیک پر یہاں پہنچا تھا۔ اس بار وہ اکیلا تھا۔ منظورے کو اس نے ساتھ نہیں لیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا حالانکہ ظاہر شاہ اور منظورے نے آصف کو نہ صرف پولیس سے بلکہ دیدہ و نادیدہ دشمنوں سے بھی محتاط رہنے کی تلقین کر رکھی تھی اور آصف اس پر عمل بھی کرتا تھا لیکن شہزادی کے سلسلے میں جانے کیوں اس نے ان کی نصیحت بھلا دی تھی۔

بلا کا چالاک اور مکار بے رحم انسان ہونے کے باوجود... آصف ایک عورت کے ہاتھوں مار کھانے والا تھا... اور تاریخ بھری پڑی ہے کہ ایسا ہی انسان عورت کے ہاتھوں مات کھاتا ہے جو خود کو سیانا کوا سمجھتا ہے۔ آصف کے دل میں بھی ایک لمحے کو یہ خدشہ ابھرا تھا کہ وہ کہیں کسی کے بچھائے ہوئے جال میں تو نہیں پھنسنے جا رہا لیکن پھر شہزادی کا خیال آتے ہی اس نے اپنے اس خدشے کو وہم پر محمول کیا۔ یہ سوچ کر کہ شہزادی تو ایک جانی پہچانی عورت ہے۔ وہ پتلی بائی کے مشہور کوٹھے سے تعلق رکھتی ہے... کوئی انجانی نہیں ہے۔ پھر بھلا ایک طوائف کی اس سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟

تاہم پھر بھی اس نے اپنی حفاظت کے لیے بھرا ہوا پستول رکھا ہوا تھا۔ بائیک سے اتر کر اس نے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے شہزادی... بالکل شہزادیوں جیسا زرق برق لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس کے مرمریں ہاتھ میں جام تھا۔ آصف کو دیکھتے ہی اس نے ایک گھونٹ لیا۔ آصف بھی اس کی سج دھج دیکھ کر مسحور ہو گیا۔

شہزادی نے دروازہ بند کر دیا۔ ایک مختصر صحن سے وہ اندر ایک کمرے میں آ گئے۔ کمرے کی سجاوٹ نے آصف پر نشہ طاری کر دیا۔

”شوقین“ کے ساتھ مدمقابل بھی ”شوقین“ ہو تو نشہ دوچند ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس شوقین کے آگے خود کو شوقین ظاہر کر رہی تھی۔ کمرا آراستہ تھا۔ ایک تپائی پر شراب کی بوتل اور ایک خالی کپ رکھا تھا۔ دیواروں پر جابجا جذبات

ابھارنے والی برانگیختہ تصاویر چسپاں تھیں۔

آصف نے جس سج دھج کی توقع کر رکھی تھی، کمرا اس کے مطابق تو نہ تھا مگر دیواروں پر آویزاں تصاویر نے اس کے جذبات... کو ہوا ضرور دی تھی۔ وہ بے اختیار شہزادی سے لپٹ گیا۔

''آؤ... لطف و سرور کی آگ میں کندن بننے سے پہلے الاؤ گرم کرلیں۔'' شہزادی نے مخمور اور معنی خیز لہجے میں اس سے کہا۔ پھر وہ خالی گلاس میں شراب انڈیلنے لگی۔ گلاس کی تہ میں پاؤڈر کی صورت میں پہلے سے چھڑکا گیا سفوف بے خود ہوتا آصف نہ دیکھ پایا تھا۔ وہ جام، شہزادی نے بڑی ادا کے ساتھ... آصف کو تھما دیا۔ اس نے ایک گھونٹ بھرا... اور شہزادی اسے نظاروں کی دعوت دیتی رہی... اس نے دوسرا گھونٹ بھرا... شہزادی... جیسے اس کے لیے کھلی کتاب کی طرح عیاں ہوگئی۔ آصف کے دل کی دھڑکنیں تھمنے لگیں۔ وہ تب تک شہزادی کے جلوۂ حسن کو دیکھنے کی تمنا میں... بے چینی سے... کئی گھونٹ بھر گیا۔ تب ہی اچانک اس کی چھٹی حس پھڑکی... اس نے بھی بھانت بھانت کی شرابیں پی رکھی تھیں۔ شراب کی یہ قسم بھی اسے معلوم تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب یونہی اس کی نگاہ شراب کے محلول پر پڑی تو وہاں تہ میں اوپر کچھ ذرات تیرتے نظر آگئے۔ ساتھ ہی اس پر غنودگی نے بھی اپنا اثر دکھانا شروع کردیا۔

خطرے کی گھنٹی نے گویا اس کا نشہ ہرن کردیا۔ وہ غراہٹ آمیز آواز نکال کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور خونخوار بھیڑیے کی طرح شہزادی پر جھپٹا۔ آصف کے چہرے کے تاثرات نے شہزادی کو بھی باور کرا دیا کہ آصف اب اس کا دیوانہ بن کر نہیں... بلکہ موت بن کر جھپٹا ہے۔

''کتیا! تو نے مجھے دھوکا دیا...'' غراتے ہوئے آصف نے اپنے نیفے میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ یقینی موت کی دہشت سے شہزادی چیخ پڑی۔

اسی لمحے آصف نے اپنے پستول کی نال شہزادی کی کھوپڑی سے لگا کر لبلبی پر انگلی رکھی ہی تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی اور ذہن گم صم ہوتا گیا۔ تب ہی اچانک اسے کسی نے زور سے دھکا دیا۔ وہ چارپائی پر جا پڑا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔ دوسرے کمرے سے وہ آدمی اگر عین وقت پر نہ نکلتا تو شہزادی زندہ نہ بچتی۔ وہ سخت دہشت زدہ ہو رہی تھی۔ آدمی نے اسے تسلی دی۔ پھر اپنے پاس سے رسی نکال کر بے ہوش آصف کو رسن بستہ کردیا۔ تب تک شہزادی اپنا لباس درست کرچکی تھی اور وہاں سے جانے کے لیے بے چین تھی۔

آدمی نے ایک پھولا ہوا لفافہ شہزادی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''پورے ایک لاکھ ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شہزادی نے رقم کا لفافہ سنبھالتے ہوئے کہا اور بولی۔

''میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اتنا بڑا رسک لیا تھا۔ اب اسے زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ ورنہ یہ میرا حشر برا کردے گا۔''

''بے فکر رہو۔'' آدمی نے کہا۔ ''یہ اب نہیں بچ سکتا... کل صبح اس کی بوری بند لاش کی خبر تم بھی سن لوگی، جو خطرہ تمہیں اس کے زندہ بچ جانے پر ہے، وہ ہمارے لیے بھی ہے۔ اس لیے بے فکر ہوکر جاؤ اور بھول کر بھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔'' شہزادی چلی گئی۔

یہ مکان اس آدمی کا تھا پھر اس نے دوسرے کمرے کی طرف منہ کر کے پکارا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ چھپا بیٹھا تھا۔

''نفیسہ بہن! باہر آجاؤ... کام ہوگیا ہے۔''

دروازہ کھلا اور ایک جوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی ناک مصنوعی ہے۔ وہ پلاسٹک کی خاص مصنوعی ناک تھی۔ تاہم وہ بولنے سے قاصر تھی۔ یہ وہی بدنصیب نفیسہ تھی جو آصف کی بربریت کا نشانہ بنی تھی۔ آصف نے اس کے شوہر گھبیل دادا کو اس کی آنکھوں کے سامنے بیدردی سے قتل کیا تھا اور بعد میں چاقو سے نفیسہ کی ناک اور زبان کاٹ ڈالی تھی کیونکہ نفیسہ نے اس کی داشتہ بن کے رہنا گوارا نہیں کیا تھا اور گھبیل دادا سے شادی کرلی تھی۔

وہ آدمی... جو اس کے ساتھ کھڑا تھا، دلاور خان تھا۔ گھبیل دادا کا نائب... آصف کو پھانسنے کی ساری پلاننگ اسی کی تھی۔ وہ آصف سے گھبیل دادا کے خون کا انتقام لینا چاہتا تھا اور اپنی منہ بولی بہن نفیسہ کے ساتھ انسانیت سوز تشدد کا بھی۔

دلاور خان، آصف کی اہمیت سے واقف تھا۔ وہ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ ظاہر شاہ کی اصل طاقت آصف ہے۔ دلاور خان نے خود دو تین بار آصف سے بھڑنے اور اسے ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر اپنی جان، آصف کے ہاتھوں گنواتے گنواتے بال بال بچا تھا۔ اس کے بعد دلاور خان میں آصف سے دوبارہ بھڑنے کی جرأت نہ ہوئی تھی لیکن

اپنے باس گھبیل دادا کا اس کی آنکھوں کے سامنے بیدردی سے قتل ہوتا اور نفیسہ پر اس کا انسانیت سوز تشدد دیکھ کر دلاور خان نے پختہ عزم کرلیا تھا کہ وہ آصف کو ختم کر کے رہے گا مگر یہ کام آسان نہ تھا۔ وہ ہر روز آصف کو پھانسنے کے لیے منصوبے کا پھندا بناتا اور توڑ دیتا تھا کیونکہ اس کی ناکامی کا دلاور خان کو پہلے ہی اندازہ ہوجاتا تھا۔

اس سلسلے میں نفیسہ نے اس کی مدد کی اور آج بغیر لاٹھی ٹوٹے سانپ ان کی پٹاری میں قید ہوچکا تھا۔ ایک طویل عرصہ... آصف کی قربت میں رہتے ہوئے نفیسہ نے اس کی کمزوری تاڑ لی تھی اور وہ تھی عورت... عورت، آصف کی کمزوری تھی۔ لہٰذا دلاور خان نے بازارِ حسن سے ایک ایسی حسین طوائف کی تلاش شروع کردی جو نہ صرف رازداری بھی رکھے اور یہ کام بھی کر ڈالے۔

شہزادی، اسے بہت تلاش بسیار کے بعد ملی تھی اور اسے دو لاکھ روپے کے عوض اس کام کے لیے رضامند کرلیا۔ ایک لاکھ اس نے ایڈوانس لیے تھے۔

آصف اپنے ساتھی منظورے کے ساتھ اکثر تتلی بائی کے کوٹھے پر جایا کرتا تھا جبکہ شہزادی کا تعلق کسی اور کوٹھے سے تھا۔

دلاور کے کام کی خاطر شہزادی نے تتلی بائی کے کوٹھے میں سکونت اختیار کرلی۔

''میں اسے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کروں گی۔'' نفیسہ نے ایک کاغذ پر یہ لکھ کر دلاور خان کو دیا۔

دلاور خان کو کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ اس نے ایک مقصد کی خاطر اس کی ویڈیو بھی بنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس نے ایک خالی کمرے میں آصف کو رسی کی مضبوط جکڑ بندوں میں کس کر کرسی پر بٹھا دیا۔ آصف کو ہوش آچکا تھا۔ دلاور خان اور نفیسہ کو پہچان کر اس نے دونوں کو خونخوار لہجے میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دیں مگر اب وہ گیدڑ بھبکیوں کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ دونوں نے مل کر پہلے تو آصف کو خوب ٹارچر کیا پھر نفیسہ نے سیاہ چادر نما لباس پہن لیا اور دلاور نے ویڈیو کیمرا تھام لیا۔

کمرے میں اسپاٹ لائٹ روشن کردی گئی۔ اب اس میں صرف کرسی پر رسن بستہ حالت میں... آصف بیٹھا نظر آرہا تھا۔ اس کے بعد پس منظر سے سیاہ پوش نمودار ہوا جو بلاشبہ... نفیسہ ہی تھی۔ اس نے آصف کے سر کو بالوں سے پکڑ کر پیچھے کیا۔ پھر کھٹاک کی آواز ابھری۔ اب سیاہ پوش (نفیسہ) کے دائیں ہاتھ میں چاقو نظر آرہا تھا۔ پھر اس کی دھار اس نے آصف کی گردن پر رکھ دی۔ پل کے پل سیاہ پوش نفیسہ کے چشم تصور میں اپنے شوہر گھبیل دادا کے آصف کے ہاتھوں قتل ہونے کا منظر ابھرا پھر دوسرا منظر... جس میں آصف کے ہاتھ میں چاقو تھا اور اس نے بڑی بیدردی سے اس کی ناک اور زبان کاٹ ڈالی تھی۔ یہ دونوں لرزہ خیز مناظر ابھرتے ہی سیاہ پوش کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور پھر اس نے آصف کی گردن پر رکھی چاقو کی دھار زوردار دباؤ کے ساتھ چلادی۔

آصف کی گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور پھر وہ زمین پر گر کر ذبح کیے جانور کی طرح تڑپنے لگا۔

دلاور خان ویڈیو بنا رہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر وجاہت نے آصف کو ٹریپ کرنے کے لیے ایک جال بنا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ آصف ہی ظاہر شاہ کے گلے کا پھندا بن سکتا ہے اور ظاہر شاہ، جہانداد کو لے کر ڈوب سکتا ہے۔ ظاہر شاہ کا کیس بہت پہلے ایک اور افسر کے حوالے تھا جسے بعد میں قتل کردیا گیا تھا پھر یہ کیس وجاہت حسین کے ذمے لگایا گیا تو اسے کچھ خاص کامیابی تو نہیں ہوئی مگر آصف والا معاملہ دوبارہ ابھرنے کے باعث ظاہر شاہ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے انسپکٹر وجاہت حسین کو ایک راستہ ضرور مل گیا جس پر چلتے ہوئے وہ ظاہر شاہ کی بیخ کنی کرسکتا تھا۔

اس دوران میں جب انسپکٹر وجاہت ظاہر شاہ اور آصف والے کیس پر کام کر رہا تھا تو اچانک افسرانِ بالا نے یہ کیس کسی اور کو سونپ دیا اور اسے دوسرا ''اہم'' کیس سونپ دیا گیا۔ اس پر وجاہت نے درخواست بھی کی تھی کہ وہ ظاہر شاہ اور آصف کے خلاف ایک مضبوط لائحہ عمل تیار کرچکا ہے مگر اس کی نہیں سنی گئی۔

پہلے تو وہ اس سازش کو نہ سمجھ پایا مگر پھر جب اسے دوسرا ''اہم'' کیس سونپا گیا تو اس کیس کی ''اہمیت'' کا اندازہ ہونے کے بعد اسے پتا چلا کہ ایسا محض اس کی توجہ ظاہر شاہ اور آصف والے کیس سے ہٹانا تھی کیونکہ جو نیا کیس اسے سونپا گیا تھا وہ شہر کے ایک بڑے بینک میں ڈکیتی کی واردات کے سلسلے میں مجرموں کی تلاش و تفتیش تھی۔

... وجاہت نے اپنی باقی چھٹیاں منسوخ کروالی تھیں۔ جتنے دن اس نے فارغ رہ کر پلاننگ بنائی تھی، وہ مکمل ہوچکی تھی۔

آج اس شخص نے اسے اپنے پاس بلوایا تھا جو ''تھرڈ پرسن'' کا رول ادا کر رہا تھا۔ یہ تھرڈ پرسن افسرانِ بالا سے

تعلق رکھتا تھا جس نے اسے ایک خطیر رشوت کی پیشکش کی۔ اس کا مقصد اسے اپنے حکم پر تابع رکھنے کا پابند کرنا تھا۔ وجاہت حسین راشی پولیس افسر نہ تھا مگر مجرموں کا بااثر ہونا اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ زہر کو زہر سے کاٹ کر ہی اپنا نیک مقصد حاصل کرسکتا ہے۔ ورنہ سچ کی آواز دبادی جاتی ہے۔ معاشرے کے ناسور کا اب یہی علاج تھا۔ یعنی کڑوی گولی۔

اب انسپکٹر وجاہت یہ کڑوی گولی نگلنے پر مجبور تھا۔ تاہم اس نے رشوت کے اس پیسے سے ایک پائی بھی خود پر خرچ نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ بعد میں وہ اسے خاموشی سے سرکاری مال خانے میں جمع کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس تھرڈ پرسن تک اس کی رسائی اتفاقاً ہی ہوئی تھی۔ اس نے خود رابطہ کر کے اس سے کہا تھا کہ وہ اگر جعلی پولیس مقابلہ دکھا کر آصف کو مردہ قرار دلوادے تو اسے دس لاکھ رشوت دی جائے گی۔ انسپکٹر وجاہت کو تب سے یہ پلاننگ سوجھی تھی کہ جب تک وہ دوست بن کر ان کی لنکا نہیں ڈھائے گا، اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔

باقی چھٹیاں کینسل کروانے کے بعد اس نے اپنی سیٹ سنبھال لی۔ اس کی جگہ جس انسپکٹر کو تعینات کیا گیا تھا، سوئے اتفاق وہ ایک حادثے میں زخمی ہوگیا تھا چنانچہ اب انسپکٹر وجاہت حسین... ان کا ''ٹاؤٹ'' تھا۔

☆☆☆

دوسال بعد!

لندن سے آنے والی پرواز کو کراچی ایئرپورٹ پر لینڈ کیے ہوئے نصف گھنٹا بیت چکا تھا۔ کسٹم اور امیگریشن سے فارغ ہو کر وہ گیٹ سے باہر نکلی۔

دوسال کا عرصہ لندن میں گزارنے کے بعد اس میں چند واضح تبدیلیاں نظر آتی تھیں۔ اس کے لمبے بال اب کندھوں تک تراشے ہوئے تھے۔ ہلکا رنگ کر کے وہ سیاہی مائل بھورے معلوم ہوتے تھے۔ جلد اور چہرے کی رنگت میں بھی اب گلابی رنگت کی آمیزش ہوچکی تھی۔ جسم تو اس کا ویسے بھی متناسب تھا۔ چال اور انداز میں پہلے سے زیادہ اعتماد اور وقار جھلکتا تھا۔ آنکھوں میں سیاہ نفیس فریم کا چشمہ تھا۔ اس کے پاس مختصر سامان تھا۔

باہر اس کے لیے گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ کار میں ڈرائیور اور ایک سوٹ پوش شخص موجود تھا۔ ڈرائیور نے فوراً اس کا سوٹ کیس کار کی ڈکی میں ڈالا۔ سوٹ پوش نے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا تو وہ اندر براجمان ہوگئی۔ وہ خود ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آبیٹھا۔

کار ایئرپورٹ سے روانہ ہوگئی۔

''مس نویرا! آپ کا سفر کیسا گزرا؟'' سوٹ پوش نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''کافی بہتر۔'' نویرا نے مختصراً جواب دیا پھر پوچھا۔ ''میٹنگ کل طے ہے... جمشید صاحب...؟''

''یہی آپ کو بتانے والا تھا۔'' جمشید نامی اس شخص نے کہا اور آگے بولا۔ ''برازیل سے آنے والی پارٹی کے ایک دن لیٹ ہونے کی وجہ سے کل کی میٹنگ منسوخ کردی گئی ہے تاہم پرسوں کنفرم ہے۔''

''اچھا۔''

''ویسے آپ کو واپس جانے کی جلدی تو نہیں ہوگی۔ آپ کی سات روزہ بکنگ کمپنی کی جانب سے ہالی ڈے ان میں کردی گئی ہے۔''

''اوکے۔'' نویرا نے مختصراً کہا۔

چھٹی کا دن تھا، اس لیے سڑک پر ٹریفک کم تھا۔ نصف گھنٹے میں نویرا کو ہالی ڈے ان تک ڈراپ کردیا گیا۔ جمشید نے ہوٹل ویٹر کے ساتھ روم نمبر 19 تک اس کی راہنمائی کی۔ پھر نویرا نے شکریہ کہہ کر جمشید کو رخصت کردیا۔ پھر خود اپنا مختصر سامان سیٹ کرنے کے بعد غسل وغیرہ سے فارغ ہوئی اور انٹرکام پر ویٹر کو اپنے لیے چائے لانے کا آرڈر دیا۔

☆☆☆

حاجرہ بیگم نے سلام پھیرا پھر دعا کے لیے اپنے دونوں ہاتھ بلند کردیے۔

''اے میرے معبود! تُو غیب کا حال جانتا ہے اور دلوں کے بھید بھی... میرے شوہر کو تُو نے شہادت کے رتبے پر فائز کیا اور مجھے ایک شہید کی بیوہ کہلانے کا اعزاز بخشا۔ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ میرا جوان بیٹا بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ تُو اس کی مدد فرما... وہ اپنی پریشانی مجھے نہیں بتاتا مگر ایک ماں ہونے کے ناتے میں بھلا کیسے اس کی فکر و پریشانی سے بے خبر رہ سکتی ہوں۔ وہ یقیناً ایک نیک مقصد کے لیے اور معاشرے کو ناسور سے پاک کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ تُو اس کی مدد فرما... اور اسے اپنے حفظ و امان میں رکھ، آمین۔''

دعا کرنے کے بعد انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور پھر جانماز لپیٹ کر تخت سے اتر آئیں۔ باورچی خانے میں آئیں تو تب تک چائے تیار ہوچکی تھی۔ چائے ایک کپ میں ڈال کر بیٹے کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ آہٹ پا کر اس نے فوراً ہاتھ میں پکڑی تصویر میز پر کتاب

کھسکا دی اور ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

''امی! آپ نے بلاوجہ زحمت کی، میں بنا لیتا چائے۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا! جب تیری دلہن آجائے گی نا... پھر ہم دونوں اس کے ہاتھ کی چائے پئیں گے۔''

حاجرہ بیگم نے مسکرا کر بیٹے سے کہا اور ممتا بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ چائے تھما کر وہ لوٹ گئیں۔

چائے میز پر رکھی تھی۔ اس نے دو تین گھونٹ لے کر دوبارہ کتاب کے نیچے دبی تصویر نکالی۔ پھر وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ ''نویرا! اچھا ہوا تم چلی گئیں۔ ورنہ میں اس ناکام چہرے کے ساتھ کس طرح تمہارا سامنا کرسکتا تھا؟ جس طرح تم اب تک اپنے دشمنوں کو نہیں بھولی ہوگی، اسی طرح میں نے بھی ان سفاک مجرموں کو فراموش نہیں کیا... اور نویرا! میں تمہیں بھی تو اب تک نہیں بھلا سکا ہوں... مجھے ماں کے دکھ کا بھی احساس ہے۔ وہ جلد سے جلد میرے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہیں۔ کاش! تم یہاں ہوتیں... تو...''

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ دفعتاً اس کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔

''ہیلو۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔

''ہیلو... انسپکٹر وجاہت حسین! کیسے ہو؟''

دوسری طرف سے ایک شناسا آواز پر وجاہت حسین کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

یہ تھرڈ پرسن کی آواز تھی... ایس پی چودھری مشتاق...

''جی جی... سر! حکم...؟'' انسپکٹر وجاہت اپنی آواز میں ابھرتی جوش کی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ایک ہدایت غور سے سنو اور فوری عمل کرو۔''

''جی سر! حکم کریں۔''

''عیسیٰ ناکا کے علاقے ریڈ زون میں ٹارگیٹڈ آپریشن کرنا ہے۔ نانا رحیم اور ظاہر شاہ پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ نانا رحیم کی پروا نہیں مگر ظاہر شاہ کو اس آپریشن میں زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ نام یاد رکھو... ظاہر شاہ۔''

انسپکٹر وجاہت اس نام پر تو چونکا تھا ہی مگر تھرڈ پرسن کے یہ الفاظ کہ ظاہر شاہ کو اس آپریشن کے دوران پولیس مقابلے میں ہلاک کرنا ہے، اس نے وجاہت کو سخت الجھن میں مبتلا کردیا۔

''سمجھ گئے؟''

''جی... جی سر... مگر...''

''ہاں بولو۔'' دوسری طرف سے گمبھیر لہجے میں کہا گیا۔

''سر! پوچھ سکتا ہوں کہ ظاہر شاہ کو...''

''کیا تم نے آج کی خبر نہیں پڑھی؟'' بات کاٹ کر پوچھا گیا۔

''نہیں سر۔''

''تو پھر پڑھ لو... اور جیسا کہا ہے ویسا کرو... زیادہ سوالات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔'' کہتے ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

انسپکٹر وجاہت حسین کی یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ آخر ظاہر شاہ کو زندہ گرفتار کرنے کے بجائے اسے ہلاک کرنے کا کیوں حکم دیا گیا تھا؟ اس میں آخر کیا بھید تھا؟

تب اچانک وہ چونکا۔ اس نے آج کا اخبار دیکھا تو اس کی وجہ اسے معلوم ہوگئی پھر ایک گھنٹا مزید ادھر اُدھر فون کرنے کے بعد اس کی آنکھوں میں تجدید عزم کی چمک ابھر آئی۔

خبر یہ تھی کہ بدنام دہشت گرد اور ٹارگٹ کلر... آصف کریکر کی بوری بند لاش ملی تھی اور ویڈیو بھی۔

گویا آصف کے بعد اس کے گرو گھنٹال کو ظاہر شاہ کے کمزور پڑنے کا اندازہ ہوچکا تھا۔ لہٰذا اب ظاہر شاہ خود اپنوں کے لیے بیکار ہی نہیں، خطرناک بھی ہوگیا تھا اس لیے وہ اسے مروانا چاہتا تھا جبکہ وجاہت تو خود عرصے سے اسی موقع کا منتظر تھا اور دانستہ ان کا ٹاؤٹ بن کر ان کی کسی کمزوری کے ظاہر ہونے کا منتظر تھا اور اب وہ کمزوری اس کے ہاتھ آچکی تھی۔

''ظاہر شاہ کو میں ہلاک نہیں کروں گا کیونکہ اس کی زندگی جہانداد خان کی موت ہوگی۔'' یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد وہ زیرلب بڑبڑایا۔ پھر فون پر آپریشن کی تیاری کے احکامات جاری کرنے لگا۔

☆☆☆

جس انٹرنیشنل انویسٹمنٹ امیگریشن کمپنی کی ایگزیکٹو پوسٹ پر وہ کام کر رہی تھی، اس کی نمائندگی اور ایک اہم میٹنگ کے سلسلے میں وہ لندن کے شہر لیڈز سے پاکستان آئی تھی۔ ہالی ڈے ان میں کمپنی کی جانب سے سات روزہ قیام کے دوسرے اور تیسرے دن میٹنگز بھگتانے کے بعد... اس کے دل کے کسی نہاں خانے میں انسپکٹر وجاہت کا خیال ابھرا تھا۔

مگر تیسرے روز کے اخبار کی خبر بجلی بن کر اس پر گری تھی۔

لندن شفٹ ہوجانے کے باوجود بھی نویرا پاکستان کی خبروں سے آگاہ رہتی تھی۔ مگر یہ اہم خبر پاکستان میں رونما

ہوئی تو وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

خبر یہ تھی کہ بدنام دہشت گرد اور ٹارگٹ کلر آصف کریکر مارا گیا تھا۔ نیز اس کے دو روز بعد پولیس نے انسپکٹر وجاہت حسین کی سرکردگی میں عیسیٰ نا کا والے علاقے پر ٹارگیٹڈ آپریشن کر کے آصف کریکر کے دیگر ساتھیوں کو بھی گرفتار کرلیا تھا' کچھ مارے گئے تھے۔ مرنے والوں میں منظورا تھا جبکہ ایک اہم گرفتاری ظاہر شاہ کی صورت میں عمل میں لائی گئی تھی۔

ظاہر شاہ کی گرفتاری کے سلسلے میں ایک سینئر صحافی اور سیاسی تجزیہ کار نے متوقع انکشافات کیے تھے کہ ظاہر شاہ کی گرفتاری سے ایک بڑی سیاسی پارٹی زبردست دھچکے کا شکار ہونے والی تھی۔

نویرا کے اندر کا ایک خوابیدہ جوش ایکا ایکی ہی انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا۔ دو سال پرانے ماضی کے کئی ابواب یکا یک وا ہونے لگے۔ لندن جانے کے بعد خود کو ایک روکھی پھیکی اور مشینی زندگی میں مصلحتاً مصروف کر چکی تھی۔ اب امید کے افق پر وہ قوس قزح کے بکھرتے رنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

ذرا دیر بعد وہ انسپکٹر وجاہت حسین کا نمبر پنچ کر رہی تھی۔

☆☆☆

انسپکٹر وجاہت کے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ اسکرین پر تھرڈ پرسن کے نمبر دیکھتے ہی وجاہت حسین کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری جس کی تہ میں فاتحانہ تاثر بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔

''اس دھوکے بازی کا بھیانک انجام جانتے ہو... انسپکٹر وجاہت!'' دوسری طرف سے تھرڈ پرسن کی گمبھیر مگر تہدیدی آواز ابھری۔

''خوب اچھی طرح جانتا ہوں مگر اپنا نہیں ان زہریلی جونکوں کا بھیانک انجام جو عوام اور ملک و قوم کا خدمت کے نام پر خون چوس رہی ہیں۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

☆☆☆

وہی سوٹ پوش ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔

''شان پیلس'' کے ایک کشادہ و آراستہ کمرے کے گداز صوفوں پر وہ دونوں براجمان تھے۔

اس کے سامنے جہانداد خان بیٹھا تھا مگر اس کی حالت ایسی تھی جیسے ''شان پیلس'' کی عظیم الشان کوٹھی اس کے سر پر آن گری ہو... اس کا چربیلا چہرہ متوقع خطرات کی تشویش سے بُری طرح ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''کتنی بار تمہیں سمجھایا تھا کہ اپنے خطرناک آدمیوں کو قابو کرنا سیکھو۔ یہ کبھی کبھی اپنے گلے کا بھی پھندا بن جاتے ہیں۔'' سوٹ پوش نے اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس پر جواباً جہانداد بولا۔ ''میں انہیں لگام دینا جانتا ہوں جناب مگر ایک آدمی کی غداری...''

''اب فضول قسم کی باتیں چھوڑو۔'' کہتے ہوئے سوٹ پوش نے اپنے پہلو میں رکھا ہوا بریف کیس کھولا اور ایک لفافہ اس کی گود میں اچھالتے ہوئے کہا۔

''اس میں تمہارا پاسپورٹ اور ٹکٹ ہے۔ جتنی جلد ہو سکے علاج کے بہانے یہ ملک عارضی طور پر چھوڑ کر چلے جاؤ۔''

''مگر... الیکشن...''

''اپنی جان کی فکر کرو۔ تم پہلے ہی ایجنسی والوں کی نظروں میں آ چکے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں، ظاہر شاہ کو کہاں غائب کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے اور تم ہمارے لیے خطرے کا باعث بن سکتے ہو۔''

''مگر میں اب آزاد ہوں... کسی پارٹی سے میرا تعلق...'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سوٹ پوش نے جس کا ایک ہاتھ ہنوز اپنے کھلے ہوئے بریف کیس کے اندر تھا، باہر آ گیا۔

اب اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول دبا ہوا تھا جس کی نال کا رخ جہانداد کی طرف تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ گولی چلی اور جہانداد کی پیشانی پر سرخ روشن دان نمودار ہوگیا۔

☆☆☆

انسپکٹر وجاہت حسین کو نویرا کا فون موصول ہوا۔

''تم نے ایک دن کہا تھا نا وجاہت... کہ اندھیری راتوں کے بعد سویرا ضرور ہوتا ہے۔ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ وہ سویرا ہو چکا ہے؟''

نویرا کی آواز سن کر وجاہت کو پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا پھر اس کی بات کا مطلب سمجھ کر اس کے اندر تک مسرتیں اتر گئیں۔ وہ جواباً بولا۔

''ہاں... نویرا... ایک سویرا تو ہو چکا مگر میں ایک اور سویرے کا منتظر ہوں... پلیز! میں نے تمہارا بہت انتظار کیا ہے۔''

''ہاں، وجاہت! یہ سویرا ابھی تمہارا منتظر ہے۔''

نویرا نے یہ کہتے ہوئے اسے ہوٹل کا پتا بتا دیا۔

رنگباز

امجد رئیس

ہر کام کے آغاز میں مشکل درپیش ہوتی ہے... مگر انہیں اپنے کام کو ترتیب دینے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا... منصوبے کے مطابق تمام تر صورتِ حال قابو میں تھی... مگر اچانک ہی ایک رنگ باز نے اپنے رنگوں سے ہر طرف سیاہی بکھیر دی...

شہزاد فردی کی سربراہی میں انجام پانے والا اسرا غری کا شاندار کارنامہ

انسپکٹر شہزاد تک ڈاکے کی خبر ایک پولیس موبائل کے ریڈیو کے ذریعے پہنچی تھی... حسن اسکوائر سے اسٹیڈیم کی جانب روانہ ہوں تو اس کے بالمقابل باؤنڈری کے اندر ایک وسیع کھیل کا میدان ہے جہاں اکثر مختلف نجی اسکول تقریبات منعقد کرتے رہتے ہیں۔

اس مرتبہ شورش زدہ شہر میں، عوامی تفریح کے لیے مقامی انتظامیہ نے ایک رنگا رنگ فیسٹیول کا اہتمام کیا تھا جس کی تشہیر اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے جاری تھی۔

فیسٹیول اتوار کو شروع ہوا تھا۔ اسے اتوار تک ہی جاری رہنا تھا۔ اب تک منعقد کی گئی اس قسم کی تقریبات میں یہ سب سے بڑا فیسٹیول تھا۔ آٹھ دن کا دورانیہ، کراچی کی بدامنی میں جہاں ایک خوشگوار تبدیلی کے طور پر محسوس کیا جارہا تھا، وہیں آٹھ دن کے دورانیے کو بعض حلقے ایک رسک بھی قرار دے رہے تھے۔

تاہم عوام فیسٹیول پر ٹوٹ پڑے تھے۔ عوام کو ذہنی دباؤ سے نجات دلوانے کے لیے سستی اور بھرپور تفریح کی ضرورت تھی۔ عوام کے ازدحام کی دو وجوہ اور بھی تھیں۔ ایک تو انتظامیہ نے تشہیر نہایت خوب صورت اور بھرپور کی تھی، دوسرے سیکیورٹی کا فول پروف بندوبست کیا گیا تھا۔ رینجرز اور پولیس کے علاوہ فائر بریگیڈ، بم ڈسپوزل اسکواڈ، کیمرے اور دیگر جدید ٹیکنالوجی کے لوازمات سے استفادہ کیا گیا تھا۔ ایک درجن کے قریب ایمبولینس ہمہ وقت موجود رہتی تھیں... سادہ لباس والے اہلکار کی خاصی تعداد جن میں خواتین اہلکار بھی شامل تھیں، ہجوم میں گھل مل گئے تھے۔ سادہ لباس والوں کی موجودگی کا علم صرف متعلقہ حکام کو تھا۔ ہر قسم کی شکایت کے لیے الگ کاؤنٹر بنایا گیا تھا۔

تین دن سے تقریب مثالی انداز میں جاری تھی۔ چینلز اور اخبارات کوریج دے رہے تھے۔ خلافِ توقع شہر کے دیگر علاقوں میں بھی وارداتیں کم ہوگئی تھیں۔ یہ ایک تحیر خیز امر تھا جبکہ دوسری جانب ماہرین اس سکوت اور امن کو طوفان سے پہلے کی خاموشی خیال کر رہے تھے۔

انسپکٹر شہزاد کو اطلاع بدھ کے روز ملی۔ خبر اتنی سرعت سے اس تک اور دیگر متعلقین تک پہنچی کہ شہزاد انتظامات کی مستعدی کا قائل ہوگیا۔ واردات ابھی ہوئی نہیں تھی بلکہ ہونے جارہی تھی کہ خبر پہنچ گئی۔

جس طوفان کے خدشات ظاہر کیے جارہے تھے، اس کے مقابلے میں یہ خبر ہاتھی کے مصداق چوہے جیسی تھی۔

اسٹیڈیم میں رینجرز اور پولیس کے چنیدہ افراد کی ایک ٹیم پوری طرح کسی بھی حادثے کی صورت میں اضافی امداد مہیا کرنے کے لیے موجود تھی۔ اس ٹیم میں شہزاد کو ڈی ایس پی نے خصوصی طور پر شامل کیا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ میں شہزاد کی شہرت تیزی سے پھیلی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی دوسری خبر آئی کہ ڈاکو مارا گیا۔

☆☆☆

وہاں میلے کا سماں تھا۔ فیسٹیول کے پانچ سیکشن بنائے گئے تھے۔ چاروں سیکشن کے مرکز میں موسیقی کا ہلا گلا تھا۔ ایک طرف بچوں کی دلچسپی کے اسٹال، تماشے اور کرتب تھے۔ مجموعی طور پر ہر قسم کی تفریح کا خیال رکھا گیا تھا۔

اس ازدحام اور ہڑبونگ کا فائدہ یہ ہوا کہ واردات کا علم بہت کم تماشائیوں کو ہوا، فائر ایک ہی ہوا تھا جس کا اور اک شور شرابے میں ہو نہیں سکا۔ اندر موجود اہلکاروں نے چابک دستی سے صورتِ حال کو سنبھالا اور ایک محدود حصے کو لوگوں سے خالی کرالیا۔ گولی کا دھما کا تو پہچانا ہی نہ جاسکا... انہی لوگوں کو پتا چلا جو ہتھیار بدست دکاندار کو یا فرار ہوتے ہوئے ڈاکو کو دیکھ سکے۔ اس وقت بھی وہاں مجموعی طور پر لاکھ کے قریب لوگ موجود تھے۔ نوّے فیصد سے زائد کو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

ایک لاش گر چکی تھی لیکن وہ بھی مجرم کی تھی۔ فیسٹیول کی وسعت اور ہنگامہ آرائی سے کوئی خاص خلل واقع نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ انتظامیہ اور سیکیورٹی اہلکار مزید الرٹ ہوگئے اور کچھ نئی ہدایات جاری کردی گئیں۔

واردات کی نوعیت اتنی معمولی اور عیاں تھی کہ ڈی آئی جی کی رائے کے مطابق قرعۂ فال بہ آسانی شہزاد کے نام کا نکلا۔

☆☆☆

شہزاد فردی جائے واردات پر عام لباس میں پہنچا تھا۔ وہاں اتنا سناٹا نہیں تھا۔ سادہ لباس اہلکاروں نے ہوشیاری کی کہ رضا کاروں کے ذریعے وہاں صورتِ حال کو معمول کے مطابق رکھنے کی کوشش کی تھی۔ رضا کار مختلف کاسٹیوم پہن کر مضحکہ خیز حرکتوں میں مشغول تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ لاش کو آڑ میسر رہے اور تقریب معمول کے مطابق محسوس ہو۔

ایک سادہ پوش نے شہزاد کو روک لیا۔ شہزاد نے کارڈ دکھا کر کچھ باتیں معلوم کیں اور اس مقام کی جانب چل دیا جہاں لاش پڑی تھی۔

حسبِ معمول اس کی آنکھوں میں انوکھی لیکن فطری اداسی کا عکس نمایاں تھا۔ سادہ لباس میں ملبوس اہلکار بھی دھوکا کھا گیا تھا کہ شاید غم ناک آنکھوں والا مرنے والے کا کوئی شناسا ہے۔ کارڈ دیکھنے کے بعد اس کی حیرت دور ہوگئی۔

لاش ایک عام سے حلیے والے شخص کی تھی۔ عمر پچیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے ایک میلے سے رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ لاش کے قریب ایک گول مٹول سا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک پسٹل اب تک موجود تھا۔ شہزاد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ اس نے پہلا حکم جاری کیا اور موٹے شخص نے گن جیب میں رکھ لی۔ آدمی ذہین تھا۔ اس نے شہزاد کے تحکمانہ لہجے کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا۔

موٹا شخص کلفٹن میں ایک شاندار گفٹ شاپ کا مالک تھا۔ فیسٹیول میں اس نے گفٹ شاپ کا نسبتاً چھوٹا سیٹ اپ لگایا ہوا تھا۔ یہ اور دیگر معلومات شہزاد نے سادہ پوش اہلکار سے حاصل کی تھیں۔

شہزاد نے تیز نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہ پینٹنگ بناتے ہوئے ایک نوجوان پر جم گئی جو کچھ فاصلے پر کینوس اور دیگر لوازمات کے ساتھ موجود تھا اور دیکھنے میں کوئی کالج بوائے لگ رہا تھا۔ اس کے قریب ایک آدمی اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ کینوس پر بچے کی تصویر کارٹون کی شکل میں ابھر رہی تھی۔ بچے کی آنکھوں میں دلچسپی اور حیرت تھی۔

بچے نے نیلے رنگ کی شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی جبکہ کینوس پر جو کارٹون تشکیل پارہا تھا اس کا بالائی جامہ پیلے رنگ کا تھا۔ شہزاد کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئیں اور غائب ہوگئیں۔

اس نے بمشکل نصف منٹ مذکورہ منظر کا جائزہ لیا ہوگا۔ پھر وہ لاش کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میلی جیکٹ میں پشت کی جانب لہو رنگ سوراخ تھا۔ ظاہر ہے اسے بھاگتے ہوئے عقب سے گولی ماری گئی تھی۔

”یہ میری رقم لے کر بھاگ...“ موٹا شخص اچانک بولا۔

”آپ سے جب سوال کروں تو بات کیجیے گا۔“ شہزاد نے لاش کے گرد پھر کر نوٹ بک پر کچھ لکھا اور سادہ پوش اہلکار کو ہدایات دے کر ایک بار پھر بغور اطراف کا جائزہ لیا اور موٹے دکاندار کی جانب متوجہ ہوگیا۔

”وہ میری رقم لے کر بھاگ رہا تھا۔ جب میں نے...“

شہزاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پھر اس کی بات کاٹ دی۔ شہزاد نے عمداً اشتعال انگیز انداز اختیار کیا تھا۔ نتیجہ اس کے حسبِ توقع برآمد ہوا۔ موٹا شخص بھنا گیا۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا تاجر نہیں تھا۔ اس کی کلفٹن والی دکان میں بیش بہا نوادرات بھی موجود تھے۔

”آخر آپ ہیں کون؟“ اس نے سوال کر ہی ڈالا۔

”آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟“ شہزاد نے الٹا سوال کیا۔

”پولیس؟“

”ظاہر ہے۔“ شہزاد نے کہا۔

”میری رقم...“

”جہنم میں گئے آپ کے پیسے۔“ شہزاد نے خلافِ معمول پولیس والوں کا مخصوص انداز اختیار کیا۔ ”کتنے تھے... دس لاکھ؟ بیس لاکھ؟“ وہ غرایا۔ ”چند ہزار کے لیے آپ نے ایک قیمتی جان لے لی... اگر وہ چور ڈاکو تھا تو آپ ایک قتل کے مرتکب ہوچکے ہیں۔“

”آپ کا نام؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”عدنان شیروانی۔“

شہزاد کے ذہن میں بے اختیار خیال نے سر اٹھایا کہ اس آدمی پر ”شیروانی“ کیسی لگے گی؟

”میں نے سیلف ڈیفنس میں...“ موٹا ہکلایا۔

”خوب سیلف ڈیفنس۔“ شہزاد نے اس کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں طیش کے بجائے وہی بے نام اداسی تھی۔ ”کیا اس کے پاس ہتھیار تھا؟ کیا اس نے آپ پر حملہ کیا تھا؟“ یہ بات شہزاد نے معلومات کی بنیاد پر ہی کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوئی شخص کسی ہتھیار کے ساتھ وہاں داخل نہیں ہوسکتا۔

”نن... نہیں۔“

”اپنی گن دکھائیں۔“

موٹے شخص نے پسٹل جیب سے برآمد کیا۔ شہزاد نے احتیاط سے اسے رومال میں لپیٹ کر محفوظ کرلیا۔

”لائسنس ہے؟“

”جی ہاں۔“ وہ واپس جامے میں آگیا۔

شہزاد نے لائسنس دیکھنے کا مطالبہ نہیں کیا۔ بغیر لائسنس کا ہتھیار رکھا تو جاسکتا ہے لیکن اس ماحول میں اسے استعمال کرنے کی حماقت کوئی پاگل ہی کرسکتا ہے... شہزاد کو یقین تھا کہ وہ لائسنس کے بارے میں سچ بول رہا ہے۔ ویسے بھی شہر کے حالات کے تحت تاجروں کے بعد عام لوگوں میں بھی ہتھیار رکھنے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

شہزاد نے قلم اور نوٹ بک سادہ پوش اہلکار کو پکڑائی اور بیان لکھنے کا اشارہ کیا۔ اہلکار، شہزاد کی شخصیت اور انداز سے مرعوب معلوم ہو رہا تھا۔ اسے فردی (FERDI) کا لفظ بھی عجیب لگا تھا۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ فردی ایک ترکی لفظ ہے اور شہزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزرا تھا۔

”کتنی رقم تھی؟“ اس نے سوال کیا۔

”پچاس ہزار کے لگ بھگ۔“

”دکان پر کوئی ملازم؟“ شہزاد نے ایزل کے پاس بیٹھے مصور نوجوان کو دیکھا۔ وہ اب اکیلا مصروف تھا۔

”یہاں میں نے ایک ملازم ساتھ رکھا ہے۔“ موٹے شخص نے جواب دیا۔

”نام؟“

"ارشد۔"
"ارشد کا ریفرنس؟"
"کلفٹن والی دکان پر جو ملازم ہیں، وہیں سے ساتھ لایا ہوں... بہت پرانا ہے۔ بچہ تھا جب سے میرے پاس ہے۔"
"ہونہہ۔" شہزاد نے گھنگرالے بالوں کی ایک گول لٹ میں انگلی گھمانی شروع کی۔ وہ پھر نوجوان مصور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس اب تین عدد ماڈرن لڑکیاں خوش فعلیوں میں مصروف تھیں۔ شہزاد نے نگاہ ہٹالی۔
"شیروانی صاحب! کچھ دیر قبل آپ نے اعتراف کیا تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔" شہزاد نے لاش کی جانب اشارہ کیا۔
"جی ہاں۔"
"تو وہ کس دباؤ پر آپ سے رقم لے کر بھاگا؟" شہزاد نے عدنان شیروانی کی آنکھوں میں جھانکا۔
"میری اہلیہ کی اچانک طبیعت خراب ہوئی تو اس نے مجھے موبائل پر اطلاع دی۔ چنانچہ میں نے دکان بند کر کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ جانے سے قبل میں رقم نکال کر گن رہا تھا... جب یہ منحوس پتا نہیں کہاں سے ٹپکا اور جھپٹا مار کر بھاگ نکلا۔ رقم میں نے چھوٹے ہینڈ بیگ میں رکھی ہی تھی کہ اُچکا نازل ہوگیا۔ میں بیگ بند بھی نہ کرسکا۔"
"آپ اور آپ کے ملازم نے نہتے ملزم کی مزاحمت نہیں کی؟"
"موقع ہی نہیں ملا... تاہم میں گن نکال کر اس کے پیچھے بھاگا... اور اسے رکنے کے لیے للکارا تھا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی... اور مجھے گولی چلانی پڑی۔"
"آپ کا نشانہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔" شہزاد نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔
"میں اندرونِ سندھ شکار کے لیے کبھی کبھی نکل جاتا ہوں۔ میرے چند دوست بھی شکار کے شوقین ہیں۔ ہمارے پاس بندوقیں بھی ہیں۔" شیروانی نے سینہ پھلانے کی کوشش کی۔
"ہونہہ۔" شہزاد طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "ڈیئر عدنان صاحب! تو آپ نے اس کی ٹانگ پر گولی کیوں نہیں ماری؟"
"کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟" عدنان نے سینہ پھلانے کی کوشش ترک کردی۔
"میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" شہزاد نے سکون سے جواب دیا۔ "میں یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ آپ کا نشانہ اچھا ہے۔ آپ شکار کے بھی شوقین ہیں تو آپ نے اس کی ٹانگ میں گولی کیوں نہیں ماری؟ ظاہر ہے کہ وہ آپ کا "شکار" نہیں تھا۔ آپ کا مقصد محض اسے روکنا تھا... اور یہ مقصد آپ اس کی ٹانگ بیکار کر کے حاصل کرسکتے تھے۔"
"میں تیز نہیں بھاگ سکتا اور وہ بہت پھرتیلا تھا۔ شکار کھیلتے وقت میں بھاگ نہیں رہا ہوتا ہوں... مجھے شک تھا کہ میرا نشانہ خطا ہوجائے گا۔"
"یعنی آپ کے دماغ میں اس کی ٹانگ کا خیال آیا تھا؟"
"بالکل۔"
"کیا آپ نہیں جانتے کہ فیسٹیول کے اندر اور باہر کتنے سخت انتظامات ہیں؟ وہ آپ کی رقم لے کر نکل نہیں سکتا تھا پھر بھی آپ نے اسے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ بھی صرف پچاس ہزار کے لیے؟"
"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ بیگم کی اچانک پریشانی کا سن کر شاید میں گھبرا گیا تھا۔"
"یعنی آپ اتنا گھبرا گئے تھے کہ آپ یہ نہیں دیکھ سکے کہ وہ جس طرف بھاگ رہا تھا، وہاں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یعنی وہ غلط سمت میں بھاگ رہا تھا۔" شہزاد نے انکشاف کیا۔
"میں یہ خیال نہیں کرسکا۔" عدنان شیروانی گڑبڑا گیا۔
"جبکہ آپ یہاں کئی روز سے موجود ہیں اور مجھے آئے ہوئے غالباً پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے۔"
شیروانی خاموش رہا۔
شہزاد نے کوٹ کی اندرونی جیب سے سگار باکس نکالا۔ اسے کھول کر اس نے سنہری رنگت سے ملتا جلتا طویل سگار منتخب کیا... ڈبا کھلا تو شیروانی نے دیکھا کہ بالائی ڈھکن کی اندرونی سمت ڈیوڈ آف لکھا تھا... عدنان شیروانی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ جس کاروبار سے برسوں سے منسلک تھا، اس نے بہ آسانی لگژری سگار کو پہچان لیا۔
شہزاد کے ہاتھ میں بیش قیمت ڈیوڈ آف رائل سالومنس کا ڈبا تھا۔
سفید پوش اہلکار نے سگار اور شیروانی کا زلزلہ زدہ چہرہ دیکھا تو کچھ سمجھ نہ سکا۔ شیروانی جانتا تھا کہ اس طویل سگار کی ایک انچ کی اسموکنگ سے لطف اندوز ہونے کا مطلب ہے کہ چھ ڈالرز کو دھوئیں میں تبدیل کردیا جائے۔ ایک عام پولیس والا "ڈیوڈ آف" کا ذوق رکھتا تھا... لیکن اس کا حصول اور قیمت... شیروانی بولے بغیر نہ رہ سکا۔
"یہ... یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟"

"کیا مطلب؟" شہزاد نے سگار دانتوں میں دباتے ہوئے تیز لہجے میں سوال کیا۔
"مم... میرا مطلب ہے یہ کیوبا..."
"نہیں، اب یہ کیوبا میں نہیں بنتا۔" شہزاد نرم پڑ گیا۔
"آپ کے پاس چند ڈبے اور ہوں تو وہ میں خرید لوں گا... اپنی کلفٹن کی دکان کے لیے۔" عدنان شیروانی نے التجا کی۔ وہ حیران تھا کہ آخر یہ بندہ ہے کون؟
شہزاد نے جواب نہیں دیا۔ وہ نوجوان مصور کو گھور رہا تھا۔ اسی وقت مصور کی نگاہ شہزاد کی آنکھوں سے ٹکرائی اور فوراً ہی اس نے نظر ہٹالی۔
"مسٹر عدنان! آپ کی رقم تو مل گئی ہوگی؟" شہزاد کی نظریں بدستور مصور کی جانب تھیں۔
"نہیں جناب۔" وہ بولا۔ "کافی تلاش بسیار کے بعد بھی رقم کا پتا نہیں چلا۔"
"وہ رقم کس حالت میں لے کر بھاگا تھا؟"
"میرے سیاہ ہینڈ بیگ میں... مختصر سائز کا دستی بیگ تو مل گیا لیکن رقم غائب ہے۔"
شہزاد نے سگار سلگاتے سلگاتے اچانک لائٹر بجھا دیا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کا رنگ گہرا ہوگیا۔ وہ جب بھی گہری سوچ میں جاتا تو اس کی آنکھوں کا انوکھا عکس گہرا ہوجاتا تھا۔
اس نے لاش کے رخ کو دیکھا پھر لاش اور مصور کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگایا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آئے۔
"آپ اس لڑکے کو جانتے ہیں؟"
"یہیں دیکھا ہے۔" عدنان شیروانی نے جواب دیا۔
"آپ کی جان پہچان ہے؟"
"پہلے دن میری فیملی نے اس سے اسکیچ بنوایا تھا۔ خوش مزاج ہے۔ اس کے بعد وہ کئی بار دکان پر آیا۔ ارشد نے اس سے اپنا کارٹون بنوایا تھا۔ دونوں میں گپ شپ رہنے لگی تھی۔ ویسے وہ ہے فنکار۔" شیروانی نے آخر میں اس کے فن کی تعریف کی۔
"اس کا فن تو میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔" شہزاد بڑبڑایا۔ اس کی آنکھوں کا اداس رنگ معمول پر آگیا تھا۔
"کیا آپ کو اندازہ ہے کہ وہ غلط سمت میں کیوں بھاگا تھا؟"
عدنان شیروانی نے مایوسی سے کندھے اچکائے۔
سادہ پوش اہلکار نوٹ بک پر اپنی کارروائی میں مشغول تھا۔
"میں گھر فون کرنا چاہتا ہوں۔" شیروانی نے بے چینی سے درخواست کی۔
"نہیں آپ گھر جائیں... بیگم کو دیکھیں۔ ضرورت کے وقت بلالیں گے۔ پتا اور فون نمبر لکھوادیں۔"
"میری گن؟"
"مل جائے گی۔"
"دکان؟"
"ملازم بند کر کے پیچھے آرہا ہے... چابیاں آپ کے پاس ہیں تو دے دیں۔"
"نہیں، اسی کے پاس ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔" شہزاد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر اسے رخصت ہونے کا اشارہ دیا۔ پھر وہ سادہ پوش سے مخاطب ہوا۔ "صاحب سے دستخط لے کر وقت اور تاریخ بھی لکھوالو... دو بندے دکان پر بھیجو، ایک وہیں رہے گا اور دوسرا ارشد کو یہاں لے آئے۔"
"ٹھیک ہے جناب۔"
"تیسرا بندہ، مصور کے پاس بھیجو۔ وہ جانے کی تیاری کر رہا ہے... تصویر بنوانے کے بہانے اسے روکو، نہ مانے تو "دوسرا" طریقہ استعمال کرو۔"
"اوکے سر۔"
"ایک منٹ۔" شہزاد نے سادہ پوش اہلکار کو روکا۔ "میری جانب سے ڈی آئی جی صاحب کو پیغام دو کہ یہ بظاہر عام سا کیس ہے ممکن ہے کہ توجہ ہٹانے کے لیے ہو۔ اس لیے باقی چاروں سیکشن میں سیکیورٹی ہائی الرٹ کردیں۔ سیکشن "سی" سے بے فکر ہوجائیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے "حل" کے ساتھ رپورٹ دے دوں گا۔ میڈیا کے لیے اپنی مرضی کی پریس ریلیز تیار کرلیں۔ سب ٹھیک ہے۔ میری رپورٹ پڑھنے کے بعد آپ لوگ میڈیا سے بہ آسانی نمٹ لیں گے۔" شہزاد نے بات ختم کردی۔
"جناب! کیس تو کلوز ہے؟" سادہ پوش نے سوالیہ انداز میں شہزاد کو دیکھا۔
"رقم کہاں ہے؟" شہزاد مسکرایا۔ سادہ پوش تفہیمی انداز میں سر ہلاتا ہوا دکان کی جانب چلا گیا۔

☆☆☆

ارشد سے شہزاد نے جو کچھ پوچھا، اس سے شیروانی

کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ دکان کے اندر جو کچھ ہوا، شہزاد کو صرف اس سے دلچسپی تھی۔ ورنہ بیرونی گواہیاں تو متعدد تھیں۔

شہزاد نے جلد ہی ارشد کو بھی جانے کی اجازت دے دی۔

اس وقت وہ دونوں دو کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سگار سلگ رہا تھا۔ اس کی مخصوص خوشبو بالکل ہی جدا تھی اور ٹھنڈی فضا میں خوشگوار مہک لہرا رہی تھی۔

مصور لڑکا بغیر حیل و حجت کے رک گیا تھا۔

''جناب! کچھ باتیں دریافت کرنی ہیں آپ کے بارے میں۔'' سادہ پوش اہلکار جو کافی دیر سے متجسس تھا، قدرے فراغت پا کر دل کی بات زبان پر لایا۔

''پہلے نام۔'' شہزاد نے سر اٹھا کر دھوئیں کا مرغولہ فضا میں بکھیرا۔

''سب انسپکٹر، مسعود عابدی۔''

شہزاد کو یہ بندہ اچھا لگا تھا۔ اس کے چہرے پر شرافت کا عکس تھا جو پولیس ڈپارٹمنٹ میں کم چہروں پر نظر آتا ہے۔

''ڈیئر مسعود! کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''آپ شہزاد فردی ہیں۔ شروع میں، میں نے کارڈ پر دیکھ لیا تھا... آپ سے ملنے کی تمنا تھی۔ آپ اس ملک کے نہیں دکھائی دیتے۔ آپ کا نام بھی عجیب سا ہے؟''

''تم ذہین آدمی لگتے ہو۔ میں ترکی میں رہا ہوں۔ ''فردی'' ترکی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''پرائیویٹ'' یا خصوصی۔''

''جب ہی آپ لیے دیے رہتے ہیں۔''

شہزاد ہنس پڑا۔ ''اتنا بھی نہیں۔''

''میرا اندازہ ہے کہ آپ کو ملازمت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''گڈ... عابدی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ میرا شوق ہے۔ خواب ہے یا جنون ہے، پتا نہیں۔''

''میں نے آپ کے کئی کیس پڑھے ہیں... آپ کا انداز مختلف اور نگاہ بہت گہری ہے۔''

''شکریہ... ہم ذاتی باتیں بعد میں کر سکتے ہیں۔ میں کسی وقت رابطہ کر لوں گا۔ فی الحال میں اس بے ضرر سی واردات کے بارے میں تمہاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔''

''بظاہر تو یہ سیدھا سادہ کیس ہے لیکن رقم کے غیاب نے اسے پراسرار بنا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خالی بیگ ہی چھین سکا تھا اور رقم شیروانی کے پاس ہی ہے۔ یہ ممکن ہے۔ آپ کو اس کی اور دکان کی تلاشی لینی چاہیے تھی... شاید۔'' عابدی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''شاید ارشد کی بھی...''

شہزاد مسکرایا۔ ''ڈیئر! ایسا ہوتا تو وہ ایک لاش نہ گراتا... زیادہ سے زیادہ ہوائی فائر کر دیتا۔''

عابدی نے اس منطق پر خجالت محسوس کی۔

''جناب! پھر رقم کہاں گئی؟''

''یہیں ہے۔''

''جی... ی... ی...'' مسعود عابدی کا منہ کھل گیا۔ ''ہم تو ہر کونہ چھان چکے ہیں۔''

''میں کھڑے کھڑے رقم تک پہنچ گیا تھا لیکن لاش کی پوزیشن میرے اندازے کی تصدیق نہیں کر رہی تھی۔ اندازے کی تصدیق، ارشد سے باتوں کے دوران ہوئی۔ تمہارے ذہن میں چند نہیں، بہت سارے سوالات ہیں بعد میں۔ میں سب کے جواب دوں گا۔ فی الحال ادھر چلو، فوٹو گرافر، فارنسک ٹیم اور ایمبولینس وغیرہ پہنچ گئے ہیں۔ کارروائی پوری ہوتے ہی لاش ہٹائی جائے گی۔ تاہم لاش کے ہٹنے سے پہلے تم تلاشی لے کر اپنی تسلی کر سکتے ہو کہ رقم اس غریب کے پاس بھی نہیں ملے گی۔ وہ خوامخواہ ہی مارا گیا۔ غالباً شیروانی کے پاس گن کی موجودگی کے امکان کو نظر انداز کرنا، اس حادثے کی وجہ بن گیا۔''

مسعود عابدی اس کے تیقن، سکون اور تشریح پر دنگ رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر رقم یہیں ہے تو پھر اسے لاش کے لباس میں ہونا چاہیے۔ کیا اس مرتبہ شہزاد غلطی کر رہا ہے؟ اس خیال نے نہ جانے کیوں اسے تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ ایمبولینس کی طرف چل پڑا۔ ساتھ ہی دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ رقم برآمد نہ ہو...

اور رقم اسے واقعی نہیں ملی، وہ اپنے ممدوح کے پاس واپس آ گیا۔

''کیا ہوا؟'' شہزاد اعتماد کے ساتھ مسکرایا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' عابدی بھی مسکرایا۔

''بندہ پولیس میں ہو یا کہیں اور...'' شہزاد نے عابدی سے کہا۔ ''سب سے اہم چیز مشاہدہ ہوتی ہے۔ حالانکہ اکثریت شک کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ دوسری چیز آپ کا زاویہ تفتیش گھسی پٹی لائن پر نہیں ہونا چاہیے، نہ اندازہ لگانے میں جلد بازی کرنی چاہیے۔ کسی ماہر ڈاکٹر یا وکیل کی طرح آپ کو مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔ یہ میدان

ہے، کچی زمین ہے۔ مختلف سیکشنز میں قالین اور دریاں، ضرورت کے مطابق لگائی گئی ہوں گی لیکن لاش کچی زمین پر ہی تھی۔ اس مقام پر ہی مجھے اپنی مرضی کے کئی نشانات مل گئے تھے۔ خیر بات لمبی ہو جائے گی۔ آؤ نوجوان مصور سے ملتے ہیں۔'' شہزاد فردی کھڑا ہو گیا۔

''نوجوان... کیا نام ہے تمہارا؟'' شہزاد نے ایزل پر سادہ کینوس کو دیکھا۔

''شکیل، جناب۔''

''تمہاری تعریف شیروانی صاحب کی زبانی سن چکا ہوں، سوچا ایک تصویر بنوا لوں۔''

''حاضر ہوں جناب۔'' نوجوان نے فدویانہ انداز اختیار کیا۔

''اچھا پہلے یہ بتاؤ کہ جو کچھ ہوا، وہ دوسروں کے ساتھ تم نے بھی دیکھا ہوگا؟''

''جی جناب۔''

''کیا دیکھا؟''

نوجوان نے بھی وہی کہانی دہرائی جو شہزاد، شیروانی، ارشد اور عابدی سے سن چکا تھا۔

''تم نے اس کے ہاتھ میں کچھ دیکھا تھا؟''

''ہاں، کالی سی چیز تھی جو گولی لگنے کے بعد اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔''

''دکان کے ملازم کے مطابق تم واردات کے وقت وہیں جا رہے تھے؟'' شہزاد نے سوال کیا۔

''ہاں، میں ارشد سے ملتا رہتا ہوں۔''

''اس طرف سے کوئی باہر جانے کا راستہ ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر وہ اس طرف کیوں بھاگا... کیا کہتے ہو؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ غالباً وہ جانتا تھا کہ ہر ایگزٹ پر گارڈ موجود ہیں۔'' نوجوان نے نامکمل جواب دیا۔

''تین دن میں کتنی تصویریں بنائی ہوں گی؟''

''یاد نہیں، غالباً پچاس سے اوپر ہی ہوں گی۔''

''اس جھاڑی کی بھی تصویر بنائی؟'' شہزاد نے شکیل کے قریب گھنی جھاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، موقع ہی نہیں ملا۔ نہ اس میں کوئی خاص بات ہے۔'' شکیل نے جواب دیا۔

''اس جھاڑی کی بھی تلاشی لی ہو گی تم نے؟'' شہزاد نے عابدی کو دیکھا۔

''کئی بار جناب... کوئی چیز نہیں چھوڑی۔''

''ایک چیز پھر بھی رہ گئی۔''

''کون سی جناب؟'' عابدی ششدر رہ گیا۔

''بتاتا ہوں۔'' شہزاد نے بات پھر ادھوری چھوڑ دی۔

''تم کیا کہتے ہو، وہ غلط سمت میں کیوں بھاگا؟'' شہزاد نے عابدی کو مخاطب کیا۔

''شکیل کی بات بھی صحیح ہے، کسی بھی ایگزٹ سے وہ نکل نہیں سکتا تھا جبکہ سادہ لباس والے بھی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ یہ بات عام لوگوں کو معلوم نہیں تھی۔ میرے خیال میں دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا... جسے رقم حوالے کر کے وہ خود دوسرے سیکشن کے ہجوم میں غائب ہو جاتا یا اس نے کوئی خفیہ جگہ پہلے سے ہی دریافت کر رکھی ہو کہ رقم وہاں عارضی طور پر چھپا دے گا۔''

''تمہاری آدھی بات تو ٹھیک لگتی ہے۔'' شہزاد جب یہ جواب دے رہا تھا تو تیز نظریں شکیل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ شکیل کے چہرے پر اسے مطلوبہ تاثر مل گیا۔ اگرچہ وہ لمحاتی تھا لیکن شہزاد کے لیے کافی تھا۔

''لیکن جناب! وہ تو کسی تک پہنچ ہی نہیں سکا۔'' عابدی نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک ہے اور اس کا ساتھی جانتا تھا کہ وہ نہیں پہنچ سکے گا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' عابدی کے چہرے پر بے بسی نظر آئی۔

شہزاد نے اسے نظر انداز کر کے شکیل کو مخاطب کیا۔ ''تم ہماری، کسی زاویے سے مدد کر سکتے ہو؟''

''جناب! میرے خیال میں یہ ایک جعلی کہانی ہے۔ ڈاکا پڑا ہی نہیں۔ سب شیروانی صاحب کا ڈراما ہے۔''

''ڈراما کرتے کرتے انہوں نے ایک آدمی مار ڈالا؟ اور ڈراما کیا کیوں؟'' شہزاد نے منہ بنایا۔

''آپ لوگ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔'' شکیل نے اپنی بھونڈی تھیوری کا دفاع نہیں کیا۔

''خیر چھوڑو۔ ہم نے تمہیں کام کے لیے روکا تھا۔ تم ذرا فٹافٹ میرا ایک کارٹون بنا دو۔ پھر تم جا سکتے ہو۔'' شہزاد نے اطمینان سے کہا۔ ساتھ ہی شکیل کے چہرے پر اطمینان کا سایہ بھی دیکھ لیا۔

شکیل نے پھرتی سے چند منٹ میں شہزاد فردی کا کارٹون بنا ڈالا۔

''میرا کوٹ تو نیلے رنگ کا ہے؟'' شہزاد نے

اعتراض کیا۔ ادھر عابدی پریشان تھا۔ اسے شہزاد کی کوئی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔

”میرے پاس نیلا رنگ ختم ہوگیا ہے۔“ شہزاد نے اس کے سامان کا جائزہ لیا۔ مختلف رنگ کے ڈبوں کو دیکھا اور گویا ہوا۔

”آج تم نے ایک بچے کا کارٹون بنایا تھا جس میں اس کی نیلی شرٹ تم نے پیلی دکھائی تھی؟“

”میں نے بتایا نا کہ میرے پاس...“

شہزاد نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی۔ شہزاد کے تاثرات بدل گئے تھے۔ ”آج ہی تمہارے پاس تین لڑکیاں آئی تھیں۔ ایک نے اپنی کٹی ہوئی زلفوں کو سنہری کیا ہوا تھا۔ دو نے پتلون بنیان اور کھلی جیکٹس پہنی ہوئی تھیں... سنہری بالوں والی نے اپنا کارٹون بنوایا تھا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں؟“

”صحیح ہے لیکن میں سمجھا نہیں۔“

”سمجھ جاؤ گے۔“ شہزاد نے کہا۔ ”سنہری بالوں والی کی بنیان نیلی تھی اور تم نے...“

”میں نے آپ کو بتایا کہ میرے پاس نیلا رنگ ختم ہو گیا ہے۔“ شکیل اب کچھ بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔ عابدی، شہزاد کی باریک بینی پر ستائش کر رہا تھا۔

”یعنی نیلے رنگ کا ڈبا خالی پڑا ہے؟“

”جی جناب۔“ شکیل نے کہا۔

”ڈبا خالی نہیں... اور ہاں، نیلا رنگ بھی نہیں ہے اس میں۔“ شہزاد نے سرسراتی آواز میں کہا۔ شکیل اور عابدی دونوں احمقوں کی طرح شہزاد کا منہ تک رہے تھے۔

”جناب...“ عابدی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

”جی جناب... ڈبا کھولیے اور رقم نکالیے۔“ شہزاد کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا جبکہ شکیل کے چہرے کا رنگ فق تھا اور عابدی کا چہرہ فرطِ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

اس نے نیلا ڈبا اٹھا لیا۔ ساتھ ہی دو وردی پوش بھی طلب کر لیے۔

”میں چلا، رپورٹ بنا کر دینی ہے۔“

”نہیں جناب! پلیز ایک سوال۔“ مسعود عابدی نے ڈبا کھول کر دیکھا اور شکیل کو پولیس کے حوالے کر کے شہزاد کی جانب گھوما۔

”جلدی کرو... میں جانتا ہوں کہ تم پوچھو گے کہ رقم ڈبے میں کیسے گئی؟“

”جی، بالکل یہی سوال ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ مارے جانے والے کے ساتھی کو پتا تھا کہ وہ اس تک نہیں پہنچ سکے گا یا رقم طے شدہ جگہ پر نہیں ڈال سکے گا... اسے شکیل کا خدشہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس بات کو شیروانی کے پسٹل نے سو فیصد کر دیا۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ سمجھنے کے باوجود مجھے ایک کڑی نہیں مل رہی تھی... کیونکہ شکیل کے ساتھی کی لاش، شکیل سے دور تھی۔ شکیل کو شک ہوگیا تھا اور وہ کھسکنے کے چکر میں تھا۔ رقم اس کے پاس تھی۔ تمہارے ذریعے میں نے اسے روک لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے نیلے کوٹ کا رنگ بدل دے گا۔ یہ محض اضافی احتیاط اور آخری آزمائش تھی۔ ورنہ مجھے کارٹون بنوانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں براہِ راست دورانِ گفتگو اس کی فیس ریڈنگ کرنا چاہتا تھا۔ ان کا جو بھی منصوبہ تھا، وہ دو وجہ سے فیل ہوا۔ ایک شیروانی کی گن سے... دوسرے سادہ لباس والوں کی موجودگی سے لاعلم ہونا۔ پھر بھی شکیل تو تقریباً کامیاب ہی نکلا جا رہا تھا۔“

”لیکن جناب میرا سوال...“

”اسی طرف آرہا ہوں... ارشد سے جو گفتگو ہوئی اس نے میری مشکل آسان کر دی کہ رقم شکیل تک کیسے پہنچی؟ اس بات چیت کو یاد کرو گے تو تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔“

عابدی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”شکیل کا دکان میں آنا جانا تھا اور ارشد کے بیان کے مطابق وہ جب رقم لے کر بھاگا تو اندر آتے ہوئے شکیل سے اس کا تصادم ہوا تھا۔“

وہ چپ ہوگیا...

”اب کیا سوچ رہے ہو؟“

”جناب! سوچ رہا ہوں کیا شکیل کو یہ فکر نہیں تھی کہ اس کا ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہوگا یا نہیں؟“ عابدی نے دھیرے سے کہا۔

”فکر پوری قوم کو صرف پیسے کی ہے... جہاں اسپتالوں میں قانونی قتلِ عام جاری ہے... ڈینگی کے مریض کو جعلی پلیٹ لیٹس کے بیگ لگائے جا رہے ہیں... بلڈ بیگ میں نارمل سلائن کی ملاوٹ کی جا رہی ہے... ان کے مقابلے میں تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔“

عابدی کی آنکھوں میں بھی اداسی اتر آئی۔

بند مکان

تنویر ریاض

قتل کرنا جتنا آسان ہے... اس کے شواہد کو چھپانا اتنا ہی مشکل ہے... مگر جذبات چاہے محبت کے ہوں یا نفرت کے... اُن کی شدت بعض اوقات وہ کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے... جو عام حالت میں انجام دینا کبھی ممکن نہیں ہوتا... نفرت کی چنگاریوں میں جُھلس کر دوسروں کو بھی خاکستر کر دینے والے جذبات کی سرکشی جو صرف اپنے ہدف کی تباہی چاہتے تھے...

الجھے ماحول... پُراسرار مکان... اور محبت کے مکین کی مثلث... جس کا کوئی زاویہ اپنے ٹھکانے پر نہ تھا...

صبح سے ہی تیز بارش ہو رہی تھی۔ ایریکو کو چھٹی کے بعد کلاس روم کی صفائی کا کام سونپا گیا تھا اس لیے وہ اپنی ایک کلاس فیلو کے ہمراہ طالب علموں کے بنائے ہوئے پوسٹرز اور تصویریں دیوار سے اتار رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ دروازے پر ایک دبلا پتلا، لمبا لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے عقبی دیوار پر لگے ہوئے ایک بڑے سے پوسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اسے بھی پھینک دو گی؟“

”ہاں۔“ ایریکو نے جواب دیا۔ وہ لڑکا عمر میں اس

سے دو سال چھوٹا لگ رہا تھا۔

''کیا میں یہ لے سکتا ہوں؟'' لڑکے نے پوچھا۔

ایریکو نے دیوار پر سے پوسٹر اتارا اور اسے رول کر کے اس پر ربر بینڈ چڑھا دیا اور لڑکے کو دیتے ہوئے بولی۔ ''تم اس کا کیا کرو گے؟''

لڑکا شرماتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کا ہیلمٹ بناؤں گا۔''

''ہیلمٹ؟'' وہ حیرانی سے بولی۔ جب وہ لڑکا چلا گیا تو ایریکو کی کلاس فیلو نے بتایا کہ یہ لڑکا مشہور مصور سوچیرا کا بیٹا ہے جو کہ میئر ایوارڈ کے لیے سلیکشن کمیٹی کا چیئرمین تھا۔ یہ ایوارڈ تصویروں کا مقابلہ جیتنے والے کو دیا جاتا تھا جس میں یوکوہاما کے پرائمری اور مڈل اسکولوں کے طالب علم حصہ لیتے تھے۔ ایریکو کا دوست کیوشی مترانی بھی ایک مرتبہ اس مقابلے کے لیے نامزد ہو چکا تھا۔

ایریکو اس لڑکے کے بارے میں جان کر حیران رہ گئی کیونکہ اس سال میئر ایوارڈ کا انعقاد اس لڑکے کے باپ اور مشہور مصور سوچیرا کے ساتھ پیش آنے والے المناک حادثے کی وجہ سے منسوخ کر دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں تو ایوارڈ کمیٹی نے منسوخی کی وجہ بتانے سے انکار کیا لیکن جلد ہی یہ بات ظاہر ہو گئی کہ سوچیرا کو اس کی محبوبہ کیوکو اماگی کے ہمراہ اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ اپنے گھر میں مقابلے میں بھیجی گئی تصویریں چیک کر رہا تھا لیکن ایوارڈ کے منسوخ ہونے کی صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی کیونکہ سوچیرا کی جگہ کسی دوسرے جج کا تقرر بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس کی ایک اور وجہ تھی کہ لاشوں کے آس پاس جو تصویریں پائی گئیں وہ داغ دار ہو چکی تھیں۔

ایریکو کو معلوم ہوا کہ وہ مقتول مصور کے بیٹے سے باتیں کر رہی تھی تو اسے اس لڑکے کے غیر جذباتی رویے پر بہت حیرانی ہوئی۔ لگتا تھا کہ اسے اپنے باپ کی موت کا کوئی غم نہیں ہے۔ وہ خود بھی اپنے باپ سے بچپن میں محروم ہو گئی تھی اور اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد وہ کتنا عرصہ بے سکون رہی البتہ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس لڑکے کی طرح مطمئن اور بے پروا بھی نہیں رہی۔ اس لڑکے کی شرمیلی مسکراہٹ اس کے ذہن میں محفوظ ہو گئی تھی۔

ایریکو جانتی تھی کہ اس کے کلاس فیلو کیوشی کو پراسرار واقعات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ جاسوسی دیکھنے اور جاسوسی ناول پڑھنے کا شوقین تھا چنانچہ اس نے وہ تمام معلومات اس سے شیئر کرنے کا فیصلہ کیا جو اسے اپنی ماں اور ان کے بار... میں آنے والے لوگوں سے حاصل ہوئی تھیں۔

سوچیرا پچاس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود خوش شکل اور اسمارٹ تھا۔ آئے دن مختلف عورتوں کے ساتھ اس کے اسکینڈل سامنے آتے رہتے تھے لیکن کیوکو اماگی کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرا تھا۔ وہ یوکوہاما سٹی بورڈ آف ایجوکیشن میں اکاؤنٹنٹ تھی اور ان دنوں اپنے شوہر اماگی سے الگ ایک اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔ اس کا کرایہ بھی سوچیرا ہی دیتا تھا۔ ملک گیر پیمانے پر شہرت حاصل کرنے سے پہلے وہ دریا کے پار ایک چھوٹے سے گھر میں اپنی بیوی ہارو کو اور بیٹے یاسو کے ساتھ رہا کرتا تھا لیکن انہیں چھوڑے ہوئے اسے عرصہ ہو گیا تھا۔

سوچیرا کے قتل کے ایک ماہ بعد بھی اس کی تفتیش میں کوئی پیش رفت نظر نہیں آئی۔ ابھی تک پولیس کوئی اہم سراغ حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ جس مکان میں سوچیرا اور اس کی محبوبہ کا قتل ہوا، وہ اندر سے مکمل طور پر بند تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب یہ قتل ہوا، اس سے تھوڑی دیر پہلے زوردار بارش ہو چکی تھی اور مکان کے اطراف کی زمین گیلی تھی جس پر پولیس کو قدموں کے نشانات تو نظر آئے لیکن ان سے کسی کے اندر جانے یا باہر آنے کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ نشانات کیوکو کے شوہر کے تھے چنانچہ پولیس نے اسے مشتبہ سمجھتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ حالانکہ ان قدموں کے نشانات سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ مکان کے اندر گیا تھا۔

ایریکو اور کیوشی، امریکی فوجی کیمپ کے قریب واقع واڈیاما اسکول میں پڑھتے تھے اور ایریکو روزانہ صبح کے وقت کیمپ کے مرکزی دروازے پر اپنے دوست کا انتظار کیا کرتی جہاں سے وہ دونوں ایک ساتھ اسکول جاتے۔ دوسرے دن اسکول جاتے ہوئے اس نے کیوشی کو اپنی اور یاسو کی ملاقات کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی وہ سب باتیں بھی بتا دیں جو سوچیرا کے قتل کے سلسلے میں اسے اپنی ماں اور دوسرے لوگوں سے معلوم ہوئی تھیں۔ کیوشی نے ان خبروں میں کوئی دلچسپی نہیں لی البتہ اس نے صرف اتنا کہا۔ ''ہیلمٹ۔''

''ہاں، اس نے یہی کہا تھا کہ وہ اس پوسٹر سے ہیلمٹ بنائے گا۔ کیا یہ کوئی اہم بات ہے؟''

کیوشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر انہیں ایک آواز سنائی دی۔ وہ مسٹر سکاتا تھے، ان کے اسکول ٹیچر جو ایوارڈ کمیٹی میں ان کے اسکول کی نمائندگی کر رہے تھے اور اپنے

طالب علموں میں کافی مقبول تھے۔ ان کی آواز سن کر وہ دونوں رک گئے۔

''مسٹر سکاتا! تم ہی ایوارڈز کے لیے نامزد ہونے والی تصویروں کا انتخاب کرتے ہو؟'' کیوشی نے کہا۔

''ہاں، لیکن میں صرف اپنے اسکول سے بھیجی جانے والی تصویریں منتخب کرتا ہوں۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجموعی طور پر اس مقابلے میں کتنی تصویریں بھیجی جا سکتی ہیں؟''

''اس کا کوٹا مقرر ہے۔ یوکوہاما کے پرائمری اسکولوں سے ستر اور مڈل اسکول سے بھی ستر تصویریں اس ایوارڈ کے لیے نامزد کی جاتی ہیں۔''

''یعنی کل ایک سو چالیس تصویریں؟'' کیوشی نے کہا۔

''ہاں لیکن اس سال یہ تعداد کم کر کے ایک سو چھتیس کر دی گئی ہے۔''

''تم اس کی وجہ جانتے ہو؟'' کیوشی نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ البتہ یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ مڈل اسکول سے بھیجی جانے والی تصویروں کی تعداد میں کمی کر کے پرائمری اسکولوں کی تصویروں کی تعداد بڑھانا چاہ رہے تھے۔ اسی لیے کمیٹی نے تجویز کیا کہ بالترتیب نوے اور پچاس تصویریں بھیجی جائیں لیکن مسٹر سوچیرا نے اس میں ترمیم کر کے بالترتیب اٹھاسی اور اڑتالیس کی تعداد کر دی جسے کمیٹی نے منظور کر لیا۔''

''ایک سو چھتیس کا ہندسہ کچھ عجیب نہیں لگتا؟'' کیوشی نے کہا۔

''اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر سوچیرا ان تمام تصویروں کو کس طرح اپنے گھر میں دیکھ سکتے تھے جبکہ وہ اتنا بڑا نہیں ہے۔ شاید وہ تنہائی چاہتے تھے۔''

اس کے بعد کیوشی نے کوئی بات نہیں کی البتہ اسکول کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے ایریکو سے کہا۔ ''اگر ہم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ مسٹر سوچیرا نے چار تصویریں کیوں کم کیں تو ہم سارا معما حل کر سکتے ہیں۔''

کلاس ختم ہونے کے بعد ایریکو اپنے دوست کے کلاس روم میں آئی تو وہ اپنی ڈیسک پر جھکا، ایک ڈرائنگ پیپر کی پیمائش کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک محدب عدسہ نکالا اور اس کاغذ کی سطح کو غور سے دیکھنے لگا۔

''تم کیا کر رہے ہو؟'' ایریکو نے اس کے قریب جا کر سرگوشی کی۔

کیوشی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''ایک تصویر کا معائنہ کر رہا ہوں۔''

''کیسی تصویر؟''

''یہ وہ تصویر ہے جو گزشتہ برس مقابلے میں بھیجی گئی تھی۔''

''لیکن تم تو تصویر کی پشت پر دیکھ رہے ہو۔ اس میں کیا خاص بات ہے جو تمہیں محدب عدسے کی ضرورت پیش آ گئی؟''

''میرا کام ختم ہو گیا اور یہ بالکل ویسی ہی ہے جیسا میں نے سوچا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے تصویر کو واپس فریم میں رکھا اور کمرے کی دیوار پر لگا دیا۔

''کیا تم کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکے؟'' ایریکو نے پوچھا۔

''ہاں، میں سمجھ گیا ہوں کہ مسٹر سوچیرا ایک سو چھتیس تصویروں کو کس طرح جانچ رہے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے قتل کا معما حل کر لیا؟'' ایریکو پُرجوش لہجے میں بولی۔

''ابھی صرف میرے ذہن میں عام خیال آیا ہے، مزید تفصیل جاننے کے لیے جائے وقوعہ پر جانا ہو گا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس گھر میں داخل ہونا بہت مشکل ہے لیکن میں کسی بھی طرح وہاں ضرور جاؤں گا۔''

''تمہیں وہ گھر معلوم ہے؟'' ایریکو نے پوچھا۔ کیوشی نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ''میری ماں نے کہا تھا کہ وہ لیون موکو ڈسٹرکٹ میں دریا کے کنارے یوگوئی سوکا کے چوتھے بلاک میں ہے۔ دیکھنے میں وہ ایک پراسرار سا مکان لگتا ہے جس کے اطراف میں تین دو منزلہ بلاک مثلث کی شکل میں واقع ہیں۔ اس کے برابر میں ایک اونچا لوہے کا مینار ہے لیکن ہم وہاں کیسے جا سکتے ہیں؟''

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' کیوشی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں پولیس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا واقعی وہ اس کیس کو حل نہیں کر سکتے؟''

''یہ کیس بہت مشکل ہے۔ وہ تو یہ بھی معلوم نہیں کر سکے کہ مسٹر سوچیرا نے اپنے گھر میں یہ تصویریں کس طرح دیکھی ہوں گی اور نہ ہی ایک مہینا گزر جانے کے باوجود وہ قاتل کا سراغ لگا سکے۔ وہ سب پریشان ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کرنا چاہیے اسی لیے میرا وہاں جانا ضروری ہے۔''

اسکول سے نکلنے کے بعد وہ لیون موکو کی طرف جانے

والے راستے پر چل دیے۔ کھیتوں اور درختوں کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ایک تنگ سڑک پر آگئے جہاں سے انہیں ایک اونچا لوہے کا مینار صاف نظر آرہا تھا۔

''یہی مسٹر سوچیرا کا مکان ہوگا۔ ہمیں اس کے قریب جانا چاہیے۔'' کیوشی نے کہا۔ ایریکو پر خوف کے مارے کپکپی طاری ہوگئی کیونکہ وہ ایک ایسے مکان کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں کچھ عرصہ قبل دہرے قتل کی واردات ہوچکی تھی۔

''کل تم جس لڑکے سے ملی تھیں، وہ مسٹر سوچیرا کا بیٹا ہے۔ اس کا نام یاسو ہے اور وہ دریا کے دوسرے کنارے واقع ان چھوٹے مکانات میں سے کسی ایک میں اپنی ماں ہارو کو کے ساتھ رہتا ہے۔ ان کے گھر میں ٹیلی فون بھی نہیں ہے۔''

''یہ لوگ مسٹر سوچیرا کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟'' ایریکو نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی وجہ میں نہیں جانتا۔''

''تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟'' ایریکو نے پوچھا۔

''میں نے ان کے بارے میں ٹیچرز سے پوچھا تھا۔ تم جانتی ہو کہ بڑی عمر کے لوگوں کو سب باتوں کا پتا ہوتا ہے۔''

گو کہ اس واقعے کو ایک مہینا ہو چکا تھا، اس کے باوجود مکان کے داخلی دروازے پر پولیس نے ٹیپ لگا رکھا تھا۔ وہاں ایک پولیس آفیسر چھتری لیے ہوئے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک سراغ رساں برساتی اور ہیٹ پہنے کھڑا تھا۔ جیسے ہی کیوشی کی نظر ان پر گئی، وہ آگے بڑھا اور سراغ رساں سے بولا۔ ''ہیلو آفیسر! کیا مسٹر اماگی نے بتایا کہ انہوں نے مسٹر سوچیرا کو کیسے قتل کیا؟''

سراغ رساں نے حیرت سے اس لڑکے کو دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''ہم اس کمرے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں مسٹر سوچیرا کا قتل ہوا تھا... ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کیسا کمرا ہے۔''

سراغ رساں نے بُرا سا منہ بنایا اور بولا۔ ''تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ یہاں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ گھر واپس چلے جاؤ۔''

''مسٹر اماگی نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے یہ قتل کس طرح کیا؟'' کیوشی نے پوچھا۔

''اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہم پہلے سے جانتے ہیں۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''تمہیں کیوں بتاؤں؟'' سراغ رساں نے خفگی سے کہا۔ ''جاؤ یہاں سے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ تمہیں قاتل کو تلاش کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں اور یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اس نے یہ قتل کس طرح کیا ہوگا۔''

سراغ رساں نے یہ سن کر زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ اب یہ مذاق ختم کردو، ورنہ مجھے واقعی غصہ آجائے گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم پہلے ہی قاتل کو پکڑ چکے ہیں۔''

''اگر تمہارا اشارہ مسٹر اماگی کی طرف ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ قتل انہوں نے کیا ہے۔ ان کے قدموں کے نشانات مکان کے چاروں طرف نظر آرہے ہیں لیکن ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ گھر کے اندر بھی داخل ہوئے ہوں گے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے جبکہ تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھے؟''

''ہم اس بارے میں سب جانتے ہیں۔ کیا تم یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ سوچیرا نے خودکشی کی ہوگی؟''

''مجھے یقین ہے کہ لوگ ایسا ہی سمجھ رہے ہیں۔''

''یہ ناممکن ہے۔ سوچیرا کے جسم پر دس جگہ زخم آئے ہیں پھر وہاں سے کوئی ہتھیار بھی نہیں ملا۔''

''جانتا ہوں کہ یہ خودکشی کا کیس نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ تصویریں بھی خراب ہوگئیں جو مسٹر سوچیرا دیکھ رہے تھے... یہ کیسے ہوا؟''

''یہ خفیہ معلومات ہیں جو ہم نے ابھی تک اخبار والوں کو بھی نہیں بتائیں۔'' یہ کہہ کر سراغ رساں وہاں سے جانے لگا۔

''ٹھیک ہے، تمہیں ہر بات بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی بہت کچھ جانتا ہوں اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

سراغ رساں یہ سن کر رک گیا اور پلٹتے ہوئے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''ٹھیک ہے پھر یہ بھی بتا دو کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا؟'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور اپنے ساتھی آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''تم نے کمرے کی پیمائش کی؟ شاید تمہیں بعد میں اس کی ضرورت پیش آئے۔ کیا اس وقت تمہارے پاس وہ پیمائش موجود ہے؟''

''پانچ ہزار ایک سو پچاس ملی میٹر!'' کیوشی اچانک ہی بول پڑا۔ یہ سنتے ہی سراغ رساں اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا اور پولیس آفیسر کے بڑھتے ہوئے قدم بھی رک گئے۔

''ان دونوں کو جس کمرے میں قتل کیا گیا، وہ چوکور نما تھا اور اس کی ہر دیوار پانچ میٹر اور پندرہ سینٹی میٹر طویل ہے۔'' کیوشی نے کہا۔

سراغ رساں اس کی جانب مڑا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ کیوشی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''گو کہ فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی لیکن وہ تمہیں اس لیے نظر نہیں آئی کیونکہ پورا فرش تصویروں سے گھرا ہوا تھا... کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

دونوں آدمیوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ صرف بارش کے قطرے گرنے کی آواز سن رہے تھے۔

☆☆☆

پچیس دسمبر کی شام پونے چھ بجے پولیس کو ایک ٹیلی فون کال موصول ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ کیوکو اماگی چوبیس تاریخ کی شام اپنے گھر واپس نہیں آئی اور نہ ہی اس نے اگلے روز سٹی ہال میں ہونے والی ایجوکیشنل بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کی۔ چنانچہ اس کے بارے میں سٹی کونسل کے ایک ممبر نے مسٹر سوچیرا کے گھر فون کر کے جاننا چاہا لیکن وہاں سے بھی کوئی جواب نہ ملا پھر وہ خود سوچیرا کے گھر گیا۔ اس کے بعد اس نے پولیس کو اطلاع دے دی۔

ان دونوں کی موت چوبیس تاریخ کو تین اور پانچ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔ اس روز ڈھائی بجے تک لگاتار بارش ہوتی رہی۔ اس لیے گیلی زمین پر اس شخص کے قدموں کے نشانات بہ آسانی بن جاتے جو ڈھائی بجے کے بعد مکان میں داخل ہوتا یا باہر آتا۔ پولیس کے دو افسران اسی شام چھ بج کر بیس منٹ پر جائے وقوعہ پر پہنچے اور انہوں نے فوری طور پر مکان کے گرد ٹیپ باندھ دیا۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں گیلی زمین کا جائزہ لیا تو انہیں وہاں دو مختلف قسم کے قدموں کے نشانات دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کے جوتوں کے نشان ہیں جو بارش کے فوراً بعد وہاں آیا ہوگا۔ لیبارٹری والوں نے ان نشانات کو پلاستر کے سانچوں کی شکل میں محفوظ کرلیا اور بعد میں ان کی شناخت کیوکو کے ناراض شوہر کی ہیچی اماگی اور بورڈ کے ممبر ناگوکا کے نشانات سے ہوگئی۔

کیونکہ مکان کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر

سے بند تھے اس لیے پولیس والوں کو داخلی دروازے کا شیشہ توڑ کر اندر جانا پڑا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک مثلث نما کمرے میں پایا جو آگے جا کر چوڑا ہوگیا تھا۔

ان کے دائیں جانب ایک زینہ تھا۔ انہوں نے اپنے جوتے اتارے اور سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چلے گئے۔ پہلی منزل پر بھی ایک مثلث نما ہال تھا جس کے سامنے والی دیوار سب سے چھوٹی اور بائیں جانب زاویہ قائمہ بناتی ہوئی دیوار اس سے لمبی تھی۔ دونوں دیواروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

پولیس والے بائیں جانب والے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ چوکور کمرا نسبتاً روشن تھا۔ وہاں انہیں ایک خالی ایزل اور لکڑی کا باکس نظر آیا جس میں آئل پینٹ کی ٹیوبس رکھی ہوئی تھیں، ایک خالی گل دان اور ایک شیلف نظر آیا۔ انہوں نے کمرے کی لائٹ جلائی تو سامنے اور بائیں جانب والی دیوار میں سلائڈنگ دروازوں والی کھڑکیاں دکھائی دیں جن کی چٹخنیاں چڑھی ہوئی تھیں اور ان پر پھول دار پردے پڑے ہوئے تھے۔ بغور معائنہ کرنے پر ان پردوں پر رنگ کے دھبے نظر آجاتے۔ اس کے علاوہ پورا کمرا بالکل صاف تھا اور وہاں کہیں بھی خون کے نشانات نظر نہیں آئے۔

دونوں سراغ رساں برابر والے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ بھی ایک چوکور کمرا تھا جس کی تین دیواروں میں سلائڈنگ کھڑکیاں تھیں جن پر پردے پڑے ہوئے اور یہ کھڑکیاں بھی اندر سے بند تھیں۔ سامنے والی کھڑکی کے ساتھ درختوں کی قطار تھی جس کے عقب میں دریا کے دوسرے کنارے پر واقع مکانات کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ دائیں جانب والی کھڑکی سے بھی دریا اور کچھ کھیت نظر آرہے تھے البتہ جب انہوں نے تیسری کھڑکی کھولی تو وہ ایک لوہے کا مینار دیکھ کر چونک گئے جو کھڑکی سے تقریباً تین میٹر کے فاصلے پر تھا۔ انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو انہیں اس کے گرد لوہے کی باڑ نظر آئی جس پر خطرے کے نشان والی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ کمرا بھی خالی تھا البتہ یہاں بھی ایک خالی گل دان، ایزل، رنگ کی ٹیوبس، برش اور ڈرائنگ پیپرز نظر آرہے تھے۔ حیرت انگیز طور پر سرخ رنگ کی تمام ٹیوبس خشک ہوچکی تھیں۔

موراکی اور ہاشی موتو نے پہلی منزل پر واقع بقیہ دو کمروں کا بھی مختصر سا جائزہ لیا۔

ان دونوں کمروں کو دیکھنے کے بعد سراغ رساں

واپس اس کمرے کی جانب آئے جس کا دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ ایک سراغ رساں نے تالا توڑا اور جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے تو ان کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ سوچیرا اور کیوکو کی لاشیں برابر برابر پڑی ہوئی تھیں اور ان کے چاروں طرف سرخ رنگ بکھرا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب سی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

''کتنی بُری بُو ہے۔'' مورا کی نے نتھنے سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''جی چاہتا ہے کہ ساری کھڑکیاں کھول دوں... اور یہ سرخ رنگ کیسا ہے؟''

وہاں صرف خون ہی نہیں بلکہ اس میں سرخ رنگ کی بھی آمیزش ہو گئی تھی اور ان کی بو اتنی شدید تھی کہ وہ دونوں بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ جب ان کی نگاہ فرش پر گئی تو سرخ رنگ کا راز ان کی سمجھ میں آ گیا۔ پورے فرش پر سرخ رنگ کے کاغذ اس ترتیب سے رکھے گئے تھے کہ ان کے درمیان کوئی خلا نہیں تھا۔ ہاشی موتو نے ان کاغذوں کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ وہ تصویریں ہیں جو میٹر ایوارڈ کے لیے نامزد کی گئی تھیں۔''

''لیکن یہ فرش پر کیوں پڑی ہیں؟'' مورا کی نے پوچھا۔

''سوچیرا کو ان میں سے ایوارڈ کے لیے بہترین تصویر کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ یہ کام اپنے گھر پر ہی کیا کرتا تھا تا کہ کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔''

''ہمیں کچھ تصویریں ہٹا کر راستہ بنانا چاہیے تا کہ لاشوں تک پہنچ سکیں۔'' مورا کی نے کہا۔ پھر اس نے جیب سے سفید دستانے نکال کر ہاتھوں پر چڑھائے اور دس تصویریں اٹھا کر دروازے کے ساتھ احتیاط سے رکھ دیں۔ ہاشی موتو آگے بڑھا اور جھک کر لاشوں کو دیکھنے لگا۔

کیوکو اور سوچیرا برابر برابر لیٹے ہوئے تھے لیکن ان کے جسم ایک دوسرے سے علیحدہ تھے۔ ان کے جسم پر پورے کپڑے تھے لیکن خون آلود ہونے کی وجہ سے ان کے رنگ کی شناخت ممکن نہ تھی۔ سوچیرا کے بائیں ہاتھ میں ایک برش تھا۔

''بہت ہی دہشت ناک منظر ہے۔'' ہاشی موتو نے کہا۔

''یہ دیکھو۔'' مورا کی بولا۔ ''ان کے جسم پر کسی تیز دھار آلے سے وار کیے گئے ہیں۔ خاص طور پر سوچیرا کے جسم پر کم از کم دس زخم آئے ہیں۔ عورت کے زخموں کی تعداد کچھ کم ہے۔''

''کمرا اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ سوچیرا نے پہلے کیوکو کو قتل کیا اور پھر خود کو مار ڈالا۔''

ہاشی موتو نے غور سے مورا کی کو دیکھا اور بولا۔ ''گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ سوچیرا نے پہلے عورت کے جسم پر پے در پے وار کیے پھر برش کے ذریعے اس کے خون سے تمام تصویروں کو رنگین کر دیا پھر وہ چلتا ہوا کمرے کے وسط میں آیا اور اپنے جسم پر دس جگہ وار کر کے خودکشی کر لی جبکہ پورے کمرے میں کہیں بھی اس کے قدموں کے نشانات نظر نہیں آ رہے۔''

مورا کی خاموش کھڑا رہا۔ ہاشی موتو اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''سوچیرا کو جو زخم آئے، وہ انتہائی مہلک اور گہرے ہیں۔ اگر وہ پوری قوت سے اپنے آپ کو چاقو مارتا تو زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ایسا کر سکتا تھا اور یہی صورت حال عورت کے ساتھ بھی پیش آتی، اگر اس نے سوچیرا کو پہلے مار دیا ہوتا۔ اس لیے یہ خودکشی نہیں ہو سکتی اور اگر ایسا ہے تو چاقو کہاں گیا؟''

انہوں نے چاروں طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی ہتھیار نظر نہیں آیا۔ مورا کی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ہاشی موتو کے تجزیے کو جھٹلانا مشکل تھا۔

''ایک بات اور۔'' ہاشی موتو بولا۔ ''لاشوں کے اردگرد بہت کم خون نظر آ رہا ہے جبکہ اس کا زیادہ تر حصہ تصویروں کو ڈھانپنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اگر انہوں نے خودکشی کی ہوتی تو یہ خون پورے فرش پر نہ پھیلا ہوتا؟''

''اگر یہ خودکشی نہیں ہے تو کمرے کا دروازہ اندر سے کیوں بند تھا؟''

''ہاں، یہ سوچنے کی بات ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ خودکشی کا کیس نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہاں کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا بلکہ پانی کا برتن، رنگ اور برش بھی نہیں دکھائی دے رہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کام کسی اور کا ہے جس نے تصویروں پر رنگ اور خون بکھیرنے کے بعد یہ چیزیں یہاں سے ہٹا دیں۔''

''کمرا اندر سے بند ہونے کے بارے میں کیا کہو گے؟'' مورا کی نے اپنا سوال دہرایا۔

''اس میں ضرور کوئی ہوشیاری دکھائی گئی ہے۔'' ہاشی موتو نے جھک کر ایک تصویر کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''اس پر صرف سرخ رنگ ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ تصویروں پر سرخ رنگ اور کچھ پر خون پھیر دیا گیا ہے۔''

''کیا وجہ ہے کہ یہ تصویریں ایک ترتیب کے ساتھ

برابر برابر رکھی گئی ہیں؟ اگر یہ قتل ہوتا تو تمام تصویریں ادھر ادھر بکھری ہوئی یا کم از کم پھٹی ہوئی ہوتیں۔''

''واقعی یہ قابلِ غور نکتہ ہے۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تصویروں کو اس طرح کیوں رکھا گیا اور ان پر خون یا رنگ کیوں پھیر دیا گیا؟''

ہاشی موتو کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

پورے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد انہیں کسی دیوار یا پردوں پر خون کے دھبے اور انگلیوں کے نشانات نظر نہیں آئے۔ انہوں نے تصویروں کو گنا۔ لاشوں کے اردگرد خون آلود تصویروں کی تعداد اڑتالیس تھی جبکہ بقیہ حصے میں رکھی ہوئی تصویروں کی تعداد اٹھاسی تھی جن پر سرخ رنگ بکھیر دیا گیا تھا۔ اس طرح ان کی کل تعداد ایک سو چھتیس بنتی تھی۔

دوسری صبح مورا کی اور ہاشی موتو، شہر میں واقع کیوکو اماگی کے اپارٹمنٹ گئے جہاں وہ گزشتہ چھ ماہ سے رہ رہی تھی جو اسے سوچیرا نے لے کر دیا تھا۔ پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ روزانہ رات کو اس کے گھر کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ جب کیوکو نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تو وہ گالیاں بکنے اور پتھراؤ کرنے پر اتر آیا اور پڑوسیوں کو شبہ ہونے لگا کہ کہیں وہ مشتعل ہو کر اپنی بیوی کو قتل نہ کر دے۔

پڑوسیوں کے اس بیان کے بعد ان کا پہلا شک کیوکو کے شوہر پر ہی گیا۔ وہ اس کی تلاش میں ریس کورس پہنچے جہاں وہ ٹرینر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن انہیں بتایا گیا کہ وہ کئی ماہ سے غیر حاضر ہے اور ساچیتا میں واقع اپنے آبائی گھر میں رہ رہا ہے۔

دوسرے دن مورا کی اور ہاشی موتو اس سے ملنے گھر گئے اور اسے پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا تو وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر تیار ہو گیا۔ جب انہوں نے اس کے جوتوں کا موازنہ قدموں کے نشانات سے کیا جو پلاستر کے سانچے میں پہلے ہی محفوظ کر لیے گئے تھے تو یہ ثابت ہو گیا کہ سوچیرا کے مکان کے گرد پائے جانے والے قدموں کے نشانات اسی کے تھے۔

قدموں کے نشانات اور قتل کا محرک سامنے آ جانے کے بعد اس کے خلاف کیس مضبوط ہو گیا اور اسے پولیس نے گرفتار کر لیا۔ ہیچی اماگی کو حراستی مرکز میں رکھا گیا جہاں اس سے تیئس دن تک پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ ابتدا میں اس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اس نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کیا ہے لیکن پولیس کے بے رحمانہ تشدد اور مسلسل بے خوابی سے بچنے کے لیے اس نے دہرے قتل کا اعتراف کر لیا لیکن وہ یہ نہیں بتا سکا کہ بند مکان میں وہ کس طرح داخل ہوا۔ نہ ہی اسے خون آلود تصویروں کے بارے میں کچھ معلوم تھا۔ جب اسے تصویروں کے بارے میں تفصیل بتائی گئی تو اس نے لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا جس پر تفتیشی افسران شش و پنج میں گرفتار ہو گئے۔ وہ اس نتیجے پر تو پہنچ چکے تھے کہ اماگی ہی قاتل ہے لیکن وہ یہ جاننے میں ناکام رہے کہ یہ جرم کس طرح انجام پایا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ عدالت میں اسے مجرم ثابت نہیں کر سکتے تھے اور پولیس کی جگ ہنسائی ہوتی۔ اس نکتے پر آ کر مورا کی اور ہاشی موتو پھنس گئے اور ان کے لیے ہیچی اماگی کے خلاف کارروائی کو آگے بڑھانا ممکن نہ رہا۔

☆☆☆

جب کیوشی ان سے ملنے آیا، اس وقت وہ مکمل طور پر مایوس اور ناامید ہو چکے تھے۔

''تمہیں کمرے کی پیمائش کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟'' مورا کی نے اس سے پوچھا۔

''یہ میرا اندازہ ہے۔ ذرا سی سوچ بچار کے بعد تم بھی یہ اندازہ لگا سکتے ہو۔''

''اسے کمرے کی پیمائش معلوم ہے۔'' مورا کی نے اپنے ساتھی سے کہا جو اسی وقت مکان سے باہر آیا تھا۔

''تم مجھے اندر جانے دو پھر میں تمہیں بتا سکوں گا کہ یہ قتل کس طرح ہوا۔'' کیوشی نے کہا۔

''تم ابھی بچے ہو۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔'' مورا کی بولا۔

ہاشی موتو نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کیوشی سے بولا۔ ''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ کمرے کی پیمائش پانچ میٹر اور پندرہ سینٹی میٹر ہے؟''

''یہ اندازہ میں نے تصویروں کی لمبائی سے لگایا۔ ہر ایک کی لمبائی پانچ سو پندرہ میٹر ہے اگر ہر قطار میں دس تصویریں ہوں تو چودہ قطاروں کا رقبہ پانچ میٹر اور پندرہ سینٹی میٹر بنتا ہے۔ اس طرح ایک سو چالیس تصویریں کمرے کے فرش پر رکھی جا سکتی ہیں۔''

''لیکن ان کی تعداد ایک سو چالیس نہیں ہے۔'' ہاشی موتو نے کہا۔

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔ وہاں ایک سو چھتیس

تصویریں ہیں۔'' کیوشی نے کہا۔
''تمہارا خیال درست ہے لیکن چار تصویریں کہاں گئیں؟''
''مجھے نہیں معلوم۔ یہ جاننے کے لیے مجھے مکان کے اندر جانا ہوگا۔ میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔''
ہاشی موتو اس سے کافی متاثر نظر آرہا تھا۔ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میرے ساتھ آؤ۔''
کیوشی نے اپنی چھتری دروازے کے ساتھ رکھی۔ وہاں ایک پرانی سی سیاہ چھتری پہلے سے موجود تھی۔ کیوشی نے پوچھا۔ ''یہ چھتری کس کی ہے؟''
''جب ہم دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو یہ چھتری اسی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ شاید مسز سوچیرا کی ہو۔''
''کیا یہ اس وقت گیلی تھی؟''
ہاشی موتو نے آگے بڑھ کر گیسٹ روم کی لائٹ جلا دی۔ وہاں سے لاشیں ہٹائی جا چکی تھیں لیکن تصویریں اسی حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔ کیوشی نے ایک تصویر اٹھائی اور محدب عدسے سے اس کی پشت دیکھنے لگا پھر کمرے کے وسط کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
''ہاں۔'' ہاشی موتو نے کہا۔ ''صرف اڑتالیس تصویروں پر خون لگا ہوا ہے جبکہ اٹھاسی تصویروں پر سرخ رنگ بکھرا ہوا ہے۔''
''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔'' کیوشی بولا۔ ''اور اسی لیے چار تصویریں کم ہیں۔''
''بند کمرے کے بارے میں کیا کہو گے؟''
''یہ اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا ہوں اور اسی لیے اس معمے کو حل کرنے کے قابل ہو سکا۔''
''گویا یہ قتل بیچی نے ہی کیا ہے؟'' ہاشی موتو نے تائید طلب انداز میں پوچھا۔
''نہیں، وہ یہ قتل کس طرح کر سکتا ہے جبکہ وہ مکان کے اندر داخل ہی نہیں ہوا۔''
ہاشی موتو نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''ہاں، یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔''
''کیا اب میں اوپر جا سکتا ہوں؟'' کیوشی نے پوچھا۔
ہاشی موتو نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ تینوں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آگئے۔ سب سے پہلے انہوں نے بڑا چوکور کمرا دیکھا۔ کیوشی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بولا۔ ''یقیناً، یہ وہی کمرا ہے جہاں سوچیرا تصویریں بنایا کرتا تھا۔ کم از کم ایزل، رنگوں، برش اور کلر دان سے تو یہی معلوم ہو رہا ہے۔ جب تم نے اسے پہلی بار دیکھا تو یہ سب چیزیں اسی حالت میں تھیں؟''
''ہاں۔''
کیوشی ایک کھڑکی کی طرف گیا اور باہر کی جانب دیکھنے لگا۔ ہاشی موتو نے کہا۔ ''تمہیں یہاں سے کھیت اور جنگل ہی نظر آئے گا۔ کچھ مکانات بھی ہیں لیکن وہ کافی فاصلے پر ہیں۔''
''ٹھیک ہے، اب ہم دوسرا کمرا دیکھتے ہیں۔'' کیوشی نے کہا اور نسبتاً چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں سراغ رساں اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ کیوشی سب سے پہلے بائیں جانب والی کھڑکی کی طرف گیا اور ٹاور کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹاور کھڑکی سے کافی دور ہے۔''
''ہاں تقریباً دس فٹ کا فاصلہ ہوگا۔''
''اس ٹاور کے گرد نیچے کی جانب ایک لوہے کا فریم بنا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی چھت بھی نظر آرہی ہے۔''
انہوں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ٹاور سے متصل ایک چھوٹی سی چھت نظر آرہی تھی۔
''یہ ایک چھوٹا سا اسٹور ہے۔ مسٹر سوچیرا نے حال ہی میں مکان میں کچھ کام کروایا تھا اور اس اسٹور میں بچا ہوا فالتو سامان رکھ دیا گیا تھا۔''
اس کے بعد کیوشی دروازے کی مخالف سمت والی کھڑکی پر گیا اور باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں سے مجھے دریا اور اس کے ساتھ لگے ہوئے درخت نظر آرہے ہیں۔ ان کی شاخوں کے پیچھے مکانات بھی ہیں اور کچھ لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔''
''بس اتنا کافی ہے۔'' ہاشی موتو بولا۔ ''کیا اس سے تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟''
''ہاں، یوں سمجھ لو کہ یہ کیس مکمل طور پر حل ہو گیا ہے۔'' کیوشی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ دونوں سراغ رساں بالکل خاموش رہے۔ وہ کیوشی کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔
''تم دونوں کا بہت شکریہ، اب میں مکمل طور پر مطمئن ہوں۔ مجھے چلنا چاہیے، ایریکو باہر اکیلی ہے۔ اسے ڈر لگ رہا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ دونوں سراغ رساں اس کے پیچھے تھے۔
''کیا تمہیں دوسرے کمرے دیکھنے کی ضرورت نہیں؟'' مورا کی نے پوچھا۔

''نہیں، میں جلدی میں ہوں۔''
''جانے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ تم نے کیا معلوم کیا؟'' ہاشی موتو بولا۔
''مسز اماگی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟''
''اسے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔'' ہاشی موتو نے جواب دیا۔ ''اور اسے موت کی سزا سنائی جائے گی کیونکہ اس نے دہرا قتل کیا ہے۔''
''کسی ثبوت کے بغیر وہ کیسے مجرم ٹھہرایا جا سکتا ہے؟'' کیوشی نے معصومیت سے کہا۔
''وہ اپنے جرم کا اعتراف کر چکا ہے۔'' ہاشی موتو نے کہا۔
وہ تینوں مکان سے باہر آئے تو ایریکو کی جان میں جان آئی۔ کیوشی نے اپنے جوتے پہنے اور جب وہ چلنے لگا تو ہاشی موتو بولا۔ ''کیا ہمیں نہیں بتاؤ گے کہ تم نے کیا معلوم کیا؟''
کیوشی نے اپنی چھتری اٹھائی اور بولا۔ ''اگر تم واقعی جاننا چاہتے ہو تو کل دوپہر اسکول کے سامنے والے گیٹ پر آجاؤ اور یہ چھتری اپنے ساتھ ضرور لانا۔'' اس نے ریک میں رکھی ہوئی پرانی سیاہ چھتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''میں سمجھا نہیں۔ اس چھتری کا تم کیا کرو گے؟'' ہاشی موتو نے کہا۔
''میں تمہیں قاتل سے ملواؤں گا۔ میں جان گیا ہوں کہ وہ کون ہے لیکن ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے لیے مجھے اس چھتری کی ضرورت ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ ایریکو کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔
دوسرے دن دونوں سراغ رساں اسکول کے مرکزی گیٹ پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وہی چھتری تھی جسے لانے کے لیے کیوشی نے اصرار کیا تھا۔ کیوشی فوارے کے پاس ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا، ایریکو بھی اس کے ساتھ تھی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ گیٹ پر آیا اور بولا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''
وہ دونوں کیوشی کے ساتھ ہی اسکول کی عمارت میں داخل ہوئے۔ کیوشی ایک کلاس روم کے دروازے پر رک گیا اور اس نے ایریکو سے یاسو کے بارے میں پوچھا۔ ایریکو نے ایک لمبے قد کے لڑکے کی جانب اشارہ کیا جو اپنی آستین کے بٹن بند کر رہا تھا۔ کیوشی نے ہاشی موتو سے چھتری مانگی اور اس لڑکے کی جانب چل دیا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں اور کیوشی نے وہ چھتری اسے دے دی جسے لے کر وہ لڑکا وہاں سے چلا گیا۔ کیوشی نے واپس آکر کہا۔ ''اس نے

چھتری لے لی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ اسی کی تھی۔ اس طرح میرے ایک شبے کی تصدیق ہو گئی۔ اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔"

اسکول گیٹ سے باہر آنے کے بعد ہاشی موتو نے پوچھا۔ "کیا تم اس لڑکے پر شبہ کر رہے ہو؟"

"نہیں، وہ شریکِ جرم تھا۔"

"پھر قاتل کون ہے؟"

"ایک منٹ۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔"

"اگر تمہاری بات مان لی جائے تو کیچی اماگی مشتبہ نہیں ہے۔"

"یقیناً، بہتر ہے کہ اسے چھوڑ دو۔ جتنی دیر تم اسے حراست میں رکھو گے تمہارے لیے مشکلات بڑھتی جائیں گی۔"

"یہ اسی صورت ممکن ہے جب ہمیں حقیقی مجرم مل جائے۔" مورا کی نے کہا۔ "یہ لڑکا کون تھا؟"

"مسٹر سوچیرا کا بیٹا یاسو۔"

"یہ لڑکا مسٹر سوچیرا کے ساتھ نہیں رہتا اور اس کے گھر میں فون بھی نہیں ہے۔" مورا کی نے طنزاً کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم سب کچھ جاننا چاہتے ہو تو شام سات بجے مجھے اپنی کار میں بٹھا لینا۔ ہم ایک بار پھر مسٹر سوچیرا کے گھر جائیں گے اور میں تمہیں پوری تفصیل بتا دوں گا۔"

"اور اگر اس دوران مجرم فرار ہو گیا؟" مورا کی نے کہا۔

"ایسا نہیں ہو گا۔"

"تم ہمیں ابھی کیوں نہیں بتا دیتے؟" ہاشی موتو نے کہا۔

"نہیں، میں جائے وقوعہ پر ثبوت کے ساتھ ہی بتاؤں گا۔" کیوشی اپنی بات پر قائم رہا۔

"اس چھتری کے بعد بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے؟" مورا کی نے تیز لہجے میں کہا۔

"یہ ثبوت کافی نہیں ہے۔ کسی پر الزام لگانے سے پہلے ضروری ہے کہ تم میری کہی ہوئی بات کی تصدیق کر لو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم سات بجے آئیں گے۔ تم تیار رہنا۔" ہاشی موتو نے کہا۔

☆☆☆

مقررہ وقت پر دونوں نے کیوشی کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور مسٹر سوچیرا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیوشی کے ہاتھ میں ایک اسپرے بوتل تھی۔ ہاشی موتو نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"اس کے ذریعے ثابت کروں گا کہ میں نے جو نظریہ قائم کیا ہے، وہ صحیح ہے یا نہیں۔"

سوچیرا کے گھر پہنچ کر مورا کی نے دروازہ کھولا اور وہ تینوں اندر داخل ہو گئے۔ کیوشی کے کہنے پر وہ پہلے اوپر کی منزل پر گئے۔ کیوشی نے اسٹوڈیو کا دروازہ کھول کر لائٹ آن کی اور بوتل سے کمرے کی ہر چیز پر اسپرے کر دیا۔ دیواریں، پردے، شیلف، کھڑکیاں، فرش، دروازے، ایزل اور گل دان، اس نے چپے چپے پر چھڑکاؤ کر دیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" مورا کی چلایا۔

"گھبراؤ نہیں۔ یہ مٹی کا تیل نہیں ہے۔ پہلے مجھے اپنا کام کرنے دو پھر میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی کمرے میں نارنجی روشنی پھیل گئی۔ یوں لگتا تھا کہ دیوار پر بارش کے قطرے گر رہے ہیں جو کھڑکی کے کناروں اور شیلف کے نیچے تالاب کی شکل میں جمع ہو رہے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز منظر فرش کا تھا جہاں کئی چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" ہاشی موتو نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ خون کے نشان ہیں۔" کیوشی نے جواب دیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں نے جو کیمیکل اسپرے کیا تھا، اسے لومی نول کہتے ہیں۔ یہ جب خون میں شامل تیزاب فیری سائنائڈ سے ملتا ہے تو اسی طرح کی چمک پیدا ہوتی ہے۔"

"گویا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ اس کمرے میں خون تھا؟" مورا کی نے کہا۔

"ہاں لیکن اسے صاف کر دیا گیا تھا اسی لیے نظر نہیں آ رہا۔"

"لیکن اگر یہاں خون تھا تو اسے صاف کیوں کیا گیا؟"

"ان دونوں کو اس کمرے میں قتل کیا گیا تھا۔" کیوشی نے وضاحت کی۔

"لیکن ان کی لاشیں تو گیسٹ روم میں پڑی ہوئی تھیں۔" مورا کی نے کہا۔

"یہ دیکھو۔" کیوشی نے کہا۔ وہ مثلث نما ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ کیوشی نے وہاں کی لائٹ آن کر دی۔ اب کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ روشنی ہوتے ہی فرش پر جگمگاتے پتنگوں کی قطار نظر آنے لگی جو ایک فوج کی شکل میں کمرے سے باہر نکلتی سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔

"لاشوں اور تصویروں کو یہاں سے گھسیٹ کر گیسٹ روم تک لے جایا گیا اور اس کام کے لیے وہ کئی بار اوپر نیچے

گئے۔ تم قدموں کے نشانات دیکھ سکتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ہاشی موتو نے اپنے پاؤں سے اس نشان کا موازنہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کسی عورت کے قدموں کا نشان معلوم ہوتا ہے۔"

"ممکن ہے یہ کیوکو کے پیر کا نشان ہو۔" مورا کی نے خیال ظاہر کیا۔

کیوشی نے دوسرے بڑے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ "گویا ان دونوں کو یہاں نہیں بلکہ چھوٹے کمرے میں قتل کیا گیا اور بعد میں ان کی لاشیں سیڑھیوں کے ذریعے گیسٹ روم میں لے جائی گئیں۔" ہاشی موتو نے کہا تو کیوشی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

وہ تینوں سیڑھیاں اتر کر نیچے گیسٹ روم میں گئے۔ اس کمرے کی دیواریں، دروازے، کھڑکیاں اور پردے وغیرہ بالکل صاف تھے اور وہاں اسپرے کرنے کے باوجود کوئی ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں جما ہوا خون سیاہ ہو چکا تھا کیونکہ کیوشی نے اس جگہ اسپرے نہیں کیا تھا۔

"میں ابھی تک نہیں سمجھ پایا۔" مورا کی بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ قاتل دونوں لاشوں کو کھینچ کر اس کمرے تک لائے پھر انہیں تصویروں پر رکھا اور ان پر بھی خون پھیر دیا۔ کیا ایسا ہی ہوا تھا؟"

"نہیں۔" کیوشی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں دوبارہ اوپر جانا چاہیے۔"

وہ واپس چھوٹے کمرے میں گیا اور بولا۔ "فرش پر دیکھو، تمہیں خون کی باریک قطار نظر آئے گی۔ یہ وہ خون ہے جو تصویروں سے ٹپکا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پہلے یہ تصویریں نیچے لے جائی گئیں پھر ان پر لاشوں کو رکھا گیا۔"

"لیکن سب تصویریں خون آلود نہیں ہیں۔ کچھ پر سرخ رنگ پھیر دیا گیا ہے۔"

"مسٹر سوچیرا نے مڈل اسکول کے بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں اس کمرے میں رکھی تھیں جبکہ پرائمری اسکول کے بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں برابر والے بڑے کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ قاتلوں نے پولیس کو گمراہ کرنے کے لیے ساری تصویریں گیسٹ روم میں لے جا کر رکھ دیں اور بقیہ تصویروں پر سرخ رنگ پھیر دیا۔"

"کیا مطلب؟" ہاشی موتو نے پوچھا۔ "کیا قاتل ایک سے زیادہ تھے؟"

"ہاں، میرا خیال ہے کہ یاسو سوچیرا قاتل نہیں ہے لیکن قانونی طور پر اسے بھی شریکِ جرم سمجھا جائے گا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ قاتل نہیں ہے؟" مورا کی نے کہا۔

"یہ سب میں بعد میں بتاؤں گا لیکن یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ قاتل لاشوں کو یہاں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اسی لیے وہ انہیں گھسیٹ کر نیچے لے گئے۔"

"کیوں؟" ہاشی موتو نے پوچھا۔

"اس وجہ سے۔" کیوشی نے کہا اور دروازے کے سامنے والی کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ "وہ روشنیاں دیکھ رہے ہو؟"

دونوں سراغ رسانوں نے اس جانب دیکھا تو کیوشی نے کہا۔ "یہی وہ مکان ہے جس میں یاسو اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔"

"ہاں، پہلے سوچیرا بھی وہیں رہتا تھا۔" ہاشی موتو نے تصدیق کی۔

"یاسو کی ماں نے یہاں کھڑے ہو کر کھڑکی کھولی اور دونوں کو قتل کرنے کے بعد آواز دے کر بلا لیا۔"

"کیا کسی نے اس کی آواز نہیں سنی ہو گی؟" مورا کی نے پوچھا۔

"نہیں، دوسرے مکان کافی فاصلے پر ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے آواز دینے کے بجائے اسے اشارہ کر کے بلایا ہو۔ بہر حال اس کے بلانے پر یاسو ٹاور کے ذریعے اس کھڑکی تک پہنچ گیا۔"

"لیکن ٹاور تو دس فٹ کے فاصلے پر ہے۔ وہ اتنی لمبی چھلانگ نہیں لگا سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔" کیوشی نے کہا۔ "اسی لیے وہ ٹاور سے متصل اسٹور کی چھت پر گیا۔ اس نے اسٹور سے دس فٹ لمبے کئی تختے نکالے اور انہیں ایک دوسرے پر اس طرح رکھا کہ سب سے اوپر والا تختہ کھڑکی کی چوکھٹ تک پہنچ جائے۔ پھر وہ ان تختوں پر چڑھتا ہوا کھڑکی کے راستے کمرے میں آ گیا۔"

"سوچیرا کی بیوی نے اپنے شوہر اور کیوکو کو کیوں قتل کیا؟"

"یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے۔" کیوشی نے کہا۔ "شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سوچیرا نے اپنی بیوی اور بیٹے کو چھوڑ کر کیوکو سے تعلقات استوار کر لیے تھے اور انہیں گزر اوقات کے لیے معقول رقم بھی نہیں دیتا تھا۔ انہوں نے اسی لیے لاشیں یہاں نہیں چھوڑیں کیونکہ پورے گھر میں یہی وہ واحد کھڑکی ہے جو ان کے مکان کی جانب کھلتی ہے اور ٹاور سے قریب ہے۔ اگر لاشیں یہاں چھوڑ دی جاتیں تو ان پر

فوراً ہی الزام آسکتا تھا۔''
''لیکن یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ان دونوں کو اسی کمرے میں قتل کیا گیا تھا؟'' ہاشی موتو نے پوچھا۔
''کل تم نے مجھے بتایا تھا کہ اڑتالیس تصویروں پر خون لگا ہوا تھا جبکہ اٹھاسی تصویروں پر سرخ رنگ پھیر دیا گیا تھا جو دوسرے کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ اسی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ قتل اسی کمرے میں ہوا ہے اور انہوں نے دونوں کمروں سے تصویریں اٹھا کر نیچے گیسٹ روم میں منتقل کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے پورے گھر کو اچھی طرح صاف کیا۔ کیونکہ انہوں نے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے کسی جگہ بھی ان کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ انہوں نے گھر کے تمام دروازے اندر سے بند کر دیے اور کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے تاکہ باہر سے کوئی انہیں نہ دیکھ سکے۔''
''ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔'' ہاشی موتو سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اب ہمیں فوری طور پر اس کے گھر کی تلاشی لینی چاہیے تاکہ آلۂ قتل برآمد کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر تفصیلات بھی معلوم کی جا سکیں۔''
''وہ چھتری بھی ایک اہم ثبوت ہے۔'' کیوشی نے کہا۔ ''ان دونوں کے پاس یہی ایک چھتری تھی۔ اس روز بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے ہارو کو نے یہاں آنے کے لیے وہ چھتری استعمال کی۔ اس نے دونوں کو قتل کرنے کے بعد اپنے بیٹے کو صفائی کے لیے بلایا اور وہ دونوں چھتری یہیں بھول کر کھڑکی کے راستے واپس چلے گئے۔ اس پورے منصوبے میں یہی ایک خامی رہ گئی تھی۔''
''اوہ۔'' ہاشی موتو نے تعجب سے کہا۔ ''اسی لیے تم نے یاسو کو وہ چھتری دی تھی؟''
''ہاں، ان کے پاس یہی ایک چھتری تھی اسی لیے جب دوسری بار بارش ہوئی تو اس نے ایریکو سے ایک ڈرائنگ پیپر مانگ کر اس کا ہیٹ بنایا۔ جب میں نے اسے وہ چھتری دی تو اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ مجھے کہاں سے ملی تو میں نے گول مول جواب دے کر اسے ٹال دیا۔ جب اس نے مجھ سے چھتری لے لی تو میں سمجھ گیا کہ وہ قاتل نہیں بلکہ شریکِ جرم ہے۔ اگر قاتل ہوتا تو کبھی چھتری نہ لیتا۔''
''یعنی وہ اتنے غریب ہیں کہ ایک چھتری بھی نہیں خرید سکتے؟'' ہاشی موتو نے کہا۔
''ہاں اور شاید یہی اس قتل کی وجہ ہے۔''

موراکی اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے ایک اور سوال کر دیا۔ ''وہ چھتری واپس لینے کیوں نہیں آیا؟ جس طرح اس نے پہلی بار اندر آنے کے لیے لکڑی کے تختے استعمال کیے تھے، اسی طرح دوسری بار بھی آ سکتا تھا۔''
''اس نے جاتے وقت اندر سے کھڑکی بند کر دی تھی اس لیے دوبارہ نہیں آ سکتا تھا۔''
''یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے کھڑکی اندر سے کیسے بند کر دی؟'' موراکی نے پوچھا۔
''اس موپ کی مدد سے۔'' کیوشی نے وہ موپ اٹھایا جو اس نے گزشتہ روز فرش پر پڑا ہوا دیکھا تھا۔ ''اس نے ایک ہاتھ سے یہ موپ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اندر کی چٹخنی کا لیور اوپر اٹھایا پھر اس نے باہر سے کھڑکی بند کی اور تیزی سے موپ کو چھوڑ دیا۔ موپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لیور سے ٹکرایا اور کھڑکی اندر سے بند ہو گئی۔ پھر وہ نیچے اترا، اس نے تمام تختے واپس اسٹور میں رکھے اور گھر چلا گیا۔''
''ایک آخری بات۔'' موراکی اس کا امتحان لینے پر تلا ہوا تھا۔ ''یہ بتاؤ کہ گیسٹ روم کا دروازہ اندر سے کیسے بند ہوا؟''
''یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ پہلے یاسو نے ماں کو کمرے سے باہر بھیجا پھر الماری پر چڑھ کر روشن دان نما کھڑکی تک پہنچا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ دبلا پتلا لڑکا ہے۔ اس لیے وہ بہ آسانی اپنے جسم کو سکیڑ کر روشن دان میں سے نکل گیا۔ باہر راہداری میں اس کی ماں کھڑی ہوئی تھی جس نے سہارا دے کر اسے نیچے اتار لیا۔''
''میں سمجھتا ہوں کہ لڑکوں کو دیوار پر چاروں ہاتھ پاؤں کی مدد سے چڑھنے اترنے کی کافی مشق ہوتی ہے۔'' موراکی نے کہا۔
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' کیوشی بولا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں گھر جا کر کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتا۔''
دونوں سراغ رساں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔ ہاشی موتو نے سرگوشی میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اس چھوٹی سی عمر میں یہ حال ہے تو بڑے ہو کر کیا قیامت ڈھائے گا۔''
موراکی خاموش رہا۔ اس کے پاس اپنے ساتھی کی بات کا کوئی جواب نہ تھا لیکن وہ دل ہی دل میں کیوشی کا شکر گزار تھا جس کی وجہ سے وہ اصل مجرم کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

چور اور مور

جمال دستی

چوری اور سینہ زوری حد سے زیادہ چالاک ماہر فنکاروں کی شہ زوری اور کمالات پر مبنی ایک دلچسپ و سنسنی خیز کہانی... دو بہنوں کی ہوشیاری و چالاکی جو بھاری پڑنے والی تھی...

چوری اور نقب زنی کی وارداتوں کے پیچھے پوشیدہ ہاتھ کی تلاش و جستجو

کیرول لیونگ روم کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی کہ ایک بے نشان کار گھر کے سامنے آ کر رک گئی۔ کیرول اچھل کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی اور تیزی سے کچن کی جانب لپکی۔ ''ڈورس! باہر پولیس آ گئی ہے۔''
اس کی بہن کچن میں روسٹ ٹرکی کے اندر سے بھرا جانے والا مسالا تقریباً نکال چکی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر کیرول کی جانب دیکھا اور بولی۔ ''پولیس؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ پولیس ہی ہے؟''

کیرول نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں نے اپنے وقت میں بہت سی بے نشان پولیس کاریں دیکھی ہیں اور میں انہیں بہ خوبی پہچان لیتی ہوں۔''

''ہم دونوں نے دیکھی ہیں۔'' ڈورس نے کہا۔
اتنے میں داخلی دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔

کیرول کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اب ہم کیا کریں گے؟ اگر ان کے پاس تلاشی کا وارنٹ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟''

''گھبراؤ مت۔ اگر وہ پولیس ہے تو انہیں کچھ دیر روکے رکھنا۔ میں اس دوران جیولری کو کسی ایسی جگہ چھپاتی ہوں کہ وہ یقین کے ساتھ اسے تلاش نہ کرسکیں۔'' ڈورس نے کہا۔

کیرول ہچکچانے لگی۔

''مجھ پر بھروسا کرو، کیرول۔ کیا میں نے ہمیشہ انہیں اس سے پہلے چالاکی سے مات نہیں دی؟''

''آل رائٹ۔'' کیرول کچن سے نکل گئی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی احاطے میں جاپہنچی۔

جب ڈور بیل دوبارہ بجی تو کیرول نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔

''میں سراغ رساں سامنتھا ہوں۔'' ایک دراز قامت عورت نے کہا جو چشمہ پہنے ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے جالی دار دروازے کے پیچھے سے اپنا پولیس بیج بھی کیرول کے سامنے کردیا۔

''اور یہ سراغ رساں ریمنڈ ہے۔''

اس عورت کے ساتھ کھڑے ہوئے پستہ قد شخص نے بے مہری سے اپنا سر ہلا دیا۔

''جی؟'' کیرول نے کہا۔ اس کا ذہن تیزی سے یہ سوچنے میں مگن تھا کہ ان سے کوئی ایسی باتیں شروع کردے کہ وہ دروازے پر ہی رکے رہیں اور ڈورس کو زیادہ سے زیادہ وقت مل جائے کہ وہ جیولری کو کسی خفیہ جگہ چھپانے میں کامیاب ہو جائے۔ ''میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں؟ کیا کوئی پرابلم ہے؟''

''ہاں۔'' مرد سراغ رساں ریمنڈ نے غرانے کے انداز میں کہا۔ ''تم اسے پرابلم کہہ سکتی ہو۔ میگی ایڈکنسن نامی ایک بوڑھی عورت کی قیمتی ڈائمنڈ جیولری آج صبح اچانک غائب ہو گئی ہے۔ تمہیں اور تمہاری بہن کو اس بارے میں کوئی علم ہے؟''

''کیا؟ آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''تم لوگ میگی ایڈکنسن کو بہ خوبی جانتی ہو... یا ایسا نہیں ہے؟'' سراغ رساں ریمنڈ نے کہا۔

''جی ہاں یہ تو درست ہے۔ لیکن میں اب بھی نہیں سمجھی...'' کیرول نے معصومیت سے کہا۔

''تمہاری بہن کہاں ہے؟'' سراغ رساں ریمنڈ نے پوچھا۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' کیرول نے کہا اور پلٹنا چاہا کہ اسے اپنے عقب سے ڈورس کی آواز سنائی دی۔

''میں یہاں ہوں، کیرول۔'' ڈورس نے آگے آتے ہوئے کہا۔ اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ''ہاں، ہم لوگ میگی اور دیگر کے ساتھ تقریباً ہر ہفتے سڑک کے آخر میں واقع چرچ میں بنگو کا گیم کھیلا کرتے ہیں۔''

پھر ڈورس نے جالی دار دروازے کی چٹخنی گراتے ہوئے کہا۔ ''پلیز، اندر آجائیں۔ باہر بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔''

''تم لوگوں کی کار کو نقب زنی کی جائے واردات سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔'' سراغ رساں خاتون سامنتھا نے کہا۔

''ہماری کار؟ نقب زنی؟'' ڈورس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ کیرول کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔

''ہاں، نقب زنی۔'' سراغ رساں سامنتھا نے کہا۔ ''مس میگی ایڈکنسن کے بیڈروم کی عقبی کھڑکی کو زبردستی کھولا گیا اور ان کے جیولری بکس کو خالی کیا گیا ہے۔ مس میگی کا پلان تھا کہ وہ یوم تشکر اپنے بیٹے کے گھر منائیں گی لیکن آدھے راستے پہنچ کر ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ سو وہ واپس گھر کی جانب چل پڑیں۔ عین اس لمحے جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو انہوں نے تمہاری ٹارس کار کو اپنے گھر سے نکلتے اور گلی میں روانہ ہوتے دیکھ لیا۔''

ڈورس تیزی سے پلکیں جھپکانے لگی۔ ''لیکن میں تو یہاں اپنا ذاتی ہالیڈے ڈنر تیار کرنے میں مصروف رہی ہوں۔ ٹرکی کو روسٹ کرنا، آلوؤں کو میش کرنا، گاجروں کو چھیلنا... میں انہی کاموں میں لگی ہوئی تھی اور کیرول بھی یہاں میرے ساتھ تھی۔''

کیرول نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ''یہ بالکل درست ہے۔ بے چاری میگی۔ یقیناً اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

سراغ رساں ریمنڈ دونوں بہنوں کو غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم یہ توقع رکھتی ہو کہ ہم اس بات پر یقین کر

لیں گے؟‘‘

’’آپ لوگ یقین کیوں نہیں کریں گے؟‘‘ ڈورس نے پنسل سی باریک سیاہ بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔

’’پہلی بات تو یہ کہ مس میگی نے جو لائسنس پلیٹ نمبر ہمیں دیا ہے، وہ تمہاری کار کا ہی نمبر ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ تم دونوں کے گزشتہ واقعات بھی ہمارے سامنے ہیں اور انہیں کسی طور پر اچھا نہیں کہا جاسکتا۔ تم دونوں کو ماضی میں جیولری کی چوری کے الزامات میں حراست میں لیا جاچکا ہے۔‘‘

’’لیکن کبھی مجرم ثابت نہیں کیا جاسکا۔‘‘ ڈورس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر ایک تسکین بخش مسکراہٹ ابھر آئی۔ ’’ہم ہمیشہ ہی بے گناہ اور معصوم رہے ہیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے، کیرول؟‘‘

کیرول اپنے سنہری بالوں والے سر کو زور زور سے تائید میں ہلاتے ہوئے بولی۔ ’’ہاں، تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو، ڈورس۔ ہم دیانت دار شہری ہیں... آفیسر۔‘‘

’’کیا تم یہ ثابت کرسکتی ہو؟‘‘ سراغ رساں سمانتھا نے کیرول سے کہا۔ اس کے گول شیشوں کی عینک کے عقب سے اس کی نیلی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

’’کیوں نہیں۔‘‘ ڈورس نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔

’’تو پھر ہم تمہارے گھر اور تمہاری کار کی تلاشی لیں گے۔‘‘ سراغ رساں سمانتھا نے کہا۔

’’ہوں۔‘‘ ڈورس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ’’تمہارا کیا خیال ہے، کیرول؟‘‘

’’مم... مجھے نہیں معلوم۔ میرا مطلب ہے کہ کیا ہمارے حقوق نہیں ہیں؟‘‘ کیرول نے کہا۔

’’یقیناً تمہیں حقوق حاصل ہیں۔‘‘ سراغ رساں ریمنڈ نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا پھر وہ ہنس دیا۔ ’’اسی طرح ہمیں بھی حقوق حاصل ہیں۔‘‘

کیرول نے استفہامیہ نظروں سے سراغ رساں کی طرف دیکھا۔

تب سراغ رساں ریمنڈ نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر انہیں دکھایا اور بولا۔ ’’ہمارے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے۔‘‘

’’اوہ!‘‘ کیرول کی آہ نکل گئی۔ ’’یہ تو بُرا ہوا ڈیئر۔ بہت ہی بُرا!‘‘ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

لیکن اگر ڈورس یہ سن کے خوف زدہ ہوئی تھی تو اس نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ’’آپ لوگ تلاشی لے سکتے ہیں۔‘‘ اس نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔

یہ سن کر سراغ رساں سمانتھا اور سراغ رساں ریمنڈ نے تلاشی لینا شروع کردی جبکہ وہ دونوں بہنیں لیونگ روم میں بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔

’’ہمارا ڈنر برباد ہوجائے گا۔‘‘ کیرول نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

’’ہم اسے دوبارہ گرم کرلیں گے۔‘‘ ڈورس نے دلاسا دیا۔

’’ہاں، ہمیں اس وقت تک تو انتظار کرنا ہی پڑے گا جب تک یہ لوگ جیولری تلاش...‘‘

ڈورس نے تیزی سے اسے گھور کر دیکھا تو کیرول نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور خاموش ہوگئی۔

ان دونوں بہنوں کو دونوں سراغ رسانوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو باری باری ہر کمرے کی تلاشی لینے میں مصروف تھے۔

بالآخر سراغ رساں ریمنڈ ٹہلتا ہوا لیونگ روم میں آگیا۔

’’اب مجھے تمہاری کار کی چابیاں چاہیے ہوں گی۔‘‘ اس نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے سے زیادہ درشتی تھی۔

’’بے شک۔‘‘ ڈورس نے جواب دیا پھر کارنس پر رکھا ہوا اپنا پرس اٹھانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

’’اسے خالی کردو۔‘‘ سراغ رساں ریمنڈ نے حکم دیا۔

’’ایکسکیوزمی؟‘‘

’’تلاشی کے وارنٹ میں تمام ذاتی اشیا بھی شامل ہیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے سراغ رساں ریمنڈ نے ڈورس کے ہاتھوں سے پرس لے لیا اور اس میں موجود تمام اشیا پلٹ دیں۔ پھر ان اشیا کو ٹٹولنے لگا۔ جب اسے اپنی دلچسپی کی کوئی شے دکھائی نہیں دی تو اس کے حلق سے مایوسانہ غراہٹ آواز نکلی اور وہ تلملا سا گیا۔

پھر کار کی چابیاں اٹھا کر گیراج کی سمت چل دیا۔

سراغ رساں سمانتھا اب بھی اندر کمروں کی تلاشی لے رہی تھی۔ گاہے بگاہے وہ اپنا سر نکال کر ان دونوں بہنوں کو بھی دیکھ لیتی تھی۔

بالآخر جب وہ دونوں سراغ رساں فارغ ہو کر ان دونوں بہنوں کے پاس لیونگ روم میں آگئے تو ڈورس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ’’کوئی دلچسپی کی چیز ملی؟‘‘

سراغ رساں نے اس بات پر ڈورس کو گھور کر دیکھا۔ لیکن سراغ رساں سمانتھا اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’تم شاید یہ سوچ رہی ہوگی کہ اس بار بھی تم بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی ہو لیکن آج کل...‘‘

ڈورس نے ایک سرد آہ بھری اور گویا ہوئی۔ ’’اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ تمہارے پارٹنر اور تمہیں ہمارے ساتھ ٹھنڈا ڈنر شیئر کرنے کے لیے دعوت دوں۔ لیکن یہ ایک غلطی ہوتی.... ہے نا کیرول؟‘‘

’’یقیناً ایک بڑی غلطی ہوتی۔‘‘ کیرول یہ کہتے ہوئے پیر پٹختی داخلی دروازے تک پہنچی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ ’’ہم تمہارے پورے ڈپارٹمنٹ کے خلاف مقدمہ دائر کرنا چاہیں گے۔ اب یہاں سے نکل جاؤ۔‘‘

ان سراغ رسانوں کے جانے کے بعد کیرول چہچہانے لگی۔

’’ہم نے کر دکھایا، ڈورس! بلکہ تم نے کر دکھایا۔ بے شک اب ہم میگی ایڈکنسن کے ساتھ کبھی بھی بنگو نہیں کھیل پائیں گے۔‘‘

’’تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔‘‘ ڈورس نے اپنی بہن سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ میگی کی مہربانی تھی کہ وہ ہر ہفتے اپنی ڈائمنڈ جڑاؤ جیولری کے بارے میں ہمیں خوب معلومات فراہم کرتی رہتی تھی۔‘‘

’’بے شک۔‘‘ کیرول نے کہا۔ ’’اس بات پر مجھے یاد آیا۔ تم نے اپنا وہ خفیہ خزانہ کہاں چھپا کر رکھا تھا جو ان سراغ رسانوں کو... بھرپور تلاشی لینے کے باوجود نہیں مل پایا؟‘‘

ڈورس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے کی ڈوربیل ایک بار پھر بج اٹھی۔

ڈورس نے دروازہ کھولا تو سراغ رساں سمانتھا اور سراغ رساں ریمنڈ کو دوبارہ سامنے پایا۔

’’ایک جگہ تو رہ گئی جو ہم نے نہیں دیکھی۔‘‘ سراغ رساں سمانتھا نے سیدھا کچن کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

’’ایک منٹ۔‘‘ ڈورس نے سراغ رساں خاتون کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا۔ کیرول بھی ان کے پیچھے چل پڑی۔

’’بنگو!‘‘ سراغ رساں سمانتھا نے ٹرکی کے خالی پیٹ میں سے مٹھی بھر جیولری نکالتے ہوئے نعرہ لگایا۔ ’’تم نے بہت ہوشیاری دکھائی کہ ٹرکی کے اندر سے بھرا ہوا مسالا نکال کر اس کی جگہ جیولری رکھ دی۔ جب ہم کار میں جا بیٹھے تو تب سراغ رساں ریمنڈ نے تبصرہ کیا کہ ٹرکی کی اسٹفنگ کا جو پیالہ بھرا ہوا کچن میں رکھا تھا، اس سے بے حد بھینی خوشبو آرہی تھی جس سے اس کی بھوک عود کر آئی تھی اور اس کے منہ میں پانی آگیا تھا۔ تب میں چونک پڑی۔ اسٹفنگ کے بھرے ہوئے پیالے کا مطلب تھا کہ ٹرکی کا پیٹ اندر سے خالی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ...‘‘ سراغ رساں سمانتھا نے شانے اچکاتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور مسکرانے لگی۔

دونوں بہنوں کے چہرے فق پڑ گئے۔

’’سراغ رساں ریمنڈ۔‘‘ سراغ رساں سمانتھا نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ ’’میرے خیال سے اب ہم ان خواتین کو ان کے حقوق پڑھ کر سنا سکتے ہیں۔‘‘

لڑکا، لڑکی

لڑکا: ’’میں آخری بار پوچھ رہا ہوں، کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟‘‘

لڑکی: ’’نہیں۔‘‘

لڑکا: ’’سوچ لو۔‘‘

لڑکی: ’’کہا نا نہیں۔‘‘

لڑکا: ’’ویٹر! باجی کا بل الگ بنانا۔‘‘

☆☆☆

لڑکا: ’’کہاں جا رہی ہو؟‘‘

لڑکی: ’’خودکشی کرنے۔‘‘

لڑکا: ’’تو اتنا میک اپ کیوں کیا ہے؟‘‘

لڑکی: ’’کل صبح اخبار میں فوٹو بھی تو آنی ہے۔‘‘

☆☆☆

لڑکے والے: ’’ہمیں ایسی لڑکی چاہیے جو زیادہ کھاتی پیتی نہ ہو۔ ہمیشہ چپ رہے اور سب کی سنے۔‘‘

لڑکی والے: ’’ایسی لڑکی تو پھر آپ کو ’’آئی سی یو‘‘ میں ہی ملے گی۔‘‘

راجا اسلم حیات کا بڑھے والا ضلع سرگودھا سے تعاون

جواری

احمد اقبال

آٹھویں قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

سکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک ا
جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... ہر ا
زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات او
حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری
رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولو
کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے او
یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہ
اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم
نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت او
نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر
انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور
ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے
ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو
نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی
لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی
بھی اور جگ بیتی بھی...
تجسس اور حیرانی کے
سارے رنگ دکھلاتی
جادو اثر تحریر...
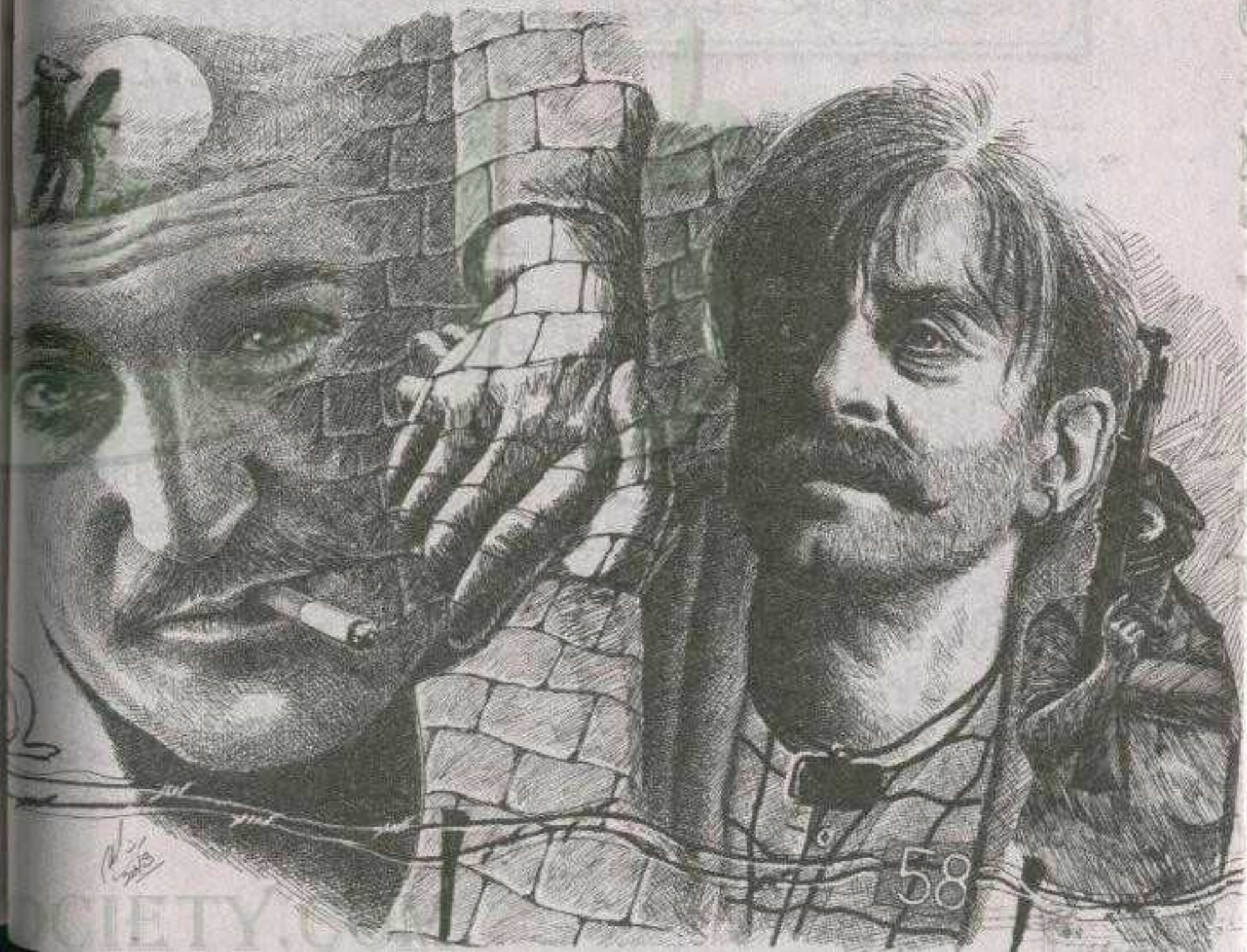
ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آ گئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا... نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آ گئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ اس نے اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا، نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ یہاں جانے میں خطرہ تھا کیونکہ خاور کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ یہ ہوٹل غیر محفوظ ہونے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آ گئے۔ خاور اور نورین وہاں سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ایئرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو پٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس نے ایک تصویر دکھائی جو نورین کی لگتی تھی مگر وہ نازی کی بہن تھی۔ اسے کسی وڈیرے کے بیٹے نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا تھا اور آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانیوال کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک بے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نادر شاہ کے آدمی آ گئے اور نورین اور خاور کو لے گئے لیکن راستے میں نورین نے جانے کیا کیا کہ گاڑی حادثے کا شکار ہوئی۔ خاور بچ گیا مگر نورین کا پتا نہ چل سکا۔ خاور نے رحیم بخش نامی شخص کے گھر میں پناہ لے لی۔ مقامی چودھری رحیم بخش کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند تھا۔ رحیم بخش کو قتل کر دیا گیا اور ریشم اور خاور کو چودھری کے گرگے اٹھا کر لے گئے۔ خاور کو قید کر دیا گیا تاہم وہ اکبر کے بھائی انور کے ساتھ رہا ہو گیا اور انور نے حویلی پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ ریشم بھی حویلی میں ہی تھی۔ چودھری انور نے اکبر کو قید کر دیا۔ اکبر اور خاور کو حویلی سے نکال کے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ تاہم کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ حویلی میں قید کر دیا گیا۔ ادھر بڑے چودھری کو دل کا دورہ پڑا لیکن اس نے اسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام کام گھر پر ہی کیے جائیں۔ خاور اور انور نے اسپتالوں کو ایکوپمنٹ سپلائی کرنے والی کمپنی سے رابطہ کیا۔ وہیں ایک شخص نے خاور کو فریدالدین کی حیثیت سے شناخت کیا تاہم خاور نے انکار کر دیا۔ انور اسے لے کر شناختی کارڈ آفس گیا اور ملک سلیم اختر کے نام سے نیا شناختی کارڈ بنوا دیا۔ واپسی میں خاور اور انور کی گاڑی پر نامعلوم افراد نے حملہ کر دیا۔ تاہم وہ دونوں محفوظ رہے اور ڈرائیور مارا گیا۔ ایکوپمنٹ کمپنی کے اہلکار ساز و سامان لے کر حویلی پہنچ گئے اور بڑے چودھری کے کمرے کو اسپتال جیسا بنا دیا۔ کمپنی کے ورکر نے خاور کو فریدالدین کی حیثیت سے پہچان لیا مگر اس بات کو راز میں رکھنے کا وعدہ کیا۔ حویلی میں کوئی سازش ہو رہی تھی۔ ایک گارڈ کی موت کے بعد انور نے تمام گارڈ بدلنے کا فیصلہ کیا۔ بڑے چودھری والدین کی قبروں پر پھول چڑھانے کی غرض سے قبرستان گئے۔ انور اور خاور بھی ہمراہ تھے۔ دو قبریں دھنس رہی تھیں۔ انور آگے بڑھا مگر اچانک ہی غائب ہو گیا جیسے اسے زمین نے نگل لیا ہو۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس سے پہلے کہ میں اپنی پریشانی اور تشویش ظاہر کرتا، میں نے چودھری کی پُروحشت آواز سنی۔ ''انور! پتر انور... اوئے کدھر گیا میرا انور...'' وہ دیوانہ وار چلایا اور قبر میں جھانکنے دوڑا۔

میں نے اسے پکڑ لیا ورنہ شاید وہ اس گڑھے میں خود بھی گر جاتا۔ میں کنارے پر تھا، مجھے خود کو بھی سنبھالنا پڑا۔ اسی وقت گڑھے میں سے انور کی آواز سنائی دی۔ ''میں ٹھیک ہوں اباجی... کچھ نہیں ہوا مجھے۔''

میں نے تاریکی میں جھانکا۔ وہ تاریکی میں کسی سائے کی طرح نظر آتا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر بڑھایا اور میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اسے کھینچ لیا۔ گڑھے کے کناروں کی ساری مٹی اس کے کپڑوں پر، چہرے پر اور بالوں پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے یہ گرد جھاڑنے میں اس کی مدد کی۔

انور نے مالی سے کہا۔ ''جا ٹارچ لے کر آ۔''

بدحواس مالی کے حلق سے بڑی مشکل سے آواز نکلی۔ ''وہ تو نہیں ہے جناب عالی۔''

''سؤر کے بچے... جا کے حویلی میں سے لا۔'' چودھری دہاڑا۔ ''یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔ ابھی گاڑتا ہوں میں تجھے اس میں۔''

مالی جو پارٹ ٹائم گورکن اور قبرستان کا رکھوالا بھی تھا، دہشت زدہ ہو کے دوڑا۔

''ملک! یہ تو کچھ اور ہی چکر ہے۔'' انور نے میری طرف جھک کے سرگوشی کی۔

اس کے لہجے میں بے یقینی تھی اور وہ خود بھی تھوڑا سا بدحواس لگتا تھا لیکن چند منٹ میں اس نے خود کو سنبھال لیا۔

بڑے چودھری کی پوری کوشش تھی کہ وہ اندھیرے گڑھے میں کچھ دیکھ لے مگر اس وقت رات تھی اور چودھری کی نظر روشنی میں بھی مشکل سے دیکھتی تھی۔ اس کی عینک کے موٹے شیشے شاید کئی سال سے بدلے نہیں گئے تھے۔

میں نے چودھری صاحب کا بازو تھاما۔ ''آپ چلیں چودھری صاحب! کچھ نہیں ہوا انور کو۔''

انور نے بھی کہا۔ ''قبریں پرانی ہیں۔ بارش کا پانی اندر چلا جاتا ہے تو نیچے سے کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔''

چودھری نے خفگی سے بازو نہیں چھڑایا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''اس سے کہو کہ آج رات اسے بھرے ورنہ صبح میں اس کے اوپر مٹی ڈلوا دوں گا۔'' عادت کے مطابق اس نے مالی کی ماں بہن ایک کرتے ہوئے کہا اور ہمارے ساتھ آہستہ آہستہ حویلی کی طرف چل پڑا۔

حویلی کے اندر میڈیکل ایکوپمنٹ سپلائی کمپنی کے دونوں نمائندے اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے اور منتظر تھے کہ چودھری صاحب پر ان کی مشینوں کو آزما کے دیکھ لیا جائے لیکن چودھری ابھی کچھ نروس تھا۔ وہ کچھ دیر اپنے عارضی بیڈروم میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب وہ مریض کی طرح اپنے پرانے بیڈروم میں مستقل قیام کے خیال سے گریزاں ہے۔ پہلے واقعی وہ ایک پرتعیش بیڈروم تھا جس میں اس نے شادی کے بعد تقریباً نصف صدی گزاری تھی۔ اب وہ ایک جدید کارڈیک کیئر یونٹ کا وی آئی پی روم تھا جو ہر قسم کے آرام و آسائش کے باوجود اسپتال کا کمرا لگتا تھا۔

انور نے خود راجا ریاست سے بات کی۔ ''اباجی تھوڑے سے نروس ہیں۔''

''وہ قدرتی بات ہے۔ آپ انہیں قائل کریں اور لے آئیں۔''

''وہ آ جائیں گے۔ دراصل ابھی قبرستان میں ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اس نے انہیں دہشت زدہ کر دیا تھا۔'' انور بولا۔

ہم کمرے کے باہر برآمدے میں آ گئے۔ ''ملک! میں تجھے کچھ بتانا چاہتا تھا۔ وہ صرف ایک گڑھا نہیں تھا۔ آ میرے ساتھ چل... میں تجھے دکھاتا ہوں۔ یہ نہ ہو وہ پاگل اس کو بھرنے لگے۔''

میں نے کہا۔ ''گڑھا نہیں تھا تو کیا تھا؟''

''یار! مجھے یقین نہیں آتا مگر اس میں کوئی سرنگ ہے۔''

میں تقریباً اچھل پڑا۔ ''سرنگ؟''

''ہاں، وہاں سے کوئی راستہ نکالا گیا ہے یا نکالا جا رہا ہے۔''

''کہاں کے لیے؟''

''شاید... شاید کیا یقیناً حویلی کے اندر جانے کے لیے... اور کہاں جائے گا کوئی؟''

''مگر... یہ مشکل... بلکہ ناممکن ہے۔''

''مشکل ہے یقیناً... مگر ناممکن نہیں... میں گرنے سے کچھ اپ سیٹ تھا اور اندھیرا ابھی تھا۔ میں دیکھ نہیں سکا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ اباجی کا خیال تھا۔''

''اب چل کے دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ایک پُرخوف تجسس میرے اندر بھی بیدار ہو گیا تھا کیونکہ رفتہ رفتہ ایک سازش کے خدوخال میرے ذہن میں بھی واضح ہونے لگے تھے۔ گزشتہ دنوں کے پُراسرار واقعات کے تانے بانے بھی آپس میں مل کر سازش کی تفصیل میں شامل ہو رہے تھے۔ میرا گزشتہ رات کسی سائے کو صحن عبور کرتے دیکھنا... عین اسی وقت چند منٹ کے لیے فیوز اڑنا... پھر چوکیدار کا قتل، سب کے مقاصد واضح ہونے لگے تھے۔

قبرستان کے رکھوالے کی حالت غیر تھی۔ چودھری صاحب کی دھمکی بہت واضح تھی اور وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ اس کا سنگین جرم کس درجہ ناقابل معافی ہے۔ واپس جائے واردات پر پہنچ کے ہمیں وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا مگر وہ ٹارچ کے ساتھ گڑھے میں اترا ہوا تھا۔ اوپر آنے والی ہلکی سی روشنی نے اس کا سراغ دیا۔ انور نے اسے اوپر آنے کا حکم دیا۔

وہ لرزہ براندام اس مدفن سے نکلا اور ایک دم انور کے پیروں سے لپٹ گیا۔ ''حضور... جناب عالی! قسم اللہ کی... رسول کی... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ قبر کو کس نے کھودا اور کب کھودا... میں دیکھتا تو سر نہ پھاڑ دیتا۔ یہ ٹھیک ہے، اس طرف بہت دن سے میرا آنا نہیں ہوا تھا۔''

انور نے اسے کھینچ کے اوپر اٹھایا۔ ''مجھے تمہاری نیت پر شک نہیں۔ لیکن غفلت تم نے کی اور اس سے کسی نے فائدہ اٹھایا۔''

''جنابِ عالی! میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردیں۔ ساری عمر آپ کا نمک کھایا ہے میں نے... بڑھا ہوگیا ہوں آپ کی خدمت کرتے کرتے۔ اس کا خیال کریں۔ رحم کریں مجھ پر۔'' وہ اب ہچکیوں سے رو رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔

انور نے ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس نے روشنی کے دھارے کا رخ قبر کے اندر کیا۔ اندھیرے میں سے ایک گہرے گڑھے کے خدوخال واضح ہوئے جو تقریباً قبر کی لمبائی کے برابر تھا۔ اوپر سے قبر سلامت نظر آتی تھی۔ اس کے سرہانے کا کتبہ بھی کھڑا ہوا تھا مگر پیروں کی طرف سے وہ حصہ کھودا گیا تھا جو قبرستان کی بیرونی دیوار کے ساتھ تھا۔ پیروں کی طرف مٹی کا ایک ڈھیر تھا اور قبر کے اندر لگائی جانے والی پتھروں کی سلوں کو دیوار کے سہارے کھڑا کردیا گیا تھا۔ چودھری صاحب اور ان کے برخوردار جمعرات کی شام کو روایت کے مطابق ذرا سی دیر کے لیے قبرستان کا رخ کرتے تھے۔ وہ چراغ جلا کے اگربتیاں سلگاتے تھے اور چودھری صاحب اپنے ماں باپ کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے بعد لوٹ جاتے تھے۔ وہاں آس پاس شاید بیس بائیس قبریں اور بھی تھیں۔ وہ سب ان کے دادا پردادا کی اور چاچے تایوں کی ہوں گی۔ چند قبریں بچوں کے مدفون ہونے کی نشاندہی بھی کرتی تھیں۔ جس قبر کو کھودا گیا تھا، وہ یقیناً غیر اہم تھی اور آخر میں ہونے کے علاوہ بہت پرانی تھی۔ پھر یہاں تدفین کے اسباب کا ڈھیر تھا چنانچہ اس کے کھودے جانے کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی۔

قبر کے پیروں کی جانب کا شگاف یا گڑھا تین فٹ کے دائرے سے کچھ کم تھا اور اسے چھپانے کے لیے اوپر ایک تختہ رکھ کر کچھ مٹی ڈال دی گئی تھی اور سوکھی شاخوں کو پھیلا دیا گیا تھا۔ سرنگ کھودنے پر مامور لوگ رات کو آتے ہوں گے تو رات بھر کام کرنے کے لیے اسے ہٹا کے اندر اترتے ہوں گے اور صبح جانے سے پہلے تختہ واپس جما کے اوپر مٹی، گھاس پھوس اور خشک پتوں کا ڈھیر ڈال جاتے ہوں گے۔ یہ محض اتفاق یا سازش کرنے والوں کی شامتِ اعمال تھی جس نے چودھری صاحب کو ادھر بلا لیا جدھر وہ عام طور پر نہیں جاتے تھے۔ انور کا پیر تختے پر پڑ گیا اور تختہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ انور کا وزن برداشت کرسکتا، نتیجہ یہ کہ انور قبر کے اندر اتر گیا۔

اس حادثاتی انکشاف نے ہم دونوں پر خطرات کے چودہ طبق روشن کردیے۔ انور کی زندگی پر ایک قاتلانہ حملہ براہِ راست کیا جاچکا تھا اور میں مستعدی سے قاتل کو بروقت شوٹ نہ کردیتا تو اس کی گولی انور کا خاتمہ کردیتی۔ وہ بالکل سامنے آگیا تھا اور یقیناً کرائے کا قاتل تھا۔ عرفِ عام میں خودکش حملہ آور... جسے معلوم تھا کہ اس قاتلانہ مشن کی کامیابی یا ناکامی... ہر صورت میں اس کی اپنی زندگی کی سلامتی کے امکانات ایک فیصد بھی نہیں۔ خود انور اسے نہ مار سکا تو اس کے قتل کے بعد حویلی کے محافظ گھیر کر مار دیں گے اس لیے اپنی زندگی کی بازی لگانے کی اچھی خاصی قیمت ایڈوانس وصول کرلی ہوگی۔ یہ رقم اس کے کام تو نہ آئی۔ معلوم نہیں اس کے بیوی بچوں کے یا ماں باپ کے کسی مالی مسئلے کو حل کرنے میں کتنی معاون ثابت ہوئی تھی۔

دوسری کوشش چند دن قبل ہوئی تھی جب شہر سے واپسی پر تاریکی میں چھپے بیٹھے مسلح افراد نے گاڑی پر فائرنگ کی تھی۔ اس میں ڈرائیور کی جان گئی تھی اور ہم بال بال بچے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انور کی جان کے درپے کسی کے سازشی ذہن نے پورا پلان بنالیا تھا جس میں ایک کوشش کی ناکامی کے بعد دوسرا منصوبہ موجود تھا۔ اب میں اسے بھی قاتلانہ حملے کی کوشش ہی سمجھ سکتا تھا کہ جب میں راجا ریاست کے ساتھ بیٹھا تھا تو میں نے تاریکی میں ایک سائے کو بڑی تیزی سے حویلی کا صحن عبور کرکے برآمدے کی طرف غائب ہوتا دیکھا تھا۔ لائٹ صرف دس منٹ کے لیے غائب ہوئی تھی۔ رات کے گارڈ فیوز چیک کرنے گئے تھے۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کے کوئی اندر آگیا تھا۔ اندر آنے سے پہلے وہ زہر آلود چائے پلا کے گارڈ کو ختم کرچکا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس وقت سب سو رہے تھے مگر میں، راجا ریاست سے اس کی آپ بیتی سن رہا تھا اور میری نظر نے مداخلت کار کو دیکھ لیا تھا۔ ظاہر ہے وہ حویلی کے اندر آدھی رات کے وقت سیر کرنے نہیں آیا تھا۔ برآمدے میں تین کمرے تھے اور میرے شک کے مطابق وہ بھابی کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ دوسرا کمرا ریشم کا اور تیسرا خود انور کا تھا۔ مجھے وہاں کسی کا سراغ نہیں ملا تھا۔

انور نے اس امکان کو یکسر مسترد کردیا تھا کہ یوں اندر آنے والا کوئی بھابی کا چاہنے والا ہوگا۔ اس حویلی کی روایات میں محبت یا ناجائز تعلقات کا عورت کے لیے ایک ہی انجام تھا... موت۔ چنانچہ کوئی عورت خودکشی کا سوچتی بھی نہیں تھی۔ اور بھابی جیسی بھی تھی، اکبر کی وفادار تھی۔ اپنے شوہر کو ایک حقیقی مشرقی عورت کی طرح چاہتی بھی تھی۔ چنانچہ شک کا نشانہ بھی براہِ راست بھابی بنتی تھی۔ یہ ہوسکتا تھا

کہ وہ اپنے شوہر کو جیل سے رہائی دلوا کے پھر حاکم بنانے کے پلان بنا رہی ہو۔ اس کی اپنی تمام شان و شوکت اپنے شوہر کی حاکمیت سے وابستہ تھی۔ اب وہ قید میں تھا تو بھابی کی کوئی اہمیت یا اوقات نہیں رہی تھی۔ اس بات کا بھی پورا امکان تھا کہ بھابی کو پسِ پردہ کسی کی حمایت حاصل ہو۔ مثلاً اکبر کے کسی جانثار کی یا اپنے والد ماجد حضرت پیر و مرشد اظہر علی سہروردی کی۔ مجھے وہ شخص ایک بہروپیا لگتا تھا جسے بھابی نے درویش بنا کے پیش کیا تھا۔

شاہینہ بھابی خود یہ سب پلان نہیں کرسکتی تھی۔ وہ عورت تھی اور اس حویلی میں اس کی تمام نقل و حرکت پر سب کی نظر تھی۔ اس کے رابطے اور وسائل بھی محدود تھے چنانچہ یہ بات تقریباً حتمی تھی کہ اس کے پیچھے ہاتھ کسی اور کا تھا۔ قبر کے اندر سے حویلی میں پہنچنے کا خفیہ راستہ بنانا بیک وقت بے وقوفی تھی اور ذہانت بھی۔ بے وقوفی اس لیے کہ کسی مرحلے پر سرنگ کھودنے والے نظر میں آسکتے تھے۔ کہیں سے زمین بیٹھ جاتی تو وہ بھی دفن ہوجاتے اور یہ راز بھی راز نہ رہتا یا آخری وقت میں انور کے کمرے کے عین نیچے پہنچ جانے کے بعد کسی کو آہٹ یا ارتعاش محسوس ہوتا۔ اس کا پلان بھی ہوگا کہ فرش میں سے براہِ راست انور کے کمرے میں طلوع ہو... یہ اتنا آسان نہ تھا تاہم پلان کی ذہانت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

قبر کے اندر اترنے سے پہلے یہ سب خیالات میرے ذہن میں ایک ساتھ گزر گئے۔ یوں جیسے میں نے واقعات اور امکانات کی ایک پوری فلم خواب کی طرح ایک لمحے میں دیکھ لی۔ گھوم پھر کے میرا یقین اور شک بھابی پر مرتکز ہوگیا۔

نیچے ایک ساتھ دو افراد کے اترنے یا کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی۔ انور نیچے اترا پھر اس نے مجھے روشنی دکھائی۔ میں احتیاط سے بیٹھ کے اترا پھر بھی کچھ مٹی میرے ساتھ گری۔ انور نے ٹارچ کی روشنی کو مخالف سمت میں گھمایا۔ میں نے زمین کے نیچے تین فٹ قطر کی ایک سرنگ دیکھی۔ یہ سب کچی تھی۔ اس میں گہرائی کی نم آلود مہک تھی۔ تیز روشنی میں مجھے چیونٹے اور دیگر بہت سے کیڑے مکوڑے رینگتے نظر آئے جن کو روشنی نے بدحواس کردیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس خیال سے رگوں میں میرا خون منجمد ہوگیا کہ ایک دن میرے وجود کو بھی انہی حشرات الارض کا رزق بنا کے قبر میں اتارا جائے گا۔ وہ رزاق اسی طرح پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔

انور نے میری طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ ''کیا آگے جانا ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''یہ خطرناک کام ہے۔ زمین بیٹھ سکتی ہے، ہمارا دم گھٹ سکتا ہے۔ اور فائدہ کیا... ہمیں معلوم تو ہوگیا سب۔''

''سرنگ ابھی بیس فٹ ہی کھودی گئی ہے۔''

''صبح ہم کسی کو آگے تک بھیج سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''سرنگ کی ڈائریکشن حویلی کے اس حصے کی طرف ہے جہاں میرا بیڈروم ہے۔'' انور بولا۔

''ظاہر ہے... اتنی محنت کرنے والا سمت کے غلط ہونے کا رسک کیسے لے سکتا ہے۔ نشانہ بھی تو تھا لیکن یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ کوئی ساتھ والے کمرے میں جا نکلتا... شاہینہ بھابی کے کمرے میں... اور وہاں چھپ کے مناسب وقت اور موقع کا انتظار کرتا مگر یہ سب ہمیں یہاں ڈسکس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

انور میرے ساتھ باہر آگیا جہاں بڈھا گورکن گھٹنوں میں سر دیے مسلسل ایک بات دہرا رہا تھا۔ ''یا ربا! میرے گناہ معاف کر۔'' یوں لگتا تھا جیسے اس کو جینے کی کوئی آس یا آرزو نہیں رہی۔ وہ ایک ناقابلِ معافی غفلت کے جرم کا مرتکب ہوا تھا اور چودھریوں کے ضابطۂ اخلاق اور ضابطۂ فوجداری میں اس کی کم سے کم سزا موت بنتی تھی۔ اس سے کہیں کم سنگین بلکہ معمولی غلطیوں پر اس نے نمک حراموں کو دفن ہوتے دیکھا تھا۔ اب تک زندگی کا سفر ایسی سزا کے سارے مواقع سے بچ کر جارہا تھا تو یہ اس کی خوش قسمتی تھی جس کی لکیر یہاں آکے ختم ہوگئی تھی۔

انور نے اسے ٹھوکر تو نہیں ماری مگر پیر سے چھوا۔ ''بابا! اب رونے سے کیا فائدہ؟''

بڈھا خاموشی سے کھڑا ہوگیا اور کانپتا رہا مگر اس نے رحم کی مزید اپیل دائر نہیں کی۔ اس کا مسترد ہوجانا یقینی تھا۔

انور نے کہا۔ ''یہ بتاؤ، تم نے پچھلے چند دنوں میں کسی کو یہاں آتے جاتے دیکھا؟''

بڈھے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں سرکار۔''

''وہی کون؟ تم جانتے ہو سب کو؟''

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''بڑے چودھری صاحب اور پیر صاحب... یا ان کے گھر والے۔''

''یہ لوگ تو جمعرات کو آتے ہیں۔ فاتحہ پڑھ کے چلے جاتے ہیں یا برسی پر... یاد کرو... ایسے کون لوگ تھے جو

ہمارے خاندان کے نہیں تھے؟‘‘

’’باہر والے بھی آتے ہیں سرکار... سب کو جانتا ہوں میں۔‘‘

’’اچھی طرح سوچ لو پھر مجھے آ کے بتانا ان کے نام... کیا رات کے وقت یہاں تم نے کسی کو دیکھا؟‘‘

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’عشاء کی نماز کے بعد میں کوٹھری سے نہیں نکلتا سرکار۔ ہم بڈھا بڑھیا کھانا کھا کے سو جاتے ہیں۔‘‘

’’پچھلے ایک ہفتے میں یا اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا کہ تم نے کوئی آواز سنی ہو باہر... جیسے کوئی زمین کھود رہا ہو یا کسی کے باتیں کرنے کی... بہت رات گئے؟‘‘

’’نہیں جنابِ عالی! میرے کان اس عمر میں بھی خراب نہیں ہوئے۔ شک ہوتا تو باہر نکل کے ضرور دیکھتا۔‘‘

انور نے سر ہلایا۔ ’’چلو ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ جانتے بوجھتے تم نے کوتاہی نہیں کی۔ لیکن یاد رکھو، اگر مجھے ذرا بھی شک ہوا یا کوئی بات ایسی معلوم ہوئی مجھے... کہ تم نے لالچ یا دھمکی سے ڈر کے کسی کا ساتھ دیا تھا... صرف خاموش رہنا بھی ساتھ دینا ہے تو تمہاری لاش اس درخت سے لٹکی رہے گی، جب تک چیل کوّے تمہارا سب گوشت نوچ کے نہیں کھا جاتے۔ ابھی تم جاؤ اور اپنا منہ بند رکھنا۔ کسی سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کرنا ہے۔ آئی بات سمجھ میں؟‘‘

بڈھے نے سر ہلایا اور ایک دم انور کے پیروں میں گر پڑا۔ ’’آپ بے شک مجھے زندہ گاڑ دیں مگر مجھ پر شک نہ کریں سرکار... اس عمر میں نمک حرامی نہیں کر سکتا میں۔‘‘

انور کوئی جواب دیے بغیر میرے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری طرح اس کے ذہن نے بھی سازش کو اوّل تا آخر دیکھ اور سمجھ لیا ہے۔ قبرستان کی بیرونی دیوار کے قریب وہ رک گیا۔ ’’یہ کتنا فاصلہ ہوگا؟‘‘

میں نے ایک نظر سے جائزہ لیا۔ ’’تقریباً چالیس فٹ۔‘‘

’’یعنی بیس فٹ کھودنے کی مہلت مل جاتی تو کوئی حویلی کے اندر ہوتا؟‘‘

’’ہاں... اور کہاں ہوتا؟ یہ بھی دیکھ...‘‘

انور نے سر ہلایا۔ ’’پچھلی طرف سے کسی ایک کمرے میں... تین کمرے ہیں ایک سیدھ میں جن کے سامنے ایک برآمدہ ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اس پر مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تُو نے اور میں نے گزشتہ دنوں کے پُراسرار واقعات سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، ایک ہی ہیں۔‘‘

’’مجھے بھی ذرا دیر سے خیال آیا ورنہ میں اباجی کو بھی روک دیتا، وہ کسی کے سامنے کوئی بات نہ کریں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’انہوں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ دیکھا تو صرف یہ کہ ایک قبر دھنس گئی تھی اور تو اس میں گر گیا تھا اور ان کے نزدیک یہ گورکن کی کوتاہی تھی۔‘‘

’’میں بتا دوں گا کہ بڈھے کو میں نے معاف کر دیا ہے۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ اب زیادہ دن کی بات نہیں... جو بھی تیرے خلاف سازش کر رہا ہے، اس سے زیادہ ناکامی کا دباؤ نہیں لے سکے گا۔ اس کے پلان محض تیری خوش قسمتی سے نہیں فیل ہو رہے ہیں... اس کی اپنی پلاننگ بھی ناقص ہے۔ وہ جلدی میں ہے۔‘‘

انور نے بے خیالی میں کہا۔ ’’تُو جانتا ہے کہ وہ کون ہے؟‘‘

’’تُو بھی جانتا ہے پھر ہمیں نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے صبر کا حوصلہ جواب دے جائے گا تو وہ نڈر بن کے براہِ راست سامنے سے حملہ کرے گا۔ اس کے اعصاب پر دباؤ ہے۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دے جائے گی بہت جلد... چنانچہ تجھے خود کو اس کی دیوانگی کے وار سے بچانا ہے۔‘‘

’’ایسا تو کوئی دفاع ممکن نہیں۔‘‘

’’اس پر ہم پھر بات کریں گے۔ ناممکن کچھ نہیں ہوتا انور... خود پر اور خدا پر اعتماد رکھ۔‘‘

بظاہر حویلی میں سب نارمل تھا۔ بڑے چودھری کو نہ چاہنے کے باوجود اس کمرے میں جانا پڑا تھا جو اس کی اپنی فرمائش پر تیار کیا گیا تھا۔ ابھی نہ نرس آئی تھی اور نہ ڈاکٹر جلالی بصد اہتمام وارد ہوئے تھے۔ نرس کو بھی یہاں چوبیس گھنٹے رہنا تھا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس میں دن رات کی تیمارداری سے زیادہ مشکل مریض کے رویّے اور خبطی پن کو برداشت کرنا تھا۔ ہم نے نرس کا انتخاب ڈاکٹر جلالی پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ خود جسے اپنے لیے بھی مناسب سمجھیں، لے آئیں۔ معاوضے کی کوئی حد نہیں تھی۔ کوئی بھی نرس اس مشکل ذمے داری کے لیے صرف انتہائی غیر معمولی اور منہ مانگے معاوضے کے لالچ میں ہی تیار ہو سکتی تھی۔ خود ڈاکٹر جلالی کا یہاں آنے پر راضی ہونا محض ہماری خوش قسمتی ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ امید یہ تھی کہ آئندہ ایک دو روز میں سب ہو جائے گا۔

راجا ریاست اور اس کے ساتھی انجینئر نے چودھری صاحب پر مشینوں کی کارکردگی کو آزما لیا تھا اور اوکے کر دیا تھا۔ انور نے ان کو فائنل پیمنٹ کا چیک دیا تو انہوں نے یقین دلایا کہ وہ رابطے میں رہیں گے اور تمام مشینوں کی دیکھ بھال ان کی ذمے داری ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے راجا ریاست جانے سے پہلے مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا لیکن خود میں نے اس کا موقع نہیں دیا۔ کوئی بات تھی تو وہ مجھے بعد میں بھی فون کر سکتا تھا اور مجھ سے مل بھی سکتا تھا۔ ابھی ہم ایک دوسرے کے رازدار رہنے کے پابند تھے۔ اس سے دونوں کا مفاد اور سلامتی وابستہ تھی۔ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد چودھری صاحب نے انور سے قبرستان پر بات کی۔

’’پتر انور! میں کچھ گھبرا گیا تھا مگر اللہ نے بڑی خیر کی... تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’مجھے کچھ نہیں ہوا اباجی!‘‘ انور نے خوش دلی سے کہا۔ ’’معمولی حادثہ تھا۔‘‘

’’مگر یہ بڑی بدشگونی کی بات ہے۔‘‘ چودھری صاحب نے تشویش کے ساتھ بڑی چودھرائن کی طرف دیکھا۔ ’’تم کل کچھ صدقے کے لیے بکرے قربان کرو اور مولوی صاحب کو بلا کے نیاز دلواؤ۔ شام تک سات دیگ چاول کی خیرات کرو۔‘‘

انور نے کہا۔ ’’چھوڑیں اباجی... جب میں بالکل ٹھیک ہوں اللہ کے فضل و کرم سے۔‘‘

’’اوئے انور! اللہ کے فضل و کرم کا شکر تو ادا کرنا لازم ہے... اور ہم ایسے ہی کرتے ہیں۔‘‘

بڑی چودھرائن خاصی متفکر اور افسردہ تھی۔ ’’میں نے کہہ دیا ہے پہلے ہی کل سے۔‘‘

میں کن انکھیوں سے بھابی شاہینہ کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ بھی اس ناخوشگوار واقعے کو منحوس ہی قرار دے رہی تھی اور اس کی نحوست کے اثرات کو زائل کرنے کے تمام مروجہ اور آزمودہ طریقے آزمانے کے حق میں تھی۔ ’’میں والد صاحب سے کہہ چکی ہوں کہ وہ اپنے آستانے پر آیت کریمہ کا ورد کرائیں اور خصوصی دعا... انہوں نے ایک وظیفہ کرنے کا بھی کہا ہے۔‘‘

شاہینہ اپنے باپ کو والد صاحب اور اپنے سسر کو شادی کے بعد چاچاجی کہنے لگی تھی۔ بڑے بھائی کی پیری مریدی پر انور کے گھر میں کسی کا اعتقاد نہ تھا بلکہ الٹا کچھ اس کو ڈراما ہی سمجھا جاتا تھا لیکن شاہینہ کے سامنے کوئی اس کا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ اس وقت بھی بھابی کی بات کو کسی نے اہمیت نہیں دی۔

بڑے چودھری صاحب نے انور کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ’’اس خبیث نوں بلا ذرا۔‘‘

انور سمجھ گیا کہ ان کا مخاطب کون ہے۔ ’’چھوڑیں اباجی! اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ پرانی قبریں بارش میں دھنس جاتی ہیں۔ نیچے کی مٹی نکل جاتی ہے، اوپر سے پتا نہیں چلتا۔‘‘

’’لیکن یہ کام ہے اس کا... بھرائی کرے اور دیکھتا رہے۔ حرام خور مفت کی روٹیاں توڑتا ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیے۔‘‘

’’میں نے اسے معاف کر دیا ہے اباجی... بڈھا بندہ ہے۔‘‘

’’اوئے انور! ان کو بگاڑ مت... ان کا دماغ مت خراب کر... انہیں شہ ملے گی تو یہ کل کو ہمارے سامنے نظر اور سر اٹھا کے بات کریں گے۔ غلطی کی سزا دوسروں کو سبق سکھانے کے لیے ضروری ہے۔‘‘

انور نے کہا۔ ’’کچھ میرا خیال کر لیں اباجی... اس دفعہ تو معاف کر دیا ہے میں نے۔‘‘

’’تمہیں ان کمینوں اور کم ذات ملازموں پر بڑا ترس آتا ہے بھائی جی!‘‘ شاہینہ نے طنز سے کہا۔

انور نے اس کی وہ بات سمجھ لی جو اس جملے کے الفاظ میں کہیں نہ تھی مگر صاف کہہ دی گئی تھی کہ اپنوں اور خون کے رشتوں کے لیے تمہارے دل میں رحم دلی کے کوئی جذبات نہیں۔ انور نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔ ’’ایسی بات نہیں بھابی کہ میں کسی کی نیت کو سمجھتا نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے نمک حرامی کرنے والوں کو کیسی عبرتناک سزا دی تھی۔‘‘

بڑی چودھرائن نے دوپٹا سر کے گرد لپیٹا۔ ’’اذان ہو گئی... میں نماز پڑھ لوں پھر رات کا کھانا لے جاؤں۔‘‘

شاہینہ نے اچانک سوال کر دیا۔ ’’بھائی جی! میں بھی جاؤں؟‘‘

بھابی کے چہرے پر بڑی پُرامید عاجزی تھی۔ میرے ساتھ جانے کے لیے انور علی اٹھا ہی تھا کہ رک گیا۔ ایک لمحے کے لیے بڑے چودھری کے ساتھ چودھرائن کے چہرے پر بھی اسی امید کی روشنی جھلکی۔ انور کے لیے یہ بڑی آزمائش کا لمحہ تھا۔ باپ کی خدمت اور اس کی دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دینے کے بعد اس نے ابھی ابھی ایک بے حیثیت مجرم کو معاف کر کے اپنی رحم دلی کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔

خود میں یہ دیکھنے لگا کہ انور اس اچانک ہونے والے جذباتی حملے پر کیا موقف اختیار کرتا ہے۔ اپنی کمزوری کا شکار ہوتا ہے یا ایک غیر جذباتی فیصلہ صادر کر کے ثابت کرتا ہے کہ عقل اس کا سب سے مضبوط اور ناقابل تسخیر دفاع ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب ایک لمحے میں وہ اس بحران سے بڑی سیاست کے ساتھ نکل گیا۔ اس نے شاہینہ کو جواب ہی نہیں دیا۔ نہ اپنے رویّے سے کسی الجھن یا ناخوشی کا اظہار ہونے دیا، نہ کوئی ایسا اشارہ دیا جس سے مثبت یا منفی ردِعمل ظاہر ہو۔ اس نے کسی تجربہ کار... حقیقت پسند اور غیر جذباتی جج کی طرح فیصلہ محفوظ کر لیا اور سپاٹ چہرے کے ساتھ جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔ یقیناً شاہینہ نے اس کو انکار سمجھ کے اپنی توہین بھی محسوس کی ہوگی لیکن انور کا پیغام بہت واضح تھا۔ ابھی فیصلے کا وقت نہیں آیا۔ اگر وہ اگلے ہی روز خود شاہینہ بھابی کو بلا کے کہہ دیتا کہ آج سے تم بھی کھانا لے جاسکتی ہو اپنے شوہر کے پاس... تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ ایک حاکم کو اسی طرح اپنے فیصلوں میں آزاد ہونے کا اختیار ہونا چاہیے اور اس کا احساس دوسروں کو بھی دلاتے رہنا چاہیے۔ خود بڑے چودھری صاحب نے انور کے ایک مجرم کو معاف کر دینے کے فیصلے پر اپنا فیصلہ مسلط کرنے سے گریز کیا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ انور ہائی کورٹ ہے تو وہ خود سپریم کورٹ ہیں اور اس کے فیصلے کو مسترد کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ انور نہ مانتا تو ان کی زیادہ سبکی ہوتی۔ انہوں نے انور کو حاکم تسلیم کر لیا تھا۔

رات کے کھانے کی میز پر سے شاہینہ بھابی طبیعت کی خرابی کے عذر پر غیر حاضر رہی۔ وہ اپنی مایوسی اور خفگی کا اظہار ایسے ہی کر سکتی تھی۔ شاید ایک صدمہ اسے اپنی سازش کے طشت ازبام ہو جانے کا تھا۔ یہ خبر عام تو نہ ہوئی تھی لیکن بھابی نے اپنی عقل سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ انور کے قبر میں اتر جانے کے بعد اندر کا نقشہ پوری طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا ہوگا۔ اگر اس نے ذکر نہیں کیا تھا تو یہ بات زیادہ باعثِ تشویش تھی۔ بہت سے حادثات محض حادثات نہیں تھے مگر انور نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کے ذہن میں کسی سازش کا خیال بھی نہیں۔ حقیقت شاید اس کے برعکس تھی۔ یہ بات بھابی کو تشویش میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی۔

میں نے انور سے راجا ریاست کا ذکر کیا تو وہ کچھ ناراض ہوا۔ ”تجھے کیا ضرورت تھی کچھ بتانے کی؟“

میں نے کہا۔ ”یار! انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ پہلے سے سب جانتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم جیل میں کب اس کی اور میری بات ہوئی تھی اور میں نے اسے نادر شاہ کے بارے میں بتادیا تھا۔“

”تو نے اپنی ایک کمزوری اس کے ہاتھ میں دے دی ہے۔“

”یا شاید اسے شریکِ راز کر کے حامی بنالیا ہے۔ یہ احساس دلادیا ہے کہ ہم ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔ اگر میں ڈوبا تو وہ بھی ڈوب جائے گا۔“

ریشم اور سلونی کے آجانے سے ہم نے موضوع بدل دیا اور اپنے چہروں سے تشویش اور فکرمندی کے آثار دور کرنے کی کوشش بھی کی لیکن موڈ کو بٹن دبا کے سوئچ اوور کرنا کسی باکمال اداکار کے لیے شاید ممکن ہو، ہماری بے کمال اداکاری ناکام رہی۔

ریشم نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ ”ہمارے آنے سے پہلے تم لوگ کچھ اور بات کر رہے تھے۔“

میں نے ڈھیٹ بن جانا بہتر سمجھا۔ ”ہاں... کر رہے تھے... پھر؟“

انور نے میرا ساتھ دیا۔ ”کیا ہم نے پوچھا کہ یہاں آنے سے پہلے تم کیا بات کر رہی تھیں اور کیوں...؟“

”ویسے بھی مردانہ گفتگو میں عقل کا دخل ہوتا ہے چنانچہ وہ خواتین سے شیئر نہیں کی جاسکتی۔“ میں نے کہا۔

”او کے... ہمارے پاس بھی کچھ سنسنی خیز بریکنگ نیوز تھیں... ہم نہیں بتاتے... کیا خیال ہے موسم پر بات کریں؟“ سلونی بولی۔

”یا، بازار کے بھاؤ ڈسکس کریں... آلو پیاز کے ریٹ...“ ریشم نے کہا۔

انور نے فوراً پسپائی اختیار کر لی۔ ”بات یہ ہے... کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ صرف کان ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر یہ دیواریں بولتی بھی ہیں، بریکنگ نیوز آگے پہنچا دیتی ہیں اس لیے ہم محتاط ہیں۔“

”آخر آپ لوگوں کے پاس بھی جو بریکنگ نیوز ہے... وہ بی بی سی یا پی ٹی وی نے تو نہیں سنائی ہوگی... مگر ہم بات کریں گے کھانے کے بعد... رائٹ؟“

حویلی کے درمیان کا صحن محفوظ اور پُرسکون جگہ تھی۔ سرسبز لان کی تازہ کاٹی ہوئی گھاس کی خوشبو تھی کے بخارات کے ساتھ اٹھ رہی تھی۔ انور نے فوارہ چلانے کا کہا تو ایک خوشگوار ٹھنڈک نے ماحول کو سکون بخش بنا دیا۔ حویلی میں ایک ایسا سکوت طاری تھا جس میں خوف اور بے یقینی کی کشیدگی تھی جس کے متعدد اسباب تھے۔ بڑے چودھری صاحب جس خوف کے زنداں میں اسیر تھے، وہ ان کا اپنا تعمیر کردہ تھا۔ اب وہ ایک آئی سی یو جیسے کمرے میں بیمار بنے لیٹ کر زندگی کے آخری ایام کسی معزول شہنشاہ کی طرح گزارنے پر مجبور تھے جس کے لیے اب ایک شاندار تدفین کے جشن اور شان و شوکت والی آخری رسوم کے سوا دنیا میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔

ایسی ہی جذباتی اذیت کے دور سے ان کی نصف صدی کی رفیقِ حیات بھی گزر رہی تھی جس نے ایک مجازی خدا کی جوانی کا جلال بھی دیکھا تھا۔ اس کی عیاشی سے بدمعاشی تک سب کو صبر کے ساتھ برداشت کیا تھا اور اب مجبور تھی کہ وہ سب بھلا کے زندگی کے آخری دور میں حقِ رفاقت ادا کرتی رہے... دونوں بیٹے اس کے لیے عمر کے اس دور میں یکساں باعثِ آزار ثابت ہو رہے تھے... نہ وہ کسی کی طرف دار تھی نہ مخالف... زندگی بھر وہ جتنی مجبور بیوی رہی تھی اتنی ہی بے اختیار ماں... کیونکہ وہ ایک عام عورت نہیں تھی جو کسی خاندان پر بزرگی کے سارے حقوق کے ساتھ حکومت کرتی تھی اور اس خاندان میں بیٹے، داماد، بہوئیں، بیٹیاں اور نواسے پوتے سب رعایا بن کر اس کے سامنے سرنگوں رہتے ہیں۔ وہ سب عام لوگ نہیں تھے جن کے درمیان خون کا رشتہ ہی سب سے مضبوط ہوتا ہے۔ یہاں اقتدار کا نشہ تھا جس نے اپنوں کو بیگانہ کر دیا تھا۔

حویلی کے صحن میں اپنایت کے احساس کی محفوظ چھاؤں میں بیٹھنے والے ہم چار ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ ہم نہ رشتے دار تھے نہ ہم ذات... نہ ایک شہر کے نہ پرانے آشنا... وقت کے دھارے میں بہتے ہم ایک جگہ مل گئے تھے اور... اعتماد کے رشتے میں بندھ گئے تھے۔

یہ ہوسکتا تھا کہ ایک کمرے میں شاہینہ بھی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی ہو۔ سوچ رہی ہو کہ وہ پھر اقتدار حاصل کرنے کے لیے کس طرح اپنے شوہر کو باہر لائے؟ کس سے سازباز کرے... اب تک اس نے ہر سازش کو ناکام ہوتے ہی دیکھا تھا مگر وہ خود شک سے محفوظ تھی۔ کم از کم وہ اس یقین کی خوش فہمی کا شکار ہوگی۔ وہ اگلا قدم کیا اٹھائے گی؟ کس سے مدد لے گی؟ اس کا ساتھ دینے والے کون ہوں گے؟ اس کے والد پیر و مرشد یا ان کے حلقۂ مریدی میں شامل جاں نثار... انور کی پوزیشن ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ محفوظ ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے تمام پرانے محافظ اور ملازم جو حویلی کے اندر باہر تمام خدمات بجالاتے تھے، بدل دیے تھے۔ ان کو دوسرے کام سونپ دیے گئے تھے جن کا حویلی کے اندرونی معاملات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ نئے ملازم صرف انور کی نظر کا اشارہ سمجھتے تھے اور ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہوتا کہ ان میں سے کس کی وفاداری کو خریدا جاسکتا تھا۔

قبرستان میں سرنگ کی دریافت معمولی بات نہ تھی۔ ریشم اتنی ڈر گئی تھی کہ اس نے صاف کہہ دیا۔ ”سلونی اب میرے بیڈ روم میں رہے گی۔ مجھے تو باہر کھڑے محافظ پر بھی بھروسا نہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ دونوں کو مسلح ہونا چاہیے۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

انور نے مجھے سپورٹ کیا۔ ”ریوالور ہم ابھی فراہم کر سکتے ہیں۔“

”ساری بات تو نشانہ لے کر گولی چلانے کی ہے۔“ میں نے کہا۔

ریشم نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”میں یہ کام نہیں کر سکتی۔“

سلونی مسکرائی۔ ”اگر کوئی ہمیں پریکٹس کرادے... تو یہ ہوسکتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ایک ہفتے میں ہوسکتا ہے۔“ انور بولا۔ ”میں گل چاچا سے کہتا ہوں... وہ بندوبست کر دے گا۔“

میں نے کہا۔ ”اور ان کا سراغ کون لگائے گا... جو قبرستان میں اپنی کارروائی کر رہے تھے؟“

انور نے کہا۔ ”آج رات اور آنے والے دو چار دن اس جگہ پر نظر رکھی جائے گی۔“

”شاید اب وہ ادھر کا رخ نہ کریں۔“

”اس کا ففٹی ففٹی چانس ہے۔ ہم نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا۔“ انور بولا۔

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ بے خبری میں پکڑے جائیں گے۔ ابھی تک انہیں معلوم نہیں ہوگا کہ سرنگ دریافت کی جاچکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہوگی کہ انور اس قبر میں گر گیا تھا... یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اندر گرتا اور کچھ نہ دیکھتا؟“

”بڑے چودھری صاحب نے بھابی کے سامنے ذکر کیا تھا۔“ سلونی نے کہا۔

”پھر تو وہ انہیں خبردار کر چکی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”کیسے؟ کیا ان کے گھر فون کر کے؟ یا کسی کے

ذریعے سے پیغام بھجوا کر... وہ کچھ کرے گی تو کل..."

ریشم نے اچانک کہا۔ "آپ لوگ بڑے افلاطون بنتے ہیں۔ یہ جو آپ نے نظریہ قائم کیا ہے کہ سرنگ کسی... بیڈروم میں آ کے نکلتی... یہ ایک احمقانہ خیال ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا ہم صرف اس لیے مان لیں کہ آپ کہہ رہی ہیں... اور ہم احمق ہیں؟"

"مجھے بتاؤ... کیا براہِ راست تہ خانے میں پہنچنا زیادہ آسان نہ ہوگا، جہاں اکبر بند ہے؟" ریشم نے سوال کیا۔

میں نے انور کی طرف اور انور نے میری طرف خفت سے دیکھا اور پھر ہم نے ایک ساتھ سر کھجایا۔ "آسان...؟"

"ہاں... یہ کیا نظریہ ہے کہ اکبر کو آزاد کرا کے دوبارہ حاکم بنانے کے لیے بھابی ایسی سازش کا منصوبہ بنائے گی جس میں خود اس کے لیے بہت زیادہ خطرہ ہے۔ ذرا حویلی کے تہ خانے کی پوزیشن دیکھو... تہ خانہ کتنی گہرائی میں ہے؟ آٹھ فٹ... اوپر کا فرش اور چھت ملا کے نو فٹ... وہ جگہ جہاں اکبر قید ہے، جنوب کی طرف ہے... ادھر کیا ہے؟ جنگل اور وہ باغ جس میں پھل دار درخت ہیں۔ میں نے انور کے ساتھ جا کے دیکھا تھا۔ کوئی بھی ادھر نہیں جاتا... اکبر کو بہ آسانی قید سے نکالنے کے لیے وہ جگہ سب سے موزوں ہے۔ تہ خانے کی دیوار ایک فٹ موٹی ہو گی۔ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کوئی ایک گڑھا کھودے.... دس فٹ گہرا... پھر تہ خانے کی طرف کھدائی کرے تو مشکل سے تین فٹ کے بعد وہ تہ خانے کے فرش کے نیچے ہوگا۔ اوپر کسی کو نہ آواز آئے گی اور نہ شک ہو گا... وہ تہ خانے کے فرش کو نیچے سے توڑ کے سیدھا اکبر کے پاس جا سکتا ہے اور اسی راستے سے اکبر کو نکال کے لے جا سکتا ہے۔"

ریشم بڑی روانی سے وضاحت کر رہی تھی اور ہم تینوں خاموشی سے اس کی صورت تک رہے تھے۔ جو بات وہ کر رہی تھی حساب کی تھی... دو اور دو چار والی... اس کی تردید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر وہ کسی کلاس روم میں ہوتی یا کانفرنس ہال میں تو نقشہ بنا کے اپنی بات سمجھا سکتی تھی۔ زبانی بھی وہ اپنا موقف درست ثابت کرنے میں کامیاب رہی تھی... ہم واقعی احمق بنے بیٹھے تھے۔

انور نے سب سے پہلے کہا۔ "او مائی گڈنیس... تم تو ایک جینئس ہو ریشم! واقعی یہ موٹی سی بات ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟"

ریشم کا چہرہ کھل اٹھا۔ انور کی نظر میں اس کے لیے ستائش ہی ستائش تھی۔

میں نے کہا۔ "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ سرنگ کون بنا رہا تھا... اور کیوں؟"

"اگر کسی نے اپنی بے وقوفی سے ایک آسان کام کو مشکل طریقے سے کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا... تو یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔" ریشم نے کہا۔

انور بولا۔ "لیکن اس ناکامی کے بعد دوسری کوشش ہی پہلے تجربے کی ناکامی کے اسباب کو سامنے رکھ کے ہو گی۔"

سلونی نے کہا۔ "ایک بات میں بھی کہوں؟"

"بولو... اب تو سنسنی ہی بڑھے گی۔" انور نے کہا۔

"دراصل دن میں ہمیں اندر کی صورتِ حال کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس سازش میں بھابی کا آخری کردار ہو۔ اس میں وہ شریک ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اور اس کا مددگار ہو۔"

انور چونکا۔ "تمہارا مطلب ہے... پیر صاحب؟"

"ان کی تشریف آوری کے پیچھے یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے... بھائی کی عیادت کا ثواب اپنی جگہ۔"

"بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے۔" انور متفکر ہو گیا۔

ریشم پھر بولی۔ "ہم نے آپس میں بات کی لیکن کل رنگیلا آیا تھا۔ اس نے ایک سوال کیا کہ آخر بھابی یہ سب کیوں برداشت کر رہی ہے؟ انور کی بات تو یہ ہے کہ اس کا حمایتی کوئی نہیں تھا۔ خود ماں باپ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی میں شریک تھے، ماں باپ شرمسار ہیں یا ڈرتے ہیں مگر بھابی تو بہ آسانی شوہر کی رہائی کے لیے قانون کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے۔ یہ اس کا قانونی حق ہے جو وہ مانگ سکتی ہے۔"

"پھر وہ ایسا کیوں نہیں کرتی؟" میں نے کہا۔

"صرف اس لیے کہ وہ نتائج سے ڈرتی ہے۔ اسے اکبر کے تحفظ کی فکر ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا، قانونی راستہ اختیار کیا تو اس کے غیر قانونی نتائج اکبر کو بھگتنا پڑیں گے۔ پہلے ایک خانہ تلاشی کے وقت اسے غائب کر دیا گیا تھا۔ یہ کہا گیا تھا کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ معلوم نہیں کب آئے گا اور معاملے کو دبا دیا گیا تھا۔ بھابی نے انور کا چنگیز خان والا روپ بھی دیکھا ہے۔ اس نے مجرموں کو کیسی عبرت ناک سزا دی۔ ابھی اکبر کو رعایت حاصل ہے لیکن خود انور پر الزام آیا تو پھر اکبر ایسا غائب ہوگا کہ دوبارہ نہیں ملے گا۔ میں سمجھتی ہوں اسے یہ لائن اس کے دنیا دار پیر والد نے دی ہے کہ پہلے اکبر کو بحفاظت نکالو۔ پھر دیکھتے ہیں کہ تمہارا قانونی حق تمہیں کیسے نہیں ملتا۔" سلونی نے بڑی وضاحت سے بات کی۔

"بالکل ٹھیک سوچا تم نے اور بروقت سوچا۔"

"انور صاحب! میں اس خاندان کی پرانی نمک خوار ہوں۔ سب کی عادت اور فطرت سے واقف ہوں۔ اندر کی بہت سی باتیں سمجھتی ہوں۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ قانون کی عملداری صرف شہروں میں ہو... گاؤں دیہات بھی شہر بن گئے ہیں۔ وڈیرا شاہی چلتی ہے مگر صرف لاوارث اور بے آسرا لوگوں پر... اکبر بے آسرا نہیں ہے۔ وہ ایسے وکیل کرے گا جو آپ کو مشکل میں ڈال دیں گے۔"

انور سوچ میں پڑ گیا۔ "پھر کیا مجھے مصالحت کر لینی چاہیے؟"

سلونی نے ایک مخلص مشیر کی طرح کہا۔ "آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں... یا اکبر کو اپنے راستے سے ہٹا دیں... ہمیشہ کے لیے... ایسے کہ پھر اس کا سراغ نہ ملے... یہ آپ کر سکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اسے اس کا حق دے دیں اور اپنا راستہ الگ کر لیں۔ ورنہ آپ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ پھر کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکے گا۔ کیا فائدہ ہوگا آپ کو اگر چند سال جیل بھی کاٹنا پڑے اور پھر آدھی جائداد ملے... آپ کی ساری تعلیم اور زندگی کے سارے مواقع ضائع ہو جائیں گے۔"

ریشم نے اور سلونی نے ہماری سوچ کی سمت بدل دی تھی۔ یہ انتہائی پریکٹیکل اور پُرخلوص مشورہ تھا۔ شاید خود انور کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ انتقامی سوچ سے مغلوب ہو کے اس نے اپنا مستقبل خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اس نے ایک سال جیل کی اذیت جھیلی تھی لیکن اب جو کچھ وہ کر رہا تھا، اس اذیت کا بدلہ تھا اور کچھ نہیں۔ اس میں خرابی ہی خرابی تھی۔ ایک غلطی کا ازالہ دوسری غلطی سے نہیں ہوتا۔ یہ ایک لاحاصل جنگ تھی جس میں فتح کسی کی نہ ہوتی۔

ایک طویل خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "تیرے سامنے واقعی دو ہی راستے ہیں۔ اگر تجھے اسی راستے پر چلنا ہے تو پھر اکبر کو اپنے راستے سے ہٹا دے... ورنہ رک جا... مصالحت کا راستہ ابھی بند نہیں ہوا۔"

رات زیادہ ہو جانے کے خیال سے ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ رات کے سکوت میں ایک درد بھری فریاد کی

آواز گونجی۔ کسی نے چلا کے کہا۔ "اوئے مینوں نہ مارو ظالموں میری گل تے سنو۔" کسی نے ایک گالی دی۔ ایک چیخ پر ہم سب اٹھ کے دوڑے۔ ریشم اور سلونی کو انور نے وہیں روک دیا۔ ہم گیٹ سے نکلے تو گارڈ کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اب ہمارا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ گارڈ کی ٹارچ کی سرچ لائٹ جیسی روشنی نے قبرستان کا منظر پوری طرح عیاں کر دیا۔ سرنگ والی قبر کے پاس بڈھا گورکن زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا اور اس کا خون قبرستان کی مٹی میں مل رہا تھا۔

گورکن سے سوال جواب کرنے سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ اسے مرنے سے بچایا جائے۔ میں نے انور سے کہا۔ "تو اسے سنبھال... میں دیکھتا ہوں حملہ آور کو... وہ ابھی دور نہیں گیا ہوگا۔"

انور نے مجھے پکڑ لیا۔ "جانے دے ملک! وہ اتنی دیر میں نہ جانے کہاں نکل گیا ہوگا... اس کے پیچھے جانے کا خطرہ مول مت لے۔"

انور کے بجائے گارڈ نے زخمی گورکن کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ چاقو کا زخم اس کے پیٹ اور سینے کے درمیان کہیں تھا جو اندھیرے میں نظر نہ آتا تھا۔ گورکن نے اپنے ہاتھ سے پیٹ کو دبا رکھا تھا پھر بھی خون اس کی انگلیوں سے ٹپک کر گارڈ کی وردی کو داغ دار کر رہا تھا۔ گورکن سخت اذیت میں تھا اور بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ انور نے گارڈ کو قبرستان کے مشرقی حصے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم قبروں کے درمیان سے گزرے۔ پھر کچی دیوار کے درمیان خلا یا گزرنے کا راستہ آ گیا۔ اس سے ملا ہوا کوٹھری جیسے ایک کمرے والا گھر گورکن کا تھا۔ اس کی چھت لکڑی کی بے ہنگم شاخوں اور گھاس پھوس کو رسی کے ٹکڑوں اور تاروں سے باندھ کر بنائی گئی تھی۔

دروازے کے اندر بظاہر صرف اندھیرا تھا مگر انور نے کواڑ بجائے تو کسی عورت نے کہا۔ "کون ہے؟"

گارڈ کی سرچ لائٹ نے گرد و پیش کو روشن کر دیا تھا۔ میں نے فرش پر گدڑی میں پڑی ایک بوڑھی عورت کو گھبرا کر اٹھتے دیکھا پھر اس کی نظر اپنے درد سے کراہتے شوہر اور انور پر گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ "ہائے... کیا ہوا سرکار اسے؟ ہائے ہائے... کس نے مارا ہے اسے؟"

گارڈ نے گورکن کو فرش پر لٹا دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ میں اور انور وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ "یہ ہم بعد میں بتائیں گے... تم تھوڑا سا پانی لاؤ... روئی اگر ہو اور اوپر سے باندھنے کے لیے پٹی۔" میں نے کہا لیکن مجھے فوراً

اندازہ ہو گیا کہ بڑھیا نے کچھ نہیں سنا اور سنا تو وہ میرے کسی حکم پر عمل کرنے کے قابل ہی نہیں۔ میں نے خود ہی اس کے میلے چیکٹ تکیے کو پھاڑا تو اندر سے پرانی روئی نکلی۔ پھٹی چادر کے کنارے سے ایک پٹی پھاڑ کر میں نے روئی کو دو انچ لمبے زخم پر رکھا اور اس پر پٹی کو لپیٹ کر خون روکنے کی ناکام کوشش کی۔ میرے مشاہدے کے مطابق یہ تیز دھار خنجر کا وار تھا اور خاصا گہرا تھا۔ بڈھے کے نزار بدن میں لہو ہی کتنا تھا۔ بہہ جانے والے خون کے ساتھ ساتھ اس میں زندگی کی رمق بھی ختم ہونے لگی تھی۔ اس کا کراہنا اور تڑپنا کم ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں کی ویران چمک ماند پڑ رہی تھی۔ وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا حالانکہ اس کی ناتواں اور عمر رسیدہ شریک حیات مسلسل اس پر جھکی آنسو بہاتے ہوئے ایک ہی سوال کو دہرائے جا رہی تھی۔ ”ہائے کس ظالم نے تیرے ساتھ یہ کیا؟“

گورکن کو بیوی کے سوال کے جواب سے زیادہ مالک کے سامنے اپنی پوزیشن کی وضاحت کی فکر لاحق نظر آتی تھی۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے لب ہل کر رہ جاتے تھے۔ اچانک اس کی آنکھیں اور جسم کی مجرا ذیت تڑپ ٹھہر گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسی زخم سے وہ روح نکل کے پرواز کر گئی ہے جو زندگی کہلاتی ہے۔ گورکن خود قبر کا رزق بن چکا تھا۔ یہ احساس فوراً ہی اس عورت کو ہو گیا جسے وقت کے بدلتے لمحے نے بیوی سے بیوہ بنا دیا تھا۔

وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ بڈھے پر گر کے واویلا کرنے لگی۔ ”ہائے میں نے کہا تھا مت لالچ کر... کیا ملا تجھے... جان گئی تیری... اب میں کیا کروں گی جی کے... کیسے جیوں گی...“ بڑھیا کی آنکھیں خشک تھیں لیکن زندگی کا سارا درد اس کی آواز میں سمٹ آیا تھا۔

انور نے میری طرف دیکھا اور خاموشی کی زبان میں جو بات کہی، وہ میں نے سمجھ لی۔ یہاں رکنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہم چلنے ہی کو تھے کہ بڑھیا نے پلٹ کے کہا۔ ”مالک! میری بھی ایک بات سن لو۔“

انور نے نرمی سے کہا۔ ”کیا بات ہے... کہو...؟“

”میرا شوہر نمک حرام نہیں تھا۔ لالچ میں پڑ گیا تھا... بہت روکا تھا میں نے اسے۔“

انور نے کہا۔ ”کس بات سے روکا تھا... مجھے معلوم ہے کہ وہ پرانا وفادار تھا۔“

”اس نے ہزار روپے لیے تھے... اور اپنی جان گنوا دی۔“ وہ پلٹ کر اپنے شوہر کی لاش سے مخاطب ہوئی۔

”اب کیا کروں میں ان ایک ہزار کا... کفن تو مل ہی جاتا تھا تجھے بدبختا۔“

انور نے کہا۔ ”حوصلہ کر بی بی... کس سے لیے تھے ایک ہزار... کس کام کے؟“

”اس اینٹوں کے بھٹے والے سے بات کی تھی اس نے... وہی پیچھے پڑا ہوا تھا۔ قبرستان کی مٹی اینٹوں کے لیے بہت اچھی تھی۔ تھوڑی لکڑی جلانے سے اینٹ پک جاتی تھی اور مضبوط ہوتی تھی۔ اس نے پہلے تو انکار کر دیا تھا کہ قبرستان چودھریوں کا ہے... اس کی مٹی میں کیسے بیچ سکتا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں پیچھے سے نکالوں گا۔ اوپر کی زمین ایسی ہی رہے گی۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ ہزار روپیا مہینا دوں گا۔“ وہ پھر بین کرنے لگی۔

میں نے اور انور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چند سیکنڈ کے بعد میں نے پوچھا۔ ”ماسی! کس نے دیے تھے ہزار روپے؟“

وہ میری طرف پلٹی۔ ”مجھ سے کیا پوچھتا ہے؟ مجھے کیا پتا... خود معلوم کر لے اینٹیں کون بناتا ہے؟“

مجھے سوال اور اس کے جواب پر یکساں شرمندگی ہوئی۔ ”ٹھیک ہے... میں معلوم کر لوں گا۔“

”اور اسے سزا بھی ملے گی۔“ انور نے کہا۔

”سزا ملے گی... کیا سزا ملے گی؟ اب اسے کیا فائدہ ہوگا سزا سے جو مرا پڑا ہے؟“ وہ تلخی سے چلائی۔

ہم لاجواب ہو کے نکلنے کے لیے پلٹے تھے کہ اس کی آواز نے روک لیا۔

”مالک! ایک منٹ رک جاؤ... ویسے تو یہ بھی مٹی ہی ہے۔“ اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن وہ تمہاری مٹی کی قیمت تھی جو اس نمک حرام نے وصول کر لی تھی۔ وہ ہزار روپے لے جاؤ۔“

تمہاری مٹی... اس کے دہرے مطلب نے مجھے دہلا دیا۔ انور کا رنگ فق ہو گیا۔ ”رہنے دو ماسی۔“

”نہیں... کفن کے پیسے ہیں میرے پاس... کئی سال پہلے اس کا بھائی گیا تھا مدینے شریف حج کے لیے... آب زم زم میں لٹھا دھو کے لایا تھا۔ وہی رکھا ہوا ہے۔“ وہ کچھ رو رہی تھی اور کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے زمین پر بچھے ہوئے گودڑ کے سرہانے رکھا ہوا ٹین کا بکس کھولا اور تلاش کر کے کوئی بنڈل نکالا۔ پھر اس نے تکیے کے اندر ہاتھ ڈال کے نوٹ نکالے۔ ”اس میں سے ہزار لے لو۔ یہ زیادہ ہوں گے۔“

انور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ''چل ماسی! میں نے اسے معاف کیا۔۔۔ تو بھی معاف کر دے۔۔۔ یہ میری طرف سے رکھ لے۔''

پھر وہ ایک دم اٹھا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میں اور میرے ساتھ گارڈ اس کے پیچھے گئے۔ ہمارے کانوں میں مرنے والے کی واحد ماتم گسار کی آواز آتی رہی۔ ''مر گیا قرضہ مجھ پر چھوڑ کے۔۔۔ میں کیسے ادا کروں گی؟''

زندگی میں بہت سے واقعات ڈرامائی ہوتے ہیں۔ گورکن کی موت ایسا ہی ایک واقعہ تھا جسے سانحہ کسی نے نہیں سمجھا تھا۔ اگلے روز جب چند افراد گورکن کو اپنی ہی مملکت کے ایک گمنام گوشے میں گاڑ کے لوٹے تو انہوں نے بڑھیا کو اسی فرش کے بستر پر مردہ پایا۔ ظاہر ہے ایک گھنٹے بعد اسے شوہر کے ساتھ والی دو گز زمین دے دی گئی۔

لیکن اس وقت جب ہم حویلی لوٹے تو ہمارے جذبات دکھ سے زیادہ شرمندگی کے تھے۔ ہم بہت ذہین اور باریک بین۔۔۔ تمام معاملات کی گہرائی تک پہنچ کے اصل حقیقت کو جان لینے پر قادر افلاطون۔۔۔ شرلاک ہومز کے جانشین سراغ رساں۔۔۔ حقیقت کو ہر زاویے اور ہر پہلو سے دیکھ کر نتائج اخذ کرنے والی نظر کے مالک۔۔۔ کتنی دور کی کوڑی لائے تھے۔ ہم نے تو قبر میں سے سرنگ کو حویلی کے اندر تک پہنچا دیا تھا۔ کاغذ پر لکیروں سے نشاندہی کرتے تو نقشے میں عین اس جگہ کراس کا نشان نظر آتا جہاں سرنگ ختم ہوتی اور انور کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا سرغنہ طلوع ہوتا۔۔۔ وہ سازش جس کے تانے بانے بڑی بھابی شاہینہ نے اپنے پیر و مرشد ابا جان کے ساتھ مل کر بنے تھے۔

بات ہنسنے کی بھی تھی مگر اس سے زیادہ ہم پر ہنسنے کی۔۔۔ میں اور انور ایک دوسرے سے اتنے شرمندہ تھے کہ اپنی سوچ کے بے تکے پن پر ہنس بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ وقت بھی ہنسنے کا نہیں تھا چنانچہ ہم خاموشی سے اپنے اپنے کمروں میں جا کے سو گئے۔ اگلے دن میں نے ایک مصروفیت نکال لی۔ میں صبح ناشتے کے بعد ریشم کے ساتھ ڈاکٹر جلالی کو بمع ساز و سامان لانے نکل گیا۔ لاہور تک کا راستہ ایک گھنٹے کا تھا۔ ڈرائیونگ میں خود کر رہا تھا۔ ریشم میرے ساتھ اس لیے آ گئی تھی کہ اسے سامان کی پیکنگ کرانی تھی۔ یہ دیکھنا تھا کہ ڈاکٹر جلالی کے بیڈروم کی ترتیب کیا ہے اور تمام اسباب کو حویلی میں لا کے بالکل اسی ترتیب سے سیٹ کرنا تھا۔

مین روڈ پر آ کے اس نے اچانک کہا۔ ''میں نے کوئی بے وقوفی کی بات نہیں کی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''ہم سب بہت عقل مندی کی باتیں کرتے ہیں۔''

''جو میں نے کہا تھا، وہ ہو سکتا ہے۔''

''ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اسی گاڑی میں تمہارے ساتھ میں بائی روڈ یورپ کی طرف نکل جاؤں اور کبھی لوٹ کے نہ آؤں مگر ظاہر ہے ایسا نہیں ہوگا۔''

''ہاں، تم نورین کے ساتھ بھی نکلے تھے۔ راستے میں اسے اوپر بھیج دیا۔ اب اس کے خوابوں پر گزارہ کر لیتے ہو۔''

طنز کا وار اتنا گہرا اور غیر متوقع تھا کہ میں گنگ ہو کے رہ گیا۔ خاموشی کی ایک سنگین چٹان ریشم کے اور میرے درمیان حائل ہو گئی جو نظر نہ آنے کے باوجود اپنے حقیقی ہونے کا احساس دلاتی تھی۔

پھر ریشم نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''آئی ایم سوری۔۔۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

''جو تم نے کہا غلط نہیں تھا۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''تم پر وہ حادثہ بہت بھاری تھا۔ تم اسے بھول نہیں سکے۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم آج بھی اس سے محبت کرتے ہو۔''

''وہ صرف میرا احساس ہے۔۔۔ کسی اور کا۔ اس سے کیا؟''

''اسی لیے تو معافی مانگ رہی ہوں تم سے کہ میں نے تمہارے احساس کو ٹھیس پہنچائی۔ جبکہ میں سب جانتی ہوں۔۔۔ سب سے پہلے میں نے ہی جانا تھا۔''

میں نے اس کے ہاتھ پر نرمی سے تھپکی دی۔ ''چلو بعض اوقات ہم سب کی زبان پھسل جاتی ہے۔''

''جو بات میں نے پہلے کی تھی، وہ غلط نہیں تھی۔ اب اسے تم بھی بے بنیاد مفروضہ کہہ سکتے ہو۔۔۔ مگر میں نے انور کو بھی بتایا کہ اس امکان کو سامنے رکھو۔ اکبر کو تہ خانے میں نقب لگا کے اغوا کیا جا سکتا ہے۔''

''پھر۔۔۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''اسے وہاں سے منتقل کر دینا چاہیے۔۔۔ کسی نامعلوم مقام پر۔''

''کیوں؟ اور آخر کب تک یہ غیر قانونی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی قید کا سلسلہ چلے گا؟ میں سو فیصد اس رائے سے

اتفاق کرتا ہوں جو کل سلونی نے دی تھی کہ جائداد کے پیچھے جنگ و جدل اور قتل و خون ریزی کا یہ کھیل ختم ہونا چاہیے۔ اکبر نے اس کا آغاز کیا تو غلط تھا اور انور نے اسے جاری رکھا ہوا ہے تو یہ زیادہ غلط ہے۔''

''کیوں زیادہ غلط ہے؟ یہ مکافاتِ عمل ہے۔۔۔ قصاص ہے۔''

''خوامخواہ کے فتوے مت جاری کرو۔ اب یہ زیادہ برا اس لیے ہے کہ اکبر اور انور میں فرق ہے۔ اور فرق ہونا چاہیے۔ وہ ان پڑھ اجڈ اور وحشی ہے۔ قبائلی خون اور حیوانی دماغ رکھتا ہے مگر دوسرا مہذب تعلیم یافتہ انسان ہے جو اخلاق، تہذیب اور انسانیت کے آداب جانتا ہے، گھوم پھر کے دنیا دیکھ چکا ہے۔ قانون کا محافظ اور رکھوالا خود قانون شکنی کرنے لگے تو ناقابلِ معافی ہوگا۔''

''اکبر کو موقع ملا تو وہ پھر وار کرے گا۔ سانپ کے ساتھ رحم دلی کا سلوک نہیں ہو سکتا۔''

''انور ایک بار نا تجربہ کاری میں مارا گیا۔ اب وہ اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ ابھی وہ جس راستے پر چل رہا ہے یا تم اسے لے جا رہی ہو۔۔۔ وہ بہت خطرناک ہے۔''

ریشم بگڑ گئی۔ ''میں لے جا رہی ہوں؟ اس کے ذمے دار تم ہو۔ کیا تم نے رہائی دلانے کے بعد اسے روکا تھا کہ جو وہ کرنا چاہتا ہے نہ کرے۔ اس وقت میں کہاں تھی، اس کے ساتھ مشورہ دینے کے لیے؟''

''میں نے روکا تھا اسے۔۔۔ مگر اس نے کہا تھا کہ یہ عارضی ہے۔ اب وہ دشمنی کے اس کھیل میں طاقت کے ساتھ شریک ہو چکا ہے اور بھول گیا ہے خود اپنے وہ تمام جذباتی فلسفے۔۔۔ جن کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑا تھا۔ وہ انتقام کے جنون میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ذرا دشمن کی نظر سے بھی دیکھو ریشم۔۔۔ اس کی کمزوری کے ساتھ اس کی طاقت پر بھی غور کرو۔ جب سے میں نے شاہینہ بھابی کے پیر و مرشد ابا کو دیکھا ہے، مجھے انور سخت خطرے میں نظر آتا ہے۔''

''انور نے اپنی سیکیورٹی سخت کر دی ہے۔ سارے محافظ بدل دیے ہیں۔ باہر کا کوئی آدمی اجازت کے بغیر اندر نہیں آ سکتا خواہ وہ پیر صاحب کے مرید ہوں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ایسے بے وقوفی کے سوال جواب تمہاری یک طرفہ جذباتی سوچ کا پتا دیتے ہیں اور کچھ غلط نہیں کہ رات سلونی کی بات نے میرے ذہن کو تھوڑا سا جھنجوڑا۔۔۔ ورنہ میں بھی صرف ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ میں انور کے دفاعی انتظامات کو کافی سمجھتا تھا لیکن دفاعی انتظامات آخر کس لیے اور کب تک؟ محفوظ راستہ اختیار کرنا بہت قابلِ قبول ہے۔ نہ آپ جارحیت کریں نہ دفاعی انتظام کی ضرورت ہو۔''

''تم انور کو قائل کر سکتے ہو۔''

''میں واپس جا کے ایسا ہی کروں گا۔ ابھی وقت ہے۔ بڑے چودھری صاحب یہ کام خوش ہو کے کریں گے۔ انہیں احساس ہے کہ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، سب انہی کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ وہ بڑے بھائی کو بلا کے یا خود اس کے پاس جا کے یہ باعزت پُرامن تصفیہ کرا سکتے ہیں۔''

گاڑی کو میں نے ڈاکٹر جلالی کی کوٹھی کے بند پھاٹک پر روکا۔ اوپر والی گھنٹی بجائی تو اوپر والی ایک کھڑکی کھلی اور ڈاکٹر جلالی کا پُرجلال چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے سلام کیا تو اس نے صرف سر ہلایا۔ اس کے پریشان گھنے بالوں کا سفید غبار سا چہرے کے گرد پھیلا ہوا تھا اور وہ ابھی تک نائٹ سوٹ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ وہ پانی پی رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں ریشم پر جم کے رہ گئی تھیں۔

''اب یہ کون آیا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔ ملک نسیم اختر؟''

میں نے کہا۔ ''سلیم اختر۔۔۔ یہ انور کی۔۔۔ کزن ہے۔۔۔ ریشم۔''

''انور کون؟'' اس نے گلاس لبوں تک اٹھا کے ایک گھونٹ لیا۔

''وہ جو میرے ساتھ آیا تھا۔ جس کے والد کی آپ دیکھ بھال کریں گے۔''

وہ غرایا۔ ''دیکھ بھال۔۔۔ مائی فٹ۔۔۔ میں کارڈیک اسپیشلسٹ ہوں یا نرسنگ ایڈ۔۔۔ میں علاج کرتا ہوں۔''

''یس سر! میرا وہی مقصد تھا۔ منہ سے غلط الفاظ نکل گئے۔ آپ کے ساتھ ایک نرس بھی تو جائے گی۔''

''کہاں ہے وہ نرس؟'' اس نے گلاس سے دوسرا گھونٹ لیا۔

''اس کا انتظام کرنے کی ذمے داری آپ نے لی تھی۔ میں آپ کو لے جانے آیا ہوں۔''

''اور یہ خوب صورت لڑکی۔۔۔ یہ کیا تمہارا دل بہلانے ساتھ آئی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ پیکنگ میں مدد کرے گی سر۔۔۔ پھر آپ کا تمام اسباب اسی ترتیب میں وہاں لگائے گی جہاں آپ جا رہے ہیں۔ اب پلیز چابی دیں تاکہ باقی باتیں میں

اوپر آ کے کروں۔"

اس نے گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابی میری طرف پھینکی۔ چابی گیٹ سے ٹکرا کے اندر گری۔ مجھے گیٹ پر چڑھ کے اندر اترنا پڑا۔ چابی میں نے گیٹ پر سے ریشم کو دی اور وہ تالا کھول کے اندر آئی۔ دوبارہ تالا لگا کے ہم گیلری سے گزرے اور زینے تک گئے۔

ریشم نے کہا۔ "یہ کیسا خبطی آدمی ہے۔ چودھری صاحب کے ساتھ اس کا کیسے گزارہ ہوگا؟"

"خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو... جیسا مریض ویسا ہی ڈاکٹر... جیسی روح ویسے فرشتے۔"

دن کا باقی حصہ بڑی مشکل اور افراتفری میں گزرا۔ میں نے سامان منتقل کرنے والی ایک کمپنی کو ٹرک کے ساتھ بلا لیا تھا۔ انہوں نے چھوٹے سامان کو ڈاکٹر جلالی کی ہدایات کے مطابق بڑے بڑے کارٹن یعنی گتے کے ڈبوں میں پیک کیا۔ وہ ایسے کام اپنی مرضی کے مطابق تیزی سے سمیٹنے کے عادی تھے لیکن ڈاکٹر جلالی کی مرضی کرنے پر مجبور تھے۔ وہ بہرحال ان کا کلائنٹ تھا۔ دو گھنٹے کا کام چار گھنٹوں میں پورا ہوا۔ درمیان میں ایک مرتبہ چائے خود ریشم نے بنائی۔ ڈاکٹر اپنا کھانا خود تیار کرتا تھا۔ باقی سب کے لیے مجھے بازار سے انتظام کرنا پڑا۔ ہم نے چلتے پھرتے ہی پیٹ بھرا۔ جسمانی تھکن اپنی جگہ تھی۔ ڈاکٹر جلالی کی ہدایات پر عمل کرنے کی ذہنی تھکن اس سے زیادہ تھی۔ اگر وہ اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ نکل جاتا اور سامان لانے کی ذمے داری پیکرز پر چھوڑ دیتا تو سب کو آسانی ہوتی اور کام وہی ہوتا جو سارا دن کی بک بک کے بعد ہوا۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔ مجھے بھی اب تشویش تھی کہ مریض اور ڈاکٹر کی آپس میں کیسے بنے گی۔ بالآخر ایک رخصت ہوگا۔ اس حویلی سے یا دنیا سے... اور ایک کے دل کا اور دوسرے کے دماغ کا روگ خاک ٹھیک ہوگا، دونوں دُہرے مرض کا شکار ہو کے کسی تیسرے سے علاج کے لیے اسپتال میں جالیٹیں گے... لیکن اب جو ہونا تھا اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اور خدا سے کچھ عجب نہیں کہ معجزہ کر دے۔

شام کے قریب ڈاکٹر نے دھکا لگوا کے اپنی تاریخی واکس ویگن کو اسٹارٹ کیا۔ وہ نہ جانے کب سے کھڑے کھڑے چلنا ہی بھول گئی تھی۔ اس کی بیٹری خلاص تھی اور ٹائروں میں ہوا اتنی ہی تھی جتنی ڈاکٹر جلالی میں عاجزی اور شرافت... روانگی سے قبل مجھے دونوں پیکرز کی مدد سے اس کو جھاڑ پونچھ کے اس قابل بھی بنانا پڑا کہ ڈاکٹر کو اس کے شیشے میں سے سڑک سیدھی نظر آئے۔ وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر جانے سے صاف انکار کر چکا تھا اور بضد تھا کہ اسے خود چلائے گا۔ "یہ بھی میری شریک حیات ہے جس کو ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے اس پر کسی نے بری نظر ڈالی تو میں نے اسے اپنی غیرت پر حملہ سمجھا۔" اس نے بتایا۔ میں نے غلطی سے کہا تھی کہ اسے بیچ دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے نزدیک وہ اوریجنل کنڈیشن میں تھی۔ اس کی قیمت کا تعین کوئی اینٹیک ڈیلر یا قدرداں ہی کر سکتا تھا جو آج کے دور کی کسی نئی مرسیڈیز کے برابر ہوگی... مگر وہ مرسیڈیز اس کا کیا مقابلہ کرے گی۔

بالآخر ہمارا قافلہ حرکت میں آیا۔ پیکرز پھر پکڑے گئے۔ یہ ایک گھنٹے کا راستہ تھا جو انہیں ہمارے ساتھ بلکہ ہمارے پیچھے چل کے تین گھنٹوں میں طے کرنا پڑا۔ ڈاکٹر جلالی کی "ڈارلنگ" سب سے آگے تھی۔ راستے میں ایک جگہ اس کے ٹائروں میں ہوا ڈالی گئی۔ کئی بار یہ بریک لگانے سے رکی تو پھر اسٹارٹ نہ ہوئی کیونکہ بیٹری مردہ تھی اور یہ مردہ کئی سال پرانا تھا۔ وہ چارج کہاں سے پکڑتی... ہر بار ہم نے اسے دھکا دے کر اسٹارٹ کرایا۔ تاہم چلنے میں وہ فاکس ویگن تھی، اپنی شاندار روایات کی حامل... یہ دنیا کی واحد گاڑی ہے جس میں ریڈی ایٹر نہیں ہوتا اور جو ایئر کولڈ ہوتی ہے۔ جتنا دوڑتی ہے، اتنی ہی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ ساری دنیا کا چکر نان اسٹاپ لگانے کے لیے اسے صرف فیول چاہیے... پانی کا ایک قطرہ نہیں مانگے گی۔ رفتار بھی اس کی کم نہ ہوتی مگر خود ڈاکٹر اسے گدھا گاڑی کی طرح چلا رہا تھا تو کار کیا کرتی۔ اس کے نقش قدم بلکہ نقش ٹائر پر میں بھی مجبور تھا اور میرے پیچھے سامان سے لدا ہوا ٹرک تھا۔

ڈاکٹر جلالی کے تمام اسباب کو پہلے سے خالی کرائے ہوئے کمرے میں اس کی مرضی کے مطابق لگوانا اب ریشم کی ذمے داری ہوگئی تھی۔ اس کام میں نہ میری مدد کام آ سکتی تھی اور نہ سلونی کی... ڈاکٹر جلالی نے حویلی اور اس کے ماحول پر یا شہر سے فاصلے پر کسی عدم اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ سلونی خود ہی ریشم کی مدد کے لیے آگئی تھی۔

میں نے کہا۔ "آئیے ڈاکٹر جلالی... میں آپ کو بڑے چودھری صاحب سے ملوادوں۔"

"پہلے میں یہ اسباب لگوادوں..." اس نے رکھائی سے کہا۔

ریشم نے مؤدبانہ گزارش کی۔ "ابھی سامان اتر رہا ہے۔ آپ مطمئن رہیں، میں نے سب دیکھ لیا تھا اور ہر چیز

یہاں اسی ترتیب کے ساتھ لگوادوں گی... اور اگر کوئی فرق ہو تو آپ بعد میں بتا سکتے ہیں... یہ بھی میری مدد کرے گی۔"

"یہ کون ہے؟" ڈاکٹر جلالی نے سلونی کو سر سے پیر تک دیکھا۔

"یہ بہن ہے میری... اور یہاں تمام انتظامات کی نگرانی کرتی ہے۔"

میرا اندازہ غلط ہوا جب ڈاکٹر جلالی نے ریشم کی بات مان لی۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود بھی سفر کی طوالت سے تھک گیا تھا۔ اسے چودھری صاحب کے سامنے پیش کرنا بھی ایک آزمائشی مرحلہ تھا۔ اس کے لیے میں نے انور کی مدد لی۔ ڈاکٹر نے اسے پہچان لیا اور ہم اسے چودھری صاحب کے پاس لے گئے۔

حسب توقع بڑے چودھری صاحب نے ڈاکٹر کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ "یہ ہے ڈاکٹر...؟ اوئے انور! یہ تو کیا چیز پکڑ لایا ہے؟"

ڈاکٹر جلالی نے ناراضی کا اظہار کیا۔ "آخر کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟"

انور نے کہا۔ "ابا جی! یہ بہت مشہور ڈاکٹر ہیں... دل کے امراض کے اسپیشلسٹ... ڈاکٹر جلالی۔"

"شکل سے تو لگتا ہے کسی سرکس میں جوکر ہوگا... اوئے ڈگری وغیرہ دیکھی تھی اس کی؟"

میں نے اس وقت ایک پرانی چال چلی۔ میں نے چودھری صاحب کے سرہانے کی طرف سے ڈاکٹر جلالی کو اشارہ کیا اور اپنی کنپٹی پر انگلی گھما کے یہ اشارہ دیا کہ مریض کی ذہنی حالت بھی درست نہیں۔ ڈاکٹر نے میرا اشارہ سمجھ لیا۔ وہ قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میں نے آپ کی بات کا بُرا نہیں مانا چودھری صاحب... اپنی ڈگری بھی دکھا دوں گا میں آپ کو... سب کچھ دکھا دوں گا... اب تو رہنا آپ کے ساتھ ہی ہے۔"

دوسری طرف انور نے ڈاکٹر جلالی کے پیچھے سے چودھری صاحب کو ہاتھ جوڑ کے سمجھایا تھا کہ وہ مصالحت سے کام لیں۔

"وہ تو پتا چل جائے گا علاج کرنا آتا ہے مجھے یا نہیں... ابھی تو میں مہمان ہوں آپ کا اور اتنی بڑی حویلی میں آنے والے کو چائے کافی کے لیے بھی نہ پوچھا جائے۔"

وہ کرسی کھسکا کے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ "پرانے رئیس تو بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔"

چودھری صاحب کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ "ہاں جی، علاج کو دفع کرو۔ پہلے تعارف تو ہو جائے چنگی طرح۔ اوئے انور! تو نے بھی آتے ہی ڈاکٹر صاحب کو علاج پر لگا دیا۔ پہلے کچھ خاطر مدارات کا بندوبست کرنا چاہیے... یہ مہمان ہیں ہمارے۔"

مجھے بھی اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر جلالی میں صرف جلال نہیں... وہ کمال بھی ہے جو مشکل مریضوں سے تعاون حاصل کرنے میں کام آتا ہے۔ اس نے چودھری صاحب کو سمجھ لیا تھا اور ایک ہی نفسیاتی حربہ آزما کے بہتر تعلقات کی بنیاد رکھ دی تھی۔ چودھری صاحب نے پہلی نظر میں جسے جوکر قرار دیا تھا، اب ڈاکٹر صاحب کہا تھا۔

جب میں نکلا تو وہ شطرنج کی بازی جمانے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر جلالی کے کمرے میں جا کے دیکھا... ریشم اور سلونی بڑی محنت اور توجہ سے کمرا سیٹ کر رہی تھیں۔ "بڈھا خبطی ہے... کوئی چیز اِدھر سے اُدھر ہو گئی تو شور کرے گا۔" ریشم نے انور کو بتایا۔

میں نے کہا۔ "وہ زبردست ڈرامے باز ہے۔ دو منٹ میں اس نے چودھری صاحب کو چت کر دیا۔ جا کے دیکھو کیسے دوستوں کی طرح بات کر رہے ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے... پہلے تو میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔" انور بولا۔

رات تک ڈاکٹر جلالی کا کمرا بھی بالکل اسی طرح سیٹ ہو گیا تھا جیسے لاہور والی کوٹھی میں تھا۔ اس میں کوئی چیز اِدھر سے اُدھر ہونی لازمی تھی مگر اب مجھے بھی ڈاکٹر جلالی کو ہینڈل کرنے کا گر آ گیا تھا۔ ریشم نے انہیں انکل کہنا شروع کیا تو وہ خفا ہونے کے بجائے موم ہو گیا۔ بہنوں کے رشتے سے سلونی نے بھی انکل کو اپنا بنا لیا لیکن مجھ سے اور انور سے ڈاکٹر جلالی کی کبھی نہیں بنی۔

رات تک ڈاکٹر جلالی نے چودھری صاحب کا بڑے دوستانہ انداز میں مکمل معائنہ کر لیا۔ اس نے پرانی رپورٹس دیکھ لیں اور وہ سب دوائیں بھی جو انہیں استعمال کم ہوئی تھیں، بچی بھی موجود تھیں۔ اس نے رات کا کھانا ہم سب کے ساتھ کھایا جس میں چودھری صاحب بھی شریک تھے لیکن بعد میں اس نے چودھری صاحب کو ایک گولی دی جو یقیناً خواب آور ہو گی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد چودھری صاحب نے کہا کہ وہ کچھ تھک گئے ہیں اور آرام کریں گے۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر جلالی نے ہم سب کی کلاس لی۔

''تم بیٹے ہو نا... بہت پڑھے لکھے بھی ہو میں نے سنا ہے... تم کو نہیں معلوم کہ اس عمر کے دل کے مریض کی خوراک کیا ہونی چاہیے؟ یہ سب الا بلا جو تم لوگ کھا رہے تھے... وہی چودھری صاحب بھی...''

انور نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ''وہ کسی کی مانتے جو نہیں۔''

''شٹ اَپ... صرف کتابیں پڑھی ہیں تم نے... عقل نام کی کوئی چیز نہیں تمہارے پاس۔ تم نہیں جانتے کہ بوڑھا بچہ برابر ہوتے ہیں؟ ان کے ساتھ ضد اور بحث کر کے تم کوئی بات نہیں منوا سکتے۔ اور یہ دو لڑکیاں... ان کے ہوتے کسی نرس کی کیا ضرورت تھی... لیکن یہ بھی غیر ذمے دار ہیں... ان کی بیوی تو مجبور ہوگی... لیکن بہو کی بھی کچھ ذمے داری ہوتی ہے... اسے ساس سے لڑنے سے فرصت نہیں ملتی ہوگی... خیر، مجھے ان معاملات سے سروکار نہیں۔ کل نرس آجائے گی... مگر اس کے بعد تمہاری ذمے داری ختم نہیں ہوگی۔ تمہیں بھی میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔''

ظاہر ہے اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بہت پریکٹیکل آدمی تھا اور مرض کے ساتھ مریض کو بھی سمجھنا ضروری جانتا تھا... اس نے مراداں والی آنا، منہ مانگی فیس وصول کرنے کے لیے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے سامنے ایک پیشہ ورانہ چیلنج آ گیا تھا اور اس کا مقصد اپنی زندگی بھر کے تجربے کو استعمال کرنا تھا، بہتر نتائج کی امید کے ساتھ... وہ شفا دینا اپنے اختیار کی بات نہیں سمجھتا تھا۔ کوشش کرنا اس کا کام تھا اور مکمل نیک نیتی کے ساتھ... ایسے انسان دوست اور پیشے کی آبرو کے رکھوالے مسیحا ہر ایک کو ہر جگہ تلاش کرنے سے نہیں ملتے۔

رات کسی وقت مجھے نیند میں احساس ہوا کہ کسی نے مجھے نام لے کر پکارا ہے۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ کچھ لوگ مکمل تاریکی پسند نہیں کرتے اور زیرو واٹ کا نائٹ لیمپ روشن رکھتے ہیں مگر مجھے ذرا سی روشنی بھی ڈسٹرب کرتی تھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ نورین کے خیال کا آسیب ہے جو اب ہر رات مجھے جگائے گا۔ پھر میں نے آنکھیں کھول کے غور سے دیکھا تو وہ عورت چند فٹ کے فاصلے پر بدستور موجود تھی۔ میں لائٹ آن کرنے والا تھا کہ اس نے مجھے منع کر دیا۔

''بھابی شاہینہ...؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ کسی کو کچھ معلوم ہو۔ مجھے صرف تم سے بات کرنی تھی۔'' وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

میں بیڈ سے اترا اور اس کے سامنے جا بیٹھا۔ ''ایسی کیا بات ہو سکتی ہے بھابی جس کے لیے ایک خفیہ ملاقات ضروری تھی؟''

''مجھے تم سے پوچھنا تھا کچھ...'' وہ لہجے سے اداس اور پریشان لگتی تھی۔ ''آخر ایسی باتیں کیوں ہو رہی ہیں میرے بارے میں؟''

میں انجان بن گیا۔ ''کیسی باتیں؟''

''تم مجھ سے ہی سننا چاہتے ہو، یہ کہا گیا یا نہیں کہ میں اپنے شوہر کو قید سے رہائی دلانے کے لیے سازش کر رہی ہوں؟''

''سازش... کیسی سازش...؟''

''اتنا انجان بننے کی ضرورت نہیں... تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کس نے کیا کہا تھا۔ یہ کس نے کہا تھا کہ گیٹ کے محافظ کو زہر دینے والا میرے پاس آیا تھا؟''

''ایسا تو کسی نے بھی نہیں کہا۔ ہاں، شک ظاہر کیا گیا تھا کہ اس طرح کوئی اندر داخل ہوا تھا۔''

''کس نے ظاہر کیا تھا یہ شک؟''

''میں نے... کیونکہ میں نے ہی دیکھا بھی تھا۔'' میں نے اعتراف کر لینا بہتر سمجھا۔

''اور قبرستان کے اندر تک سرنگ بنانے کا شوشہ کس نے چھوڑا تھا... بعد میں کیا پتا چلا؟''

میں نے کمزور سا دفاع کیا۔ ''وہ... وقتی بات تھی۔ دماغ میں ہر قسم کا خیال آتا ہے۔''

''انتہا یہ ہے کہ میرے والد کی مریدوں کے ساتھ آمد کو بھی غلط رنگ دیا گیا۔ آخر کیوں؟ کیا ایک باپ اپنی بیٹی سے ملنے نہیں آ سکتا؟ اور اگر بیٹی کسی مشکل میں ہے تو کیا اس کو تسلی دینا اور اس کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کرنا غلط ہے؟ آخر میں کس سے مدد مانگوں؟ مجھے بتاؤ... کیا میرا پریشان ہونا بھی غلط ہے؟ میں کچھ نہ کروں... میرا شوہر قید میں ہے اور میں چپ چاپ بیٹھی رہوں؟ رات کو آرام سے سو جاؤں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں... میں تو کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔ کرنا تو دور کی بات ہے۔ وہ زندہ تو ہے ابھی... لیکن یہ حویلی کے اندر کی سیاست رشتوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتی... طاقت اور حکومت ہی سب کچھ ہے۔ نہ کوئی کسی کا باپ ہے نہ بیٹا... نہ بڑا بھائی اور نہ چھوٹا... اس میں باہر کا قانون یا کوئی اور دباؤ کچھ نہیں کر سکتا، الٹا نقصان کر سکتا ہے۔ میں اسی ماحول میں پلنے والی عورت ہوں۔ میں اپنی مجبوریاں جانتی ہوں۔ میں ایسی بے وقوفی کرنے کا کیسے سوچ سکتی ہوں جس سے اکبر کی جان خطرے میں پڑ جائے۔ میں تمام عمر خود کو مجرم سمجھتی رہوں کہ میں نے کچھ نہ کیا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔'' وہ اب باقاعدہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

اس کے چپ ہو جانے کے بعد میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ اس سے کیا کہوں۔ مجھے حیرانی تھی کہ جو باتیں ہم نے بڑی رازداری سے کی تھیں، وہ بھابی تک کیسے پہنچ گئیں۔ کیا کسی اور نے بھی ہماری باتیں سن لی تھیں یا پھر ہم میں سے کوئی... مگر کون؟ میں جانتا تھا کہ میں نہیں... انور خود ایک فریق تھا... وہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ رہ جاتی تھیں دو لڑکیاں... سلونی یا ریشم... تو... ان پر میرا اعتماد اتنا ہی تھا جتنا خود پر... یہ بات اہم تھی لیکن بھابی کے کسی سوال کا جواب نہیں ہو سکتی تھی۔

''چپ کیوں ہو ملک صاحب... کیا کہنے کو کچھ نہیں...؟'' وہ تلخ اور طنزیہ لہجے میں بولی۔

''شاید ایسا ہی ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر اعتراف کر لیا۔ ''میں آپ سے پوچھوں کہ ایسا کس نے کہا تو اس کا فائدہ نہیں اور آپ کی بات کو جھوٹ یا محض آپ کا وہم قرار دوں تو یہ بھی فضول... مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں...؟ میں نے سب سن لیا جو تم نے کہا۔''

''تم سب کچھ کر سکتے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''محض خیال ہے تمہارا۔''

''انور تمہاری مانتا ہے۔''

''ایک حد تک... اس حد کا مجھے علم ہے۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا اور یہ فیصلہ میں نے ابھی تمہارے آنسوؤں سے متاثر ہو کے نہیں کیا۔ میں پہلے بھی سوچ رہا تھا کہ انور کو انصاف کی طرف لاؤں، اسے قائل کروں کہ ایک سال کی رنجش اور تلخی کو فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے ختم کرے۔ وہ تو جاگیرداری اور اس استحصال کے خلاف تھا۔ اس کے خیالات اور نظریات میں یہ الٹا انقلاب کیسے آیا... ہو سکے تو وہ اپنے ذہنی سکون کے لیے چھوٹے بھائی سے برابری کی بنیاد پر سمجھوتا کر لے۔ آدھی جاگیر اسے دے کر قناعت اختیار کرے۔ اس کے معاملات الگ کر دے... ورنہ یہ تمام زندگی کا روگ ہے، وہ ناانصافی کرے گا تو خطرے میں بھی رہے گا۔''

''تم نے ایسا سوچا تھا یا مجھے ٹالنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو؟''

''بھابی! جھوٹ سچ کا آپ کو پتا چل جائے گا۔ مجھے اکبر کی نہیں... انور کی بہتری کا خیال تھا۔''

''پھر کب کرو گے تم اس سے بات؟''

''میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کہ کل یا اگلے ہفتے... میں مناسب وقت دیکھوں گا۔ اگر اس بات سے آپ کی تسلی نہیں ہوتی تو آئی ایم سوری... میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا، جیسے تمہاری مرضی... میں بالکل نا امید ہو کے نہیں جا رہی ہوں... اور مجھے یہ احساس نہیں ہے کہ میں نے تم سے بات کر کے کوئی بے وقوفی کی۔''

''ایک بات اور... اگر آپ وہ سب نہیں کر رہی تھیں... جن کا الزام آپ پر آیا... تو پھر آپ کو مطمئن رہنا چاہیے اور اللہ سے بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔''

بھابی کے چلے جانے کے بعد میں بہت دیر تک بے یقینی کے گرداب میں تنکے کی طرح ڈوبتا ابھرتا رہا۔ اس صورت حال میں یہ ناممکن تھا کہ میں بھابی کی ہر بات من و عن تسلیم کر لوں... اور یہ بھی مشکل تھا کہ اس سے ہونے والی گفتگو کو ایک ڈراما یا اس کی سازش کا ایک نیا روپ سمجھ کے نظر انداز کر دوں۔ ظاہر ہے مجھے کسی سے بات کرنی تھی، خود بھابی یہی چاہتی تھی لیکن اب ریشم اور سلونی کی طرف سے میرے اعتماد کے آئینے میں بال آ گیا تھا تو میں صرف انور کو شریکِ راز کر سکتا تھا۔

اگلے دن مجھے انور سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع بہت دیر سے ملا۔ صبح وہ اپنی زمینوں کے معاملات نمٹانے نکل گیا تھا۔ حویلی میں بڑے چودھری کا علاج باقاعدگی سے شروع کر دیا گیا تھا اور یہ ڈاکٹر جلالی کا ہی کمال تھا کہ اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ حویلی میں کوئی زبردستی کر کے ڈاکٹرز کی ہدایات پر عمل کرا سکتا ہے... خصوصاً خوراک میں احتیاط کا مسئلہ دوا لینے سے زیادہ مشکل تھا۔ اصرار کر کے انہیں وقت پر دوا دی جا سکتی تھی مگر نمک والا کم سے کم روغن والا سالن... سبزیوں پر مشتمل غذا... گوشت سے مکمل پرہیز... ایسا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ چیختے دھاڑتے الگ اور برتن اٹھا کے کھانا لانے والے کے منہ پر مارتے... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر جلالی نے بھی کچھ رعایت دی کہ تبدیلی کا عمل آہستہ آہستہ آئے۔ خود اس نے چودھری صاحب کے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ وہ شطرنج بھی کھیلتے رہے۔ پھر پیدل چلانے کے بہانے ڈاکٹر جلالی نے ان کے ساتھ باغ اور زمینوں کا دورہ کیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اپنی چودھراہٹ اور بزرگی کی دہشت سے انہوں نے خود کو تنہا کر لیا تھا۔ ان کا حکم ماننے

والے بہت تھے، دوست کوئی نہیں تھا جس سے وہ بے تکلف ہو کے ہر بات شیئر کر سکتے۔ جلالی انہی کی عمر کا تھا اور اس نے اپنی دوستانہ جارحیت سے چودھری کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ حاکم بن کے انسان محکوموں کے درمیان کتنا اکیلا ہو جاتا ہے۔ قید تنہائی میں کیسی بھی آرام و آسائش میسر ہو... اکیلے پن کی سزا تو آدمی خود کاٹتا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے انور کو گھیر لیا۔ ”تُو کہاں پھر رہا ہے... صبح سے میں دیکھ رہا تھا۔“

”یار، یہ ایک چھوٹی موٹی ریاست تو ہے... اس میں صرف میرے مسائل نہیں، دوسروں کے بھی ہیں۔ تُو بتا تیرا کیا مسئلہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”کل تجھے نئی گاڑی کی ڈلیوری لینی تھی۔“

”مگر کل تو سارا دن باہر رہا... مجھے یہاں کے کام تھے... خیر چلتے ہیں، ابھی تو بہت وقت ہے۔“

میں یہی چاہتا تھا کہ حویلی میں کوئی بات نہ کروں۔ ”تُو جا گاڑی لینے... میں آتا ہوں ایک گھنٹے بعد... وہ نرس نہیں پہنچی۔ اسے لانے کا بہانہ ہے۔“

انور نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”یعنی تو ہماری آپس کی بات کو بھی سیکرٹ رکھنا چاہتا ہے؟ او کے... میں چلتا ہوں پھر۔“

میں نہیں چاہتا تھا کہ ریشم یا سلونی کو بھابی کی شکایت کا پتا چلے۔ اگر ہم ساتھ جاتے تو یہ ہو سکتا تھا کہ ریشم بھی اپنی مرضی سے یا انور کے کہنے سے ساتھ چل پڑتی۔ آج کل ان دونوں کے معاملات کسی حد تک اوپن ہو گئے تھے۔ شک کے مرحلے سے آگے نکل جانے کے بعد انہوں نے بھی رازداری ختم کر دی تھی۔ انور نئے ڈرائیور کے ساتھ ایک کار لے گیا تھا۔ مجھے خود جیپ چلا کے جانا پڑا۔ شوروم میں انور نئی گاڑی وصول کر چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو جیپ کے ساتھ واپس کر دیا۔ اب ہم دونوں کو اپنی اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرنی تھی۔

اطمینان سے بات کرنے کے لیے پی سی کا ریسٹورنٹ ہی مجھے سب سے مناسب جگہ لگتی تھی۔ وہاں کافی پیتے ہوئے میں نے اسے بھابی سے ہونے والی تمام گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے پریشانی سے زیادہ غصہ ہے... مگر میری بات اسے سننا پڑی۔

میرے خاموش ہوتے ہی اس نے کہا۔ ”وہ عورت کوئی نیا کھیل کھیلنا چاہتی ہے۔“

”پہلے یہ سوچ کہ جو بات ہمارے درمیان ہوئی، وہ بھابی تک کیسے پہنچی؟ میرے اور تیرے علاوہ ان معاملات پر جو گفتگو ہوئی، اس میں صرف ریشم اور سلونی شریک تھیں۔“

”تیرا خیال ہے کہ ان میں سے کسی نے بھابی کے کان بھرے؟“

”تو اپنا خیال بتا۔“

”میں سلونی پر شک کر سکتا ہوں، ریشم پر نہیں۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”سلونی پر تیرا اعتماد پرانا ہے... ہے یا نہیں؟ ریشم پر شک نہ کرنے کی وجہ بھی ظاہر ہے۔“

وہ بگڑ گیا۔ ”یار! تو ایسی بات کیسے کر سکتا ہے؟ کیا تُو میرے ساتھ نہیں تھا جب مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا؟ فائرنگ میں ڈرائیور مارا گیا تھا۔ آخر کس پر جائے گا میرا شک... میرا تو کوئی دشمن نہیں تھا اور شروع میں جو گارڈ مجھے شوٹ کرنے آیا تھا... کوئی نہیں تھا میرا دشمن۔“

”مگر اب بھائی ہے... شاید صرف بھائی ہے۔ اب تُو کہے گا کہ دشمنی کی ابتدا اس کی طرف سے ہوئی تھی۔ ظلم اور ناانصافی کرنے والا وہ تھا۔ ماں باپ مجبور تھے یا نہیں... اس سے فرق نہیں پڑتا مگر جب تیری باری آئی تو کیا ہوا؟“

”انصاف ہوا... مجرم کو سزا ملی۔“

”اور دشمنی بڑھ گئی۔ انور! سوچ... غور کر کہ معاملات کو اس انتہا تک لے جانے میں کس کا ہاتھ ہے۔ میرا... چودھری صاحب کا... ماں جی کا یا بھابی کا... نہیں... یہ سو فیصد تیرا فیصلہ تھا۔“

”اب یہ غلط کیسے سمجھا جا سکتا ہے اور میں نے اسے بہت رعایت دے رکھی ہے۔“

”تو اپنی بات سے پھر گیا ہے انور... تُو نے مجھے قائل کیا تھا کہ تجھے خود کو حاکم تسلیم کرانے کے لیے... اپنے دشمنوں کو ایک پیغام دینا تھا تاکہ وہ تجھے کمزور نہ جانیں... بہت ظالمانہ... بلکہ انسانیت سوز سزائیں دیں تو نے۔“

”میں نے بہت رحم دلی کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔“

”انور! میں نے بہت سوچا۔ یہ صرف بھابی کی بات کا اثر نہیں ہے۔ تُو ایک روایتی مزاج والا جاگیر بن رہا ہے۔ تو بھی اکبر بن رہا ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ تو اس جاگیردارانہ نظام اور ظلم کے خلاف تھا۔ زمین کو تقسیم کرنے اور غریبوں کی فلاح کی بات کرتا تھا۔“

”اور اسی کی سزا ابھی ملی ہے۔“ وہ تلخی سے بولا۔

”ہاں مگر اس سے تیری شخصیت بدل گئی، سوچ بدل گئی۔ تیری سب تعلیم اور ذہنی برتری خاک میں مل گئی۔ تجھ پر لالچ غالب آ گیا۔ اقتدار کی ہوس نے تجھے مغلوب کر لیا۔“

”مجھے زندہ رہنے کے لیے ایسا ہی بن کر رہنا ہوگا۔ یہ مجبوری ہے میری۔“

”غلط... تُو نے اپنی زندگی کو خطرات کے جنگل میں دھکیل دیا ہے۔ پہلے کوئی تیرا دشمن نہیں تھا۔ یہ تُو نے خود کہا اور اب ہر طرف تجھے دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں... سازشی اور قاتل۔ تجھے محافظ بدلنا پڑے۔ پھر بھی تو ڈرتا ہے... اکبر کے ساتھ بھابی ہے... اس کا باپ ہے، اس کے پیروں مریدوں کی فوج ہے جو اس کے حکم پر کچھ بھی کر سکتی ہے... تیری مشکلات میں اضافہ ہوگا انور...“

وہ چلّانے لگا۔ ”صاف کیوں نہیں کہتا کہ تُو ڈر گیا ہے۔ تُو مجھے بھی ڈرانا چاہتا ہے۔“

”انور! خطرات سے نمٹنا اور بات ہے، خطرات کو دعوت دینا اور بات ہے۔ آدمی بہت ہوشیار اور بہادر بنتا ہے لیکن اس کی ساری طاقت کا غرور ایک سوراخ سے نکل جاتا ہے جو ایک انچ کی چھوٹی سی گولی اس کے سر میں بنا دے... تُو کیوں ایک مطمئن اور محفوظ خوش و خرم زندگی پر قناعت کرنا نہیں چاہتا؟ اس جاگیرداری کے غرور یا جنون کی قیمت کیا ہے آخر؟“

”یار! کیا چاہتا ہے تُو آخر... کیوں مجھے پریشان کر رہا ہے؟“

”اگر تو دوست سمجھتا ہے مجھے... تو میری بات سن اور سمجھنے کی کوشش کر... ورنہ تو اپنی مرضی کا مالک ہے۔ میں بیک وقت دوستی کا دعویٰ اور تیری تباہی کا تماشا نہیں کر سکتا۔ میں ایک لاوارث اجنبی تھا جس کے نہ یہاں کسی سے رشتے تھے اور نہ کہیں اور... میں چلا جاؤں گا۔“

”یہ بلیک میلنگ ہے ملک...“

”تو جو چاہے سمجھ... اگر تُو میری بات سننا یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا تو میرا تیرے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ... محض مصاحب بن کے ہر معاملے میں جی حضور کہتا رہوں یا تجھے گڑھے میں گرتا دیکھوں پھر بھی چپ رہوں... نو سر... ایسی بے ضمیری میرے خون میں نہیں۔“

انور کے چہرے پر خفت سے پسینا آ گیا۔ ”یار! آئی ایم سوری... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ اچھا تو بول... میں سن رہا ہوں۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور ایک گلاس اپنے اندر انڈیل کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کیا۔ ”دیکھ انور! یہ سیدھا سیدھا حساب کا سوال بنتا ہے... اندازاً کیا مالیت ہوگی تیری تمام جائداد و جاگیر کی؟“

”مجھے کوئی آئیڈیا نہیں۔“

”آئیڈیا ضرور ہوگا۔ کروڑ دو کروڑ کے فرق کو چھوڑ... ایک ارب، ڈیڑھ ارب یا اس سے زیادہ؟“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”شاید دو ارب۔“

”اس میں تیرا حصہ قانونی طور پر بنتا ہے... ایک ارب... یہ تیرا حق ہے... شرعی قانونی اور اخلاقی... جنگ ہے اضافی ایک ارب کے لیے... جس میں دو زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ تیری اور اکبر کی... رائٹ؟ اب تک یہی پوزیشن ہے کہ ایک مالک ہو سکتا ہے، دوسرا نہیں... چنانچہ ایک کو مالک اور دوسرے کو مرحوم و مدفون کہلانا ہے۔ یہ مستقبل کا فیصلہ ہے۔ مستقبل بالکل غیر یقینی وقت ہے جس کے بارے میں کوئی بھی دست شناس یا نجومی نہیں بتا سکتا... کیا ایک ارب کم ہیں تیرے لیے... اور دو ہوں گے تو تجھے کتنا فرق پڑ جائے گا؟ تیری شان و شوکت، عیاشی، بدمعاشی سب دگنی ہو جائے گی؟ ایک ارب میں تو خود کو غریب محسوس کرے گا اور کمتر؟ تیری ڈگریاں اور علم کے خزانے گئے بھاڑ میں۔“

انور نے آہستہ سے کہا۔ ”ایک ارب بھی بہت ہوتے ہیں... مگر...“

”مگر کیا... یہ انا کا مسئلہ ہے... شان کا... انتقام کا... جس پر تو زندگی کا جوا کھیلے گا... ہر احمق، امید پرست جواری کی طرح یہ نہیں سوچے گا کہ ہار تو کسی کے حصے میں بھی آسکتی ہے... سکون، قناعت، خوشی اور عافیت کی تیرے نزدیک کوئی قیمت یا وقعت نہیں؟ بھابی کی باتوں کو چھوڑ... سازش کے تمام امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ خود کو بچانے کے لیے بلی بھی شیر سے لڑ جاتی ہے۔ بھابی کے پیچھے اس کے باپ کی جذباتی سپورٹ کا ہونا فطری بات ہے اور وہ کس قماش کا آدمی ہے... تُو جانتا ہے مجھ سے بہتر۔“

”پھر کیا کروں میں... سمجھوتا کر لوں... تقسیم پر راضی ہو جاؤں... سوال یہ ہے کہ کیا دوسرا فریق بھی راضی ہوگا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں ہوگا تو کر لیا جائے گا۔ اس پر دباؤ ڈالنے والے بہت لوگ ہیں۔ اس کی بیوی... بیوی کا باپ اور خود اس کے ماں باپ بھی یہی کہیں گے کہ صلح صفائی

سے رہو... تم بھائی ہو... دشمن نہیں۔"

انور نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اچھا، میں سوچوں گا۔"

"میں بھائی سے بات کرتا ہوں... تو انہیں ملنے کا موقع دے... اکبر کو اس کی بیوی سمجھا سکتی ہے... وہ اپنے باپ سے بھی بات کرسکتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ انہیں تیری پیشکش بھی ایک چال لگے۔ میں بھی پیر صاحب کو تیری طرف سے ضمانت دے سکتا ہوں۔ اس میں دیر خطرناک ہو گی انور... اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ پیر صاحب کے مریدوں کا ایک ٹولہ نتائج کی پروا کیے بغیر حویلی پر حملہ کر دے۔ تجھے اٹھالے جائے اور اکبر کو بھی چھڑا لے... نہ جانے کیوں مجھے میری چھٹی حس خبردار کرتی ہے کہ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے والا ہے۔ وہ تیری نیت کو بھی دیکھ رہے ہیں اور تیرے اعمال کو بھی۔"

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "چل تو کہتا ہے تو... بات کر بھابی سے... مگر ایک بات میری بھی سن لے... تو مجھ پر بھروسا کرسکتا ہے۔ اکبر پر نہ میں کرسکتا ہوں اور نہ تجھے کرنا چاہیے۔ وہ دوغلا ہے۔ ابھی مان جائے گا لیکن اس کے اندر سے وہ زہر نہیں نکلے گا جو اس کے خون میں شامل ہے۔ اس کے خواب وخیال میں نہیں تھا کہ کبھی اسے میری جگہ قید میں آنا پڑے گا۔ یہ اس کے غرور کی اور انا کی شکست ہے اور وہ معاف کرنے والا آدمی نہیں ہے۔"

"ہوسکتا ہے کہ قید کے تھوڑے سے دنوں میں اسے سمجھ آگئی ہو۔"

انور نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا اثر الٹا ہوگا ملک صاحب! وہ سمجھے گا کہ پہلی بار اس نے مجھے زندہ چھوڑ کے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اب تقدیر نے اسے پھر موقع دیا ہے تو اسے دیر نہیں کرنا چاہیے۔ جس دشمن کو پہلے چھوڑ دیا تھا، اب ہرگز نہیں چھوڑنا... اس میں اور مجھ میں بہت فرق ہے دوست... اسے کوئی سمجھا نہیں سکتا۔"

"کیونکہ اس کا دوست کوئی نہیں... اور دوست اس کا نہیں ہوتا جو کسی پر اعتماد نہ کرتا ہو۔ وہ اپنی زندگی ایسے ہی گزارنا چاہے گا تو اس کی مرضی... ہم اس کے نقشِ قدم پر نہیں چلیں گے... لیکن اپنی حفاظت کے خیال سے غافل بھی نہیں ہوں گے۔"

جب ہم واپس پہنچے تو رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ یہ سوال صرف ریشم اور سلونی نے کیا کہ ہم جس نرس کو لانے گئے تھے، وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں آئی۔ کھانے کی میز پر سے بھابی غیر حاضر تھی۔ مریض اور مسیحا نے کھانا مل کے ایک ہی جگہ کھایا تھا۔ یعنی بڑے چودھری صاحب کے کمرے میں... اور ایک جیسا کھایا تھا۔ ڈاکٹر جلالی نے چودھری صاحب کو کسی بگڑے ہوئے بچے کی طرح کنٹرول کیا تھا۔ بگڑا ہوا بچہ نہ بہت مار سے سدھرتا ہے نہ بہت پیار سے۔ اسے نفسیاتی طریقے سے مطیع بنانا پڑتا ہے۔

ریشم نے پھر کچھ چھیڑا۔ "آخر نرس لانے کا بہانہ کر کے جانے کی ضرورت کیا تھی؟"

میں نے کہا۔ "بہانہ کیسا... اس کا نام ڈاکٹر جلالی نے بتایا تھا مگر اس نے آنے سے انکار کردیا۔"

"کیوں... جب معاوضہ بھی طے ہوگیا تھا۔"

میں نے جھلا کے کہا۔ "یار! اس نے پوچھا کہ دل کا مریض کون ہے؟ میں نے کہا کہ میں ہوں ہمیشہ سے... دل، حسینوں کے وار... محبت سے انکار اور ہجر کے آزار اٹھاتے اٹھاتے بہت کمزور ہوگیا ہے۔ اب آپ پر آ گیا ہے... میرا ہاتھ تھام لو اور میرے ساتھ چلو۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہم چاروں کے درمیان ہونے والی گفتگو شاہینہ بھابی کے کانوں تک کیسے پہنچی؟ جبکہ اس وقت کوئی سننے والا قریب نہیں تھا۔ کوئی دیوار بھی نہیں تھی جس کے کان ہوں۔"

میرا سوال اتنا اچانک، غیر متوقع اور ڈائریکٹ تھا کہ اس کا ردِعمل ایک شاک کی صورت میں آیا۔ سلونی اور اس کے ساتھ ہنسنے والی ریشم کی ہنسی ایک دم کافور ہوگئی۔ وہ کچھ دیر میری صورت دیکھتی رہیں جیسے میری بات سمجھنے میں دشواری لاحق ہے۔ یہ انکشاف سے زیادہ ایک الزام تھا جو کسی پر نہ ہونے کے باوجود سب پر تھا۔

سلونی نے میرے سوال کا جواب دوسرے سوال سے دیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، یہ کون کرسکتا ہے؟"

"معلوم ہوتا تو میں تم سے کیوں پوچھتا؟" میں نے کہا۔

ریشم نے احتجاج کے انداز میں کہا۔ "یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ تم سے کس نے کہا؟"

"خود بھابی نے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں کسی کی طرف بھی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ دل میں شک بھی نہیں لاسکتا لیکن بھابی کی شکایت کو نظرانداز بھی نہیں کرسکتا، ورنہ کہتا کہ یہ آپ کا وہم ہے، افواہ ہے... لیکن جو اس نے بتایا تھا، وہی تھا جو ہم نے ڈسکس کیا تھا۔ اس نے کہا کہ بلاوجہ اس کے خلاف سازش کرنے کا شک کیا جارہا ہے۔ اس کے باپ کی نیت پر شک کیا جارہا ہے... اس نے سرنگ والی بات کا بھی حوالہ دیا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ وہ

کتنی بے بنیاد بات تھی۔"

انور نے ان کے دفاع کی کوشش کی۔ "یار ملک! شاید ہم اونچا بول رہے تھے اور رات کا وقت تھا... کسی نے وہ باتیں سن لیں۔"

"کس نے؟ آس پاس کون تھا؟"

"یہ ہوسکتا ہے کہ اندھیرے کی آڑ میں کوئی دبے پاؤں قریب آگیا ہو... درختوں کے پیچھے چھپتا چھپاتا... تو چھوڑ اس بات کو۔"

میں نے کہا۔ "او کے... میں مطمئن تو نہیں ہوا لیکن لاجواب میں بھی ہوں۔"

"ایک سوال میں بھی کروں؟" سلونی نے کہا۔ "اس گورکن یا مالی کو قتل کرنے والا کون تھا؟"

"اسے تو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔"

"اسے قتل کرنا کس نے ضروری سمجھا؟ آخر کس کا مجرم تھا وہ... کیا جرم تھا اس کا... اس کی بیوہ نے تو بتایا کہ وہ قبر کے نیچے سے مٹی نکال کے اینٹیں بنانے والوں کو دے رہا تھا۔ یہ جرم کس کے نزدیک تھا؟"

"اس کے نزدیک، جو سمجھتا تھا کہ مٹی میری تھی... وہ چوری کررہا تھا۔" میں نے سوچ کے کہا۔

"بھٹا تو یہاں شاید ایک ہی ہے۔ ممکن ہے دو ہوں... بھٹے کے مالک چوری نہیں کررہے تھے۔ وہ مٹی خرید رہے تھے اپنے فائدے کے لیے... ان پر کوئی الزام نہ آتا۔ وہ کہتے کہ ہمیں کیا معلوم وہ مالکوں سے چوری چھپے مٹی بیچ رہا تھا۔ مٹی کا مالک کون ہے؟"

سب خاموش رہے... اس سوال کے جواب میں دو ہی نام لیے جاسکتے تھے... بڑے چودھری صاحب... یا چودھری انور۔

ان باتوں نے بدمزگی پیدا کردی تھی اور فضا اتنی مکدر ہوگئی تھی کہ انور نے نیند کے بہانے یہ بحث ختم کی۔ "یار! دفع کرو... ایسی باتوں میں دماغ سوزی لاحاصل ہے۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں آج... سونے جارہا ہوں۔"

میں بھی کچھ دیر اپنے کمرے میں لیٹا چھت کو دیکھتا رہا۔ سلونی کا سوال بے حد اہم تھا۔ چوری چھپے مٹی بیچنے پر گورکن کو سزا وہی دے سکتا تھا جو خود کو اس کا مالک سمجھتا ہو... چودھری صاحب کا عمر بھر یہی انداز حکمرانی رہا تھا۔ اکبر بھی ان کا صحیح جانشین تھا چنانچہ غلاموں، ملازموں اور نمک خواروں کے ساتھ غیرانسانی رویہ رکھنے اور ان پر ظلم کرنے کی روایت برقرار رہی تھی لیکن انور تو ایسا نہیں تھا۔

چودھری صاحب اپنے وارڈ میں لیٹے تھے۔ اکبر قید میں تھا۔ دماغ اسے مسترد بھی کرتا تھا مگر انور کا نام پھر سامنے آجاتا تھا۔ میں سخت الجھن میں تھا اور اس وقت بھابی سے بات کرنے کے مسئلے پر غور نہیں کررہا تھا جب وہ خود دبے پاؤں آگئی۔

"بھابی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اٹھ کے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا ٹھیک نہیں ہے ملک صاحب؟"

"تمہارا یوں چوری چھپے آکے مجھ سے ملنا... کسی کو کیا معلوم کہ تم کیا کہنے آئی ہو؟"

"تم ڈرتے ہو؟"

"کیا مجھے ڈرنا نہیں چاہیے؟ حویلی میں یہ جرم نہیں سمجھا جائے گا کہ گھر کی بہو آدھی رات کو ایک نامحرم سے... باہر کے آدمی سے ملنے آئے... اس کی خواب گاہ میں... تاریکی میں... نہیں بھابی۔" میں نے لائٹ آن کردی۔

وہ گھبرائی۔ "لائٹ بجھادو۔"

"ہرگز نہیں... میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ بات کریں سب کے سامنے... دن کے اجالے میں... کوئی مجھ سے یا آپ سے پوچھے تو صاف بتائیں کہ آپ کی پریشانی کیا ہے... آپ کو کس کا ڈر؟"

وہ مطمئن ہو کے بیٹھ گئی۔ "میں پوچھنا چاہتی تھی... تم نے انور سے بات کی؟"

"یہ بات آپ کل دن میں بھی پوچھ سکتی تھیں۔ کہیں بھی بلا کے یا روک کے... ابھی پلیز آپ جائیں... اپنے لیے اور میرے لیے خوامخواہ کی الجھن پیدا مت کریں۔"

بھابی نے سخت خفت اور ذلت محسوس کی ہوگی مگر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کس کی مجال ہے کہ مجھ پر شک کرے؟"

"فضول بات ہے یہ... ایک جوان خوب صورت عورت رات کے وقت کسی اجنبی مرد کے بیڈروم میں جائے تو دیواریں بھی شک کرتی ہیں... فرشتہ نہ میں ہوں نہ آپ... مجھے آپ کو بے عزت کرنا مقصود نہیں۔ آپ کی عزت پر حرف نہ آئے... اس لیے میں ایسا کررہا ہوں۔"

وہ باہر نکل گئی اور دروازے کے قریب رکی۔ "ایک جملے میں تم میرے سوال کا جواب دے سکتے تھے۔"

"جواب سن لیں... انور سے بات کی تھی میں نے اور امید ہے سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا... اب جائیے۔"

مجھے اس بے رخی کا افسوس ضرور تھا لیکن میں نے

اچانک محسوس کیا کہ خطرہ صرف میرے لیے ہے۔ یہ ایک نیا خیال تھا جس نے میرے وجود میں خوف کی سنسنی کو جگا دیا۔ کیا یہ بھی بھابی کے انتقامی جذبات کی آگ میں جھلسنے والے ذہن کی کوئی سازش تھی؟ جو بات وہ دن کے اجالے میں کر سکتی تھی اس کے لیے بھابی نے رات کے مجرم اندھیرے کا انتخاب کیوں کیا... اکیلے میں وہ مجھ سے کہیں بھی مل لیتی... مجھے اپنے کمرے میں بلا لیتی اور دروازہ کھلا رکھتی یا میرے کمرے میں آجاتی۔ میں لاکھ باہر کا سہی، اب اس گھر کے ایک فرد کی ذمے داری نبھا رہا تھا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے اپنا لیا گیا تھا۔ یہ خاندان، ذات، برادری اور شجرۂ نسب کی سند رکھنے والے خون کا مسئلہ تھا۔ میری حیثیت انور کے ایک دوست جیسی تھی۔ اتنے ہی اعتماد کے ساتھ حویلی میں گل چاچا موجود تھا۔ سلونی تھی اور بہت سے دیگر نمک خوار تھے۔ وہ گھر میں تھے، خاندان میں نہیں۔

یہ ہو سکتا تھا کہ بڑے چودھری صاحب اتفاق سے بھابی کو آدھی رات کے بعد میرے کمرے میں آتا دیکھ لیتے۔ وہ جسمانی امراض کے ساتھ دماغ کو گھن کی طرح چاٹنے والی فکروں میں مبتلا تھے اور ان کی رات اس پرسکون گہری نیند کی نعمت سے محروم تھی جو ان کے بچپن یا جوانی کے ایام کا حصہ تھی۔ جب رات کے ساتھ آنکھ بند ہوتی تھی مگر صبح کے ساتھ کھلتی نہیں تھی۔ اب نیند ٹوٹ ٹوٹ کے آتی تھی اور ایک رات کئی حصوں میں کٹتی تھی۔ یہ بڑی چودھرائن خود بھی دیکھ سکتی تھی کہ گھر کی عزت کہی جانے والی بہو کیسے چوری چھپے ایک اجنبی کی خواب گاہ میں داخل ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے اپنی مرضی اور خوشی سے... کوئی اور بھی یہ چیز ان تک پہنچا سکتا تھا۔ ذاتی ملازم انہی کے نمک خوار اور مخلص تھے۔ ایسے چوری چھپے کی خفیہ ملاقات کے پیچھے مقصد ایک ہی ہو سکتا تھا اور یہ مقصد سزائے موت کا مکمل جواز فراہم کرتا تھا۔ سب سے پہلے اس اجنبی کے لیے جو حویلی کی آبرو کے حصار میں داخل ہوا۔ اس کا اجنبی ہونا ہی اس کا پہلا جرم تھا۔ گھر کی بڑی بہو بھی مجرم تھی جو حویلی کی غیرت کو نیلام کرنے نکلی۔

ورغلانا شیطان کا کام ہے مگر وہ شیطان ہے۔ ترغیب گناہ کو قبول نہ کرنا ایک خاندانی عزت دار بہو کا فرض ہے۔ میری سزا تو طے تھی۔ بھابی کو شاید صفائی کا موقع ملتا یا صفائی کی مہلت اور رعایت مل جاتی۔ اس کی پوزیشن مضبوط تھی۔ وہ تمام الزام مجھ پر ڈال سکتی تھی۔ جھوٹ بول سکتی تھی۔ وہ بڑی بہو اور تایا کی بیٹی تھی۔ تایا پیر تھا۔ وہ فرشتوں کی گواہی لے آتا کہ اس کی بیٹی معصوم اور پاک نیت ہے۔ میرا کتے کی موت مارا جانا یقینی ہوتا۔ بہت دیر تک میں اس خیال کی دہشت میں مبتلا رہا۔ یہاں سارا فساد ملکیت کا تھا۔ قبر کے نیچے کی مٹی کس کی ملکیت تھی۔ بلا اجازت اسے بیچنا خیانت تھی۔ عورت کا جسم فردِ واحد کی ملکیت تھا۔ وہ زندہ ہو نہ ہو... اس پر بری نگاہ ڈالنے والا سب سے بڑا مجرم اور گناہ گار تھا۔

میرا دماغ سخت کشمکش کا شکار تھا۔ جو خوف مجھے ڈرا رہے تھے، بھابی کو بھی ہوں گے... پھر...؟ کیا اس نے چانس لیا؟ ہارے جواری کی طرح اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا؟ شاید اسے اعتماد تھا کہ کوئی اس پر شک کر ہی نہیں سکتا اور وہ کیوں چاہے گی کہ حویلی سے میرے وجود کو خارج کر دے۔ صرف اس لیے کہ میں ان میں سے نہیں تھا اور میں ہی ریشم کو لایا تھا جس نے اس کے شوہر پر اجارہ داری خطرے میں ڈال دی تھی۔ اکبر اس سے نکاح پر تل گیا تھا۔ بے شک اب وہ انور کے ساتھ تھی اور شاید اس کی ملکیت ہو سکتی تھی لیکن کبھی انور نہ ہوا تو پھر اکبر ہوگا۔ بلکہ صرف اکبر ہو گا اور وہ پچھلی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے دوسرا حملہ زیادہ قوت کے ساتھ کرے گا۔ تو ان دونوں کو اگر نکالا نہیں جا سکتا تو معدوم بہرحال کیا جا سکتا ہے۔ نہ رہے بانس اور نہ بانسری... مجھ سے مدد مانگنا دانہ ڈالنے والی چال تھی۔ میں انور سے وہ سب نہیں کرا سکتا تھا جو وہ اپنے طاقتور پیر باپ سے کرا سکتی تھی۔

میری رات انہی پریشان خیالات میں سوتے جاگتے کٹی۔ صبح میں بہرحال اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مجھے ہرگز خاندانی معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے انصاف اور قناعت کے فارمولے کو انور نے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وقت نے اس کی سوچ کیسے بدل دی تھی، یہ ایک حیران کن تجربہ تھا۔ آدمی کی سرشت وہی رہتی ہے۔ ڈگریاں اور کتابوں کے علمی خزانے کسی کی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ نوجوانی کے شوریدہ سر جذبات کا ایک مختصر دور ایسا آتا ہے جب ہر نوجوان انقلابی سوچ کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن وہ دور محض سطحی تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔ صدیوں پرانے خالص خون کی تاثیر نہیں بدلتی۔

میں ناشتے کے بعد چودھری صاحب کی طبیعت کا حال پوچھنے گیا تو مریض اور مسیحا میں شکار کے پروگرام پر اتفاقِ رائے ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چودھری صاحب نے فرمایا۔ ”لو جی بندہ بھی آ گیا جو ہمارے ساتھ جائے گا۔“

ڈاکٹر جلالی نے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے مجھ پر نظر ڈالی۔ ”یہ کیا کرے گا؟ شکار کو گھر سے بلا کے لائے گا یا ہمارے حکم پر گولی چلائے گا؟“

”یہ ہمارا ڈرائیور ہوگا اور محافظ بھی۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”یہ اچانک علاج چھوڑ کے شکار؟“

”اسے بھی تم علاج میں شامل سمجھو... بھئی کیا ضرورت ہے چودھری صاحب کو یوں آئی سی یو میں لٹائے رکھنے کی۔“

”اگر یہ آپ کا فیصلہ ہے تو ٹھیک ہے۔“

”اپنے ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ سیر و تفریح بھی دوا ہے۔ تو ہم نے ایک چھوٹا سا پروگرام بنا لیا ہے۔ جیپ لے کر چلتے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ دن بھر کی ضرورت کا سارا سامان رکھ دیا جائے۔ خرگوش بہت ہیں لیکن اس سیزن میں ہرن مل جاتا ہے۔“

”ہرن؟ اس کے شکار کے لیے وائلڈ لائف والوں سے لائسنس کی ضرورت نہیں پڑتی؟“

”اوئے ملکا... ایسی شہری باتیں مت کیا کر... ادھر ہماری چلتی ہے... تیرے سرکاری محکمے والے خود آ گئے تھے... یہ پوچھنے کہ چودھری صاحب! اس سیزن میں آپ شکار کے لیے نہیں گئے۔ خیال ذرا دیر سے آیا ورنہ صبح صبح مرغابیاں مل جاتیں... ابھی ان کے واپس جانے کا موسم نہیں آیا۔ خیر، دیکھتے ہیں رات کو ادھر ڈیرا لگا کے...“

ظاہر ہے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اندر سے پچھتر سال پرانے دل کی کیا حالت تھی، یہ جلالی نے دیکھ لیا تھا اور دواؤں کے ساتھ اس نے علاج کا یہ نسخہ آزمایا تھا کہ دماغ کو تفکرات اور اندیشوں کے بوجھ سے آزاد کیا جائے کیونکہ یہ بوجھ دل پر آتا تھا۔ یہ ایک اچھا فارمولا تھا لیکن اس پر ہم عمل نہیں کرا سکتے تھے۔ جلالی نے چودھری صاحب کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور یہ مشورہ قبول کر لیا تھا کہ دنیا کی فکریں چھوڑ کے صرف اپنے لیے جیو... دنیا کے معاملات چلانے والے موجود ہیں مگر وہ تمہاری صحت کی گاڑی نہیں کھینچ سکتے۔ تم اپنی ساری توانائی اپنے لیے صرف کرو، زندگی جب تک ہے اسے خوشی کی توانائی دو... یہ دوا سے زیادہ ضروری ہے۔ دوا کو بھی کارگر کرنا ہے۔

مجھ سے پہلے انور کو بطور ڈرائیور منتخب کیا گیا تھا لیکن اس نے ضروری کام کے عذر پر انکار کر دیا تھا۔ اس کے ضروری کام نہ جانے کیا تھے۔ عموماً وہ پٹواری کے ساتھ لینڈ ریکارڈ میں الجھا رہتا تھا۔

پہلے مجھے انور کی زمینوں کے مسائل میں بڑھتی ہوئی دلچسپی پر حیرانی ضرور تھی کیونکہ وہ ذہنی طور پر مختلف ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا اور اس پس منظر سے بہت عرصہ کٹ کے رہا تھا۔ اس کا مطالعہ اور مشاہدہ بھی الگ تھا لیکن اب یوں لگتا تھا کہ وہ سب وقتی بات تھی۔ اندر سے وہ بھی چودھری تھا۔ چودھریوں کے سلسلۂ نسب کی ایک کڑی... وہ اپنے اصل کی جانب لوٹ رہا تھا۔ یہ تبدیلی مجھے خبردار کرتی تھی کہ شاید میں زیادہ عرصہ اس کا مشیر اور معتمد نہیں رہ سکوں گا۔

انور کا ایک فیصلہ اچھا رہا۔ اس نے بھی اکبر کی طرح بڑے چودھری کو زمینداری کے معاملات سے الگ رکھا مگر بڑی سعادت مندی کے ساتھ... اس نے ان کی خواہش کے مطابق انہیں علاج معالجے کی سہولت فراہم کی اور انہیں ایک ڈاکٹر کے ساتھ آئی سی یو جیسے کمرے تک محدود کر دیا۔ بڑے چودھری کے دماغ کو زمینوں کے مسائل سے کاٹ کے اس نے آسانی شاید خود اپنے لیے پیدا کی تھی اور بڑے چودھری نے بھی مجبوری کو ہنسی خوشی کے ساتھ قبول کرنا بہتر جانا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی صورت میں ان کو بیوی جیسا چوبیس گھنٹے کا ہمدم و رفیقِ تنہائی بھی مل گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کے رشتے میں ایڈجسٹ ہو چکے تھے۔

میں بڑے چودھری صاحب کی ہدایات کے مطابق چلا گیا۔ ہائی ایکس میں کھانے پینے کا وافر سامان تھا۔ تھرماس، چائے کافی اور برف سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک فولڈنگ ٹینٹ تھا جو کہیں بھی نصب کیا جا سکتا تھا اور ہوا بھرنے والے... سلیپنگ بیگ تھے۔ چودھری صاحب بہت خوش تھے۔ وہ ڈاکٹر جلالی کو پرانے قصے سنا رہے تھے۔ جوانی کی شوقین مزاجی کے نہیں... سیر و شکار کے... ان حاکم لوگوں کے بارے میں جو یہاں آتے رہے تھے مگر اب وقت بدل گیا تھا۔

نہر ایک میل کے بعد خم کھا کے ایک میدانی علاقے سے گزری جس میں درخت چھدرے اور زمین کچھ بنجر لگتی تھی پھر ایک جنگل آیا اور چودھری صاحب نے مجھے رکنے کا حکم دیا۔ ”یہاں سے آگے شکار کا علاقہ ہے، آخر تک... جنگل ختم ہوتا ہے تو جھیل جیسا دریا کا پاٹ ہے جس میں سے دوسری نہر جنوب کی طرف نکلتی ہے۔ اس جگہ ہجرت کر کے آنے والی مرغابیاں ڈیرا ڈالتی ہیں۔ آگے ہم پیدل جائیں گے۔“

میں نے ان کی ہدایت کے مطابق خیمہ نصب کیا اور

سلیپنگ بیگ میں ہوا بھری۔ یہ ڈبل کیبن پک اپ تھی جس کے دونوں کیبن ائرکنڈیشنڈ تھے۔ پچھلے حصے میں تمام اسباب لوڈ کیا گیا تھا۔ مریض اور ڈاکٹر کیبن میں بیٹھے چائے کافی پیتے رہے۔ ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے ہدایات دیں اور اپنے اپنے ہاتھوں میں بندوق اٹھا کے چل پڑے۔ چودھری صاحب کو میں نے آج پہلی بار بدلے ہوئے لباس میں دیکھا تھا۔ یہ مخصوص شکاریوں والا ڈریس تو نہیں تھا مگر وہ سفاری سوٹ میں آئے تھے۔ ظاہر ہے ہمیشہ زیر استعمال رہنے والا سفید شلوار قمیص، سیاہ شیروانی اور پگڑی یہاں نہیں چل سکتے تھے۔ پگڑی کی جگہ انہوں نے ولایتی سولو ہیٹ سر پر رکھ لیا تھا۔ ڈاکٹر جلالی پینٹ شرٹ میں تھا۔ جاگرز دونوں نے نہیں پہنے تھے۔ یہ نفسیاتی اثر تھا کہ چودھری صاحب خود کو بیمار اور ضعیف محسوس نہیں کررہے تھے۔ وہ صحت مندوں کی طرح چل رہے تھے اور بڑے جوش سے باتیں کررہے تھے۔

اب مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ میں ڈیش بورڈ پر لگے ریڈیو کو ٹیون کرنے لگا۔ میڈیم ویو پر لاہور کی نشریات موصول ہورہی تھیں۔ امرتسر جالندھر ریڈیو کی آواز اتنی صاف نہیں تھی مگر وہاں سے اچھے گانے آرہے تھے۔ مجھے بالکل پتا نہیں چلا اور ایک جیپ بالکل ساتھ آکے رک گئی۔ مجھے اس میں ڈرائیور کے ساتھ پیرومرشد اظہر علی سہروردی نظر آئے۔ ڈرائیونگ کے فرائض سرانجام دینے والا ان کا مریدِ خاص ہوگا جیسے کہ پیچھے بندوق کے ساتھ بیٹھے ہوئے محافظ۔

میں نے نیچے اتر کے ان سے مصافحہ کیا تو ان کے مریدوں کو میری یہ جسارت ناگوار گزری۔ ایک نے کہا۔ ”تمہیں پہلے پیرومرشد کی قدم بوسی کرنی چاہیے۔“

پیر صاحب نے بڑی فراخ دلی اور شفقت اور معاف کر دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ اٹھا دیا۔

”یہ ہمارا برخوردار شہری بندہ ہے۔“ پیر صاحب نے کہا۔ ”سیکھ جائے گا یہاں کے ادب آداب بھی۔“

میں نے کہا۔ ”آپ یہاں کیسے؟“

پیر صاحب نے اپنے عربی لباس کو سنبھالا۔ ”ہم ایک مریدِ خاص کی درخواست پر اس کے لیے دعا کرنے گئے تھے۔ رات بھر محفلِ سماع کا روح پرور ماحول تھا۔ نمازِ فجر کے بعد سو کے اٹھے تو اپنے آستانے پر جارہے تھے کہ اصغر کی گاڑی دیکھی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ شکار کے لیے آئے ہیں۔“

”شکار کے لیے؟ ہم نے تو سنا تھا کہ وہ اتنا بیمار ہے کہ اسپتال نہیں جاسکتا... اسپتال اس کے لیے وہیں آگیا ہے۔“

”ٹھیک سنا تھا آپ نے... ان کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر جلالی بھی چودھری صاحب کے ساتھ ہے۔“

”یہ اچھا علاج ہے یار۔“ انہوں نے مسکرا کے مریدوں کو دیکھا۔ مرید اپنا فرض سمجھ کے مسکرائے۔

”ان کے واپس آنے کا تو کچھ پتا نہیں، دو گھنٹے سے پہلے مشکل ہے۔“

”ایسی حالت میں صدقہ دینا واجب ہے... بے زبان جانوروں کا خون نفس کے ذائقے کے لیے جائز نہیں... اللہ اسے ہدایت دے۔“

”آمین۔“ مریدوں نے ایک کورس میں کہا۔

”آپ تشریف رکھیں... میں چائے کافی پیش کروں؟“

پیر صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نمازِ ظہر ہمیں آستانے پر ادا کرنی ہے... تم ہمارے ساتھ چلو۔“

”میں آپ کے ساتھ چلوں؟“

”ہوں... اچھا ہوا تم یہاں مل گئے... ہمیں ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے۔“ وہ پھر جیپ میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا۔ ”میں یہاں سے کیسے جاسکتا ہوں؟“

ایک دم دو مریدوں نے مجھے دبوچ لیا۔ ”تو پیر صاحب کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔“

میں نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ ”یہ کیا بدمعاشی ہے... پیر صاحب! آپ منع کریں انہیں... میں چودھری کے ساتھ آیا تھا... وہ اجازت دیں گے مجھے۔“

پیر صاحب نے یوں ”اللہ اکبر“ کہا جیسے انہوں نے میری آواز ہی نہ سنی ہو۔ مریدوں نے مجھے دھکے دے کر اور گھسیٹ کر جیپ کے پیچھے چڑھا دیا۔ مرید باڈی گارڈ بہت مضبوط اور تومند تھے اور مسلح بھی۔ میں بے خبری میں پکڑا گیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو میں ان کی ساری بدمعاشی ایک منٹ میں نکال دیتا۔ انہیں کہاں اندازہ تھا کہ کالج کے زمانے میں اور پھر جیل میں قیام کے دوران میں نے جوڈو کراٹے کی تربیت حاصل کی تھی۔

میرا احتجاج رائگاں گیا۔ ایک محافظ نے ریوالور میری پسلیوں سے لگا دیا تھا۔ ”آرام سے بیٹھ جا ورنہ گولی چل گئی تو قصور ہمارا نہیں ہوگا۔“ جیپ چل پڑی۔

پیر صاحب نے پیچھے دیکھے بغیر کہا۔ ”بھئی اس کو

بحفاظت لے جاتا ہے... زندہ سلامت۔"

میں نے کہا۔ "پیرو مرشد! آپ مجھے حکم کرتے... میں حاضر ہو جاتا... لیکن یہ کون سا طریقہ ہے بدمعاشی کا..."

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے محافظ نے دہاڑ کے کہا۔ "گستاخ... بے ادب۔" اور میرے سر پر ریوالور کا دستہ مارا۔

کچھ دیر کے لیے دنیا میری نظر میں اندھیر ہو گئی۔ مجھے ایک چکر سا آیا اور کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو جیپ پیر صاحب کے آستانے کے سامنے رکی ہوئی تھی، غالباً یہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پیر صاحب اٹھتے بیٹھتے اللہ اکبر کا ورد کرتے تھے۔ جیپ سے اترتے ہوئے انہوں نے اللہ اکبر کہا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اسے حجرے میں پہنچا دو۔" پھر وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کے گرد پھیلا ہوا سفید لبادہ سنبھالتے اور تسبیح کے دانے گھماتے آگے بڑھ گئے۔

مجھ میں غصہ بھرا ہوا تھا لیکن عقل نے مجھے روکا کہ یہاں مزاحمت اور مقابلے میں نقصان صرف میرا ہوگا۔ مسلح ہونے کے علاوہ محافظ تو اناجی تھے اور سب سے زیادہ خطرناک ان کے جذبات کی دیوانگی تھی۔ پیرو مرشد کے لیے جان لینا بھی ان کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا جان دینا۔ اگر وہ میرے ہاتھوں مارے بھی جاتے تو اسے شہادت شمار کرتے۔ ایسے جنونی دیوانوں سے الجھنا کسی طرح بھی میرے حق میں نہ ہوتا۔ میں خود ہی جیپ سے اترا اور وہ منکر نکیر کی طرح میرے دائیں بائیں ریوالور میری پسلیوں میں گھسا کے چلتے رہے۔ یہ ان کا علاقہ تھا۔ یہاں پیرو مرشد کی بادشاہت تھی۔ ان کے تیور بدمعاشوں والے تھے مگر وہ مرید اور جانثار تھے۔

آستانہ ایک کشادہ ہال جیسی عمارت تھی جو شاید بیس فٹ بلند تھی۔ صرف دو سیڑھیوں کے بعد جو لمبائی میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، ایک چبوترا تھا۔ چبوترے کی چوڑائی میرے اندازے کے مطابق پچاس فٹ سے زائد تھی اور یہ مرکزی عمارت کے چاروں طرف موجود تھا۔ سیڑھیاں سادہ سیمنٹ کی تھیں اور چبوترے کا فرش موزیک سے بنا تھا۔ عمارت کے سامنے والے حصے میں محرابی دروازہ لکڑی کا تھا اور اس پر چنیوٹی کام تھا۔ بارہ فٹ سے زائد بلند دروازے کے دونوں پٹ مل کر آٹھ فٹ کی گزرگاہ بناتے تھے۔ اس وقت صرف ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے کے آس پاس کی تمام بیرونی دیواروں پر ملتان اور ہالا کے نیلے نقوش اور گل کاری والے ٹائل جڑے گئے تھے۔ عین دروازے کے اوپر انہی ٹائلوں کو جوڑ کے کلمہ طیبہ لکھا گیا تھا۔ یہ جنوبی پنجاب اور سندھ کے عام مزارات کا انداز تھا۔

چھت پر مزدور چاروں کونوں پر مینار ایستادہ کرنے میں مصروف نظر آتے تھے۔ غالباً آستانے کو زیادہ مرعوب کن بنانے کے لیے اس کو روایتی ڈیزائن کے مطابق بنایا جا رہا تھا۔ چبوترے پر ہر طرف دیہاتی مرد عورتیں فرش پر ڈیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ آج جمعرات ہے اور شاید آستانے پر کوئی محفلِ سماع یا خصوصی دعائیہ تقریب ہو گی۔ گھیردار شلواروں... بڑی بڑی پگڑیوں اور لمبے کرتوں والے مریدانِ خاص ہر طرف کسی خصوصی محافظ فورس کی طرح موجود تھے۔ ان کی گھنی سیاہ داڑھیاں تھیں اور بڑی بڑی مونچھیں... ان کی آنکھیں لال انگارہ محسوس ہوتی تھیں۔ وہ عقیدت مندوں میں چاول تقسیم کر رہے تھے جو وہ اپنی جھولیوں میں لیتے تھے اور ندیدوں کی طرح مٹھی بھر بھر کے کھانے لگتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے اس جھولی پر مکھیوں کی طرح منڈلاتے تھے۔

اندر کا ماحول نیم تاریک اور ٹھنڈا تھا۔ بہت سی دیہاتی عورتیں، مرد اندر دوزانو بیٹھے تھے اور مختلف حرکات میں مصروف تھے۔ مرد دائیں بائیں جھوم رہے تھے اور حلق سے "اللہ ہو" کی آوازیں نکال رہے تھے۔ دو عورتیں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتی تھیں اور پھر زمین پر مارتی تھیں تو خود بھی سجدے میں چلی جاتی تھیں۔ نسبتاً جوان سروں پر چادریں ڈالے یا چہرے کو دوپٹے میں لپیٹ کر گم صم بیٹھی تھیں۔ کچھ سہمی ہوئی، کچھ غصے اور ناگواری کے ساتھ... ایک جوان عورت چلانے لگی۔ "مجھے جانا ہے... مجھے جانا ہے۔" اور اس نے دونوں ہاتھوں کے ایک جھٹکے سے قمیص کے گریبان کو دامن تک چیر دیا۔ اس کے ساتھ آنے والی بڑھیا دہائی دینے لگی۔ "اوئے بے حیا بے شرما... کتھے جا؟ اے توں مینوں پتا اے۔" اور لڑکی کو دونوں ہاتھوں سے کوستے ہوئے اس کے گرد اپنی چادر لپیٹنے لگی لیکن جوان لڑکی نے اسے یوں دھکیلا کہ وہ دور جا کے فرش پر گری۔

اس وقت میں نے دو تنومند محافظ یا مریدوں کو لپکتا دیکھا۔ "ہٹ جا تو ماسی... اسے ہم قابو کرتے ہیں۔" پھر انہوں نے لڑکی کو دونوں طرف سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ لڑکی مچل رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ "میں نے جانا ہے... میں نے جانا ہے۔" اور اس کی دونوں ٹانگیں فرش پر جسم کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھیں۔ میرا رخ ہال کے دائیں جانب والے دروازے کی طرف تھا۔ لڑکی کو مرید بائیں کونے کے دروازے کی سمت لے گئے۔ بیشتر عقیدت مندوں کے نزدیک یہ ایک روحانی سفر تھا۔ لڑکی پر جنات یا شیطانی ارواح کا غلبہ تھا اور کسی عام آدمی کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ اس کے جنون کو کنٹرول کر سکے۔ یہ کام پیر صاحب کی جلالی نظر اور خاص روحانی قوت کر سکتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی بے اولاد بہو تھی یا زبردستی بیاہی جانے والی لڑکی جس پر ہسٹریا کا اثر تھا اور ساس کے سخت ظالمانہ رویے کا اس میں زیادہ دخل تھا۔

یہ چند منٹ کا نظارہ تھا جو میں نے ہال کی مسافت طے کرتے ہوئے دیکھا اور یہ میرے لیے کوئی انہونی یا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ یہ نظارے عام تھے۔ میں کونے کے دروازے تک پہنچا تو ایک مرید جو وہاں دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے دروازے کا قفل کھول دیا۔ مجھے لانے والوں نے پیچھے سے مجھے دھکیلا تو میں دروازے سے گزر گیا۔ دروازہ میرے پیچھے بعد میں بند ہوا۔ اس سے پہلے میں نے خود کو تاریک خلا میں تیرتا محسوس کیا۔ میرے پیر جو دروازے کے پیچھے فرش پر جم کر آگے بڑھنا چاہتے تھے، کسی ٹھوس جگہ کے نہ ہونے سے ہوا میں حرکت کرتے رہ گئے اور زمین کی کشش نے مجھے گہرائی کی طرف کھینچ لیا۔

میں نے ایک اضطراری کیفیت میں سہارے کے لیے دائیں بائیں ہاتھ پھیلائے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ حواس میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور تاریکی مجھے نگل رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا یا سنبھلتا، میرا اسّی کلو وزن کا وجود بھوسے میں دفن ہو گیا۔ میں نے ہاتھ پیر چلائے اور خود کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر میرے پیروں کے نیچے بھوسا پھسل رہا تھا اور میرے ہاتھ کسی سہارے کو گرفت میں لینے سے قاصر تھے۔ میری کیفیت اس شخص جیسی تھی جو تیرنا نہ جانتا ہو اور اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

اندھیرا اتنا تھا کہ مجھے دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بھوسے کی تیز بو تھی جو میرے حواس کو مختل کر رہی تھی۔ بھوسے کے ذرات اڑ کر سانس کے ساتھ میرے حلق میں اور ناک میں داخل ہو رہے تھے۔ اس وقت جو بھی میں نے کیا، غیر ارادی تھا۔ میں کسی کو مدد کے لیے کیا پکارتا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے بے بسی کی کیفیت میں پیر صاحب کو وہ سب گالیاں دیں جو میں دینا چاہتا تھا مگر ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ چند منٹ میں مجھے ہوش آ گیا۔ میں سوچنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے ہاتھوں کو کپڑے سے رگڑ کے اپنے چہرے کو صاف کیا اور اپنا سر بھوسے کی دلدل سے اوپر کیا۔ چند گہرے سانس لے کر میں نے اضطرابی کیفیت میں لاحاصل جدوجہد کرنے والے اعضا پر قابو پایا اور ساکت ہو گیا۔

یہ پیر صاحب کی ہوش مند آدمی کو حواس باختہ کر دینے کی بہت موثر تکنیک تھی۔ اگر زمین پر چلتے ہوئے کوئی میرے سر پر ہتھوڑا مار دیتا تو شاید میرا سر پھٹ جاتا مگر میں اس طرح مفلوج اور بے دست و پا نہ ہوتا۔ چند سیکنڈ تک خلا اور تاریکی میں ڈوبنے کے بعد بھوسے کی دلدل میں اترنے تک میرے دماغ نے جیسے سوچنا ہی بند کر دیا تھا۔ میں ایک بے جان وجود رہ گیا تھا اور یہ شاک میری اعصابی مزاحمت کی تمام قوت ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔ سبق نمبر ایک... تم چوہے دان میں پھنس جانے والے چوہے سے بھی زیادہ بے بس ہو... زندہ ہونے کے باوجود...

بھوسے کی گرد میرے حلق میں بھی اتری تھی۔ اب میں کھانس رہا تھا اور چاہتا تھا کہ ایک گھونٹ پانی کا ملے تو میں سانس کے راستے میں بچھ جانے والے ان کانٹوں کو صاف کر دوں مگر پانی دینے والا کون تھا۔ میری آنکھوں سے بھی پانی بہہ رہا تھا پھر مجھے چھینکیں آنے لگیں۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ اس تمام اذیت سے مجھے خود ہی نکلنا تھا۔ یہ کنواں سا تھا جس میں نہ جانے مجھے کتنی بلندی سے دھکیلا گیا تھا۔ اس کی گہرائی کا میں کیا اندازہ کرتا۔ شاید یہ دس بارہ فٹ نیچے تھا۔ یہ کوئی تہ خانہ تھا جس کے فرش پر کئی فٹ بھوسا بچھا ہوا تھا۔ خالی فرش ہوتا تو میرے جسم کی نہ جانے کتنی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں۔ بھوسے کی شاک پروف تہ نے میرے حواس چھین لیے تھے مگر جسم کو گزند نہیں پہنچنے دیا تھا۔ مقصد مجھے زندہ رکھنا نہ ہوتا تو بھوسے کی جگہ پتھر بچھے ہوتے۔ سرکش مریدوں پر قابض "جنات" کے لیے بھی یہ پہلا جھٹکا الیکٹرک شاک سے زیادہ موثر تھا۔ شاید کسی خفیہ کیمرے کی نظر پیر صاحب کے کنٹرولڈ آپریشن کو یہ منظر دکھاتی ہو گی کہ پہلا تجربہ کس حد تک کامیاب رہا۔ وہ مجھے بھی دیکھ رہے ہوں گے۔

معلوم نہیں اس کنوئیں میں ایسا گھپ اندھیرا کیوں تھا کہ سر اٹھا کے دیکھنے پر بھی کہیں کسی درز یا شگاف سے بھی روشنی کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اس بھوسے کے ڈھیر پر بے دست و پا پڑا رہوں۔ میں

اٹھنے کی کوشش کرتا تھا تو میرے پاؤں جم نہیں پاتے تھے۔ بھوسے کا فرش میرے پیروں کے نیچے سے اِدھر اُدھر سلپ ہو جاتا تھا۔ پھر اس کی عجیب سی بو بھی جواب میرے اعصاب پر بھی اثرانداز ہونے لگی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بھوسے کے باریک ذرات گرد کے ساتھ مل کر ہوا میں شامل ہو رہے ہیں اور میری سانس کے ساتھ پھیپھڑوں میں اتر رہے ہیں۔ میرے حرکت کرنے اور ہلنے جلنے سے یہ غبار بڑھ جاتا تھا۔

شاید اس وقت جب میرے سر پر مریدِ خاص نے مشتعل ہو کے ریوالور کا دستہ مارا تھا اور میں کچھ دیر کے لیے ہوش کھو بیٹھا تھا میری گھڑی اتار لی گئی تھی ورنہ اس کے روشن ڈائل سے مجھے وقت کے گزرنے کا پتا چلتا۔ ایک پہلو سے یہ اچھا بھی تھا۔ گھڑی ہوتی تو اس کی سوئیوں کی حرکت میرے اعصاب پر اثرانداز ہوتی۔ مجھے غصہ آتا کہ وہ اتنی سست رفتاری سے کیوں آگے بڑھ رہی ہیں۔ وقت گزر کیوں نہیں رہا ہے۔ اب دیکھنے اور سمجھنے کو کچھ نہیں تھا۔ بس انتظار تھا جو اندھیرے کی صورت میں منجمد ہو گیا تھا۔ انتظار تھا کہ کچھ ہو... اچھا یا بُرا... لیکن ہر چیز جیسے رک گئی تھی۔ صرف میرے دل کی مشین ابھی چل رہی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ میں زندہ ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ نیند تھی یا بے ہوشی جس نے مجھے مغلوب کر لیا تھا اور احساس کھو دینے سے پہلے میں نے کتنا وقت اپنے حواس برقرار رکھنے کی جدوجہد کرتے گزار دیا تھا۔ پھر مجھے یہ اندازہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بے ہوشی سے ہوش تک کا وقفہ کتنا تھا۔ بس اچانک میری آنکھوں نے ایک بدلا ہوا منظر دیکھا۔ تاریکی جو ٹھوس دیواروں جیسی تھی، غائب ہو گئی تھی۔ روشنی میں میری نظر خود کو اور اس جگہ کو دیکھ سکتی تھی جہاں میں قید تھا۔ یہ آٹھ فٹ بائی آٹھ فٹ کا کمرا تھا۔ اس کی چھت بھی اتنی ہی بلندی پر تھی جہاں وہ دروازہ نظر آ رہا تھا جس سے میں نیچے گرا تھا۔ میرے سامنے تین فٹ اونچی دیوار تھی اور یہ بھوسے کو پھیلنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد دو فٹ چوڑا چبوترا تھا اور سامنے والے حصے میں پانچ فٹ کا فولادی گرل والا دروازہ جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ چبوترے پر چاولوں سے بھری ایک پلیٹ رکھی تھی اور پانی سے بھرا ہوا جگ... دونوں برتن پلاسٹک کے تھے۔

میں لپک کے اٹھا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد جگ تک پہنچ گیا۔ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ چکے تھے۔ پانی میرے لیے آبِ حیات ثابت ہوا۔ میں نے ایک سانس میں آدھا جگ خالی کر دیا۔ پھر جیسے عقلِ سلیم نے مجھے خبردار کیا اور میں رک گیا۔ آہستہ آہستہ میرے حواس بحال ہوئے اور میں پُرسکون ہونے لگا۔ میں نے خود کو چبوترے پر کھینچا اور دروازے کی گرل سے باہر جھانک کر دیکھا۔ یہ جگہ عین آستانے کے مرکز میں پیر صاحب کی نشست کے نیچے تھی۔ چاروں طرف ایسے ہی قید خانوں کے دروازے نظر آ رہے تھے مگر وہ سب بند نہیں تھے۔ آدھے سے زیادہ غیر آباد تھے لیکن سب کے مکین کوٹھریوں کے درمیان صحن میں نظر آ رہے تھے۔ ان میں مرد صرف دو تھے۔ ایک سولہ سترہ برس کا نوجوان تھا اور دوسرا ایک بہت ضعیف... سفید داڑھی اور سفید بالوں والا بوڑھا... چھ عورتوں میں صرف ایک عمر رسیدہ تھی اور ...... چاروں طرف ایک کونے سے دوسرے کونے تک طواف کرتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ اس کی باتوں میں کوئی ربط نہ تھا۔ وہ کبھی ہنستی تھی کبھی روتی تھی۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ باقی پانچ میں سے تین عورتیں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھیں جن کی عمریں بیس اور تیس کے درمیان ہوں گی۔ وہ سب کمزور اور بیمار نظر آتی تھیں۔ دو رو رہی تھیں اور ہاتھوں سے اپنے آنسو صاف کرتی جاتی تھیں۔ دو لڑکیاں صحت مند اور کم عمر تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہنسنا شروع کیا۔ دوسری اسے مارنے دوڑی تو وہ بھاگی اور آگے پیچھے وہ میرے سامنے سے گزریں۔

میرے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی۔ یہ بالکل کسی پاگل خانے کا منظر تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ آستانے پر لائے جانے والے پاگل نہیں ہوتے تھے۔ عقیدت مند لواحقین انہیں پیر صاحب کے دم درود کے لیے لاتے تھے تاکہ ان پر سے جن بھوت اور آسیب کا سایہ اتر جائے اور کوئی بدروح ان کے وجود میں سما گئی ہے تو نکل جائے۔ میں بچپن سے سنتا چلا آیا تھا کہ جاہل اور کم عقل کس طرح ذہنی امراض کو آسیب سے منسوب کرتے ہیں اور درگاہوں پر ان کے روحانی امراض کا علاج کیسے کیا جاتا ہے۔

اس کالے جادو، آسیب اور بلا سے شفایابی کے لیے سب سے زیادہ خواتین آتی تھیں یا لائی جاتی تھیں۔ یہ بے بس مظلوم بیویاں ہوتی تھیں جن کو ساس کی اطاعت نہ کرنے... شوہر سے سرکشی یا بے اولادی کی سزا ملتی تھی... ان کا ہمدرد کوئی نہیں ہوتا تھا۔ خود ان کے گھر والے بھی نہیں۔

میں حیران تھا کہ مجھے اس مرکزِ روحانیت پر کیوں لایا گیا ہے۔ لیکن میری حیرانی کسی سوال کا جواب نہ تھی۔ مجھے دیکھنا تھا کہ مجھ سے کیا کہا جاتا ہے۔ میرے قتل کا جواز کوئی نہ تھا۔ میں کسی کا دشمن نہ تھا اور میری ذات سے کسی کو خطرہ بھی نہ تھا اور قتل کرانا تو پیر صاحب کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ مجھے کہیں بھی ٹھکانے لگا کے گاڑا جا سکتا تھا لیکن مجھے زندہ رکھا گیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی مقصد ضرور تھا۔ شاید مجھ سے کسی ایسے مطالبے پر عمل کے لیے کہا جائے گا جو میں کسی دباؤ کے بغیر ہرگز نہ مانتا۔ میں باہر کا آدمی اور کسی سے اپنی منوانے کے معاملے میں بالکل غیر مؤثر تھا۔ میں چھوٹے بڑے کسی چودھری سے پیر صاحب کا کوئی مطالبہ کیسے منوا سکتا تھا۔ ان کے جھگڑے جائداد کے ہوں یا خاندانی رشتوں کے... میرا کسی میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ بات تو پیر صاحب بھی سمجھتے ہوں گے... مجھ سے زیادہ طاقت اور اثر رسوخ وہ خود رکھتے تھے۔

ذہنی اور جسمانی قوت کے بحال ہوتے ہی مجھے چاولوں کی مہک نے متوجہ کیا۔ یہاں میرا کوئی اختیار نہیں تھا، نہ اسیری پر نہ رہائی پر... مجھے سب سنتا اور برداشت کرنا تھا۔ بھگتنا تھا اور قبول کرنا تھا جو پیر صاحب کے دماغ میں تھا... زندہ رہنے کے لیے روٹی، پانی کا ایندھن ضروری تھا۔ مجبوری میں موت کو قبول کرنے کی بات الگ تھی لیکن اپنی مرضی سے اس زندگی کو ختم کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے چاول کی پلیٹ اٹھائی اور ایک لقمہ چکھا۔ یہ بھوک ہے جو کھانے کو ذائقہ عطا کرتی ہے۔ پیٹ بھرا ہوا ہو تو قورمہ، بریانی کی مہک سے بھی جی متلاتا ہے اور فاقہ ہو تو سوکھی روٹی بھی پیزا سے زیادہ مزے کی لگتی ہے۔ میں نے بھی مزے لے لے کر کھانا شروع کیا۔ چاولوں کی خوشبو نے نظامِ ہضم کو متحرک کر دیا تھا۔ پہلے لقمے نے طلب میں آگ لگا دی۔ میں ندیدوں کی طرح مٹھی بھر بھر کے حلق میں ڈالتا رہا اور نگلتا گیا۔ جب پلیٹ خالی ہو گئی تو میں نے اِدھر اُدھر گر جانے والے چاول بھی چن کر کھائے اور پھر خالی پلیٹ کو حسرت سے دیکھا۔ عام حالات میں شدید بھوک کی کیفیت میں چاولوں کا یہ ڈھیر میں ختم نہیں کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ میری جسمانی توانائی بحال ہوئی اور مجھے خیال آیا کہ لمبے فاقے کے بعد مجھے احتیاط سے کام لیتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے کھانا چاہیے تھا۔ ایک دم نظامِ ہضم کو اوورلوڈ کرنے کا نتیجہ بھی فوراً ہی سامنے آ گیا۔ ایک الٹی کی صورت میں معدے نے زائد خوراک کو خارج کر دیا۔ میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا اور مجھے نقاہت محسوس ہوئی۔ میں پھر بھوسے پر گر گیا اور ایک بار پھر گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا۔ جب میرے حواس پھر بحال ہوئے تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ معدے کا احتجاجی ری ایکشن تھا یا چاولوں میں کچھ تھا جس نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ کسی بھی امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر چاولوں میں کوئی بے ہوش کرنے والی دوا تھی یا کوئی زہر تھا تو شاید ایک الٹی میں کھایا پیا نکل جانے سے اس کے اثرات بھی کم ہو گئے تھے۔ دوسری طرف یہ خیال تھا کہ مجھے مارنا ہی مقصود ہوتا تو پیر صاحب کو گرفتار کرنے اور اسیر رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ گزرتے گزرتے بھی مجھے بھون دیتے اور ان کے جرم کا سراغ کبھی کسی کو نہ ملتا۔

مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ وقت کا حساب رکھنے والی گھڑی نہ ہو تو انسان گزرنے والے سیکنڈ اور منٹ کیا گھنٹوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں جان سکتا کہ دنیا میں دن ہے یا رات... باہر سورج چمک رہا ہے یا چاندنی ہے۔ دن اور تاریخ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ ابھی میرے دماغ کی بے سمت پرواز جاری تھی کہ میں نے تاریک در کو روشن ہوتا محسوس کیا۔ میں نے باہر دیکھا تو منظر بدلا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ جو کچھ میں نے پہلے دیکھا تھا وہ شاید خواب تھا یا اب میں کسی اور جگہ ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔ کوٹھریاں جن میں آسیب کے شکار مریضوں کو رکھا جاتا تھا اپنی جگہ لیکن سب کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور زیرِ علاج مریض ایک بھی نہیں تھا۔ کوٹھریوں میں اندھیرا تھا۔ درمیان کے صحن میں بھی روشنی بہت کم تھی۔ چھت سے آویزاں ایک سفید گلوب کا اجالا اس جگہ محض دھندلکا سا پھیلا رہا تھا جس سے تاریکی بہرحال نہیں رہی تھی۔

اچانک ایک کوٹھری کی تاریکی میں سے سائے کی طرح ایک عورت برآمد ہوئی۔ اس نے سیاہ قمیص پہن رکھی تھی جس پر زرد پھول تھے۔ وہ زرد دوپٹے کے ساتھ ساٹن کی پیلی شلوار میں تھی۔ دوپٹا اس کے گلے میں تھا اور کھلے سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے یہ سب دیکھا اور مجھے اس میں شک نہیں ہونا چاہیے تھا جو میری آنکھوں نے دیکھا۔ لیکن میری نظر اس کے چہرے پر گئی تو یکلخت جیسے وقت تھم گیا۔ میری آنکھیں اس پر مرتکز ہو گئیں۔ ایسے کہ میں پلک جھپکانا تک بھول گیا۔ وہ بے یقینی کا ایک لمحہ تھا جب مجھے لگا کہ میری بصارت نے دھوکا نہیں دیا تو پھر

میرے حواس نے مجھے فریبِ خیال میں مبتلا کر دیا ہے... وہ نورین تھی۔

میں نے اپنی آنکھوں کو ملا اور پھر دیکھا تو وہ وہیں موجود تھی۔ جب میں اس کے سراپا کو اور اس کے لباس کے ہر رنگ اور نقش کو صاف دیکھ سکتا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی صورت کے نقوش سے دھوکا کھا جاتا۔ یہ نقش اپنی تمام تازگی اور تابانی کے ساتھ میری یادداشت میں محفوظ تھے۔ وہ وہاں کھڑی تھی۔ کچھ حیران... پریشان... خاموش اور ساکت... اس کی نظر سامنے تھی مگر صاف محسوس ہوتا تھا کہ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی ہے۔

”نورین!“ میں گلا پھاڑ کے چلّایا تو میری آواز کو دیواروں نے بھی سنا۔ نورین چونکی اور اس نے ایک بار نظر اٹھا کے میری طرف بھی دیکھا لیکن پھر اپنی وارفتگی میں گم ہوگئی۔ یوں جیسے اس کے کانوں تک پہنچنے والی آواز کہیں باہر سے سنائی دی تھی۔ اور یہ آواز نہ جانے کسے پکارتی تھی۔ نورین کون تھی؟ ہوگی کوئی۔

میں پھر چلّایا۔ ”نورین! دیکھو میری طرف... دیکھو میری طرف... میں سلیم... نہیں... میں خاور ہوں... تمہارا خاور۔“

نورین نے ایسے میری طرف دیکھا جیسے میری آواز تو سن رہی ہے لیکن میں کس سے مخاطب ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں... یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے اور نہ اسے سمجھنے کی ضرورت ہے... میں کوئی ایسی زبان بول رہا ہوں جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی۔

میں نے دروازے کو زور زور سے ہلا کے کھڑکھڑایا۔

”نورین! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“

نورین اسی بے حسی کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کے فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی نظر آتی تھی اور دنیا کی باقی آوازوں سے لاتعلق تھی۔ کون اسے پکار رہا ہے اور کیوں... اسے کوئی غرض نہیں۔

میں چلّاتا رہا۔ ”نورین... نورین... خدا کے لیے ہوش میں آؤ... کیا ہوگیا ہے تمہیں... خدا کے لیے ادھر آؤ... میرے پاس آؤ... میری بات سنو... میں خاور ہوں۔“

اچانک وہ اٹھی اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ ہر کوٹھری کے سامنے رک کر دیکھتی تھی۔ میرے یقین کے مطابق کسی دروازے کے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ اندھیرے میں بھی کوئی اس حد تک گم کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ سب جن کو میں دیکھ چکا تھا جیتے جاگتے زندہ لوگ تھے۔ ان پر آسیب کا اثر تھا یا وہ سب ذہنی مریض تھے۔ اس سے قطع نظر وہ ساکت اور خاموش رہنے والے نہیں تھے۔ وہ لمحہ لمحہ بدلتی ذہنی کیفیت کے مطابق ہنستے تھے، روتے تھے، چلّاتے تھے اور اپنے اندر کی بے سکون روح کی تڑپ کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ وہ اتنے سکون کے ساتھ سوتے نہیں رہ سکتے تھے کہ میری دہاڑ بھی انہیں بیدار نہ کرے۔

لیکن نورین ایسے ہر دروازے پر ٹھہر کے اندر دیکھتی تھی جیسے وہاں کوئی ہے... کچھ ہو رہا ہے... چند سیکنڈ رک کر وہ آگے بڑھ جاتی تھی۔ وہ میرے چیخنے چلّانے سے ذرا ڈسٹرب نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو کنٹرول کیا اور اس وقت کا انتظار کرتا رہا جب وہ میرے سامنے آکے دروازے کی دوسری طرف رکے گی۔ بالآخر وہ میرے سامنے ٹھہری اور میں نے دل کی بے قراری کو آواز میں سمو کے کہا۔ ”نورین! دیکھو میری طرف... مجھے پہچانو... میں خاور ہوں... تمہارا خاور۔“

خلافِ توقع وہ چند سیکنڈ کے بعد آگے نہیں بڑھی۔ اس کی آنکھیں کسی جذبے کے بغیر مجھے دیکھتی رہیں۔

میں نے اپنے جذبات کا اظہار جاری رکھا۔ ”کیا تمہیں کچھ یاد نہیں... ہم سکھر میں ملے تھے... اس آسیب زدہ حویلی میں... اور پھر تم میرے ساتھ تھیں جب پک اپ نہر کے پل کا جنگلا توڑ کے پانی میں گری تھی... یاد کرو۔“

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑی رہی اور اس کی ویران آنکھوں میں شناسائی کی کوئی چمک نہیں جاگی۔

میں بولتا رہا۔ اسے یاد کراتا رہا کہ ہم کیسے جدا ہوئے تھے۔ وہ کون تھی اور میں کون تھا... ہم کہاں کہاں ساتھ تھے۔ وہ سنتی رہی لیکن صاف نظر آتا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی یاد نہیں... اس کا حافظہ ایک بلینک شیٹ کی طرح تھا۔ لیکن اس کے رکے رہنے سے میرے دل میں یہ امید جاگ اٹھی تھی کہ کہیں کوئی یاد جاگی ہے۔ کوئی کرن چمکی ہے... کچھ تو ہے جس نے اسے روک لیا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کی یادداشت کو حادثے نے متاثر کیا تھا۔ دماغ کی کسی چوٹ نے اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم کردیا ہے۔ وہ صرف لمحۂ موجود میں زندہ ہے۔ کسی احساس کے بغیر... سوچ اور جذبات کے بغیر... شعور کی برفیلی چٹان کے نیچے پرانا وقت تھا تو وہ خود اس سے لاتعلق تھی مگر میری صورت یا میری آواز نے اس برف میں کوئی دراڑ

ضرور ڈالی ہے۔

وہ سن رہی تھی اور اس کی بے جان آنکھوں میں دلچسپی سے زیادہ حیرانی اتر آئی تھی۔ ”میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آتی۔“ وہ کنفیوژن اور بے یقینی کا شکار ہوگئی تھی۔ ”تم مجھے نورین کیوں کہتے ہو؟“

”اس لیے کہ تم نورین ہو... اور میں خاور۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں فاطمہ ہوں... اور میں کسی خاور کو نہیں جانتی۔“

”تم یہاں کیسے آئی ہو؟ کون لایا ہے تمہیں؟“

”ولی خان... میرا ابا...“

مجھے مایوسی ہونے لگی۔ ”کون ہے یہ ولی خان؟ وہ تمہیں یہاں کیوں لایا ہے؟“

”وہ کہتا ہے... مجھ پر سایہ ہے... مجھے کچھ یاد نہیں رہتا... پیر سائیں نے کہا ہے کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”دیکھو، تم کسی ولی خان کی بیٹی فاطمہ نہیں ہو... تم نورین ہو... میں بتاتا ہوں تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔“ میں نے ایک بار پھر دریا میں گاڑی گرنے کے حادثے کا ذکر کیا۔

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”جھوٹ بول رہے ہو تم... میں فاطمہ ہوں... یہاں سے کچھ فاصلے پر میرا گاؤں ہے۔ میری ماں ابھی سال بھر پہلے مر گئی تھی۔ ہمارا کوٹھا گر گیا تھا۔ وہ اس کے نیچے دب گئی تھی۔ میں بچ گئی تھی۔ میرا ایک بھائی تھا، وہ بھی ہلاک ہوا تھا۔“

میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ نورین نہیں... اس کی صورت کے ساتھ اس کی آواز، اس کا لہجہ سب نورین ہونے کی گواہی دیتے تھے مگر وہ خود کو فاطمہ بتا رہی تھی ـــ یادداشت... جانے کا سبب اس حادثے کو قرار دیا جاسکتا تھا۔ دنیا میں ایک جیسی صورت رکھنے والے بہت ہیں اور بعض اوقات ان کے درمیان مشابہت ناقابلِ یقین حد تک گمراہ کن ہوتی ہے۔ میرا یقین تھا کہ اس کی یادداشت کے نقصان کا سبب گاڑی کا نہر میں گرنا تھا مگر یہ ولی خان جواب اس کا باپ بنا ہوا تھا، اسے کچھ اور یقین دلا چکا تھا۔ اس کا ایک مختلف ماضی سے تعلق جوڑ چکا تھا اور نورین نے خود کو فاطمہ مان لیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹی۔ اب اس کی آنکھوں میں بے یقینی سے زیادہ خوف تھا۔ جادو کا کوئی ناممکن اور ناقابلِ یقین کرتب دیکھنے والے کی طرح میں نورین کو دور جا کے اسی کوٹھری کے اندھیرے میں غائب ہوتا دیکھتا رہا جس میں

سے وہ طلوع ہوئی تھی۔ صورتوں میں اس درجہ مشابہت ناممکن نہیں تھی۔ لیکن یہ ممکن بھی تو نہیں تھی۔ یہ درگاہ ایک شیطانی کارخانہ تھی جہاں ہر قسم کے شعبدے اور جادوگری کے کمالات بے عقل، کمزور اور مجبور عقیدت مندوں کو روحانی کرشمات بنا کے دکھائے جاتے تھے۔ سفلی علوم اور کالے جادو کے توڑ سے جنات اور بدروحوں کے عذاب سے نجات تک غریب آدمی کی ہر مشکل آسان کرنے، اس کے مالی مسائل اور بیماریوں سے دماغی امراض اور خواہشات کی تکمیل تک ان چالاک زمانہ ساز مکروفریب کے بنے ہوئے جعلی پیروں کے پاس سب کچھ تھا۔ وہ غریب مجبور ومحکوم لوگوں کا خون چوس چوس کر زیادہ دولت مند ہوتے جارہے تھے اور بدمعاشی کی طاقت بھی حاصل کررہے تھے۔

میں پیر اظہر علی کی بادشاہی میں اسیر، ایک بے حیثیت، بے سہارا، بے نام ونشان غلام کی طرح تھا۔ جیسے سیلاب کی تباہ کن قوت کے سامنے ایک تنکا... وہ مجھے ایسے مسل دیتا جیسے روڈ رولر کے نیچے چیونٹی... مگر وہ ایسا نہیں کررہا تھا تو یہی میری امید اور طاقت تھا۔ یہ اس کی کوئی غرض تھی جس نے پیر صاحب کو میرے ساتھ یہ کھیل رچانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ مجھے مختلف تماشوں سے حیران... خوف زدہ اور کمزور کررہا تھا تاکہ میں اس کو انکار نہ کرسکوں۔ ایک وقت آئے جب میں اس کی طاقت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوجاؤں۔ میں اس کی روحانی قوت کے پُرفریب کھیل سے متاثر ہو کے فرماں برداری اختیار کرنے والا نہیں تھا۔ مجھے ڈرا کے اور لالچ دے کے اطاعت پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ ڈرانے کا سلسلہ جاری تھا۔ کیا اب نورین کو سامنے لاتا وہ انعام تھا جس کا لالچ مجھے آنکھیں بند کرکے پیر صاحب کا مطیع بناسکتا تھا؟

لیکن کیا وہ نورین تھی؟ کیا پیر صاحب کو معلوم تھا کہ وہ میری جذباتی کمزوری ہے؟

بہت سوچنے کے بعد میرا اس نتیجے پر پہنچنا ناگزیر تھا کہ میرے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں بالکل مزاحمت نہ کروں یا تھوڑی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دوں۔ ظاہر کروں کہ میں ڈر گیا یا دوستی اور وفا شناسی کے سارے اصول بھلا کے ذاتی فائدے کو مدِنظر رکھوں گا۔ بھاڑ میں جائیں انور، اکبر... میرا ان سے کیا رشتہ اور جب تعلق ہی نہیں تو شرافت اور وفا کیسی... مجھے ذاتی فائدہ اور اپنی زندگی کو دیکھنا چاہیے...

اس جعلی پیر نے یہ ڈراما مجھ سے اطاعت حاصل کرنے کے لیے رچایا ہے تو ڈراما مجھے بھی کرنا چاہیے۔ ہر قسم کا وعدہ اور حلف اٹھا لینے میں کوئی گناہ نہیں۔ زندگی بچانے کے لیے حرام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ وقفے وقفے سے مجھے زندہ رکھنے کے لیے جو کھانے اور پینے کے لیے دیا گیا، اس میں کیا کچھ شامل تھا۔ وہ وقفے کتنے طویل تھے۔ میں سو جاتا تھا، بے ہوش ہوجاتا تھا اور پھر ہوش میں آجاتا تھا۔ مجھے اسیری میں رکھنے والے جنات کو قابو کرنے کے سارے حربے جانتے تھے۔ میں تو ایک انسان تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ یہ کھیل ختم ہو... انتظار میرے اعصاب پر اثرانداز ہورہا تھا لیکن مجھے سوچنے سمجھنے اور اپنا لائحہ عمل تیار کرنے کا وقت بھی مل رہا تھا۔

پھر وہ ہوا جو متوقع تھا۔ مجھے پیر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ میری آنکھ کھلی تو میں اس تاریک بھوسے بھرے کنوئیں کے بجائے ایک آرام دہ بیڈ پر تھا۔ میرے کپڑے بھی بدلے ہوئے تھے۔ مختصر سے کمرے میں بیڈ کے علاوہ فرش پر کارپٹ اور ایک صوفہ سیٹ تھا جس کے سامنے میز بھی لگی ہوئی تھی۔ کھڑکی پر مجھے پردہ نظر آیا جو میرے سرہانے کی طرف تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے اسے ہٹایا تو شیشوں سے دن کا اجالا اندر آیا۔ یہ درگاہ کے اندر ہی کوئی جگہ تھی۔ شاید پیر صاحب کی ذاتی رہائش گاہ کا کوئی حصہ... مجھے اس کمرے سے متصل واش روم بھی نظر آیا۔ ہاتھ منہ دھوتے ہوئے میں نے اپنا چہرہ دیکھا۔ میری شیو بھی بنی ہوئی تھی اور بظاہر میری صحت میں کوئی خرابی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

میں نے خود کو پیر صاحب کی خدمت میں پیش ہو کے مذاکرات کے لیے تیار کرلیا تھا۔ ابھی تک مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ میرے اغوا سے اب تک کتنے دن اور گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اعصابی طور پر توڑنے کا یہ پہلا حربہ ہوتا ہے کہ قیدی کو زمان ومکان کے احساس سے محروم کردو۔ اسے دن رات کا پتا نہ چلے... تاریخ اور دن کا علم نہ ہو... وہ اندازہ بھی نہ کرسکے کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے اپنی شکست مان لی تھی کیونکہ مزاحمت یا مقابلہ ناممکن تھا۔ میری رہائی کا انحصار میری تابع داری پر تھا۔ غیر مشروط اور یک طرفہ... میں یہ بھی جانتا تھا کہ پیر صاحب کو غچا دے کر میں نکل بھی جاتا تو مجھے اتنی ہی آسانی سے پھر لایا جاسکتا تھا۔ یہ شطرنج کا کھیل تھا جس میں مجھے ہر چال سوچ سمجھ کے چلنا تھی۔ مجھے ہارنا تھا مگر یوں نہیں

کہ شک ہو اور جیتنے والا سمجھ جائے کہ میں جان بوجھ کے غلط چال چل رہا ہوں۔

میری تمام نقل وحرکت مریدوں اور ملازموں کی نظر میں ہوگی۔ ابھی میں واش روم سے نکلا ہی تھا کہ ایک نوجوان دیہاتی لڑکی میز پر ناشتے کی ٹرے رکھ گئی۔ ابھی ناشتا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ پیر صاحب نے جلوہ نمائی کی۔ وہ اپنے جاہ و جلال اور کروفر کے ساتھ آئے اور صوفے پر بیٹھنے سے پہلے انہوں نے بہ آواز بلند کہا۔ ”اللہ اکبر... کیسے ہو ملک سلیم؟“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”آپ کو سب معلوم ہوگا... مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟“

پیر صاحب ڈھٹائی سے مسکرائے۔ ”وہ دراصل... ہم کچھ زیادہ مصروف رہے اور خیال ہی نہیں آیا کہ تمہیں بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”بات کرنے کے لیے آپ نے بہت غلط راستہ اختیار کیا۔“

”غلط کام کرنے یا کرانے کا کوئی صحیح راستہ بھی ہوتا ہے؟“ پیر صاحب بولے۔

”پہلے شرافت سے بات کرکے دیکھ لینا چاہیے۔“

وہ ناگواری سے بولے۔ ”تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے کوشش بھی نہیں کی مگر شرافت سے ہماری بات کس نے سنی؟ نہ ہمارے چھوٹے بھائی نے... نہ بھتیجے نے اور نہ داماد نے... ہم ایک خاندانی جھگڑے میں پڑ کے اپنی نیک نامی اور شہرت کو داؤ پر کیسے لگاتے؟“

میں نے طنزیہ کہا۔ ”آپ کا روحانی کاروبار متاثر ہوتا۔“

پیر صاحب نے جیسے میری بات نہیں سنی۔ ”تمہیں سمجھانے اور تمہارے ذریعے سے انور کو سمجھانے کا آسان طریقہ کوئی نہیں تھا۔ پہلے بھی انور نے اور تم نے انکار کردیا تھا۔ اب ہم بلاتے تو کیا تم شرافت سے آجاتے؟“

”چنانچہ آپ خود اٹھا لائے مجھے...“

”ایسا اتفاق سے ہوگیا۔ تم نظر آگئے ہمیں... ورنہ ہمارے مرید لے آتے۔“

”آپ کو اندازہ نہیں کہ واپسی پر بڑے چودھری صاحب مجھے وہاں نہ پا کے کتنے پریشان ہوں گے۔“

پیر صاحب مسکرائے۔ ”برخوردار! تمہیں بھی معلوم ہے کہ اس کی زندگی میں سوائے پریشانی کے اور ہے کیا؟ بڑی بڑی پریشانیوں میں ایک یہ بھی سہی۔“

میرا اندازہ ہی میرا یقین بن چکا تھا۔ پیر صاحب کا مقصد کچھ منوانے کے لیے دباؤ ڈالنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ مجھے مرعوب اور دہشت زدہ کرچکے تھے۔ کم از کم ان کا یہی خیال تھا۔ مطالبات کا مجھے علم تھا چنانچہ میں ایک دفاعی اور جوابی حکمتِ عملی تیار کرچکا تھا۔ یہاں میرا داؤ پر کچھ بھی لگا ہوا نہیں تھا۔ ”پیر صاحب! آپ نے میرا انتخاب کیوں کیا؟ میں اس فیملی کا ممبر نہیں ہوں... ان کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں... آپ مجھے مار بھی دیں تو کیا... اس کے علاوہ... میں خود بھی ان کے لیے جان دینے والا نہیں ہوں... آپ انور کو لے آتے۔“

”ہاں... وہ بھی سوچا تھا لیکن یہ بہتر لگا کہ پہلے تمہیں آزمایا جائے۔ انور تمہاری مانتا ہے اور اب تو بڑے چودھری نے بھی تمہاری ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کرلیا ہے۔“

”اسی طرح جیسے ڈاکٹر جلالی کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے... اس کی جگہ ڈاکٹر جمالی آجائے تو کیا۔“

”بات آج کی ہے... آج تمہاری اہمیت ہے۔“

”آپ کی یہ خوش فہمی اب دور ہوجائے گی۔ ویسے آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں انور سے کہوں کہ وہ آپ کے داماد کو رہا کردے، اس کا حصہ دے اور اپنا لے کر الگ ہوجائے... یہ سب تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں... بہت اچھی طرح سمجھا چکا ہوں۔“

”اور کیا تمہارے سمجھانے سے وہ مان گیا؟“

”ہاں، وہ بے وقوف نہیں ہے۔“

پیر صاحب ہنسے۔ ”بے وقوف تم ہو... تمہاری خوش فہمی دور ہوجائے گی بہت جلد... اس کی رگوں میں ایک جاگیردار کا خون ہے۔ اس کا سارا علم اور دماغ کے کسی خانے میں محفوظ پڑا ہے جیسے لائبریری میں پرانی کتابیں ہوتی ہیں، وہ پڑی رہتی ہیں۔ پڑھی نہیں جاتیں... اگر یہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا ہوتا تو میں اتنا مشکل راستہ کیوں اختیار کرتا؟“

میں اسے دیکھتا رہا لیکن کچھ بول نہیں سکا۔ اس نے میرے یقین کو متزلزل کردیا تھا۔ پیر صاحب نے ایک جدی پشتی جاگیردار کی سائیکی جن الفاظ میں بیان کی تھی، وہ انور کے موجودہ کردار کو دیکھتے ہوئے بہت حقیقت پسندانہ مشاہدے کی بات تھی۔ پہلے میں انور کے اعلیٰ و ارفع نظریات اور انسانیت دوستی کی اعلیٰ اقدار والی سوچ سے متاثر ہوگیا تھا۔ اس کے انقلابی خیالات پر مجھے اس کے سوشلسٹ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہورہا تھا

کہ وہ سب سطحی باتیں تھیں یا خود فریبی تھی۔ اقتدار حاصل ہوتے ہی انور کے اندر کا خاندانی جاگیردار غالب آ گیا تھا اور انقلابی نوجوان کو شکست ہو گئی تھی۔ شاید یہ ایک سال تک زندگی اور موت کی بے یقینی کا شکار رہنے کا نتیجہ تھا۔

’’اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں پیر صاحب؟‘‘ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

’’یہ بھی بتا دیں گے... پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ...‘‘ اس کے چہرے پر ایک عیار مسکراہٹ آ گئی۔

میں نے سوچ کے کہا۔ ’’کیا بتاؤں؟ میرا خیال ہے کہ میرے بارے میں آپ زیادہ جانتے ہوں گے۔‘‘

’’پھر بھی... ہم تمہاری زبانی سنیں گے۔ عرصہ دراز سے تمہارے بارے میں جو اطلاعات مل رہی تھیں، وہ بہت کنفیوز کرنے والی اور بعض اوقات متضاد ہوتی تھیں۔‘‘

’’آپ تصدیق کرا سکتے تھے... شاید کرائی ہو گی۔‘‘

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ’’اس میں تو کوئی شک کی بات نہیں کہ تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو... اور بن گئے ہو۔ یہ لاہور یا کراچی نہیں ہے برخوردار جہاں کسی کو کسی سے نہ غرض ہے نہ واسطہ... جن کے ساتھ دیوار ملتی ہے ان گھروں میں کون آیا کون گیا... یہ بھی کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ یہ گاؤں ہے۔ یہاں نسلوں سے وہی خاندان چلے آ رہے ہیں۔ اب تم مجھے یا اصغر کے سامنے تو وہ کہانی نہیں سنا سکتے کہ تمہارا دادا جنگِ عظیم میں یہاں سے گیا تھا اور تم بابا رحیم بخش کے دور کے رشتے دار ہو۔ تمہیں وہیں دیکھا گیا تھا سب سے پہلے۔ تم نے جو کہا لوگوں نے مان لیا۔ مجبوراً یا لاتعلقی میں... کون پڑتا اس چکر میں... اور تمہاری شناخت کو چیلنج کرکے ملتا بھی کیا۔ تمہیں سپورٹ کیا ہے پہلے بابا رحیم بخش نے... پھر اس کی لڑکی ریشم نے...‘‘

’’آپ کو شک ہے کہ بابا رحیم بخش کا قتل بھی میں نے کیا؟‘‘

’’یہ بہت سے لوگوں کا شک تھا لیکن تم نے بڑی... چالاکی سے خود کو بچا لیا۔ گواہی تھی ریشم کی۔ وہ یتیم لاوارث لڑکی تھی۔ کچھ لوگوں نے سوچا کہ تم اس کا سہارا بنتے ہو تو اچھا ہے۔ وہ ایک خود دماغ، سرکش اور بہت منہ پھٹ لڑکی تھی۔ اکبر کو اس کی یہی سرکشی بھا گئی تھی۔ اب سنا ہے انور نے اسے پسند کر لیا ہے۔‘‘

’’ویسے تو آپ کو پل پل کی خبر ہے... مگر شاید ایسا نہیں ہے۔ ان دونوں کی پسند کا مقصد شادی نہیں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

پیر صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔ ’’یہ تو واقعی اچھی خبر ہے۔ میری ایک بیٹی ہے وہاں... اور دوسری بھی ہو سکتی تھی... اگر ریشم درمیان میں نہ آتی... یہ نورین کون ہے؟‘‘ اس نے اچانک سوال کر دیا۔

مجھے یوں لگا جیسے بے خبری میں کسی نے میرے کان کے قریب ریوالور رکھ کے فائر کر دیا۔ ’’نورین؟‘‘

’’یہاں بھی تم اسے پکار رہے تھے۔ ایک لڑکی فاطمہ کو نورین سمجھے تھے۔‘‘

’’وہ فاطمہ نہیں ہو سکتی پیر صاحب... وہ نورین ہی تھی۔‘‘

’’اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ کون ہے نورین... تم مختلف اوقات میں مختلف باتیں مشہور کرتے رہے ہو اپنے بارے میں... اب انور نے تمہیں ملک سلیم اختر کی شناخت دی ہے اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے... اور وہ تمہارا گواہ اور ضامن بن گیا ہے تو تم خود کو ملک سلیم اختر سمجھ رہے ہو۔ انور کی وجہ سے ابھی تمہیں خطرہ نہیں۔‘‘

’’آپ نے بڑی محنت کی ہو گی میرے بارے میں سچ جاننے کے لیے... اور شاید سچ جان لیا ہو گا۔ آپ اس پوزیشن میں ہیں کہ مجھے بلیک میل کریں۔ اب کھل کر بات کیجیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’ابھی تک تم نے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ نورین کون ہے؟ دیکھو چھپایا کچھ بھی نہیں جا سکتا۔ اس میں کچھ وقت ضرور لگے گا لیکن ایسی جلدی بھی نہیں ہے ہمیں... اور خود ہمیں کیا کرنا ہے... ہمارے مرید زمین کی سات تہوں میں دفن مردے کا شجرۂ نسب بھی معلوم کر سکتے ہیں... بلکہ بڑی سے بڑی رشوت لے کر پولیس اس حقیقت تک نہیں پہنچتی جو معمولی سی عقیدت رکھنے والے مرید کے ذریعے سامنے آ جاتی ہے۔ اگر تم میرے اعتماد پر پورے اترو گے تو تمہاری حفاظت کی ساری ذمے داری میری... اصغر یا اس کا بیٹا انور تمہیں بھی کوئی ضمانت فراہم نہیں کر سکتے۔‘‘

پیر صاحب نے مجھے اپنے ہی جال میں گرفتار کر لیا تھا۔ اپنے بارے میں سچ کو ظاہر نہ ہونے دینا میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ میں اس کو ایک کے بعد دوسرے جھوٹ کے پردے میں چھپا رہا تھا لیکن سچ وہ کبھی نہ مرنے والا خودرو پودا تھا کہ میں اس پر مٹی ڈالتا تھا، پتھر بچھاتا تھا اور سیمنٹ کی تہ بچھاتا تھا مگر یہ پھر سر نکال لیتا تھا۔ سنگلاخ چٹانوں میں اگنے والے بیج کی طرح ایک بار پھر مجھے اس کا

سامنا تھا اور بظاہر مجھے اس کے وجود کو تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا۔ میرا ذہن ماضی کے ان چور راستوں پر بھٹک رہا تھا جن پر بھاگتے بھاگتے میں یہاں تک آ گیا تھا اور اس خود فریبی کا شکار تھا کہ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں... اب میں محفوظ ہوں... پیر صاحب اپنے پتے بڑی ہوشیاری سے شو کر رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مقابلے میں میری کوئی چال کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میں ایک ہارا ہوا جواری تھا جس کے پاس اب ہارنے کو بھی کچھ نہ تھا۔ وہ میرے ماضی کے بارے میں اوّل تا آخر سب جانتا تھا۔

’’اگر تمہیں سوچنے کے لیے وقت چاہیے تو مجھے بھی کوئی جلدی نہیں۔‘‘ اس نے ایک عیار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

میں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ’’پیر صاحب! آپ سچ جان چکے ہیں۔‘‘

’’لیکن تم پر اعتبار کی بات کرنے سے پہلے ہم یہ سچ تمہاری زبان سے بھی سننا چاہتے ہیں... کون تھی نورین؟‘‘

اس کے ایک ہی سوال کو بار بار دہرانے سے میرے دل میں ایک امید پیدا ہوئی۔ شاید ابھی وہ سارا سچ نہیں جانتا تھا۔ وہ صرف میرے جھوٹ سے واقف تھا۔ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح میں نے جھوٹ کا ایک آخری جعلی نوٹ چلانے کا فیصلہ کیا۔ کیا ہو گا زیادہ سے زیادہ... میں بازی ہار جاؤں گا... وہ میں پہلے ہی ہارا ہوا ہوں... جعلی نوٹ پکڑا گیا تو مجھے کیا فرق پڑے گا لیکن چل گیا تو کیا پتا میرا یہ داؤ چل جائے۔

’’نورین... میری بیوی تھی... میرا مطلب ہے ہونے والی... ویسے ہماری شادی ناممکن تھی۔ ہم قتل کر دیے جاتے... ہم نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا... اور ہم کامیاب ہو گئے تھے کہ ایک حادثے نے ہم سے وہ مستقبل چھین لیا جس کے خوابوں کی تعبیر ہمیں اپنی دسترس میں نظر آنے لگی تھی۔‘‘

’’نورین تمہیں خاور کے نام سے جانتی تھی؟‘‘ پیر صاحب کی نظریں مجھ پر جم کے رہ گئی تھیں۔

میں نے آہستہ سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ انکار لاحاصل تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ نورین سے میں نے کیا کہا تھا۔ ’’ہم اس پل پر تھے... ایک پک اپ والے نے ہمیں لفٹ دی تھی... تو پک اپ بے قابو ہو گئی اور نہر کے پل کی ریلنگ توڑ کے پانی میں گر گئی۔ مجھے ریشم نے نکال لیا۔ میں بہتا ہوا جا رہا تھا اور وہ کسی کام سے نہر پر گئی تھی۔ مجھے اس نے ہوش آنے پر یہی بتایا۔ بابا رحیم بخش نیک اور رحم دل آدمی تھا۔ لوگوں نے غلط سمجھا۔ اس نے مجھے ریشم کے لیے منتخب نہیں کیا تھا، نہ ریشم کے اور میرے درمیان ایسی کوئی بات تھی۔ اسے بھی بہت ہمدردی تھی مجھ سے... انہوں نے مجھے پناہ دی۔ پھر ان کے ساتھ اعتماد کا رشتہ قائم ہو گیا۔ رحیم بخش کو بیٹی کی فکر تھی کہ وہ نہ رہا تو ریشم اکیلی کیسے رہے گی۔ اس کی تھوڑی سی زمین تھی، وہ بھی محفوظ نہ رہتی... یہ ہو سکتا ہے کہ رحیم بخش نے مستقبل میں مجھ سے امیدیں باندھ لی ہوں کہ میں ساتھ رہوں گا تو شاید وقت کے ساتھ نورین کو بھول جاؤں گا... ریشم کو اپنا لوں گا۔ اس کا یوں سوچنا غلط بھی نہ تھا۔ تاہم میرے یا ریشم کے دل میں ایسا کوئی خیال نہ تھا۔‘‘

’’اپنے بارے میں تم کہہ سکتے ہو... ریشم کے دل کا حال ہم کیسے جان سکتے تھے؟‘‘

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ ’’اکبر ہر صورت میں ریشم کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری موجودگی وہ کیسے برداشت کرتا۔ اس نے بابا رحیم بخش کو مروا دیا، اس یقین کے ساتھ کہ قتل کے جرم میں میرے سوا کوئی اور نہیں پکڑا جا سکتا۔ میں نے رشوت چلائی لیکن یہ رشوت نہیں... کسی اور کی مدد تھی کہ میں بچ گیا... مجھے ایسا لگتا ہے۔‘‘

’’بابا رحیم بخش بھی ہمارا مرید تھا۔ ہماری قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ پیر سائیں دعا کریں جب تک ریشم اپنے گھر کی نہ ہو جائے... میں اس کے ساتھ رہوں... خدا نے اس کی یہ مشکل آسان کی۔‘‘

میں پیر صاحب کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ ’’اس نے... میرے بارے میں بتایا تھا؟‘‘

پیر صاحب نے اقرار میں سر ہلایا۔ ’’اس نے کہا تھا... پیر سائیں! یہ نوجوان اچھا ہے۔ بھروسے کے قابل ہے اور ہم نے کہا کہ رحیم بخش... اللہ پر بھروسا رکھ... تیری مشکل آسان ہو جائے گی۔ آخری بار وہ آیا تو بہت مطمئن تھا۔ اس نے پوچھا کہ پیر صاحب... ریشم کو اس اجنبی کے حوالے کر دوں... تو ہم نے کہا کہ کوئی حرج نہیں... مگر ایک بار اسے ہم سے ملوا دے... وہ ضرور ملواتا مگر اسے مہلت نہ ملی۔ ہمیں اس غریب آدمی کی پریشانی کا احساس تھا۔ ہم نے اس تھانیدار کو پیغام بھیج دیا کہ ملزم تم نہیں... ہمارا اشارہ ہی کافی تھا۔ اس نے تمہیں ریشم کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو تمہارے حق میں صفائی کا گواہ بن گیا تھا۔ رشوت کی بات سب کو معلوم ہے لیکن پولیس کے سامنے

کون آتا... اس کا والی وارث تو کوئی تھا نہیں... اور ریشم خود تمہاری بے گناہی کی سب سے بڑی گواہ تھی۔ سب لوگ خاموش ہو گئے۔ اکبر بھی کچھ نہ کر سکا اس وقت تو... مگر پھر تم اس کی رقابت کا نشانہ بن گئے اور بچ بھی گئے۔"

میں دم بخود یہ سب سنتا رہا۔ "آپ نے اس لیے بھی مجھے بچایا کہ آپ کی بیٹی نے کہا تھا؟"

"ہاں... ہم نے اصغر سے کہا تھا کہ میری بیٹی تمہارے گھر میں ہے تو تمہاری بھی بیٹی ہے... بہو نہیں... اور اس میں لاکھ برائیاں سہی... ایک وضع داری بھی ہے۔ اس نے کہا کہ اکبر خود مختار اور مرد ہے لیکن تمہاری بیٹی محفوظ ہے۔ اکبر دوسری تیسری چوتھی کرے مگر وہ اس گھر کی بہو نہیں ہوگی۔ ہماری ایک مجبوری اور تھی... ہماری دوسری بیٹی کو بھی اسی گھر میں جانا تھا۔ یہ مجبوری نہ ہوتی تو انور کو بچانے والا کون ہوتا۔ ہم نے یہ نہیں ہونے دیا۔ انور کو زندہ رکھا... توبہ توبہ... زندگی اور موت تو اس مالکِ کل کے ہاتھ میں ہے... اگر تم اور ریشم اس رات نکل جاتے تو مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا۔ ہم دونوں بھائیوں میں صلح صفائی سے انصاف کراتے۔ انور کو ہماری جاگیر مل جاتی۔ اکبر باپ کا وارث ہوتا تو انور ہمارا... مگر خود اکبر کی بے وقوفی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اس رات تم فرار ہو جاتے ریشم کے ساتھ تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ اب معاملات بہت الجھ گئے ہیں۔ اگر انور نے ریشم کو پسند کر لیا ہے اور وہ ہماری بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو تم بھی کیا کر سکتے ہو؟"

میں حیرانی سے اس ڈرامے کا وہ حقیقی پس منظر سنتا رہا جس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اب میرے سامنے نہ پیر اظہر علی تھا اور نہ کوئی جاگیردار... نہ مراداں والی کے چودھری...... کا بڑا بھائی... اور نہ اکبر کا سسر... میرے سامنے صرف ایک بیٹی کا باپ تھا۔ دو بیٹیوں کا مستقبل اس کی پہلی ترجیح تھی اور اس معاملے میں وہ کسی مزدور یا صنعت کار یا کلرک سے کسی طرح مختلف نہ تھا جو اپنی بیٹیوں کی پیدائش کے وقت سے ان کے مستقبل کی خوشیوں سے بھرے خوش حال ازدواجی مستقبل کے خواب دیکھنے لگتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تعبیر کو حقیقت بنانے کے لیے خواہش سے کوشش تک اور دعا تک وہ سب کرتا ہے جو اس کے امکان میں ہو... یہی نہیں جب وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تب بھی مطمئن ہو کے نہیں بیٹھتا۔ وہ جب تک بیٹی کا باپ رہتا ہے، اس کی ہر پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟" پیر صاحب نے کہا۔

میں چونکا۔ "وہ... دراصل... میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ریشم کے ساتھ میرے فرار کو خود بڑے چودھری نے پلان کیا تھا؟"

پیر صاحب مسکرائے۔ "ظاہر ہے... یہ مسئلے کا آسان حل تھا۔ اکبر خود ریشم کو قبول نہیں تھا۔ اکبر کی خواہش کو لگام ڈالنا نہ باپ کے اختیار میں تھا اور نہ بیوی کے... تم کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کیوں... یہ سب اس نے نہیں سوچا... اگر تم ریشم کے ساتھ غائب ہو جاتے ہو تو سارا جھگڑا ختم۔"

"پیر صاحب! یہ سو فیصد آپ کا خاندانی اور گھریلو معاملہ ہے... مجھے اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں لیکن بات خود آپ نے چھیڑی ہے تو مجھے بھی اجازت ہے کہ مشورہ دوں۔"

"ہاں بولو... یہاں ہم دونوں کے سوا کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "شاہینہ کی شادی انور سے طے ہوئی تھی اور اکبر کی روزینہ سے۔"

پیر صاحب نے اقرار میں سر ہلایا۔ "سوچا بھی تھا ہم نے... اور غلط بھی نہ تھا۔ بڑے کے لیے بڑی... چھوٹے کے لیے چھوٹی... حالانکہ یہ ضروری بھی نہیں تھا۔ جب رشتے آپس کے ہوں تو وہ سب کچھ نہیں دیکھا جاتا جو باہر شادی کرتے وقت اب دیکھا جاتا ہے... شکل صورت... تعلیم... عمر..."

"پھر انور نے انکار کر دیا۔ آپ نے اس کی واپسی کا انتظار بھی نہیں کیا؟"

"انتظار کب تک کرتے اور کس امید پر؟ اصغر نے خود کہا کہ کب تک بٹھا کے رکھے گا شاہینہ کو... وہ بڑی تھی... میں نے اسے رخصت کر دیا۔ عمر کی مناسبت سے وہ انور سے تین سال کم تھی۔ اکبر سے دو سال زیادہ... مگر اس کی اہمیت نہیں... روزینہ عمر میں انور سے آٹھ سال کم ہے... اس سے فرق نہیں پڑتا... اب انور آ گیا ہے واپس تو..."

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "گستاخی معاف... میں نے یہ بھی سنا ہے کہ روزینہ بھی انور سے شادی کرنا نہیں چاہتی... وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔"

پیر صاحب کی آنکھوں میں کچھ جلال کی سرخی آئی۔

"یہ کون کہتا ہے... اس نے دہاڑ کے کہا۔ "اور کون ہے وہ؟"

"یہ چھوڑیے... اگر یہ سچ ہے۔"

"یہ جھوٹ ہو یا سچ... غیر اہم ہے۔ یہاں لڑکیاں اپنے بر خود پسند نہیں کرتیں۔ جو فیصلہ ماں باپ کرتے ہیں، وہی آخری ہوتا ہے۔" پیر صاحب نے اپنی آواز کی گرج پر قابو پا لیا اور تھوڑا سا پانی پیا۔

"آپ ناراض نہ ہوں۔ آپ مجھ سے مدد چاہتے ہیں اور میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ کی مدد کروں۔ میرے لیے آپ صرف... بیٹی کے باپ ہیں اور بیٹی کا مستقبل آپ کے لیے باقی سب معاملات سے زیادہ اہم ہے۔ ایسی صورت میں کہ وہ دونوں اس شادی پر راضی نہیں... اور زبردستی کی صورت میں خوش کوئی نہیں ہوگا۔ وہ ناخوشی کے ساتھ زندگی بھر ساتھ رہنے پر مجبور ہوں گے تو کیا آپ کو اس سے خوشی حاصل ہوگی؟"

"تم بہت شہری باتیں کرتے ہو۔ کتابوں اور فلموں والی... وہاں بھی عملی زندگی یہی ہے... ایک مرد اور عورت مل کے گھر اور خاندان کو چلاتے ہیں۔ فلموں اور کہانیوں والے رومانس کہاں دیکھے تم نے؟ شادی سے پہلے کی محبت اور عشق وغیرہ اس عمر کی بیماریاں ہوتی ہیں جیسے خسرہ بچپن کی بیماری ہے۔" وہ مسکرائے۔

میں نے اعتراف کیا۔ "بے شک حقیقت ایسی ہے... مگر محبت صرف فلمی نہیں ہوتی۔"

"اصل محبت آتی ہے احساسِ ذمے داری کے ساتھ... جو میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے اور پھر اپنے بچوں کے لیے محسوس کرتے ہیں اور مل کے نبھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساری ذمے داریاں پوری ہو جاتی ہیں اور تب انہیں احساس ہوتا ہے کہ اب ایک دوسرے کے سوا ان کا کوئی نہیں رہا اور وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔"

میں پیر صاحب کی ذہانت اور مشاہدے پر حیران رہ گیا۔ اس کی سوچ بہت عملی تھی۔ اس کی وجہ وہ کتابیں ہی تھیں جو اس نے پڑھی تھیں اور اس کے بھائی نے نہیں پڑھی تھیں۔ مشاہدے کے ساتھ اس کا مطالعہ بھی تھا۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آج اگر آپ کو میں اس کا نام بتا دوں جس سے آپ کی بیٹی شادی کی خواہش مند ہے یا وہ خود آپ کو بتا دے... تو کیا آپ اس شخص کو راستے سے ہٹانے کے لیے غائب کرا دیں گے؟ مروا دیں گے؟ اس کا جواب دو ٹوک ہوتا۔ ہاں... موثر اور آسان طریقہ یہی ہے۔ اس سوال پر تو شاید وہ میرے منہ پر تھپڑ مار دیتا کہ وقت بہت بدل گیا ہے اور نوجوان اب اپنی زندگی ماں باپ کے فیصلوں پر اتنی آسانی سے قربان نہیں کرتے۔ اگر روزینہ اس نوجوان کے ساتھ اسی طرح نکل گئی جیسے اس گاؤں کی ایک لڑکی ریشم میرے ساتھ نکل رہی تھی اور جب آپ بھی چاہتے ہیں کہ نکل جائے... پھر؟

پیر صاحب کے جلال کو دعوت دینا کوئی عقل مندی نہ ہوتی چنانچہ میں نے دوسرا سوال کیا۔ "اب آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں ریشم کے ساتھ نکل چلوں... کیونکہ اس کا اور انور کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ہاں، تمام مسائل کا یہ آسان حل ہے، تمہارے لیے بھی... تم ریشم کو ساتھ لے کے نکل جاؤ... کہیں بھی..."

"شاید اب یہ ممکن نہیں رہا پیر صاحب! ریشم انکار کر دے گی۔ یہاں وہ محفوظ ہے۔ اکبر سے اسے کوئی خطرہ نہیں رہا۔"

"وہ بے وقوف ہے اگر ایسا سمجھتی ہے۔ اور تم یہ کام نہ کر سکے تو پھر ہمیں کرنا پڑے گا۔ خوشی سے نہ سہی زبردستی سہی... ابھی اپنی منزل کا انتخاب وہ خود کر سکتی ہے... پھر ہم کریں گے۔"

"اور وہ ایک ہی ہے... دوسری دنیا...؟" میں نے تلخی سے کہا۔

پیر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب وہ دے چکے تھے۔ یہاں انسانی حقوق... صنفی مساوات... شخصی آزادی جیسی اصطلاحات کا مطلب کوئی نہیں جانتا تھا کیونکہ یہاں بیسویں صدی بھی نہیں اتری تھی۔ ایسی آبادیاں کراچی، لاہور یا اسلام آباد جیسے شہروں سے اتنی ہی دور تھیں جتنے یہ شہر نیویارک اور پیرس کے کلچر سے... یہاں صرف حاکم کا فرمان ہی قانون تھا اور قانون یا جمہوریت کا کہیں دخل نہ تھا۔ وہ خاندان کا حاکم ہو، قبیلے کا یا بستی کا... اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ فیصلہ کن ہوتا تھا۔ اگر میں پیر صاحب کو انکار کرتا تو شاید ان کے لیے آسان حل ہوتا۔ بانس اور بانسری دونوں نہ ہوں گے تو سُر تال کا کیا سوال... شاید یہ ان کی مہربانی تھی یا میری خوش نصیبی کہ انہوں نے مجھے بھی زندگی کا ایک موقع دیا تھا اور ریشم کو بھی... کسی حد تک یہ سوچ کی تبدیلی بھی تھی۔ وقت بالکل نامعلوم طریقے سے زندگی گزارنے کے انداز بدلتا جاتا ہے اور پتا بھی نہیں چلتا۔

پیر صاحب نے گھڑی دیکھی۔ "ہماری حاضری کا

وقت ہو رہا ہے... تم سوچ لو۔"

میں نے اچانک آنے والے خیال پر کہا۔ "پیر صاحب! نورین کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"جسے تم نورین سمجھتے ہو، وہ فاطمہ ہے... دیکھ لو جاؤ اسے۔"

"نہیں، وہ نورین ہی ہے۔ آپ معلوم کریں اس کے بارے میں... اس کے باپ سے پوچھیں... اگر وہ اسی علاقے کے رہنے والے ہیں تو یہ بات سب کو معلوم ہوگی کہ وہ فاطمہ ہے۔"

انہوں نے سر ہلایا۔ "یہ معلوم ہو جائے گا مگر وہ تمہاری بیوی نورین نہیں ہے۔"

پیر صاحب کے جانے کے بعد مجھے ہر سمت سے چلنے والی خیالات کی آندھی نے گھیر لیا۔ میں کوشش کرنے سے پہلے جاننا تھا کہ کوشش کا انجام کیا ہوگا۔ اب ریشم کا جواب یہی ہوگا کہ مجھے مر جانا قبول ہے، انور کو چھوڑنا نہیں۔ اور خود انور کا فوری ردِعمل کیا ہوگا؟ وہ پیر صاحب کے چیلنج کو قبول کرے گا۔ وہ ایک دن ضائع کیے بغیر ریشم سے شادی کر لے گا اور پھر پیر صاحب کو چیلنج دے گا کہ اب ریشم میری حفاظتی تحویل میں ہے۔ ہمت ہے تو کچھ کر کے دکھاؤ... کیا یہ بات پیر صاحب کی عقل میں نہیں آئی اور انہوں نے کیسے فرض کر لیا ہے کہ ریشم نہیں ہوگی تو انور ہنسی خوشی روزینہ سے شادی کر لے گا؟ روزینہ پر ان کا بس چلتا تھا۔ انور خود مختار تھا اور حالات نے اسے حریف بنا کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ میری رہائی کی یہی شرط بن رہی تھی چنانچہ میں نے پیر صاحب سے جھوٹ بول دیا تھا کہ انور کا ریشم سے شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

ریشم اپنی زندگی داؤ پر لگانا چاہتی ہے تو یہ اس کی زندگی ہے۔ ہر جواری جیت مانگتا ہے مگر ہار ملے تو مرتا نہیں۔ مجھے ریشم کے سامنے یہ تجویز رکھنا ہی لاحاصل لگتا تھا کہ زندہ رہنا ہے تو چلو ہم نکل جاتے ہیں جیسے پہلے نکل رہے تھے۔ اس کا جواب صاف ہوگا کہ پہلے کی بات اور تھی۔ اب تم جاؤ... میں انور کے ساتھ ہی رہوں گی مرتے دم تک۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ میں کس گورکھ دھندے میں پھنس گیا؟ جھگڑا دو بھائیوں اور ان کی اولادوں کا اور آپس کی رنجشوں رقابتوں کا سلسلہ... میرا ان سے کیا تعلق... ایک وقت تھا کہ ہمدردی میں ریشم کو میں اپنے ساتھ لے کر نکلنا چاہتا تھا۔ بعد میں ریشم کے اور میرے تعلق کی بنیاد کیا ہوگی؟ صرف ہمدردی یا اس سے بڑھ کر کچھ... یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اب ریشم کو میری پروا نہیں تو مجھے کیوں ہو... پیر صاحب اسے قتل کرائیں یا ریشم اپنے محبوب سے کہے کہ وہ اس کی خاطر پیر صاحب کو مار ڈالے... میں کیوں سوچوں... خود نکل جاؤں... ابھی یہ وعدہ چلے گا کہ میں ریشم کے ساتھ نکلوں گا۔

میں اٹھ کر ٹہلنے لگا لیکن اب پھر میں اکیلا کیسے جا سکتا ہوں... اگر وہ نورین ہے۔ اور شک کی کون سی بات ہے کہ وہ نورین ہے؟ نظر کی گواہی کی بات نہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے، دل کی ہر دھڑکن گواہی دیتی ہے کہ نورین کے علاوہ وہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہوگی تو یہیں ملے گی۔ وہ زیادہ دور کیسے جا سکتی تھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جیسے ریشم نے مجھے بچا لیا تھا، اسے بھی کسی نے ڈوبنے نہ دیا ہو۔ حادثہ تو حادثہ ہوتا ہے اگر اس کے نتیجے میں وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی اور اب سب کے کہنے سے خود کو فاطمہ سمجھنے لگی ہے تو اس کا کیا قصور؟ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ جو خود کو اس کا باپ کہتا ہے، وہ سچ مچ اس کا باپ ہے... یا نورین کو نہر سے نکالنے کے بعد وہ اسے باپ کی طرح پال رہا ہے... اگر ایسا ہی ہوا تو...؟

یہ ایک الگ مسئلہ تھا۔ کیا وہ جو باپ بنا ہوا ہے اپنی فاطمہ کو میرے حوالے کر دے گا؟ میرے ساتھ جانے دے گا؟ وہ نورین ہے یا رضیہ یا کوئی اور۔ خود اس کی گواہی نہیں تو پھر کس کی گواہی مانی جائے گی؟ ماں باپ، بھائی بہن... محلے دار... اور میں کون؟ خود میری شناخت اور گواہی غیر مصدقہ... یہاں کون ہے، انور کے سوا اگر وہ کہے گا کہ ہاں یہ ملک سلیم اختر ہے... نورین کے لیے میں خاور تھا اور فاطمہ سے بھی میں نے یہی کہا تھا... کیا پیر صاحب کو یہ نہیں بتایا گیا ہوگا کہ یہ بندہ خود کو فاطمہ کے سامنے خاور کہہ رہا تھا۔ اور خاور ہو یا ملک سلیم اختر... نورین یا فاطمہ کا کون؟ شوہر ہے تو دکھائے نکاح نامہ... فاطمہ مانتی خود کو نورین اور مجھے شوہر تو کوئی جھگڑا کھڑا ہی نہ ہوتا لیکن ایسا کون ہے جو فاطمہ کو یا نورین کو میرے ساتھ جانے دے گا؟ سب متفق ہوں گے کہ وہ موجودہ باپ کے گھر میں ہی بھلی... جب تک پیر سائیں اس کے آسیب کا علاج نہیں کرتے اور اسے یاد نہیں آتا کہ وہ کون ہے... میں اسے لے کر بھاگ جاؤں... یہ بھی ممکن نہیں۔

اس کے بعد آخری سوال یہ کہ نہ ریشم میرے ساتھ جائے گی نہ فاطمہ... تو میں کہاں جاؤں گا اور کیوں؟ بے شک یہ میری منزل نہیں تھی۔ ایک حادثہ تھا جس نے مجھے

مراداں والی پہنچا دیا اور شاید نورین کو ایسے ہی کسی قریب کے گاؤں میں... اب میں اکیلا چل پڑوں؟ انور نے مجھے حفاظت کا اور آسودگی کا ایک سائبان فراہم کر رکھا ہے یہاں ٹھہر کے میں اس وقت کا انتظار کر سکتا ہوں جب کسی علاج یا قدرت کے معجزے سے فاطمہ کی یادداشت واپس آئے اور وہ کہے کہ ہاں میں نورین ہوں اور مجھے اس شخص کے ساتھ جانا ہے جو خاور سے ملک سلیم اختر بن گیا۔ جیسے میں نورین سے فاطمہ بن گئی... اور تب تک مجھے انتظار کرنا چاہیے۔ پیر صاحب کا مہرہ بننے کا کیا فائدہ؟ میں وہ سب نہیں کر سکتا جو وہ چاہتے ہیں۔ آسان یہ ہوگا کہ میں پیر صاحب سے اقرار کروں اور واپس جا کے انور کو سب بتا دوں۔ پھر انور ہوگا پیر صاحب کے مقابل تو میں اس کے ساتھ... ابھی انور اور ریشم کے عشق کو جھٹلا کے میں نے اپنا راستہ کھلا رکھا تھا۔ پیر صاحب ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ میں نورین کے ساتھ جاؤں۔

یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ اگر وہ نورین ہی تھی تو میں نے اس کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ آج کے بعد اس کا کوئی سراغ نہ ملے گا۔ وہ درگاہ پر نظر نہیں آئے گی... اس گاؤں میں نظر نہیں آئے گی جہاں اس کی پرورش کی ذمے داری اٹھانے والا یہ باپ رہتا تھا۔ پیر صاحب نے ایک رعایت مجھے بھی دی تھی اور ریشم کو بھی۔ اگر ہم مراداں والی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں تو محفوظ رہنے کے لیے... ساری دنیا میں ہم جہاں چاہے جائیں... راستے کھلے ہیں لیکن یہاں ریشم کی وجہ سے روزینہ کا رشتہ خطرے میں پڑ جائے... یہ ناممکن ہے... نہ روزینہ کسی اور کے بارے میں سوچ سکتی ہے اور نہ انور کو سوچنا چاہیے۔

میرا جھوٹا وعدہ ایک لائف لائن بن گیا تھا۔ ریشم کو اور مجھے زندہ رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ بعد کے حالات کے بارے میں پیر صاحب کا اعتماد ان کی خوش فہمی ثابت ہوتا ہے یا نہیں... اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ جب ریشم چلی جائے تو انور اسے یوں بھول جائے جیسے وہ اپنے نظریات اور خیالات کو بھول گیا تھا۔ مخصوص وڈیرا ذہنیت کے ساتھ وہ روزینہ کو اس کی تمام جائداد کے ساتھ قبول کر لے اور اسے بہت فائدے کا سودا سمجھے... جو کچھ ہے وہ زمین، جائداد، دولت اور حکومت ہے۔ بیوی محض ایک عورت ہے... ریشم ہو یا روزینہ... کیا فرق ہے؟ اور وہ اسی گھر میں جگہ بنا لے تو سارے جھگڑے ختم... سب خوش... دل کی بات بھی نہیں... آج ریشم پر آیا ہے... کل کسی اور پر آ جائے گا۔ پرسوں کسی اور پر... استعمال کی چیزیں تو بدلتی رہتی ہیں۔ اس کے آباؤ اجداد کا طریقہ یہی تھا۔ اب وہ خود بھی اسی پر چلنا چاہتا ہے۔ رہی روزینہ... یہ بھی اچھا ہوا کہ سنی سنائی کی بنیاد پر میں نے پیر صاحب کے سامنے اس کے ماموں زاد کا حوالہ نہیں دیا جس سے روزینہ شادی کی خواہش مند تھی۔ میرے منہ سے اس کا نام نکل جاتا تو اس کے ڈیتھ وارنٹ جاری ہو جاتے۔ کیا پتا آج ہی اس کی زندگی کی آخری رات ہوتی۔ معلوم نہیں وہ کون تھا؟

یہ طے کرنے کے بعد کہ جیسے بھی ہوا میں ریشم کو ساتھ لے کر مراداں والی سے نکل جاؤں گا، میں نے وقتی طور پر رہائی کی ضمانت پالی تھی۔ میں پیر صاحب سے کہوں گا کہ مجھے راہداری فراہم کی جائے۔ بحفاظت نکال دیا جائے۔ مراداں والی پہنچ گیا تو میں ساری صورتِ حال انور کے سامنے رکھ دوں گا اور پھر اس سے کہوں گا کہ اپنے تمام وسائل استعمال کر کے فاطمہ کا سراغ لگائے۔ بڑی آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ نہر سے کسی لڑکی کو نکالا گیا تھا تو وہ کون تھی اور اسے کس نے نکالا تھا۔ اگر فاطمہ مل جاتی ہے تو کسی کو وضاحت دینے کی ضرورت نہیں۔ انور کے بندے اسے اٹھا لائیں... اس کی یادداشت میں نورین کو واپس لانے کا مرحلہ بعد کا ہوگا۔

میرا خیال تھا کہ اب میں قید میں نہیں ہوں۔ سرہانے کی طرف والی کھڑکی کھول کے دیکھنے سے بھی یہ خوش فہمی دور نہیں ہوئی۔ ادھر کسی حویلی جیسے گھر کا بیک یارڈ تھا۔ ادھر گائے بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ مرغیوں کے ڈربے تھے اور دھوئے گئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ درمیان میں چارپائی ڈالے ایک عورت حقہ پی رہی تھی۔ وہ موٹی تازی اور ادھیڑ عمر تھی۔ اس نے مردوں کی طرح تہ بند بھی لپیٹ رکھا تھا اور وہ کسی سوچ میں گم تھی۔ اس حصے کے آخر میں آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی جس پر شیشے کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ دیوار سے آگے کافی دور تک کھیت تھے۔ چند مکان فرلانگ بھر دور دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے کھڑکی کھلی رہنے دی۔ ادھر سے تازہ ہوا آتی تھی اور میں نیچے ہونے والی گفتگو بھی سن سکتا تھا۔ بہت موٹی چوکھٹ میں میری انگلی سے بھی موٹی فولادی سلاخیں نصب تھیں۔ نہ ادھر سے کوئی فرار ہو سکتا تھا نہ چور اندر آ سکتا تھا۔ دوسری طرف ایک ہی دروازہ تھا جس سے پیر صاحب قبلہ نے نزولِ جلال فرمایا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو بالکل سامنے کھڑے محافظ مرید نے اپنی رائفل اٹھالی۔ "حکم کرو

جناب!'' اس نے عزت سے سوال کیا۔ مطلب یہ تھا کہ باہر تشریف لانا منع ہے۔ کوئی خدمت ہے تو ہم حاضر ہیں۔

یہ ایک برآمدہ تھا جس کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں برآمدے کے آخری حصے میں تھا اور یہاں ایک ہی دروازہ نظر آرہا تھا۔ آگے سپاٹ دیوار تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ پیر سائیں کا ڈیرا ہے؟''

اس نے میرے سوال پر مجھے بے یقینی سے دیکھا۔ پاگل خانے میں ایک پاگل نے دوسرے سے پوچھا تھا کہ بھائی... یہ سورج ہے یا چاند... تو اس نے بڑی شرافت سے جواب دیا تھا کہ معاف کرنا بھائی... مجھے نہیں معلوم... میں یہاں نیا ہوں... سنتری کو میرا سوال بھی ایسا ہی لگا تھا مگر اس نے اقرار میں سر ہلا دیا اور مجھے تعجب سے دیکھتا رہا۔

قیاس کی بنیاد پر میں نے ایک ضمنی سوال پوچھا۔ ''یہ آستانے کے پیچھے ہے نا؟''

اس کا سر خود بخود ہل گیا مگر اس نے کہا۔ ''تمہیں نہیں معلوم تو مجھے بھی نہیں معلوم۔''

''اچھا... خوش رہو جب تک زندہ ہو۔'' میں نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

ایک پورا دن میں نے سوتے جاگتے اور کمرے میں ٹہلتے... کھڑکی سے جھانکتے اور کسی جواری کی طرح اندازے قائم کرتے گزار دیا۔ میری جیت والے پتے دو تھے۔ ایک ریشم اور دوسری فاطمہ... اگر میں ریشم کے ساتھ نکل جانے کے عہد پر قائم رہتا ہوں اور نورین کا نام نہیں لیتا تو بند راستے کھل جائیں گے۔ یقیناً پیر صاحب میری رہائی کے احکامات صادر کرنے سے پہلے ایک بار پھر ملاقات کر کے میری یقین دہانی حاصل کریں گے۔ میں صدقِ دل سے حلف اٹھا کے انہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ آج رات ہی ریشم کے ساتھ مراداں والی چھوڑ دوں گا۔ بس مجھے کسی طرح لاہور پہنچا دیا جائے یا اس سڑک یا ریلوے اسٹیشن تک جہاں سے مجھے بس اور ٹرین مل سکتی ہو پھر میں لاہور کی طرف نہیں... کراچی کی طرف جاؤں گا اور دوبارہ کوئی مراداں والی میں میرا نام تک نہیں سنے گا۔

یہاں سے نکل کے میں آج ہی رات انور کے ساتھ فاطمہ کو تلاش کروں گا۔ گرد و نواح کے کسی گاؤں میں اس کا سراغ مل جائے گا۔ صبح تک ہم اسے مراداں والی پہنچا دیں گے پھر جو ہوگی دیکھی جائے گی۔ انور کو ریشم سے شادی کرنی ہے تو سو دفعہ کرے۔ وہ میری حفاظت کی ذمے داری لیتا ہے تو ٹھیک ورنہ میں نورین کے ساتھ چلا جاؤں گا کہیں بھی... جہاں پہلے جا رہا تھا۔

میرے لیے اسی کمرے میں چائے اور کھانا فراہم کیا گیا۔ میں نے کھڑکی سے جو گفتگو سنی، اس میں ایک آواز خود پیر صاحب کی تھی۔ دوسری کسی نوکرانی کی جو روزینہ بی بی کے سامنے کسی غلطی کی معافی مانگ رہی تھی اور جواب میں روزینہ بی بی کی برہمی برداشت کر رہی تھی۔ روزینہ کی آواز بالکل اپنی بہن شاہینہ جیسی تھی۔ ان کی ماں کون تھی؟ یہ ذکر کبھی کسی کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ یا میں بھول رہا تھا، شاید خود شاہینہ نے ذکر کیا تھا کہ ماں مر گئی تھی اور باپ نے ہمیں پالا۔

بالآخر رات ہوگئی اور کھانا پھر آگیا۔ مجھے رہائی کی جلدی تھی۔ صرف نارمل نظر آنے کے لیے میں نے کھانا کھا لیا اور انتظار کرتا رہا کہ پیر صاحب پھر نزولِ اجلال فرمائیں تو میں ان کی مرضی کے مطابق حلف اٹھا کے وعدہ کروں کہ جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ میں ریشم کے ساتھ بھاگ جاؤں گا اور پھر کبھی فاطمہ یا نورین کا نام تک نہیں لوں گا۔

لیکن رات گزرتی گئی اور میری مایوسی بڑھتی گئی۔ شاید آج ہی یہ سب نہ ہو۔ پیر صاحب قبلہ کو جلدی کوئی نہیں۔ وہ مجھے مزید ایک دو دن رکھ سکتے ہیں۔ میری نیت اور ارادے کو یقین کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے... یا مجھے رہا کرنے سے پہلے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ بڑھا اپنی بیٹی فاطمہ پر سوار آسیب کے ساتھ اس علاقے سے دفع ہو جائے... اس سے پہلے کہ فاطمہ اپنی بدقسمتی سے نورین ثابت ہو۔

میرا خیال ہے کہ مجھے مایوسی میں بستر پر لیٹے لیٹے جھپکی آگئی تھی۔ اچانک ایک فائر اور پھر ایک پُرکرب ہائے کی آواز نے مجھے چونک کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو اس میں آدھی رات کا وقت تھا۔ بے اختیار میرے قدم دروازے کی طرف بڑھے۔ ابھی میں کنڈی کھول ہی رہا تھا کہ دوسرے فائر کی بازگشت سنائی دی۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر سے فائر ہونے لگے۔ ہر دھماکا مختلف تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ فائرنگ میں مختلف قسم کے آتشیں ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں اور مختلف سمتوں سے... دروازہ کھولتے ہی میں نے باہر کھڑے ہوئے مزید محافظ کو دیکھا جو طویل راہداری میں دم توڑ رہا تھا۔ اس کے سر میں گولی لگی تھی اور اب اس کا خون اور مغز سیمنٹ کے فرش پر پھیل رہے تھے۔ اس پر نزع کا تشنج طاری تھا اور وہ چند سانسوں کا مہمان تھا۔

میرے کمرے کے سامنے کی طویل گیلری میں ایک طرف میرا کمرا اور سپاٹ دیوار تھی۔ دوسری طرف چار فٹ سے اونچی حفاظتی دیوار تھی۔ فائرنگ کہیں پیچھے ہو رہی تھی اور معلوم نہیں کس کے درمیان اور کیوں ہو رہی تھی؟ محافظ کو کسی نے نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اس کا سر دیوار سے اوپر تھا اور دستِ قضا نے کسی بھولی بھٹکی گولی کو اس کی طرف موڑ دیا تھا۔ میں نے جھک کے صورتِ حال کا اندازہ کیا۔ متحارب فریق حویلی کے اندر اور باہر تھے۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ فائرنگ وقفے وقفے سے ہوتی تھی۔ فوری طور پر میں نے اس صورتِ حال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جان کو داؤ پر لگا کے فرار ہونے کا جوا کھیلنے میں رسک تو ہے مگر اس سے زیادہ رسک شاید کچھ نہ کرنے میں تھا۔

میں نے مر جانے والے محافظ کی تلاشی لی۔ اس کے ہاتھ میں خودکار قسم کا ریپیٹر تھا جس کی صورت دیکھ کے خوف آتا تھا۔ استعمال کرنا تو دور کی بات ہے، میں نے اسے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس کی تلاشی لینے پر مجھے ایک ریوالور ملا جو متبادل ہتھیار تھا کہ ریپیٹر نہ رہے یا جواب دے جائے تو ریزرو میں رکھا ہوا ریوالور کام آئے۔ اسے میں نے فوراً قبضے میں کر لیا۔ محافظ کی جیب میں ایک پرس تھا اور اس میں چھ سات سو روپے تھے جو میں نے چھوڑ دیے۔

مجھے احساس تھا کہ وقت کم ہے۔ اس فائرنگ کے تبادلے کو رات بھر جاری نہیں رہنا تھا۔ غالباً یہ ڈاکو تھے جن سے محافظ نمٹ رہے تھے۔ میں دوڑ کر گیلری کے آخر تک گیا اور کونے پر سے جھانک کے دیکھا۔ اُدھر دروازے کی ایک قطار تھی۔ ہر دروازے پر کوئی مسلح مرید موجود تھا۔ وہ سب دیوار کے اوپر سے سر نکال کے اندھیرے میں کچھ دیکھتے تھے اور فائر کرتے تھے... اُدھر سے نکلنا محال تھا، میں وہیں سے واپس ہوا۔ اوپر سے کچھ نظر نہیں آتا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ جمپ لگانے کی صورت میں بلندی کا فاصلہ بارہ فٹ اور چار فٹ کی حفاظتی دیوار کے ساتھ سولہ فٹ ہو جاتا تھا۔ اتنی بلندی سے چکنے فرش پر گرنے کا نتیجہ ایک دو ٹانگوں، پسلیوں یا دیگر ہڈیوں کے ٹوٹنے کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں کسی درخت میں پھنس جاؤں یا نیچے کچی زمین ہو... وقت کم تھا اور مجھے کوئی اندر کی آواز چانس لینے پر مجبور کر رہی تھی۔

اب مجھے ان فلموں کے مناظر یاد آئے جن میں قیدی کسی زنداں سے فرار ہونے کے لیے بیڈ شیٹس کو پھاڑ کے

رسی بناتے تھے۔ میں اندر دوڑا۔ بیڈ شیٹ کو گھسیٹا اور دانتوں سے کاٹ کے اس کو درمیان سے پھاڑا۔ برآمدہ نما گیلری میں پانی کی نکاسی کے لیے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر ایک سوراخ چھوڑا گیا تھا اور اس میں لوہے کا دو انچ قطر کا پائپ لگا دیا گیا تھا۔ میں نے طے یہ کیا تھا اس پائپ میں چادر کے ایک کونے سے گرہ باندھ کے نیچے لٹکنے کی کوشش کم خطرناک بنائی جاسکتی ہے۔ ٹکڑوں کی لمبائی سات فٹ تھی۔ دو کو ملا کے یہ چودہ فٹ ہو جاتی تھی۔ ایک فٹ گانٹھ لگا کے دونوں کپڑوں کو جوڑنے میں کم ہو جاتے تھے۔ شاید ایک فٹ ہی پائپ کے گرد گرہ لگانے میں کم ہوں گے... پھر بھی بارہ فٹ کی رسی بچے گی۔

چادر کی لمبائی کے رخ دونوں ٹکڑوں کے کونے ملا کے ایک کرنے میں بس ایک منٹ ہی لگا۔ پھر میں نے گیلری میں آکے اور دیوار کے اوپر سے جھک کر پائپ کو گانٹھ کے پھندے میں ڈالا اور چادر کو کھینچا تو پائپ کے گرد اس کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ اب بھی رسک تین تھے۔ گانٹھ کھل جانے سے پائپ نکل جائے... گانٹھ دونوں ٹکڑوں کے جوڑ پر سے کھل جائے یا چادر میرے ساتھ ہی آجائے... اس وقت سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آگے کے رسک اپنی جگہ تھے مثلاً یہ کہ میں کسی مسلح محافظ کے سامنے خلاباز کی طرح اتروں مگر وہ میرا استقبال اس طرح نہ کرے... یا میں نیچے جاتے جاتے اِدھر اُدھر سے گزرتی گولی کا نشانہ بن جاؤں۔

آنکھ بند کر کے میں لٹک گیا اور چند سیکنڈ میں درخت کی شاخوں سے جھولنے والے ٹارزن کی طرح نیچے پہنچا مگر آدھے راستے تک... چادر کا جوڑ کھل گیا اور میں ایک ٹکڑے سمیت نیچے گرا... پھر بھی بلندی چھ سات فٹ تھی اور جسم کے خودکار عمل نے مجھے چوکس کر دیا تھا۔ ہائی جمپ لگانے والے کی طرح میں نے زمین پر پاؤں لگتے ہی خود کو اٹھایا... میں کچی زمین پر اترا تھا اور صحیح سلامت رہا تھا۔ زمین سے پیر چھوتے ہی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کوئی باغ تھا جس کی باؤنڈری بیس پچیس گز کے فاصلے پر نظر آرہی تھی۔ یہ آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی جس کو عبور کرنا مجھے ناممکن نہیں لگتا تھا۔ قریب پہنچ کے مجھے کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آ گیا۔ اس میں کنڈی اندر سے لگی ہوئی تھی مگر تالا نہیں تھا۔

پلک جھپکتے میں، میں باہر تھا۔ یہ میدانِ جنگ تھا۔ فائرنگ باہر سے ہو رہی تھی۔ اس کا جواب اندر والے دے رہے تھے۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا غیر ضروری تھا کہ لڑائی کس بات پر ہے۔ مجھے کسی بھی سمت میں فرار ہونا تھا۔ آدھا چاند عین سر پر تھا چنانچہ سمت کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ ابھی میں چند قدم ہی گیا تھا کہ مجھے دیوار کے ساتھ لگی سائیکل نظر آئی۔ میں نے اسے دیکھے بغیر اٹھا لیا اور اس پر سوار ہو کے اندھا دھند پیڈل مارنے لگا۔ اس کے ٹائروں میں ہوا نہ ہوتی یا سرے سے ٹائر ہی نہ ہوتے تب بھی میں اس مشین کو استعمال کرتا۔ اس وقت میرے لیے سائیکل کی اہمیت جیٹ طیارے سے کم نہ تھی۔ اب اللہ نے راستہ بنایا تھا تو ساز و سامان اور حالات سے بھی مدد کر رہا تھا۔ سائیکل میں ہوا تھی۔ غالباً مالی اسے مقامی آمد و رفت کے لیے استعمال کرتا ہوگا۔

غبار جیسی چاند کی روشنی میں منظر صاف نہیں تھا مگر میں کسی درخت سے نہیں ٹکرایا اور کسی گڑھے میں نہیں اترا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ سائیکل کے ٹائر تک پنکچر نہیں ہوئے۔ میں فائرنگ والے علاقے سے دور جانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ سمت کا فیصلہ محفوظ علاقے میں پہنچنے کے بعد بھی کیا جا سکتا تھا۔ ایک فرلانگ دور جاتے جاتے میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور میری جسمانی قوت خلاص ہو گئی۔ ایک جگہ میں گر گیا اور پھر وہیں پڑا رہا۔

چند منٹ میں سانس بحال ہوئی تو میں نے حواس کو بھی مجتمع کیا۔ اب طے کرنا ضروری تھا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ ایک بار پھر شمال کے قطبی ستارے نے مجھے متوجہ کیا اور میں آنکھیں بند کر کے سوچنے سے مراداں والی کی سمت کا تعین کرنے میں کامیاب رہا۔ آستانہ اس دھند لکے میں ایک فرلانگ پیچھے صرف روشنی کی وجہ سے نظر آتا تھا۔ فائرنگ اب بند ہو گئی تھی۔ اب کہیں ذہن کے نہاں خانوں سے ایک خیال ابھرا۔ پیچھے کچھ لوگ بلند آواز میں چلا بھی رہے تھے۔ ایک عورت گالیاں دے رہی تھی۔ معلوم نہیں کیسے... مگر میں نے ایک لڑکی کی آواز بھی سنی تھی جو چیخ رہی تھی۔ مار دو... مجھے بھی مار دو... ابھی مار دو... غالباً وہ روزینہ تھی۔ اس کی آواز میں سن چکا تھا جو اپنی بہن شاہینہ کی آواز سے کافی ملتی تھی۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟

مجھے کیا ضرورت ہے فکرمند ہونے کی؟ میں نے سوچا اور پھر سائیکل پر چڑھ گیا۔ اب میں خاصا پُراعتماد تھا اور محفوظ بھی۔ مراداں والی جانے کے لیے مجھے دائیں طرف جانا تھا۔ بیچ میں کہیں نہر بھی آئے گی۔ اسے کراس کرنے کے لیے پل کہاں ہے؟ پل نہ ہو تو میں سائیکل چھوڑ کے پانی میں اتر سکتا ہوں اور اس تھوڑے سے فاصلے کو تیر کے پار کر سکتا ہوں۔ لیکن میں سیدھا چلتا جاؤں تو کیا کسی گاؤں میں پہنچ سکتا ہوں؟ یا اس جگہ جہاں سے مجھے اٹھایا گیا تھا۔ جہاں بڑے چودھری نے شکار کے لیے خیمہ نصب کیا تھا۔ اس سے پہلے نہر کا موڑ تھا اور پھر جھیل جیسا پاٹ جہاں سے دوسری نہر نکلتی تھی۔

اچانک میں نے دو سائے سے دیکھے۔ وہ رات کے وقت نہ جانے کیا کھود رہے تھے۔ الٹے ہاتھ پر کھیت تھے۔ شاید وہ کھیتوں میں لگانے کے لیے پانی کی چوری کر رہے تھے۔ میرا خیال درست تھا۔ وہ نہر سے نکلنے والی ایک فٹ چوڑی نالی کا ایک کنارہ کاٹ کے پانی کا رخ اپنے کھیت کی طرف موڑ رہے تھے۔ مجھے اچانک سامنے پا کے وہ ٹھٹک گئے۔ ان دونوں کے تن پر صرف ایک لنگوٹی تھی اور دھند لکے میں ان کے سیاہ بدن یوں چمک رہے تھے کہ ہڈیاں گنی جاسکتی تھیں۔ وہ مجھے تذبذب کے ساتھ دیکھتے رہے کہ میں لاتعلقی سے گزر جاتا ہوں یا ان سے پوچھتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو۔ خوف تو ہر چور کے دل میں ہوتا ہی ہے۔ وہ دونوں بھائی تھے۔ ایک کچھ لمبا... دوسرا چھوٹا۔

میں نے سائیکل روک کے پوچھا۔ ”پانی چرا رہے ہو... چراؤ... بڑے چوروں کا مال ضرور چوری کرو۔“

ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”ہم سمجھے تھے تم نہر کے بندے ہو یا پیر سائیں کے... کیا کریں بارش نہیں ہوئی اور اپنے حصے کا پانی بھی نہیں ملتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”رہتے کہاں ہو... گاؤں کدھر ہے؟“

ایک نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”اُدھر... تھوڑے سے کچے گھر ہیں۔“

”ایک بات بتاؤ... ابھی کچھ عرصہ پہلے... ایک لڑکی نہر میں بہتی ہوئی آئی تھی۔ کسی نے اسے نکالا تھا۔ لڑکی کا نام فاطمہ ہے اور اس پر جن آتے ہیں... اس کے بارے میں کچھ پتا ہے؟“

ایک بھائی نے دوسرے کو دیکھا۔ ”مولوی صاحب کو پتا ہوگا... وہ جن اتارتے ہیں۔“

”ہمارے گاؤں سے آگے جاؤ۔“ اس نے تاریکی میں ہاتھ لہرایا۔ ”ایک کوس کے بعد۔“

”ایک کوس کہاں ہے... کم ہے... پہلے مسجد آئے گی پھر پنڈ چھوٹا... سنا ہم نے بھی تھا مگر پتا کچھ نہیں۔“

یہ بڑی امید افزا اطلاع تھی۔ میں نے پھر سائیکل کو بحرِ ظلمات کے گھوڑے کی طرح دوڑانا شروع کیا اور سائیکل نے کوئی فریاد نہیں کی اور نہ احتجاج۔ وہ میرا بوجھ اٹھا کے اس پُرآزمائش راستے پر دوڑتی رہی۔ میرا خیال ہے کہ اس رفتار سے یا زیادہ تیز میں خود دوڑ سکتا تھا لیکن ٹھوکر کھا کے گرنے کے علاوہ سو گز کے بعد میرا سانس اتنا پھول جاتا کہ مجھے آرام کا وقفہ نکالنا پڑتا۔ صاف سڑک پر سائیکل چار پانچ گنا فاصلہ طے کرتی مگر وہ ایک کوس یا ایک میل کا فاصلہ بھی اس نے طے کر ہی لیا۔ میری ٹانگیں شل ہو رہی تھیں لیکن حوصلہ بڑھ گیا تھا۔

بالآخر تاریکی میں ایک مسجد کے آثار دکھائی دینے لگے۔ نیم تاریک آسمان کے پس منظر میں اس کا ایک مینار اور ایک گنبد کسی سنگِ میل کی طرح منزل کی خبر دیتے تھے۔ میں نے جن اتارنے والے مولوی صاحب سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ مسجد میں تاریکی تھی لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سائیکل کو دیوار سے لگا کے اندر گیا تو چھوٹے سے صحن کے سامنے گنبد کے نیچے واحد ہال جیسا کمرا تھا۔ دائیں طرف مینار تھا اور بائیں طرف دو کھڑکیاں دو کمروں کی نشاندہی کرتی تھیں۔ یہ مولوی صاحب کی اقامت گاہ ہو سکتی تھی۔ قریب جا کے دیکھنے سے مجھے دونوں کھڑکیوں کے درمیان کا دروازہ دکھائی دیا جس پر ملیشیا کے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں نے کسی حاجت مند کی طرح دروازہ بجا کے پکارنا شروع کیا۔ ”مولوی صاحب... مولوی صاحب...“

اندر سے کسی نے کھانس کر کہا۔ ”کون ہے بھائی! آرہا ہوں... ٹھہرو۔“

دو منٹ بعد مولوی صاحب چار خانے کی دھوتی پر بنیان کے ساتھ نمودار ہوئے۔ وہ عمر رسیدہ آدمی تھا جس کی گھنی داڑھی کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس نے لالٹین اوپر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ ”کون ہو تم... کیا کام ہے؟“

میں نے تمام عاجزی اپنی آواز میں سمو کے کہا۔ ”مولوی صاحب! آدھی رات کے بعد جگانے کی معافی۔ لیکن میں بڑی دور سے آیا ہوں دھکے کھاتا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔“

”اوہو... مدد سے پہلے مسئلہ تو بتاؤ؟“

میں نے تقریباً رو کے کہا۔ ”حضور! مجھے اپنی گھر والی کی تلاش ہے۔“

”لاحول ولاقوۃ... یہ کس نے کہا ہے کہ وہ میرے پاس ملے گی؟“ وہ برہم ہو گئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

”نہیں جناب عالی... یہ بات نہیں۔ ہم کچھ عرصہ پہلے نہر کے پل پر سے گزر رہے تھے۔“ میں نے ہاتھ لہرا کے پل کی سمت اشارہ کیا۔ ”ادھر مراداں والی کے پاس... گاڑی نہر میں گر گئی... مجھے کسی نے بچا لیا۔ اس وقت سے میں فاطمہ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ یہ میری گھر والی کا نام ہے۔ اب پتا چلا کہ اسے بھی کسی نے بچا لیا تھا ڈوبنے سے... وہ آس پاس کے کسی گاؤں میں ہے لیکن اس پر جن آنے لگے ہیں۔ اس کو پیر اظہر علی کے آستانے پر بھی لے گئے تھے۔“

وہ بڑے دھیان سے میری بات سن رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ میری بات نے اس پر اثر کیا ہے یا میری اداکاری نے جو ایک حرماں نصیب شوہر کے جذبات کی ترجمان تھی۔ اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا... ”ادھر تو نہیں... لیکن آگے الٹے ہاتھ ایک کوس پر جو گاؤں ہے، چک نمبر ستائیس ٹی آر... وہاں ساون خان ہے... اس نے لڑکی کو نکالا تھا۔“

”ساون خان... مجھے اس کا پتا بتائیں۔“ میں نے بے تابی سے کہا جیسے وہ مکان اور گلی نمبر بتائے گا۔

”یہی پتا ہے... ادھر جا کے معلوم کر لینا... ساون خان موچی ہے۔ اس دن شہر سے لوٹ رہا تھا اور نہر کے کنارے پر دم لینے رکا تھا کہ اسے فاطمہ نظر آ گئی۔ رب کے کھیل نرالے ہیں۔ جسے چاہے وسیلہ بنا دے... ساون خان کے دھی پتر کوئی نہیں... بندہ ہمت والا ہے۔ فاطمہ کو اٹھا کے گھر لے گیا۔ اس لڑکی پر جن آنے لگے تو یہاں لایا تھا ایک مہینے پہلے... پھر ادھر لے گیا... درگاہ پر۔“

میں نے مولوی صاحب کے دونوں ہاتھ تھام کے چومے۔ ”اللہ آپ کو صحت اور خوشی دے۔ آپ نے بھی ڈوبتے کو بچا لیا... اتنی رات کو تکلیف دینے کی معافی۔“ میں نے اسے چھوڑا اور سائیکل کی طرف دوڑا۔ اب میری بے قراری کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس رات کوئی دستِ غیب میری مدد اور راہنمائی کر رہا تھا۔ میرے فرار ہونے... سائیکل کے دستیاب ہونے... پانی چوروں سے ملاقات... اور اب مولوی صاحب تک رسائی سب اسی کی مدد تھی۔ جو میں چند گھنٹے قبل سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہ حقیقت بن کے سامنے آ گیا تھا۔ نورین مجھے ملنے والی تھی۔ اب رات کے تین بجنے والے تھے۔ کچھ دیر بعد صبح صادق کا اجالا آ جاتا لیکن اس سے بہت پہلے میں بھٹکے بغیر اس گاؤں تک پہنچ گیا جہاں میری نورین موجود تھی۔ نام اس کا فاطمہ تھا تو کیا... وہ اپنی یادداشت کھو چکی تھی یا کسی آسیب کا شکار تھی، تب بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس کا علاج کرا لوں گا۔ بالآخر اسے سب یاد آ جائے گا... وہ مجھے پہچان لے گی۔

جیسے جیسے گاؤں قریب آ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ پہلے کچے مکان کے باہر کوئی چارپائی ڈالے سو رہا تھا۔ میں نے رک کر اسے جگایا۔ ”کیا ہے... کون ہو تم؟“

میں نے کہا۔ ”معاف کرنا۔ مجھے ساون خان کے بارے میں پوچھنا تھا جس کی بیٹی ہے فاطمہ... اس پر جن آتے ہیں۔“

”ہاں، ہاں... لیکن وہ تو چلا گیا یہاں سے۔“

مجھے ایک شاک لگا۔ ”چلا گیا؟ کہاں چلا گیا؟“

اس نے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ ”کسی کو نہیں پتا... کل درگاہ شریف سے واپس آیا تھا۔ فاطمہ کو وہ ہر جمعرات ادھر لے جاتا تھا۔ اس کی ایک گدھا گاڑی تھی۔ اس میں سارا سامان رکھ کے اور فاطمہ کو بٹھا کر چلا گیا۔“

”کسی کو بتا کے تو گیا ہوگا؟“ میں نے چلّا کے کہا۔

”نہیں، کسی نے پوچھا تھا تو بولا کہ شہر جا رہا ہوں، فاطمہ کا علاج کرانے۔ واپس نہیں آؤں گا۔ گھر والی اس کے ساتھ تھی اور فاطمہ بھی... شہر کا پتا نہیں دے کر گیا۔“

”کون سے شہر... لاہور یا ملتان؟“ میں نے مایوسی سے کہا۔

”یہ بھی نہیں پتا... چلو میں اس کی کوٹھری دکھا دوں تمہیں...“ وہ دھوتی کس کر باندھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”اجنبی ہو یہاں؟“

پانچ منٹ بعد میں اس کوٹھری کے سامنے تھا جس میں صبح فاطمہ تھی... خستہ حال دروازے میں کوئی تالا نہیں تھا۔ میں نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر شکستہ حال دیواروں کی ویرانی نے میرا استقبال کیا۔ چاند ترچھا ہو کے دروازے سے اپنی تھوڑی سی روشنی اندر پہنچا رہا تھا۔ اس میں صاف نظر آتا تھا کہ اندر کوئی نہیں... کچھ نہیں... میں وہیں بیٹھ گیا۔

> ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
> جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

کیری کا فون سنتے ہی وہ لفٹ کی طرف بھاگا۔ اس کا خیال تھا کہ عمارت میں موجود درجنوں افراد یہ خبر سننے کے بعد اپنے کمروں سے نکل آئے ہوں گے اور ان سب کا رخ لفٹ کی جانب ہوگا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لفٹ میں اس کے علاوہ صرف تین افراد تھے اور اس سے بھی زیادہ حیرت اسے اس بات پر ہوئی کہ وہ تینوں مزے لے لے کر ڈوجرز کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لاس اینجلس کی سب سے مقبول بیس بال ٹیم تھی اور اس کے کھلاڑی یہاں کے لوگوں کے لیے ہیرو کا درجہ رکھتے تھے لیکن اس وقت جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کے بعد کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔

عمارت کی دوسری منزل پر بہت سے لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ عورتیں زار و قطار رو رہی تھیں جبکہ مرد غیظ و غضب کے عالم میں لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اسٹوڈیو بی کے دروازے پر کئی مسلح پولیس آفیسرز تعینات تھے۔ دراصل یہ عمارت پولیس اسٹیشن سے صرف آدھے میل کے فاصلے پر تھی اس لیے بڑی تعداد میں پولیس والوں کو دیکھ کر اسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس نے کوٹ کی جیب

کہانی در کہانی چھپے کرداروں کے اسرار... جنہیں پہلی اور آخری چوٹ درکار تھی...

پسِ پردہ

بابر نعیم

سفاک و بہیمانہ رویے اچھی پوشاک و گفتگو سے زیادہ دیر ڈھکے نہیں رہتے... وقت و حالات انہیں بیدردی سے منکشف کر دیتے ہیں... ایسے ہی ایک خوش اخلاق... خوش لباس اور خوش الحان شخصیت کی پرتیں... ایک پرت اتری تو پھر کئی اور پرتیں کھلتی چلی گئیں...

سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر ایک آفیسر کے سامنے کیا۔ اس نے غور سے کارڈ دیکھا اور بولا۔ ''کارپوریٹ ریلیشنز'' اس کا کیا مطلب ہے؟''

''اس کا مطلب ہے کہ میں کمپنی کے چیف ایگزیکٹو آفیسر مسٹر مرفی کے لیے براہِ راست کام کرتا ہوں۔ میرے ذمے کئی فرائض ہیں جن کی تفصیل میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ اس وقت میرا اندر جانا بہت ضروری ہے۔''

''آپس کی بات ہے۔'' وہ پولیس والا بولا۔ ''میں نے آج تک اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں سنا۔ میرا مطلب ہے کہ یہاں کیا ہوا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' پال نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''براہِ کرم مجھے اندر جانے دو۔''

''ضرور جاؤ۔ تمہیں کون روک سکتا ہے، تم تو مرفی کے خاص آدمی ہو۔''

پندرہ منٹ پہلے اسٹوڈیو حاضرین سے بھرا ہوا تھا، ان کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی سو سے کم نہ تھی جبکہ کم مقبول شوز میں نشستیں پُر کرنے کے لیے پروڈکشن ہاؤس کے عملے کو بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی۔ اس کے لیے انہیں مقامی ہائی اسکولوں کو عطیہ کے نام پر رشوت دینا پڑتی تاکہ وہ اپنے طالب علموں کو بسوں میں بھر کر خالی نشستیں پُر کرنے کے لیے بھیج سکیں۔ بعض اوقات ایسے لوگوں کو بھی کبھی کبھار کر لایا جاتا جو حال ہی میں جیل سے رہا ہوئے ہوں اور ان کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہ ہو۔ یہ لوگ اسکول کے طالب علموں کے مقابلے میں کم پُرجوش ہوتے تھے اور ان کے لیے پانچ چھ گھنٹے کسی شو میں بیٹھنا ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن اس کے عوض انہیں جو معاوضہ ملتا، وہ ان کی ناراضی اور بیزاری دور کرنے کے لیے کافی تھا لیکن جس شو کے دوران میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کے حاضرین جانے پہچانے اور معزز افراد تھے ان سے ایسی کسی حرکت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

پال کی نظریں اسٹیج کا طواف کر رہی تھیں۔ سفید کوٹ میں ملبوس طبی عملے کے چھ کارکن نوجوان اور پُرکشش ڈاکٹر کی مدد کر رہے تھے جس کا کلینک اسی عمارت میں تھا اور وہ اس نیٹ ورک کے لیے خدمات انجام دیتی تھی۔ اس کا نام لارا تھا۔ عملے کے دیگر افراد وہیں رک گئے تھے یا انہیں روک لیا گیا تھا۔ وہ بھی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ صدمے کی کیفیت سے نکل آئے ہیں۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے یا وقفے وقفے سے سیل فون پر کسی سے بات کر لیتے۔ اس دن کی یاد سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل تھا اور اس واقعے کے عینی شاہد ہونے کی بدولت وہ کم از کم اگلے دو ہفتوں تک پارٹیوں میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتے تھے۔

شو کا سیٹ کسی امیر گھرانے کے ڈرائنگ روم سے مشابہ تھا۔ آتش دان کے سامنے اور ایک بڑے سے گلوب کے نیچے چمڑے کی نشستوں اور بجنت والی دو بڑی کرسیاں رکھی تھیں جن پر مہمان اور شو کے میزبان کو بیٹھنا تھا۔

یہ شو اب تک ون نیٹ ورک کا سب سے کامیاب شو ثابت ہوا تھا۔ فائنل مومنٹس، نامی اس شو کا میزبان اپنے وقت کا مشہور اداکار رچرڈ فورسٹر تھا جس کا نام کسی بھی شو کی کامیابی کی ضمانت تھا۔

ہفتے میں پانچ دن وہ ایسی عورتوں کو اس پروگرام میں بلا کر انٹرویو کرتا جنہیں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو یا جنہوں نے خودکشی کی کوشش کی ہو۔ یہ عورتیں مختلف مسائل سے دوچار تھیں۔ ان میں جنسی تعلقات، طلاق کے بعد بچوں کی پرورش، غربت، ازدواجی الجھنیں، شراب نوشی، جسم فروشی، عریانیت اور منشیات کا استعمال۔ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی روگ لگا ہوا تھا۔ اپنا دکھ بیان کرتے وقت ان عورتوں کے لیے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ شو کے اختتام پر فورسٹر مہمان عورت کو گلے لگا کر تسلی کے کچھ الفاظ کہتا اور یہ منظر دیکھ کر پروڈکشن ہاؤس کے لوگ اس کا مذاق اڑاتے کہ اس بہانے وہ اپنے سفلی جذبات کی تسکین کیا کرتا ہے۔ ان تبصروں کو سن کر کمپنی کا چیف ایگزیکٹو مرفی بھی پریشان ہو جاتا کیونکہ عورتوں کے بارے میں فورسٹر کی شہرت اچھی نہیں تھی۔

اس شو کے لیے کام کرنے والے تینوں معاونین ایک کونے میں خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے معمولی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جیسے ہی کیرن نے پال کو دیکھا وہ تیزی سے اس کی جانب لپکی اور اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ پال کو یوں لگا جیسے اس کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی ہو۔ پال اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

وہ اپنے آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بہت بہت شکریہ۔ تمہارے آنے سے مجھے تسلی ہو گئی۔''

''مجھے خوشی ہو گی اگر تمہارے کام آ سکوں۔''

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔''

پال کو اس معصوم لڑکی سے ہمدردی محسوس ہونے لگی ویسے بھی عام طور پر وہ شو کے لیے کام کرنے والے معاونین کو پسند کرتا تھا۔ ان میں زیادہ تر تازہ گریجویٹ تھے جو تفریح کی دنیا میں قدم جمانے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ ان سب کی الگ الگ خواہشات تھیں۔ کوئی اداکار بننا چاہتا تھا تو کسی کو ڈائریکٹر، پروڈیوسر بننے کی تمنا تھی۔ یہ لوگ اس عمارت سے پیش کیے جانے والے گیارہ شوز کے لیے ناگزیر تھے۔

کیرن ریاست مشی گن سے آئی تھی۔ وہ دبلی پتلی بھورے بالوں والی پُرکشش لڑکی تھی۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ وہ جس تندہی اور محنت سے کام کر رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے پال کو یقین تھا کہ چھ ماہ کی آزمائشی مدت ختم ہونے کے بعد اسے کمپنی میں مستقل ملازمت مل جائے گی۔

''اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود مجھے یقین نہیں آیا۔'' کیرن جذباتی انداز میں بولی۔ ''مجھے یوں لگا جیسے... ٹی وی پر کوئی منظر دیکھ رہی ہوں لیکن فائر کی تین آوازوں اور لوگوں کی چیخ و پکار نے مجھے یقین کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے فوراً بعد لوگوں نے دروازوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ میں چند سیکنڈ گم صم کھڑی رہی پھر میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کیسے ہوا لیکن ہم سب لوگوں کو اسٹوڈیو سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔''

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''میں ہمیشہ یہی سوچا کرتی تھی کہ فورسٹر کو اسی عمارت میں کام کرنے والی کوئی عورت مار ڈالے گی کیونکہ وہ ان میں سے کئی ایک کے ساتھ شب بسری کر چکا تھا اور......'' یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی جیسے کسی ناخوشگوار یاد سے پیچھا چھڑانا چاہ رہی ہو۔

چند ثانیوں بعد کیرن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو ایمی کا خیال آ رہا ہے۔ اس کے لیے یہ ایک اور صدمہ ہے اس کا ایک بھائی پہلے شکار کھیلتے ہوئے مارا گیا تھا۔ میں اس کے پاس جا رہی ہوں۔''

پال جانتا تھا کہ مرفی کو پریس کے لیے ایک بیان جاری کرنے کی ضرورت ہو گی گو کہ نیٹ پر اس واقعے کی تفصیلات آنا شروع ہو گئی تھیں لیکن پال قتل کا پس منظر جاننے کے ساتھ ساتھ مرفی کا موقف بھی معلوم کرنا چاہ رہا تھا لہٰذا اس نے سیل فون نکال کر اس کا نمبر ڈائل کیا۔

''میں یہاں بیٹھا محض اپنا سر ہلا رہا ہوں۔'' مرفی کے لہجے میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں۔ تم جو مناسب سمجھو میری طرف سے لکھ لو۔''

پال کو مرفی کی بہت سی باتیں پسند تھیں۔ وہ اپنے ملازمین کو اچھی تنخواہ کے علاوہ ان کی محنت کے اعتراف میں بونس بھی دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ فلاحی اداروں کی بھی دل کھول کر مدد کرتا تھا۔

''ابھی تک کسی کو اس بارے میں اندازہ نہیں راجر۔'' پال نے کہا۔ ''ڈاکٹر اس کی لاش کا معائنہ کر رہی ہے۔ تم جانتے ہو اسے کیمرے کے سامنے آنے کا کتنا شوق تھا۔''

''وہ مجھ سے مسلسل کہتا رہتا کہ اسے ایک ریئلٹی شو دے دوں۔''

''ہاں یہی ریئلٹی شو اس کی موت کا سبب بن گیا۔'' پال نے اسٹیج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا ذہن اس حقیقت کو قبول نہیں کر رہا کہ کسی نے ہمارے سب سے بڑے اسٹار کو سیٹ پر قتل کر دیا۔''

''میں تمہارے لیے ایک بیان تیار کر کے بھیج رہا ہوں تم اسے دیکھ لو۔ اس دوران میں اس واقعے کا پس منظر جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر شخص صدمے کی کیفیت میں ہے اس لیے شاید یہ اتنا آسان نہ ہو۔''

''ہم اپنی پبلسٹی پر بے تحاشا پیسا خرچ کرتے ہیں لیکن اس واقعے نے سب کچھ برباد کر دیا۔ اب فورسٹر کی ذات سے جڑی ساری کہانیاں سامنے آ جائیں گی۔ میری بیوی کا کہنا ہے کہ مجھے اس کے بارے میں اچھا سوچنا چاہیے۔ تم ہی بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

پال نے ڈاکٹر لارا کی طرف دیکھا جو لاش کے معائنے سے فارغ ہو چکی تھی۔ وہ سیٹ کے ایک کونے پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ لارا کے سنہرے بال اس کے دائیں کندھے پر جھول رہے تھے۔ لارا صرف خوب صورت ہی نہیں بلکہ اس کی تربیت بھی بہت اعلیٰ تھی۔ پال نے اس کے بارے میں کئی بار سوچا لیکن اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا زخم ابھی تازہ ہے۔ اس کے سرجن شوہر نے ایک ٹی وی اداکارہ کے جال میں پھنس کر اسے چھوڑ دیا تھا اور اس زخم کے بھرنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

لارا اس کے قریب آئی اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کچھ دیر بعد میرے ساتھ کافی پینے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے ذہن میں بہت سے سوالات ہیں اور شاید تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکو گے، میں اپنے دفتر میں ہی ملوں گی۔''

''جتنی جلدی ممکن ہو سکا، میں تم سے ملتا ہوں۔''

ہولی فاؤلر کا دفتر بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ دیوار پر

مختلف اسٹارز کے ساتھ اس کی تصاویر آویزاں تھیں جبکہ حیرت انگیز طور پر فائنل مومنٹس کی ایک ہی تصویر نظر آرہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شو پر بہت زیادہ تنقید کی جارہی تھی۔ حالانکہ اس شو میں ایسی عورتوں کو سامنے لایا جارہا تھا جنہیں نفسیاتی طور پر مدد کی ضرورت تھی۔ دیکھنے والوں کے لیے اس میں دلچسپی کا سامان تھا لیکن رچرڈ فورسٹر لوگوں کی توقعات پر پورا نہ اُتر سکا۔ اسی لیے ہولی نے اپنے لیے ایک پبلسٹی ایجنٹ کا انتخاب کیا تھا تاکہ وہ اسے ایک پُرکشش عورت کے روپ میں پیش کرسکے۔ جبکہ وہ اس غیر معمولی شو کی محض نگراں تھی۔

جیسے ہی پال اس کے کمرے میں داخل ہوا، وہ اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں جس سے بات کرنی چاہیے، وہ نیچے ہال میں ہے۔“

”تمہارا اشارہ نینسی سلورمین کی طرف ہے؟“

”بالکل۔ میرا کام شو کی نگرانی کرنا ہے جبکہ نینسی مہمانوں کا انتخاب کرتی ہے۔“

دوسرے شوز کی طرح فائنل مومنٹس کی بھی ویب سائٹ تھی جس کے ذریعے عورتیں اپنی کہانی نینسی سلورمین کے دفتر بھیج سکتی تھیں۔ اگر شو کی انتظامیہ کو کہانی پسند آتی تو وہ کہانی بھیجنے والے سے ٹیلی فون پر انٹرویو کرنے کے علاوہ اس کی فیملی اور دوستوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیا کرتے تھے تاکہ کہانی میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کی تصدیق ہوسکے اس کے بعد اسے لاس اینجلس بلایا جاتا۔

”کیا تم اس عورت سے پہلے بھی مل چکی ہو؟“ پال نے پوچھا۔

”ہاں، میں ہمیشہ ان عورتوں سے ملتی ہوں جو پروگرام میں شرکت کے لیے آتی ہیں۔ وہ مقامی عورت تھی اس لیے ہم نے تیاری کے لیے اسے دفتر میں ہی بلالیا تھا۔“

”اس کے بارے میں تمہارا کیا تاثر تھا؟“

ہولی نے ڈرامائی انداز میں سگریٹ کا کش لیا اور بولی۔ ”تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہ رہے ہو؟ وہ ایک عام سی نفسیاتی مریضہ تھی جن سے ہمیں ہفتے میں پانچ دن واسطہ پڑتا ہے۔“

پال نے محسوس کیا کہ اس قتل نے اسے بھی متاثر کیا ہے۔ اس کی نیلی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے رچرڈ کی موت کا افسوس ہے۔ یہ بہت ہی ہولناک واقعہ ہے بالکل ایک ڈراؤنے خواب کی طرح۔“

”پریس والے ہماری جان عذاب میں کردیں گے۔ کیا تم یہ بات جانتی ہو؟“

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میں نے جو کچھ نینسی کے ساتھ کیا، اس پر مجھے افسوس ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بالآخر میں ہی ذمے دار ٹھہرائی جاؤں گی۔ نینسی میری دوست ہے اور اس نے ایک بہت اچھا کام کیا۔ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ رچرڈ مرگیا اور وہ پاگل عورت اپنی بقیہ زندگی ذہنی امراض کے اسپتال میں گزارے گی۔ یہ میری غلطی ہے۔ میں ہی اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ پال نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے اسے لابی میں دیکھا تھا۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی لہٰذا میں اسے سیکیورٹی کے بغیر ہی اپنے ساتھ لے آئی۔ میں کبھی کبھی مہمانوں کو اسی طرح سیکیورٹی چیک کے بغیر اندر لے آتی ہوں۔“

پال نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، ہم لوگ بعض اوقات سیکیورٹی کے معاملے میں نرمی سے کام لیتے ہیں۔“ اس نے خود کئی مرتبہ لوگوں کو سیکیورٹی چیک کے بغیر گزرتے دیکھا تھا۔ ”اس عورت کا نام کیا ہے؟“

”سینڈی کولن۔“

”اور نینسی نے کبھی اشارتاً بھی نہیں کہا کہ یہ عورت ذہنی مریضہ ہوسکتی ہے۔“

”نہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ یہ بات نہیں جانتی ہوگی حالانکہ وہ کافی محتاط رہتی ہے۔ مہربانی کرکے تم اسے مت بتانا کہ میرے کہنے کے مطابق یہ اس کی غلطی ہے۔“

”ٹھیک ہے، نہیں بتاؤں گا۔“

وہ نینسی کے دفتر سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا جب اس نے کسی کی سسکیوں کی آواز سنی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر نینسی نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی بولی۔ ”مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں استعفا دے رہی ہوں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ پال نے پوچھا۔

”مجھے اعتراف ہے کہ یہ سب میری غلطی کی وجہ سے ہوا۔“

”مجھے اس میں شبہ ہے۔“ پال نے کہا۔ ”اور ویسے بھی یہ وقت اس طرح کے فیصلے کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔“

”میں نہیں جانتی کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہے۔“ نینسی نے بے بسی سے کہا۔ ”اس کا الزام بہرحال مجھ پر ہی آئے گا کیونکہ میں نے ہی اسے جانچا اور شو کے لیے تیار کیا تھا۔“

سسکیوں کی آواز اب مدھم ہوچکی تھی۔ پال نے پوچھا۔ ”یہ کون رو رہا ہے؟“

”سینڈی کی بہن ایمی۔ دونوں جڑواں ہیں۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔ اب وہ اکیلی بیٹھی رو رہی ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی۔ اسے کسی پُرسکون دوا کی ضرورت ہے۔“

اس عمارت میں کم از کم سو لوگ ایسے ہوں گے جن کی درازوں میں ایسی دوائیں رکھی ہوں گی لیکن پال نے اس کا تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے نینسی سے پوچھا۔ ”کیا پولیس نے تم سے کوئی بات کی ہے؟“

”مرفی نے ہدایت جاری کی ہے کہ سب لوگ اپنی جگہ پر موجود ہیں تاکہ پولیس ہم سب سے انٹرویو کرسکے۔“

پال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے پہلی بات تو یہ کہ سیکیورٹی والوں نے اسے حفاظتی دروازے سے نہیں گزارا، جس کی وجہ سے اس کے پاس اسلحے کی موجودگی کا سراغ نہ مل سکا اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کی بہن کو ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ سینڈی کوئی ایسی حرکت کرنے والی ہے تو کیا وہ تمہیں اطلاع نہ کرتی۔“

”مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ایسا ضرور کرتی۔ سینڈی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ خود بھی بہت اچھی عورت ہے البتہ اس کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ چند ماہ قبل اس نے کچھ وقت نفسیاتی اسپتال میں بھی گزارا ہے اس نے وہاں رہ کر اپنے تجربات پر مبنی ایک کتاب بھی لکھی۔ اسے توقع تھی کہ اس شو کے ذریعے کوئی پبلشر اس سے رابطہ کرے گا۔“

”ہم بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تو مجھے مرفی کی جانب سے بیان لکھنا ہے۔ تم استعفا دینے کے بارے میں بالکل مت سوچو۔“

”تمہارے مشورے کا شکریہ۔“ نینسی نے کہا۔ ”لیکن مجھے بے چاری سینڈی اور ایمی پر افسوس ہو رہا ہے کاش میں فورسٹر کے بارے میں بھی ایسا ہی کہہ سکتی لیکن وہ واقعی بہت بُرا تھا خاص طور پر اس وقت جب وہ نئی لڑکیوں کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتا تھا۔“

پال نے پندرہ منٹ میں مرفی کی جانب سے پریس کے لیے بیان لکھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ عمارت کی تیسری منزل پر چلا گیا جہاں مختلف پروگراموں کی ایڈیٹنگ ہورہی تھی۔ اس نے ایک ایڈیٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس شو کی ویڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری مدد کروگے؟“

اس نے کندھے اچکائے اور پال کو اس جگہ لے گیا جہاں دوسرے ایڈیٹر اس شو کی ویڈیو دیکھ رہے تھے۔ پال کے کہنے پر انہوں نے ٹیپ کو ری وائنڈ کیا اور شروع سے لگا دیا۔ ابتدائی دس منٹ میں سینڈی کولن نے اپنے حالاتِ زندگی بیان کیے۔ وہ پھولے ہوئے چہرے والی موٹی عورت تھی جس کی سیاہ آنکھوں سے گزرے ہوئے پچاس برسوں کا دکھ جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا بچپن انتہائی تنگ دستی میں گزرا۔ وہ دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کرچکی تھی پھر اس نے دماغی امراض کے اسپتال میں گزارے ہوئے دنوں کے بارے میں بتایا اور اس کتاب کا بھی ذکر کیا جو اس نے وہاں قیام کے دوران لکھی تھی۔

ابتدا میں فورسٹر نے اس کہانی کو کوئی اہمیت نہیں دی

سرداری

ایک سکھ زمیندار کو مشاعرے کی صدارت کے فرائض سونپے گئے۔ موصوف کو پہلی مرتبہ کسی مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا تھا۔ مشاعرے میں ایک شاعر کے پہلے ہی شعر کو بہت پسند کیا گیا اور سامعین نے مکرر... مکرر کی صدائیں بلند کیں تو سردار جی مائیک پر آکر ناگواری سے بولے۔ ”دیکھیے جی! آپ لوگ ایک ہی مرتبہ شعر کو غور سے سنیں... شاعر کو خوامخواہ بار بار پریشان نہ کریں۔“

☆☆☆

ایک خط ڈاک خانے کو واپس کیا گیا۔ خط پر لکھا ہوا تھا۔ ”مکتوب الیہ مرگیا ہے۔“ غلطی سے یہ خط دوبارہ ڈاک میں تقسیم ہوگیا۔ اور دوسری بار ڈاک خانے واپس آیا تو اس پر لکھا تھا۔ ”مکتوب الیہ ابھی تک زندہ نہیں ہوسکا ہے۔“

☆☆☆

ایک مشہور ادیب کے خلاف عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ اس پر نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کرنے کا الزام تھا۔ ادیب نے استدلال پیش کیا کہ اس نے ڈرائیونگ سے قبل دانت میں تکلیف کے سبب برانڈی سے کلی کی تھی، اس وجہ سے منہ میں الکحل کی بو تھی۔

جج نے طبی معائنے کا حکم دیا۔ رپورٹ آئی تو لکھا گیا تھا کہ ادیب کے سارے دانت مصنوعی ہیں۔

کراچی سے ولید بلال کا انتخاب

لیکن آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے اور وہ مضطرب نظر آنے لگا جب کیمرے نے اس کے چہرے کا کلوزاپ لیا تو اس کی کیفیت پوری عیاں ہو گئی۔ فورسٹر کے چہرے کے تاثرات کچھ اس قسم کے تھے جیسے وہ اس عورت کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

اس کا خوف بے جا نہ تھا۔ سینڈی کولن اچانک اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ گن تھی۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے فورسٹر کی جانب بڑھی اور فائر کھول دیا۔ اس کے ریوالور سے تین گولیاں نکلیں اور فورسٹر کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا اسی لمحے ہال میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ گھبراہٹ کے عالم میں دروازوں کی طرف لپکے۔

ویڈیو دیکھنے کے بعد وہ دوسری منزل پر چلا گیا۔ اس نے اپنے لیے ایک گلاس بنایا اور پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ دروازے پر ڈاکٹر لارا نمودار ہوئی۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ”کیا تم ہمیشہ کام کے دوران میں ڈرنک کرتے ہو؟“

پال نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بولا۔ ”ضروری نہیں، جب بھی موقع مل جائے۔“

”کیا میں تمہارے ساتھ شریک ہو سکتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلی آئی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ اس نے ابھی تک سفید کوٹ پہنا ہوا تھا۔

پال نے اس کے لیے ایک گلاس تیار کیا اور بولا۔ ”میں تقریباً چار گھنٹے سے یہاں ہوں۔ مرفی چاہتا ہے کہ ہم پر جو حملے ہو رہے ہیں، میں ان پر نظر رکھوں۔ فی الحال ویب سائٹ پر کہانیاں آنی شروع ہو گئی ہیں۔ وہ صرف ایک پیراگراف کا اضافہ کر کے بار بار ان کہانیوں کو پوسٹ کریں گے۔ ایسے اخبار بھی ہم پر حملہ کر رہے ہیں جن کی اشاعت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب مجھے ان کا جواب تیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ وہ کل صبح ایک تیس سیکنڈ کی ویڈیو بھیج سکے۔“

”میں نے کچھ دیر کے لیے شام کی خبریں سنی تھیں۔“ ڈاکٹر بولی۔ ”ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے دروازے پر مشعل بردار ہجوم جمع نہیں ہوا۔“

”ابھی رات ختم نہیں ہوئی۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ ویسے تم اب تک کیا کرتی رہی ہو؟“

لارا گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”میں زیادہ وقت دوسری منزل پر ایک کمرے میں بیٹھی ان لوگوں سے باتیں کرتی رہی جنہیں اس بھگدڑ میں چوٹیں آئی تھیں۔ میں اسی لیے ٹی وی اور فلموں میں تشدد کے مناظر پسند نہیں کرتی۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس کی وجہ سے عام آدمی کتنا متاثر ہوتا ہے۔“ اس نے اپنا خالی گلاس میز پر رکھا اور بولی۔ ”ایک اور...“

”اگر تم نے اتنی زیادہ ڈرنک کی تو تمہیں یہاں سے اٹھا کر لے جانا ہوگا۔“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”میں نے آدھا گھنٹا ایمی کولن کے ساتھ گزارا ہے اور دونوں بہنوں کے بارے میں بہت کچھ جان گئی ہوں۔“

”کچھ اندازہ ہوا کہ اس کی بہن نے فورسٹر کو کیوں قتل کیا؟“

”یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اسے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ سینڈی نے اپنے منصوبے کے بارے میں اس لیے نہیں بتایا کہ کہیں ایمی اسے دوبارہ نفسیاتی اسپتال جانے پر مجبور نہ کر دے۔ سینڈی نے اس سے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ اس شو میں کام کرنے والے لوگوں کو پسند کرتی ہے۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور بات معلوم نہیں ہوئی؟“

”نہیں، فی الحال سینڈی کو نفسیاتی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا ہے جس کے باہر پولیس کا پہرا ہے۔ وہ ابھی تک گہرے صدمے کی کیفیت میں ہے اور اسے حقیقت کا بالکل بھی علم نہیں۔“ پھر وہ ایک جماہی لیتے ہوئے بولی۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں شاید ہی دس بجے تک ڈیوٹی پوری کر سکوں۔“

”کیا تم بھوکی ہو؟“

”ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں لیکن کھانے کے لیے کچھ وقت نکال لوں گی۔ کیا قریب میں کوئی ریسٹورنٹ ہے؟“

”ہم جلد ہی واپس آ جائیں گے۔“

لفٹ میں سوار ہوتے ہوئے پال نے پوچھا۔ ”کیا تم نہیں سمجھتیں کہ ایمی کولن تم سے کچھ چھپا رہی ہے۔“

”میں کسی کا ذہن تو نہیں پڑھ سکتی لیکن میرے خیال میں وہ ایک ایمان دار عورت ہے۔ بہت ہی پیاری، مجھے تو وہ بہت اچھی لگی۔“

”پریس والے اس کا پس منظر ضرور جاننا چاہیں گے کہ سینڈی نے فورسٹر کو کیوں قتل کیا۔ اب تک پانچ عورتوں کے نام سامنے آ چکے ہیں جن کے فورسٹر کے ساتھ تعلقات تھے اور مجھے یقین ہے کہ یہ تعداد اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔“

”اس کی بیوی کو کچھ معلوم نہیں۔“

”شاید وہ اس کی حرکتوں سے لاعلم تھی۔“

”شادی شدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی روش

نہیں بدلی۔ ہر عورت کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ اس نے مجھ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے دھمکی دی کہ مرفی سے شکایت کر دوں گی۔ وہ ایک بدکردار شخص تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے ایک زیرِ تربیت لڑکی کو بھی نہیں چھوڑا تو مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ وہ لڑکی میرے پاس معائنے کے لیے آئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ حاملہ نہ ہو گئی ہو۔ اس نے مجھے بتایا کہ فورسٹر سیر کرانے کے بہانے اسے اپنی کشتی پر لے گیا اور اس کی عزت لوٹ لی۔ گو کہ وہ حاملہ نہیں تھی لیکن اس واقعے کے بعد دل برداشتہ ہو کر گھر واپس چلی گئی اور اس منحوس شخص کی وجہ سے ایک لڑکی کا مستقبل تباہ ہو گیا۔“

لفٹ سے باہر آنے کے بعد پال نے کہا۔ ”میں نے آج کسی بھی شخص کو اس کے بارے میں کوئی اچھی بات کہتے نہیں سنا۔“

”کیا تمہیں اس پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی؟“ لارا نے پوچھا۔

”اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا اس لیے ہمیں اس کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔“ پال نے اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

دوسری صبح عمارت پر سخت حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے اور حفاظتی عملہ ہمیشہ کے مقابلے میں بہت زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا۔ عمارت میں جانے والے ہر شخص کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ پال کو بھی اس عمل سے گزرنا پڑا۔ اس نے جیبوں کی تلاشی دینے کے بعد سیکیورٹی گارڈ سے گزشتہ شب پیش آنے والے واقعے کے بارے میں پوچھا۔ اس گارڈ کا نام آرتھر جیک تھا لیکن سب اسے اے جے کہا کرتے تھے اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”عام طور پر شو میں حصہ لینے والے مہمان سیکیورٹی گیٹ سے نہیں گزرتے۔ اس سلسلے میں ہمیں خط کے ذریعے مطلع کر دیا جاتا ہے یا شو کی انتظامیہ کا کوئی فرد فون کر کے کہہ دیتا ہے کہ مہمان کو سیکیورٹی چیک کے بغیر اندر آنے دیا جائے۔ تم جانتے ہو بہت سے لوگ نازک مزاج ہوتے ہیں اور وہ جامہ تلاشی پسند نہیں کرتے۔“

”گزشتہ شب آنے والی مہمان کے بارے میں تمہیں کس نے ہدایات دی تھیں؟“

”کسی نے نہیں۔ البتہ اس وقت اچانک ہی مِز فاؤلر نیچے آ گئی۔ شاید وہ اپنے لیے کینٹین سے سینڈوچ یا

جدید سیاسی محاورے اور ان کا مطلب

دکھتی رگ چھیڑنا۔ کسی ترمیم پر بات کرنا۔
رسّی دراز کرنا۔ ملازمت میں توسیع دینا۔
منہ شکر سے بھر دینا۔ شوگر مل کا پرمٹ دینا۔
شیر و شکر ہونا۔ ایک پارٹی چھوڑ کر اس پارٹی میں جانا جس کے جیتنے کے امکان ہوں۔
بغلیں بجانا۔ من پسند وزارت کا حلف اٹھانا۔
منہ میں قفل لگ جانا۔ ایوانِ صدر سے ہو کر آنا۔
من و سلویٰ اڑانا۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھانا۔

کچھ اور لینے آئی تھی۔ وہی مہمان کو اپنے ساتھ لے گئی۔“

ساڑھے نو بجے کے قریب اس کے اسسٹنٹ نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ ڈاکٹر لارا ایک عورت کے ہمراہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اس عورت کا نام ایمی کولن ہے۔ پال سوچ میں پڑ گیا کہ اتنی جلدی لارا کو اس سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی کیونکہ گزشتہ شب ہی تو اس نے لارا کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔

ایمی کولن ایک دبلی پتلی عورت تھی۔ اس کے سفید ہوتے ہوئے بال خشک اور مرجھائے ہوئے تھے۔ اس نے سفید بلاؤز اور براؤن پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا جو کثرتِ استعمال سے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک لیپ ٹاپ پکڑا ہوا تھا جو کم از کم دس سال پرانا تھا۔

تعارف کا مرحلہ گزرنے کے بعد ایمی نے لیپ ٹاپ میز پر رکھا اور بولی۔ ”میں نے آج صبح لارا سے بات کی تھی اور اسے اس لیپ ٹاپ کے بارے میں بتایا تھا۔ اس سے مجھے اپنی بہن کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ لیپ ٹاپ لے کر تمہارے پاس آؤں۔“

پال نے غور سے اس عورت کو دیکھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ عورت کتنی بے تکلفی سے لارا کا نام لے رہی تھی اور لارا نے بھی اس کا برا نہیں منایا شاید جونیئر ڈاکٹر اس طرح کی بے تکلفی کے عادی ہوتے ہیں۔

”یہ میری بہن کا لیپ ٹاپ ہے۔“ ایمی بولی۔ ”میں نے اسے پہلے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ گزشتہ شب مجھے خیال آیا کہ شاید اس لیپ ٹاپ سے کچھ معلوم ہو جائے کوئی ایسا

اشارہ مل جائے جس سے ظاہر ہو کہ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔ مجھے اس کا پاس ورڈ معلوم تھا۔ لوشی، یہ اس کی بلی کے بچے کا نام تھا جو اس نے نو سال کی عمر میں پالا تھا۔ ایک دن وہ بلی کا بچہ کہیں باہر نکل گیا اور پھر کبھی نہیں ملا لیکن سینڈی کے ذہن میں یہ نام چپک کر رہ گیا اور وہ ساری زندگی اسے نہ بھلا سکی۔ بہرحال جب میں نے گزشتہ شب اسے اسپتال میں دیکھا تو وہ مسکن دواؤں کے زیر اثر تھی اور اس حالت میں اس سے کچھ پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ میں نے گھر آ کر اس کا کمپیوٹر کھنگالنا شروع کر دیا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اس نے مجھ سے کیا کچھ چھپا رکھا ہے۔ وہ مجھے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے جذبات و احساسات کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ وہ مجھے بہن یا دوست نہیں بلکہ جیلر سمجھتی تھی۔ مجھے اسے شروع میں ہی روک دینا چاہیے تھا۔ اس کمپیوٹر سے جو کچھ معلوم ہوا وہ بہت مایوس کن ہے۔ مجھے لگا جیسے کسی اجنبی کی کہانی پڑھ رہی ہوں اسی لیے میں یہ لیپ ٹاپ یہاں لے کر چلی آئی۔"

اس کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور اس کا رخ پال کی جانب کر دیا۔ اس نے ایمی سے پوچھا۔ "کیا پولیس گزشتہ شب تمہارے پاس آئی تھی؟"

"ہاں اور انہوں نے اس کی تمام چیزوں کی تلاشی لی لیکن یہ لیپ ٹاپ ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا کیونکہ سینڈی نے اسے اپنے بستر کے گدے کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ میں نے بھی اس کے بارے میں انہیں نہیں بتایا۔ شاید میں اس وقت میں بھی اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

یہ کہہ کر ایمی نے کمپیوٹر آن کیا اور بڑی مہارت کے ساتھ آدھے منٹ تک کچھ ٹائپ کرتی رہی پھر اس نے لیپ ٹاپ کا رخ پال کی جانب کر دیا تاکہ وہ اسکرین دیکھ سکے۔ پہلے تو وہ ساحل پر کھڑے ہوئے مرد اور عورت کو نہ پہچان سکا لیکن ان کے چہروں کو غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ وہ سینڈی کولن اور فورسٹر کی جوانی کی تصویر تھی۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اپنا وزن کم کر چکی تھی اور اس نے اپنی ایک سہیلی کے ساتھ نائٹ کلب جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ لڑکی اسے اسپتال میں ملی تھی جہاں وہ علاج کے لیے داخل ہوئی تھی۔ کم از کم سینڈی نے تو مجھے یہی بتایا تھا لیکن گزشتہ شب مجھ پر انکشاف ہوا کہ دراصل اس کی ملاقات ایک کلب میں فورسٹر سے ہوئی تھی جہاں وہ اور اس کی سہیلی جایا کرتی تھیں۔ سینڈی نے فورسٹر سے ملنا شروع کر دیا جبکہ وہ جانتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے لیکن اس نے اس کی کوئی پروا نہیں کی پھر وہ حاملہ ہو گئی جب اس نے فورسٹر کو بتایا تو وہ بے پروائی سے بولا کہ ایسے کئی اسپتال ہیں جہاں جا کر وہ اس مشکل سے گلوخلاصی کروا سکتی ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" پال نے پوچھا۔

"تقریباً تیس سال ہو گئے۔ اس وقت وہ بیس برس کی تھی۔" یہ کہہ کر ایمی نے سر جھکا لیا جب ان کی نظریں دوبارہ ملیں تو اس نے کہا۔ "سینڈی کو مجبوراً اسقاط کروانا پڑا۔ اس کے بعد اسے دورے پڑنے لگے۔ وہ تین سال تک اسپتال میں رہی۔ اس کے بعد پھر کبھی اس کی زبان پر فورسٹر کا نام نہیں آیا۔ اس نے مکمل طور پر چپ سادھ لی تھی۔ اگر اس نے کسی سے اس بارے میں بات کی ہو تو مجھے اس کا علم نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ ہم نے اسے پہلے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔"

"گویا وہ اس شو میں فورسٹر کو قتل کرنے کے لیے آئی تھی لیکن وہ اسے نہیں پہچان سکا۔"

"وہ کیسے پہچان سکتا تھا۔ تیس سال میں وہ بہت بدل گئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کا رنگ تبدیل کر لیا تھا اور کنٹیکٹ لینس استعمال کرنے لگی تھی۔ اسے ہمیشہ سے بادامی آنکھیں پسند تھیں لیکن میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔"

"فورسٹر کی اس سے زیادہ تذلیل کیا ہو سکتی ہے۔" لارا نے کہا۔ "سینڈی نے اسے اسی کے شو میں مار دیا۔"

اخبارات اور میڈیا میں بھی فورسٹر کے دوسری عورتوں سے تعلقات کا ذکر آنے لگا ہے۔ لیکن ابھی تک کسی کے ہاتھ کوئی ثبوت نہیں لگا تھا۔ اس کی بیوی نے بھی ان افواہوں کی تردید کرتے ہوئے اسے وفادار شوہر قرار دیا تھا لیکن اس تیس سال پرانی تصویر کے سامنے آنے کے بعد حقیقت واضح ہو جاتی اور سب لوگوں کو پتا چل جاتا کہ فورسٹر کو ایک پریشان حال عورت نے اس کے ماضی کے کسی گناہ کی سزا دی تھی۔"

"گزشتہ شب میری ایک ماہرِ نفسیات سے بات ہوئی تھی۔" ایمی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "وہ نہیں سمجھتا کہ سینڈی مقدمے کا سامنا کرنے کے قابل ہو سکے گی۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی بقیہ زندگی نفسیاتی اسپتال میں ہی گزرے گی۔ میں اس پر خوش ہوں کہ اس طرح وہ جیل جانے سے بچ جائے گی۔ وہ ایک مہینا بھی جیل میں نہیں رہ سکتی۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے اس پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔ وہ گزشتہ تین راتوں سے اکیلی باہر جا رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ شو کے سلسلے میں ہونے والی میٹنگ میں جاتی ہے لیکن ایک روز یونا تو کیفے سے فون آیا۔

وہ اپنا والٹ وہاں چھوڑ آئی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اس کی مالی حالت ایسی نہیں کہ وہ اتنے مہنگے ہوٹل میں جا سکے لیکن جب میں نے اس سے پوچھا تو وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی کہ مجھے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔"

پال بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ہوٹل کا نام سن کر وہ بھی چونکا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ ایمی فکرمند ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے معلوم ہے کہ پریس والے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"وہ پہلے سے ہی تمہاری کھوج میں ہیں۔" پال نے کہا۔ "سینڈی کی بیماری کے بارے میں جاننے کے بعد انہیں ایک نئی کہانی کے لیے مواد مل جائے گا۔"

"میری ایک دوست پاسا ڈینا میں رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس آج دوبارہ مجھ سے پوچھ گچھ کرے۔ میں انہیں وہاں کا نمبر دے دوں گی۔"

"یہ لیپ ٹاپ میرے پاس چھوڑ دو۔ اگر ضرورت ہوئی تو پولیس کو دے دوں گا۔"

ایمی بولی۔ "میں صرف چند ہفتوں کے لیے غائب ہونا چاہتی ہوں جب تک یہ معاملہ دب نہیں جاتا۔"

"یہ معاملہ طول پکڑ سکتا ہے۔ فورسٹر کے ماضی کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ روزانہ ایک نئی کہانی سامنے آئے گی۔ مجھے یہ بات کہنی نہیں چاہیے لیکن تمہیں چند ہفتے نہیں بلکہ طویل عرصے تک اپنی دوست کے پاس قیام کرنا ہوگا۔ اس کے باوجود پریس والے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کہاں پر ہو۔"

"اس وقت تو میں اپنی بہن کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اس نے زندگی میں کچھ نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر بھی اس کی اداسی اور خوف کی وجہ نہ جان سکے۔ وہ خود ہی اسے برداشت کرتی رہی۔"

یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور بولی۔ "میں چاہتی تھی کہ پہلے تمہیں یہ سب بتا دوں کیونکہ لارا نے بتایا تھا کہ تم جانتے ہو کہ اس معاملے سے کس طرح نمٹنا ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اب کم از کم ہمارے پاس ایک محرک ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہمیں کہاں تک لے جائے گا لیکن اب یہ اتنا مبہم نہیں رہا۔"

جب وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تو پال نے کہا۔ "میں اب بھی یہ سوچ رہا ہوں کہ اس نے تم سے یہ سب کیسے چھپایا۔ یقیناً وہ ایکٹنگ کر رہی ہو گی۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی لیکن میں نے اس بارے میں سوچا ضرور تھا۔" پھر وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میں یہاں کے کسی فرد کو الزام دینا نہیں چاہتی اور نہ ہی میں نے کسی کو اس کے ساتھ دیکھا کیونکہ میں دن رات اس کے ہمراہ ہوتی تھی۔"

ایمی کے جانے کے بعد اس نے نینسی سلور مین کو فون کیا اور اسے اپنے ساتھ کیفے ٹیریا میں لنچ کرنے کی دعوت دی۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ "جانتی ہوں کہ تم میرا پیچھا نہیں کر رہے پھر یہ مہربانی کیوں؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں۔ بس تمہارے ساتھ لنچ کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ اس بہانے کچھ باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

نینسی کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بہت تھکی ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی جیسے رات بھر سو نہ سکی ہو۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اسے بھی ان لوگوں میں شامل نہ کر لیا جائے جن پر سینڈی کولن کو شو میں لانے کا الزام تھا۔

"میں نے ایک وکیل سے بات کی ہے۔ وہ میرا کزن جیکب ہے تاکہ اگر کوئی مجھ پر مقدمہ کرے تو میں اپنا دفاع کروں۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہوگا۔" پال نے کہا۔ "ایمی کولن آج صبح میرے دفتر آئی تھی۔ اس سے کافی طویل گفتگو ہوئی۔ وہ خود اس معاملے سے دور رہنا چاہ رہی ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ کسی پر کوئی مقدمہ کرے گی۔"

"اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں۔ مثلاً فورسٹر کی بیوی...."

"وہ بھی شاید ایسا نہ کرے کیونکہ اس طرح اس کے شوہر کے سارے کرتوت سامنے آ جائیں گے۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "فی الحال تو میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اس نے سینڈی کے متعلق کیا کہا ہے۔"

پال نے اسے مختصراً وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے لیپ ٹاپ پر دیکھا تھا۔ نینسی کا چہرہ مزید زرد ہو گیا اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اب مجھے اس پر افسوس ہو رہا ہے۔ فورسٹر کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ لڑکی ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے۔ اس کے باوجود اس نے سینڈی کے ساتھ یہ زیادتی کی۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ "جب وہ شو میں شرکت کے لیے آئی تو ہم نے اس میں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔ وہ عام مہمانوں کی طرح لگ رہی تھی۔ ہم اس شو میں ایسے ہی لوگوں کو بلاتے ہیں جنہیں دیکھ کر دوسروں کو

حوصلہ ہو یہی اس شو کا مرکزی خیال ہے۔ وہ شو کی ریکارڈنگ سے پہلے کئی مرتبہ یہاں آ گئی اور ہماری ایک معاون کیرن پامر سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی یہاں آتی تو کیرن اس سے پندرہ بیس منٹ ضرور بات کرتی تھی۔"

"لنچ ختم کرنے کے بعد میں کیرن سے بھی بات کروں گا۔"

"مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے خلاف جا سکتا ہے۔ پریس والوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ ہم نے ایک ایسی عورت کو شو میں کیوں بلایا جو ذہنی مریضہ تھی۔"

"وہ اسے مشتبہ قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ خواہ وہ بے قصور ہی کیوں نہ ہو لیکن اس وقت اس پر نحوست کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ وہ ہر اس شخص کا انٹرویو کریں گے جس کا فورسٹر یا سینڈی سے ذرا سا بھی تعلق رہا ہو۔ اب یہ معاملہ اسی وقت سرد ہو سکتا ہے جب کوئی دوسری بڑی کہانی سامنے آ جائے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" نینسی پُرامید لہجے میں بولی۔

فورسٹر کے قتل کے بعد فائنل مومنٹس، غیر معینہ عرصہ کے لیے ملتوی ہو گیا تھا اور دیگر معاونین کی طرح کیرن کی ملازمت بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اتفاق سے کیرن کو دوسرے سیٹ پر کام مل گیا۔ پال اسے تلاش کرتا ہوا اسی سیٹ پر پہنچ گیا۔ کیرن اسٹوڈیو کے پچھلے حصے میں کھڑی تھی۔ پال نے کہا۔ "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمہیں دوسرا کام مل گیا۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ جو کچھ ہوا وہ ایک المیہ ہے لیکن میں اس کا سوگ نہیں منا سکتی۔ مجھے کام کی ضرورت ہے۔"

پال نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سب کو کام کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے حادثات کے باوجود زندگی کے معمولات چلتے رہتے ہیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔ "مجھے نینسی نے بتایا ہے کہ تم سینڈی کولن کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔"

"مجھے اس سے ہمدردی ہے لیکن وہ ہمیشہ ایسی باتیں کرتی تھیں جو بناوٹی لگتی تھیں۔"

"مثلاً۔"

"میں نے اسے ایک دوسری لڑکی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے اسے اپنے ساتھ فلم دیکھنے کی دعوت دی تھی پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے اس کے ساتھ کنسرٹ پر جانے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب میں نے اس سے پوچھا کہ میں نے کب یہ بات کہی تو وہ خاموش ہو گئی۔"

"وہ ذہنی مریضہ عورت تھی اور ہمیں اس کی باتوں پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔" پال نے کہا۔

"اس نے ہولی کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ ہولی اچھا نہیں سمجھتی کہ کوئی اس کے بارے میں کچھ کہے وہ گزشتہ برس چھٹیوں پر گئی تھی۔ واپس آنے کے بعد کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئی ہے۔"

"چھٹی پر جانے کی کیا وجہ تھی؟" پال نے پوچھا۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے صرف دس مہینے ہوئے تھے اور ہولی اس کے آنے سے پہلے چھٹیوں پر گئی تھی۔

"میں نے سنا ہے کہ اس کا باپ بہت بیمار تھا اور وہ اس کی عیادت کے لیے گئی تھی لیکن ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اصل وجہ کچھ اور تھی۔"

"وہ کیا؟"

کیرن مسکراتے ہوئے بولی۔ "یہاں طرح طرح کی افواہیں گھڑی جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے کوئی دوسری ملازمت مل گئی تھی جبکہ چند ایک یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنے صحافی دوست سے ملنے پیرس گئی تھی۔ میں تمہیں بتا رہی تھی کہ سینڈی کس طرح فرضی باتیں کرتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ اور ہولی اچھی دوست تھیں۔ ہولی نے جب یہ سنا تو وہ یہاں آئی اور اسے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔"

ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک لڑکا کسی کام کے سلسلے میں اسے بلانے آ گیا اور وہ پال سے معذرت کر کے چلی گئی۔ وہ بھی واپس اپنے دفتر آ گیا۔ اس نے بوناتو کیفے فون کر کے نائٹ شفٹ کے منیجر کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ ابھی نہیں پہنچا۔ پال نے کہا کہ وہ کچھ دیر بعد دوبارہ فون کرے گا۔ اس کے بعد دس منٹ تک وہ اپنے ذہن میں آنے والے ایک نئے خیال کے بارے میں سوچتے لگا۔ فی الحال اس کے ذہن میں ایک موہوم سا نقشہ تھا لیکن اگر یہ سچ ہوا تو وہ اسے کیسے ثابت کر سکے گا۔

کچھ دیر بعد پال نے دوبارہ بوناتو کیفے کا نمبر ملایا۔ اس بار نائٹ منیجر سے اس کا رابطہ ہو گیا۔ وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کیونکہ ہوٹل کے عملے کو ہدایت تھی کہ وہ گاہکوں کے بارے میں پریس سے کوئی بات نہ کریں۔ پال نے اسے یقین دلایا کہ اس کا پریس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ

فورسٹر کے قتل کے سلسلے میں معلومات جمع کر رہا ہے۔ پال نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے تعاون نہ کیا تو وہ پولیس کی مدد لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ دھمکی کام آ گئی اور اس شخص نے وہ سب کچھ بتا دیا جس کی پال توقع کر رہا تھا۔

پال جب ہولی کے دفتر پہنچا تو اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ فون پر کسی سے بڑے خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھی اس نے پال کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فون پر بولی۔

"میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔ اس وقت ایک مہمان مجھ سے ملنے آ گیا ہے۔" پھر وہ پال سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "کافی پیو گے؟ چینی اور دودھ کے بغیر۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں وہی پسند ہے۔"

پال نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ہولی نے ایک قیمتی زرد رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ معمولی نقش و نگار کی عورت تھی البتہ اس کی سیاہ آنکھوں میں بڑی کشش تھی۔ اس نے پال کی نظروں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کی اور بولی۔ "جب تم نے اندر آنے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کیا تو میں سمجھ گئی کہ کوئی خاص بات ہے اور اب میں اندر سے لرز رہی ہوں۔" اس نے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

پال نے اس کے مذاق پر کوئی توجہ نہیں دی اور سنجیدگی سے بولا۔ "تمہیں وہ ٹاک شو یاد ہو گا جس میں میزبان عورت نے دو لڑکوں کو بلایا تھا۔ ان میں سے ایک ہم جنس پرست تھا اور اس نے شو کے دوران ہی دوسرے لڑکے سے اظہارِ محبت کر دیا۔ وہ لڑکا یہ برداشت نہ کر سکا اور بعد میں اس نے اسے قتل کر دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ شو بھی بند ہو گیا۔ میں نے اس واقعے کو بنیاد بناتے ہوئے ایک اسکرپٹ لکھا ہے اور میرے ایجنٹ نے اسے حال ہی میں کرائم اسٹوریز کو فروخت کر دیا ہے۔"

"واؤ۔ وہ تو بہت برا شو ہے۔" وہ بے اختیار بولی پھر اسے احساس ہوا کہ پال کو اس سے یہ بات کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ گو کہ ان کے درمیان اچھے تعلقات تھے لیکن دوستی کا رشتہ نہیں تھا اس لیے یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔

"یہ میرا پہلا بڑا اسکرپٹ ہے کیونکہ تم اس طرح کے شوز دیکھتی ہو اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں بھی بتا دوں۔"

"گویا ہم دوبارہ ہائی اسکول کے زمانے میں چلے گئے۔" ہولی نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

"میرا خیال تھا کہ تم میری اس کوشش کی تعریف کرو گی۔"

"اوہ تم تو برا مان گئے۔ واقعی مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔" ہولی نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا تھا۔" پال کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "کیا تم یہ کہانی سننا پسند کرو گی؟"

اس نے ہولی کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور بولا۔ "یہ دو عورتوں کی کہانی ہے۔ ان میں سے ایک عورت دوسری عورت کو کسی آدمی کو قتل کرنے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص نے ایک سال قبل پہلی عورت کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان معاشقہ چل رہا تھا لیکن اس مرد نے اپنا مطلب نکل جانے کے بعد عورت کو چھوڑ دیا۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں جو آسانی سے ہار مان لیں۔ وہ ایک حاسد اور کینہ پرور عورت ہے۔ اسے کتیا کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ جب اس کی دوسری عورت سے ملاقات ہوئی تو اس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے اس نے اسے اپنے مقصد کے لیے موزوں جانا اور اسے اپنے بے وفا محبوب کے قتل پر آمادہ کر لیا۔ دوسری عورت ذہنی طور پر غیر متوازن ہے اور ماضی میں دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کر چکی ہے۔ پہلی عورت یہ بات جانتی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دوسری عورت کے لاشعور میں بھی یہ خواہش موجود تھی کہ وہ اس شخص کو مردہ دیکھے کیونکہ ماضی بعید میں وہ بھی اس کے ستم کا نشانہ بن چکی تھی اور اسے اس حال کو پہنچانے والا وہی شخص تھا۔ اگر پہلی عورت اسے نہ بھڑکاتی تب بھی وہ اس مرد کو اس کے انجام تک ضرور پہنچا دیتی۔"

ہولی کا چہرہ زرد ہو گیا اور وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس کہانی میں جھول نظر آ رہا ہے۔ یہ تم کیسے ثابت کرو گے کہ پہلی عورت نے دوسری عورت کو اس قتل کے لیے آمادہ کیا۔ کسی ثبوت کے بغیر لوگ اس کہانی پر کبھی یقین نہیں کریں گے۔"

پال خوش تھا کہ اس نے ایک فرضی کہانی سنا کر ہولی کو پریشان کر دیا اور اب اس سے مزید اگلوانا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ وہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ مکمل طور پر ناقابلِ ثبوت نہیں۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھے گی۔ سب کچھ واضح ہوتا چلا جائے گا۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ ان دونوں عورتوں نے قتل کی واردات سے پہلے کافی وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ وہ ایک ہی ہوٹل میں کھانا کھاتی تھیں اور دوسری عورت کی بہن کا کہنا ہے کہ وہ پہلی عورت سے ملنے کے بعد بالکل بدل گئی تھی۔ کیا یہ جاننے کے بعد کچھ لوگوں، بالخصوص پولیس کو تجسس نہیں ہو گا کہ ان دونوں عورتوں کی ملاقاتوں کا مقصد کیا تھا؟"

ہولی نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔ وہ ٹشو پیپر سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی ”اس کے باوجود یہ سب کچھ بعید از قیاس لگتا ہے۔ اگر تم نے یہ کہانی لوگوں کو سنائی تو تم پر ہتکِ عزت کا مقدمہ ہو سکتا ہے۔ جسے تم بری عورت کہہ رہے ہو وہ کسی بڑے وکیل سے رابطہ کر سکتی ہے۔ ایسا وکیل جو تمہاری زندگی جہنم بنا دے۔“

پال نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ دوسری عورت اسلحہ لے کر سیکیورٹی گیٹ سے اندر نہیں آسکتی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق اس معاملے میں بھی پہلی عورت نے اس کی مدد کی۔ وہ کسی بہانے باہر گئی اور دوسری عورت کو اپنے ساتھ لے کر اندر آگئی۔ اس کی گواہی بہت سے لوگ دے سکتے ہیں۔ اسی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس قتل کے پیچھے پہلی عورت کا ہاتھ تھا۔“

پھر وہی ہوا جس کی پال کو توقع تھی۔ ہولی نے میز کے نیچے لگا ہوا بٹن دبایا جسے صرف اس کی سیکریٹری سن سکتی تھی۔ یہ گویا اس کے لیے اشارہ تھا کہ وہ ہولی کے دروازے پر دستک دے کر کہے کہ چند منٹوں بعد اس کی ایک اہم میٹنگ ہے۔ ”ہولی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم نے اس کہانی کا عنوان کیا رکھا ہے؟“

”میں تمہارا پوائنٹ سمجھ گیا، شاید تمہاری تسلی اس وقت ہوگی جب اس میں ایک سراغ رساں کا ذکر آئے گا جو اصل مجرم کا سراغ لگا سکتا ہے لیکن اب اس بُری عورت کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا اس کے بارے میں... کم از کم ایک شخص ضرور جانتا ہے اور اس کے پاس اتنا مواد موجود ہے جو ڈسٹرکٹ اٹارنی کی دلچسپی کا سبب بن سکے اور اب وہ عورت اس بارے میں مسلسل سوچتی رہے گی اور اس کی زندگی عذاب بن کر رہ جائے گی۔“

توقع کے مطابق دروازے پر دستک ہوئی اور اس کی سیکریٹری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”ایکسکیوزمی! مسز فاؤلر۔ دو منٹ بعد تمہاری میٹنگ ہے۔ وہ شخص اس وقت استقبالیہ میں موجود ہے۔“

”شکریہ جین۔“ ہولی اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی پھر اس نے پال سے کہا۔ ”تم سے باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔ پھر ملاقات ہوگی۔“

پال میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم اس کہانی کی تعریف کرو گی۔“ پھر وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔

”میں صرف یہ چاہ رہا تھا کہ سب سے پہلے تمہیں اس بارے میں معلوم ہو جائے۔“

باہر آکر اس نے استقبالیہ پر دیکھا وہاں کوئی ملاقاتی نہیں تھا۔ اب اسے اطمینان ہو گیا کہ ہولی ہی وہ عورت تھی جس نے سینڈی کو اس قتل کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کو اس کہانی میں کوئی جھول نظر نہیں آئے گا کیونکہ تمام واقعات اور شواہد ہولی کو مجرم ثابت کر رہے تھے۔

اس نے لارا کو فون کر کے ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران لارا نے پوچھا۔ ”تمہیں پہلی بار کب اندازہ ہوا کہ ہولی اس قتل میں ملوث ہے؟“

”میں سوچ رہا تھا کہ سینڈی ریوالور کو اندر کیسے لے آئی کیونکہ ہر مہمان کو سیکیورٹی پوسٹ سے گزرنا ہوتا ہے جہاں اس کی تلاشی لی جاتی ہے جب میں نے اس معاملے کی چھان بین کی تو پتا چلا کہ سینڈی سیکیورٹی پوسٹ سے اندر نہیں آئی تھی اور اسے عملے کا کوئی فرد اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس کے بعد بہت سی باتیں سامنے آئیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسے اندر لانے والی ہولی فاؤلر تھی۔ ایکی نے مجھے بتایا کہ سینڈی جس ہوٹل میں ڈنر کرنے جاتی تھی وہ اس کی استطاعت سے باہر تھا۔ میں نے ہوٹل کے منیجر سے معلوم کر لیا کہ وہ ہولی کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ کیرن نے بھی مجھے ہولی کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ جب میں نے سینڈی اور ہولی کے ماضی کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی فورسٹر کی دھوکا دہی کا نشانہ بن چکی تھیں۔ فورسٹر نے سینڈی کے ساتھ جو کچھ کیا۔ اس کے بعد وہ ذہنی مریضہ بن گئی جبکہ ہولی سخت مزاج عورت ہے۔ وہ اتنی آسانی سے فورسٹر کو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ جب میں نے واقعات کی کڑیاں ملائیں تو سب کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔ میں نے ایک فرضی کہانی گھڑی اور ہولی کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے بعد مجھے حقیقت جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ہولی ہی اصل مجرم ہے جس نے سینڈی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔“

”تمہیں تو رابطہ افسر کے بجائے سراغ رساں ہونا چاہیے تھا۔“ ڈاکٹر لارا متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

پال مسکرا کر رہ گیا۔ وہ ڈاکٹر لارا کو نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ درحقیقت سراغ رساں ہی ہے لیکن رابطہ افسر کے روپ میں کمپنی کے لیے سراغ رسانی کے فرائض انجام دیتا ہے کیونکہ اس کے مالک کا یہی حکم ہے کہ وہ اپنی اصلیت کسی پر ظاہر نہ ہونے دے۔

ہمزاد

میمونہ عزیز

سیدھے سادے طریقۂ زندگی میں اچانک ہی ایک ایسی ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے... جو جرم کے ارتکاب پر مجبور کر دیتی ہے... ذہین و فطین افراد کے ذہنی خلفشار کا خونی ابہام!

ذہانت کے رسیا کا مختصر احوال..... جس کے لیے ہر ذہن مرغوب غذا تھا

”لیری، تم حیرت انگیز ہو۔“ فلورا نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے جیسے تمہیں ہر چیز کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔“

”ابھی میری معلومات مکمل نہیں ہوئی ہیں۔“ لیری نے جواب دیا۔ ساتھ ہی کار ہائی وے سے ایک بغلی سڑک پر اتار دی۔ ”میں نے اپنے دماغ میں سائنس، تاریخ اور لسانیات کے بارے میں ڈھیروں علم ٹھونس کر بھر لیا ہے لیکن میں ریاضی میں مزید ذہین براق بننا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ ریاضی میرا خصوصی مضمون رہا ہے۔“ فلورا نے کہا۔

لیری یہ سن کر ہنس دیا۔ ”مجھے معلوم ہے اسی لیے میں نے تمہیں آج شب باہر چلنے کو کہا تھا۔“

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”ایک نہایت اسپیشل جگہ پر۔“

لیری نے خود کو پہلے کبھی اتنا پُرجوش محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ گزشتہ چند ماہ کے دوران میں کئی بے گمان ذہین دماغوں کو اپنے کیبن میں لا چکا تھا۔ اور ان میں سے ہر ایک سے اپنے علم کو بلند تر کر چکا تھا۔

آج کی رات فلورا نے اسے حتمی علم فراہم کرنا تھا۔

سب سے پہلے تو وہ فلورا کے مشروب کو نشہ آور بنا دے گا۔ جب وہ بے ہوش ہو جائے گی تو وہ فرش پر بھاری کپڑے کی چادر بچھا دے گا۔ پھر اپنا ایکسٹرا اسپیشل فولڈنگ ٹیبل کھول کر اس پر فلورا کے بے ہوش جسم کو لٹا دے گا اور اس کو اسٹریپ سے باندھ دے گا تاکہ اگر اسے ہوش آ جائے تو وہ کوئی حرکت نہ کر سکے۔ پھر وہ اپنی کھوپڑی کاٹنے والی آری اور کھانے کے ظروف اور آلات نکال لے گا۔

اپنے ابتدائی ڈونرز کے ساتھ سیکھنے کے مراحل میں اسے جو دشواریاں پیش آئی تھیں اس سے لیری نے یہ سبق حاصل کر لیا تھا کہ اسے پلیٹوں اور برتنوں سمیت سب کچھ سے تیار رکھنا ہوگا۔

اور زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے اسے ڈونر کا مغز اس کے کسی بھی خلیے کے بے جان ہونے سے قبل تیزی سے ندیدوں کی طرح ہڑپ کرنا ہوگا۔

اسی لیے وہ فلورا کے مغز کی ضیافت کے لیے بے تاب ہو رہا تھا اور اس سے مزید صبر نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو۔“ فلورا نے کہا۔

”ہوں۔“

”صرف ریاضی ہی میرا ٹیلنٹ نہیں ہے۔ میں ذہنوں کو بھی پڑھ سکتی ہوں۔ مجھے وہ سب کچھ معلوم ہے جو تمہارے ذہن میں ہے۔ تم نے اپنا علم کس طرح حاصل کیا ہے اور اس کے حصول کے لیے تم نے کس کس کا مغز کھایا ہے، مجھے اس کا بخوبی علم ہے۔“ فلورا نے بتایا۔

یہ سنتے ہی لیری نے فوراً ہی کار کے بریک دبا دیے اور فلورا کو جکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن فلورا پہلے ہی دروازہ کھول کر چھلانگ لگا چکی تھی۔ پھر وہ رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔

”تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔“ لیری نے چیخ کر کہا۔ پھر اگنیشن سے چابیاں ایک جھٹکے سے باہر نکالیں اور فلورا کے پیچھے دوڑ پڑا۔

”تم سن رہی ہو؟ تم کبھی بچ کر نہیں نکل سکتیں۔ میں اس علاقے کو اس طرح جانتا ہوں جیسے اپنے ہاتھ کی پشت کو جانتا ہوں۔“

اسے جھاڑیوں میں فلورا کے دوڑنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کیا وہ ذہن پڑھ سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن تھا؟ کیا یہ صلاحیت بھی اس کے اندر منتقل ہو جائے گی؟

وہ انہی خیالوں میں گم دوڑ رہا تھا کہ کسی درخت کی شاخ اس کے چہرے سے ٹکرا گئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ایک کراہ نکل گئی۔

مجھے خاموش رہنا ہوگا، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ آوازیں سن کر اسے پتا چل جائے گا کہ میں کہاں پر ہوں۔

وہ ساکت کھڑا ہو گیا اور سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ لعنت ہو، وہ بڑبڑایا۔ وہ یقیناً میرے خیالات پڑھ رہی ہوگی۔ اس نے بھی حرکت روک دی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ یہی اس کی واحد امید ہے۔ لیکن وہ اپنے اس علم سے کام نہیں لے سکے گی۔ میں اس وقت تک اسے تلاش کرتا رہوں گا جب تک اسے ٹھکانے نہ لگا دوں۔

”میں تمہیں ڈھونڈ کر رہوں گا میری ریاضی کی چھوٹی سی عجوبہ اب تمہارے لیے کوئی راہِ فرار نہیں۔ اب کسی طور تم بچ کر نہیں جا......“

فلورا پیچھے سے آ کر اس زور سے اس سے ٹکرائی کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھل پاتا اور اٹھنے کی کوشش کرتا، وہ اس کے اوپر سوار ہو چکی تھی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے انگوٹھے لیری کی آنکھوں میں گاڑ دیے۔

لیری چیخنے لگا اور اسے اپنے اوپر سے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا۔

فلورا نے ایک بھاری پتھر اٹھا کر لیری کی کھوپڑی پر دے مارا۔ ساتھ ہی فاتحانہ لہجے میں بولی۔ ”تمہارا سارا علم اب میرا ہے۔“

پھر اس نے لیری کی چٹخی ہوئی کھوپڑی سے اس کا مغز کھینچ کر باہر نکال لیا اور اس کے دانتوں نے مغز کو چھوٹے چھوٹے نوالوں میں کھانا شروع کر دیا۔

مردِ ناداں

آصف ملک

رشتے ناتوں کے بھرم سے ہی گھر بنتے بگڑتے ہیں... وہ دونوں ہی ایک بندھن میں یکجا تھے... اس کے باوجود ان میں تضاد کی دیواریں کھڑی ہو گئیں... ایک نازنین، آفتِ ساماں کی کج ادائیاں... جو اپنے ماضی سے جڑے ہر تعلق سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتی تھی...

ایسی بازی کا کھیل جو شاید اس کی زندگی کی آخری بازی تھی

عورت نے اس مرد کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”اب میں تھک گئی ہوں۔“

”یہ آخری بار ہے جان۔“ مرد نے کہا۔ وہ تقریباً تیس سال کا خوش شکل اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ عورت بے پناہ حسین تھی اور ان دونوں کا جوڑ اچھا تھا۔ مرد نے ایک تصویر عورت کی طرف بڑھا دی۔ ”اسے دیکھو... موزوں نہیں لگتا؟“

عورت نے اعتراف کیا۔ ”لگتا تو ہے۔“

”بڑی اسامی ہے۔ اس سے خاصا مال مل جائے گا اور پھر ہم ہمیشہ کے لیے اس ملک سے چلے جائیں گے۔“

عورت نے تصدیق طلب نظروں سے مرد کی طرف دیکھا۔ ”یہ آخری بار ہے نا؟“

”تمہاری قسم، یہ آخری بار ہے۔“ مرد نے یقین دلایا۔

عورت نے تصویر کی طرف دیکھا۔ ”اس کا نام کیا ہے اور کیا کرتا ہے؟“

”سیٹھ کریم بھائی نام ہے اور بہت بڑا بزنس مین ہے۔ سب سے بڑھ کر اکیلا ہے۔“ مرد کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

سیٹھ کریم تقریباً پچپن سال کے صورت سے شریف اور سادہ نظر آنے والے آدمی تھے۔ خوبرو اور مناسب نقوش کے ساتھ لائٹ گرے بالوں میں وہ بہت سوبر نظر آتے تھے۔ دیکھنے میں اپنی عمر سے دس سال کم لگتے تھے۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں میٹرک کر کے انہوں نے بزنس کا آغاز کیا۔ ان کے والد سیٹھ رحیم شہر کے نامی گرامی کاروباری تھے لیکن انہوں نے کریم کی کوئی مدد نہیں کی۔ انہوں نے اپنا پہلا کاروبار اپنی والدہ سے ادھار رقم لے کر کیا تھا اور جب وہ کمانے لگے تو انہوں نے یہ رقم واپس کر دی۔ مگر وہ اپنے والد کے شکر گزار تھے جنہوں نے انہیں خود انحصاری کا سبق دیا تھا۔ بعد میں انہوں نے یہی سبق اپنے بیٹوں کو دیا۔ اگرچہ ان کے کاروبار کے لیے روپیا سیٹھ کریم نے ہی فراہم کیا لیکن انہیں اپنے کاروبار سے بالکل الگ رکھا۔ وہ شروع سے اکیلے سب دیکھتے آئے تھے اور اب بھی مکمل کاروبار اکیلے ہی چلاتے تھے۔

سیٹھ کریم نے شروع سے اصول رکھا ہوا تھا کہ کسی عورت کو دفتر میں جگہ نہیں دینی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت گھر کی ملکہ ہوتی ہے اور اسے گھر میں رہنا چاہیے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مسز کریم یعنی حاجرہ سچ مچ گھر کی ملکہ تھیں اور سیٹھ کریم سمیت کسی کی مجال نہیں تھی جو ان کے کسی بھی فیصلے سے جو گھر سے متعلق ہو، چوں بھی کر سکے۔ کریم کی حکومت گھر کی چار دیواری کے باہر تک ہوتی تھی۔ جیسے ہی وہ گھر میں قدم رکھتے تھے، یہ حکمرانی یک دم ختم ہو جاتی۔ حاجرہ عمر میں سیٹھ کریم سے پانچ سال چھوٹی تھیں مگر دیکھنے میں زیادہ جوان اور خوب صورت دکھائی دیتی تھیں۔ کم عمری میں شادی ہو گئی تھی۔ بیس سال سے پہلے دو بیٹوں کی ماں بن گئی تھیں۔ حاجرہ سے کریم کی چار اولادیں تھیں، تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ سب اپنے گھر کے ہو چکے تھے۔ ابھی چند مہینے پہلے انہوں نے بیٹی کی شادی کی تھی اور اس کی رخصتی کی تھی۔

بیٹوں کو پہلے ہی شادی کے بعد رخصت کر چکے تھے۔ کریم کا پختہ اعتقاد تھا کہ ایک گھر ایک عورت کے لیے ہوتا ہے، اس لیے ایک گھر میں ایک ہی عورت کو رہنا چاہیے۔ اگر وہاں دو عورتیں ہو جائیں تو پھر وہ گھر نہیں رہتا۔ اس لیے جس بیٹے کی شادی کرتے، اسے دوسرے مہینے الگ گھر میں منتقل کر دیتے۔ گھر میں یہ واحد فیصلہ تھا جو کریم نے کیا اور اس پر... عمل درآمد بھی کیا۔ حالانکہ حاجرہ نے بہت شور کیا، وہ کسی صورت بیٹوں کو الگ کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

”میرے بیٹے اس گھر سے نہیں جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، بیٹے یہیں رہیں گے ہم کہیں اور جا کر رہتے ہیں۔“ کریم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو حاجرہ کو ہار ماننا پڑی۔ یہ گھر ان کا تھا اور انہوں نے اسے بڑی محبت اور محنت سے سجایا سنوارا تھا، وہ بھلا اسے ایک نئی آنے والی عورت کے حوالے کیسے کر دیتیں؟ یوں بیٹے رخصت ہوئے اور گھر پر ان کا راج تھا۔ بعد میں ان کی سمجھ میں آیا کہ... کریم کا مقصد کیا تھا۔ وہ اکیلی تھیں مگر خوش تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ ان کی خوشی زیادہ دن برقرار نہیں رہی، طبیعت خراب ہوئی اور معائنے کے بعد جگر کا کینسر تشخیص ہوا۔ تاخیر کی وجہ سے بات علاج کی حد سے نکل گئی تھی اور حاجرہ ایک سال سے بھی پہلے دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ تب سے سیٹھ کریم اکیلے تھے۔ حاجرہ کی زندگی میں انہوں نے کبھی بلاوجہ باہر کھانا نہیں کھایا تھا مگر اب وہ رات کا کھانا باہر ہی کھاتے تھے۔ البتہ ان کا باورچی ناشتے کے ساتھ ان کے لیے لنچ تیار کر دیتا تھا۔

اس رات وہ ساحل کے پاس واقع ایک بہت پرانے اور اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ڈنر کے لیے آئے تھے۔ یہ ان کی پسندیدہ جگہ تھی۔ جب حاجرہ زندہ تھیں، تب بھی وہ مہینے میں ایک دو بار ڈنر کے لیے یہاں آتے تھے اور اب وہ ہفتے میں ایک چکر لگاتے تھے۔ لان والے حصے میں کھلی جگہ ڈنر کرنے کا اپنا مزہ تھا۔ سمندر کی طرف سے بھیگی ہوئی نم ہوا کے جھونکے آتے تھے۔ ڈنر کے بعد وہ آدھا پون گھنٹا وہیں ٹہلتے تھے اور پھر گھر کا رخ کرتے۔ اس رات بھی وہ ہوٹل ڈنر کرنے آئے لیکن موسم ذرا سرد ہو چلا تھا اس لیے وہ ڈنر کے بعد زیادہ دیر نہیں رکے۔ وہ پارکنگ میں آئے جہاں ان کی مرسیڈیز پارک تھی۔ مگر جب وہ نزدیک آئے تو ٹھٹک گئے۔ بونٹ پر ایک عورت جھکی بیٹھی تھی اور اس نے اپنا بایاں پاؤں تھام رکھا تھا۔ وہ دبی آواز میں سسکیاں لے رہی تھی۔ لمبی ریشمی فراک میں اس کا سراپا نمایاں تھا۔ ریشمی

بال اس کے چہرے پر سایہ فگن تھے اس لیے سیٹھ کریم اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے لیکن ہاتھ اور پیروں کی دودھیا گلابی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ کتنی حسین اور نازک اندام ہے۔

سیٹھ کریم ہچکچائے اور پھر آگے آئے۔ ”اینی پرابلم...“

عورت نے سر اوپر کیا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ سیٹھ کریم ساکت رہ گئے۔ بالوں کی ہم رنگ لائٹ براؤن آنکھیں جن پر لمبی پلکیں سایہ فگن تھیں۔ ستواں ناک جو نہ تو چھوٹی تھی اور نہ بہت نمایاں... نوک سے ذرا گول تھی اور ان کے تلے سلگتے ہوئے گداز لب۔ صبیح رخساروں پر آنسو جیسے گلاب پر اوس کی طرح لرز رہے تھے۔ اس کی عمر اٹھائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”میرا پاؤں... موچ آئی ہے... بہت درد ہے۔“

اس کے لہجے میں ایسی بے تکلفی تھی کہ سیٹھ کریم نے بے ساختہ اسے رومال پیش کیا اور پھر اس کا پاؤں دیکھا۔ کسی قدر چست ٹراؤزر شفاف پنڈلی تک چڑھا ہوا تھا۔ اس نے ہائی ہیل اتار دی حالانکہ اسے ہائی ہیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا قد فائیو سکس تھا۔ سیٹھ کریم کا قد اس سے ایک انچ زیادہ تھا۔ انہوں نے پاؤں کا معائنہ کیا۔ ٹخنے کے پاس سے اس پر سوجن آنے لگی تھی اور یہ چوٹ بہت زیادہ نہیں لگ رہی تھی لیکن عورت بہت نازک تھی شاید اسی لیے وہ زیادہ تکلیف میں تھی۔ ”موچ آئی ہے۔“ کریم نے کہا۔ ”ڈاکٹر کو دکھانا ہو گا۔“

”ڈاکٹر کو...“ وہ پریشان ہو گئی۔

”آپ کے ساتھ کوئی ہے؟“

”نہیں، میں اکیلی آئی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”یہ میری کار ہے مگر اب میں ڈرائیو کیسے کروں؟“ اس نے برابر میں کھڑی ہلکے سبز رنگ کی چھوٹی سی لیکن جدید ماڈل کی کار کی طرف اشارہ کیا۔ ”باہر نکلی تھی کہ یہ ہو گیا۔“

سیٹھ کریم ہچکچائے پھر انہوں نے کہا۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لیے چلتا ہوں۔ میرا نام کریم الدین ہے لیکن سب کریم بھائی کہتے ہیں۔ میرا چھوٹا سا بزنس ہے۔“ تصدیق کے لیے انہوں نے اپنا کارڈ بھی پیش کیا۔ اس نے کارڈ لے لیا مگر دیکھا نہیں۔

”میں آپ کو جانتی ہوں، آپ اکثر یہاں آتے ہیں۔ میں بھی کبھی کبھی آتی ہوں۔“

وہ خوش ہو گئے۔ ”تب آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔“

عورت نے معصومیت سے سر ہلایا۔ ”مجھے یقین ہے آپ اچھے آدمی ہیں۔“

سیٹھ کریم نے سہارا دے کر اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھایا۔ حاجرہ کے بعد وہ پہلی عورت تھی جس کے اتنے قریب آئے تھے۔ اس کے بدن کا گداز اور انوکھی مہک محسوس کی تھی۔ کریم کو یقین تھا کہ یہ اس کی اپنی مہک تھی، کسی پرفیوم کی خوشبو نہیں تھی۔ وہ ہوٹل سے نکلے تو انہیں خیال آیا۔

”معاف کیجیے گا آپ کا نام پوچھا نہیں...“

”شاہانہ کریم۔“ اس نے جواب دیا تو سیٹھ کریم نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ذرا پیچھے ہو کر بیٹھی تو کریم نے نظریں چرا لی تھیں۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کا بدن خود متوجہ کرتا ہے۔ وہ ہچکچائے۔

”کریم آپ کے شوہر ہیں یا...“

”میرے والد ہیں۔“ شاہانہ نے جلدی سے وضاحت کی۔ ”لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

”اوہ آئی ایم سوری۔“ کریم نے معذرت کی۔ نہ جانے انہیں جان کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ غیر شادی شدہ تھی۔ وہ اسے اپنے واقف کار کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ اس لیے ایک اچھے نجی اسپتال کی او پی ڈی میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے شاہانہ کے پاؤں پر سخت بینڈیج باندھ دی۔ لگانے کے لیے کریم اور پین کلر دوا دی تھی۔ اس نے تسلی دی تھی کہ ایک دو دن احتیاط کریں گی تو جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر اس نے کریم سے کہا۔

”آپ کی مسز زیادہ ہی نازک ہیں، ان کا خیال رکھا کریں۔“

وہ دونوں جھینپ گئے مگر کچھ کہا نہیں۔ سیٹھ کریم اسپتال میں بھی اسے سہارا دے کر لے گئے تھے۔ اندر جاتے جاتے ان کے دل کی دھڑکن خاصی تیز ہو گئی تھی۔ ایسے میں ڈاکٹر ان کا بی پی چیک کرتا تو وہ خاصا اونچا ہی ملتا۔ مگر واپسی وہیل چیئر میں ہوئی اور وہ دل مسوس کر رہ گئے۔ کریم نے شاہانہ سے اس کی رہائش کا پوچھا۔ اس نے کلفٹن کا پتا بتایا... جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ چھوٹی سی عمارت تھی جس کے پہلے فلور پر شاہانہ کا فلیٹ تھا۔ اس بار سیٹھ کریم کو کہیں زیادہ سہارا دینا پڑا اور ان کی ساری کوفت کا ازالہ ہو گیا۔ وہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئے تھے۔ شاہانہ نے لاک کھولا اور سہارا لے کر اندر چلی گئی۔ اس نے کریم کا شکریہ ادا کیا لیکن انہیں اندر آنے کی دعوت نہیں دی۔ ویسے بھی اس کی

حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ انہیں اندر بلاسکتی۔ وہ ہچکچائی لیکن کریم نے خود جلدی سے کہا۔

”آپ آرام کریں، اگر کوئی مسئلہ ہو تو کارڈ پر میرے سارے نمبر ہیں... مجھے ایک کال کر دیجیے گا۔“

”مجھے اپنی کار کی فکر ہے۔“

”اسے میری ذمے داری سمجھیں... اگر آپ اعتماد کریں تو چابی دے دیں' میرے آفس کا ڈرائیور کار لے کر یہاں چھوڑ جائے گا۔“

شاہانہ کو اپنی کار کی زیادہ فکر تھی۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دے دی۔ ”بہت نوازش ہوگی۔“

اب کریم کے لیے آسان ہوگیا تھا۔ ”اپنا کونٹیکٹ نمبر بھی دے دیں' ڈرائیور آپ سے پتا پوچھ کر آئے گا۔“

شاہانہ نے اپنا سیل نمبر دے دیا۔ ”ایک بار پھر... تھینکس' آپ نے میرے لیے بہت کیا ہے۔“

”نہیں... نہیں... یہ تو کچھ نہیں ہے۔“ سیٹھ کریم انکساری سے بولے۔ ”آپ آرام کریں۔ اب کھڑی مت رہیں۔“

اس رات گھر جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھے۔ حاجرہ کے بعد ان کی زندگی بہت ڈل اور بور ہوگئی تھی۔ بچے اپنی زندگیوں میں مگن تھے اور اگر وہ ان کے ساتھ بھی ہوتے، تب بھی شریکِ حیات کا کوئی متبادل نہیں ہوتا۔ بعض اوقات انہیں حاجرہ پر غصہ آتا تھا کہ وہ اتنی جلدی ان کا ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔ آدمی کو اس عمر میں بیوی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جب گھر آتے تو حاجرہ یاد آتی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گھر آئے تو حاجرہ کے بجائے انہیں شاہانہ کا خیال آرہا تھا۔ اگلی صبح دفتر جانے سے پہلے انہوں نے شاہانہ کا نمبر ملایا۔ عین اس وقت جب وہ کال بند کرنے والے تھے، شاہانہ نے کال ریسیو کرلی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”ہیلو... کیسے ہیں آپ؟“

”یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے اور میں نے اسی لیے کال کی ہے۔“

”میں باتھ لے رہی تھی۔ بیل بجی تو مجھے آپ کا خیال آیا۔“

باتھ کا سن کر کریم کو سنسنی کا احساس ہوا۔ ”سوری، میں نے ڈسٹرب کیا لیکن آپ نہائی کیوں؟ آپ کا پاؤں ابھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں نے گرم پانی پاؤں پر ڈالا تو بہت اچھا لگا پھر نہا لی۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”ویسے اب ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے چوٹ اتنی زیادہ نہیں تھی، شاید مجھے فیل زیادہ ہوئی تھی۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میری کال ہوگی؟“

”بس میرے دل نے کہا۔“ وہ بولی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ... آپ خود میری کار لے آئیں؟“

”ہو تو سکتا ہے لیکن کوئی وجہ؟“

”بس مجھے اچھا نہیں لگا تھا کہ کل میں نے آپ کو باہر سے جانے دیا۔ میں چاہتی ہوں آپ میرے گھر آئیں اور میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

”اس کی ضرورت...“

”پلیز... انکار مت کریں۔“ اس کے لہجے میں اصرار آیا تو کریم کو اس کی بات ماننا پڑی لیکن انہوں نے کہا۔

”ٹھیک ہے مگر میں آج نہیں آؤں گا۔ ابھی آپ کا پاؤں ٹھیک نہیں ہے، میں گاڑی لے کر کل شام کو آؤں گا۔“

اگلے دن شام تک کا وقت کریم نے کیسے گزارا، یہ وہی جانتے تھے۔ پانچ بجے وہ دفتر سے نکل کر ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے' وہاں اپنی کار پارکنگ میں کھڑی کی اور شاہانہ کی کار لے کر روانہ ہوئے۔ راستے میں انہوں نے خوب صورت گلدستہ اور کیک لیا تھا۔ دروازے پر دستک دی تو شاہانہ جیسے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا اور انہیں دیکھ کر وہ جیسے کھل اٹھی تھی۔ خود بھی کھلی کھلی سی تھی۔ سرخ میکسی نما فراک پہنی تھی۔ آستینیں شانوں پر چڑھی تھیں اور گریبان جہاں فراغی کا احساس دیتا تھا، وہاں نظروں کو تشنہ کام بھی چھوڑ رہا تھا۔ کریم کی نظریں محسوس کر کے اس کا رنگ مزید گلابی ہوگیا۔ وہ انہیں اندر لائی۔ یہ دو بیڈ رومز، لاؤنج اور ایک نشست گاہ پر مشتمل چھوٹا اپارٹمنٹ تھا لیکن بہت صفائی اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ چیزیں کم تھیں لیکن بہت اعلیٰ معیار کی اور منتخب تھیں۔ کریم نے اسے گلدستہ دیا تو وہ خوش ہوگئی۔ ”تھینک یو... اس کی کیا ضرورت تھی؟“

شاہانہ نے کیک کی طرف اشارہ کیا تو کریم نے ہنس کر کہا۔ ”اسے آپ رہنے دیں۔“

وہ شوخ انداز میں ہنسی۔ ”آپ باتیں بڑی خوب صورت کرتے ہیں۔“

”جیسی شخصیت ویسی بات۔“

شاہانہ کا پاؤں بہتر تھا اور وہ کسی قدر لنگڑا کر چل رہی

تھی۔ اس نے ان کے لیے ڈنر تیار کیا۔ ڈنر آٹھ بجے تھا اور اس وقت تک وہ باتیں کرتے رہے۔ کریم نے محسوس کیا کہ شاہانہ خوب صورت اور شوخ تو تھی لیکن ساتھ ہی معصوم اور سادہ لڑکی بھی تھی۔ اس کی گفتگو بناوٹ سے پاک تھی۔ البتہ یہ جان کر کریم کو کسی قدر مایوسی ہوئی کہ وہ ایک بار شادی شدہ رہ چکی تھی۔ نہ جانے کیوں ان کے ذہن میں تھا کہ اس کی زندگی میں اب تک کوئی مرد نہیں آیا تھا۔ شاہانہ کی ہارون نامی شخص سے شادی ہوئی تھی اور یہ ارینج میرج تھی۔

”پتا نہیں میرے ڈیڈی کیسے اس شخص کی باتوں میں آگئے اور میری اس سے شادی کر دی۔ شادی کے بعد اس کی اصلیت سامنے آئی اور یقین کریں، اس کے ساتھ تین سال میں نے جیسے جہنم میں گزارے۔ پھر ایک دن اس نے نشے میں مجھے طلاق دی تو میری اس سے جان چھوٹی۔“

شاہانہ کی طلاق کو چار سال ہو چکے تھے۔ اس کی عمر تیس سال تھی اور تیئس برس کی عمر میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اب وہ اکیلی رہتی تھی۔ دنیا میں صرف ایک باپ تھا اور اس کا انتقال بھی شاہانہ کی شادی کے دوسرے سال ہوگیا تھا۔ ہارون سے طلاق کے بعد وہ اپنے باپ کے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔ اس کا باپ بہت کچھ چھوڑ کر گیا تھا اور اس کی گزر بسر اس سے ہو جاتی تھی۔ ڈنر کے بعد بھی وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شاہانہ نے منع کرنے کے باوجود ان کے لیے گرین ٹی بنائی کیونکہ وہ پیتے ہی گرین ٹی تھے۔ عام چائے یا کافی انہیں پسند نہیں تھی۔ ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا اور شاہانہ کا بھی نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ وہ جب اٹھنے لگتے تو وہ کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتی۔ مگر بارہ بجے وہ اٹھ ہی گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”بہت دیر ہوگئی ہے۔ ابھی مجھے جا کر اپنی گاڑی بھی لینی ہے۔“

”ہاں۔“ شاہانہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”آپ سے ملنے میں بہت دیر ہوگئی۔“

گھر کی طرف جاتے ہوئے سیٹھ کریم نے محسوس کیا کہ شاہانہ خود ان کی طرف ملتفت تھی۔ جب عورت متوجہ ہو تو مرد کو پیش قدمی کرتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ مرد تو ویسے بھی سگنل گرین ہونے کا انتظار کرتا ہے اور گرین ہوتے ہی آگے بڑھتا ہے۔ یہاں سگنل پہلے ہی گرین تھا۔ دوسری ملاقات میں معاملہ آگے بڑھا اور شادی کے موضوع پر پہنچ گیا۔ شاہانہ نے اعتراف کیا کہ پہلے تجربے کے بعد اسے شادی اور مرد کے نام سے خوف آنے لگا تھا۔ کئی مرد اس کی طرف آئے لیکن اس کے دل نے ہاں نہ کی۔ مگر اب وہ اکیلے رہتے رہتے تھک گئی تھی۔ پھر اس نے اعتراف کیا کہ کریم کے لیے اس کے دل نے نہ نہیں کی تھی۔ وہ پہلے مرد تھے جن پر اسے اوّل لمحے سے اعتماد ہوگیا تھا۔ اس سے اگلی ملاقات میں کریم نے اسے پروپوز کر دیا اور اگلی بار شاہانہ نے ہاں کر دی۔

دونوں کے پاس وقت کم تھا اور دھوم دھام کا موقع بھی نہیں تھا اس لیے کریم نے صرف بیٹوں کو مطلع کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اعتراض کرتے انہوں نے شادی کی تاریخ بھی رکھ دی۔ نکاح اور رخصتی سادگی سے ہوئی۔ البتہ ولیمہ کریم نے اپنے معیار کے مطابق کیا اور اس میں خاص لوگوں کو مدعو کیا۔ کریم کے بچے اور دوسرے رشتے دار بھی بادلِ ناخواستہ شریک ہوئے تھے مگر انہیں کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ شاہانہ کے ساتھ شادی پر خوش تھے۔ پھر ایک ہی تقریب کی بات تو تھی۔ اس کے بعد سب کو اپنے اپنے گھر جانا تھا اس لیے کون خوش تھا اور کون نہیں، کریم نے دیکھا ہی نہیں۔ شاہانہ صرف جسمانی طور پر حسین نہیں تھی، اس میں سلیقہ طریقہ بھی تھا۔ چند دن میں اس نے کریم کا گھر یوں سنبھال لیا جیسے ہمیشہ سے یہاں رہتی آئی ہو۔ اس نے باورچی کی چھٹی کر دی تھی اور اپنے لیے ایک مددگار ملازمہ رکھ لی تھی۔ کھانا وہ بناتی تھی اور ملازمہ دوسرے کام نمٹاتی تھی۔

کریم کا خیال تھا کہ شاہانہ شادی کے وقت کچھ شرائط رکھے گی، کچھ سیکورٹیز مانگے گی لیکن اس نے نہ تو کوئی شرط رکھی اور نہ ہی سیکورٹی مانگی۔ کریم نے اس سے حق مہر پوچھا تو اس نے کہا تھا۔ ”آپ جو مناسب سمجھیں اور آسانی سے ادا کر دیں، مجھے آپ پر بوجھ ڈالنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ باقی مجھے کوئی فنانشل پرابلم نہیں ہے۔“

کریم نے مہر دس لاکھ روپے رکھا اور وہ منہ دکھائی سے پہلے ادا کر دیا تھا۔ منہ دکھائی میں انہوں نے خوب صورت سبز ہیرے کی انگوٹھی دی تھی۔ اس کا پتھر ہی پچاس لاکھ روپے کا تھا لیکن انہوں نے شاہانہ کو بتایا نہیں۔ اس شادی سے شاہانہ بھی بہت خوش تھی۔ اگر شاہانہ نے آکر ان کی زندگی کو رنگ و نور سے بھر دیا تھا تو انہوں نے بھی اسے جیسے پھولوں پر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے اسے فری ہینڈ دیا کہ گھر اور ان کے سلسلے میں وہ جو چاہے اور جیسے چاہے کرے۔ اس میں خرچ کی پروا نہ کرے۔ شادی کے دو ہفتے بعد وہ اسے ورلڈ ٹور پر لے گئے۔ دبئی، ترکی پھر انگلینڈ اور وہاں سے واپسی پر وہ پھر دبئی سے ہوتے ہوئے آئے۔ ہر جگہ

انہوں نے شاہانہ کا بہت خیال رکھا اور اس کی پسند کی ہر چیز اسے دلاتے رہے۔ واپسی پر روٹین لائف شروع ہوئی۔ سیٹھ کریم بہت دن دفتر سے دور رہے تھے اور بہت سے معاملات دیکھنا پڑ رہے تھے لیکن وہ پھر بھی دن میں کئی بار شاہانہ کو کال کرتے تھے اور شام جلد از جلد گھر آنے کی کوشش کرتے۔

بچے شروع میں خفا رہے لیکن جب انہوں نے ٹھنڈے دل سے سوچا اور باپ کی خوشی محسوس کی تو وہ بھی اس پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ شاہانہ ان سے اچھی طرح پیش آتی تھی۔ خاص طور سے علینا سے اس کے اچھے تعلقات بن گئے تھے اور کریم اس پر خوش تھے کیونکہ علینا ان کی چہیتی تھی۔ سیٹھ کریم نے اس طرف سے بھی سکون محسوس کیا تھا کہ ان کے بچے اب ان سے ناراض نہیں ہیں۔ اس کے لیے وہ شاہانہ کے شکرگزار تھے جس نے ذاتی کوشش کر کے انہیں پاس کیا تھا۔ شادی کے دوسرے مہینے انہوں نے شاہانہ کو نئی کار گفٹ کی۔ اس کی پرانی کار بھی تھی۔ اگر اسے کہیں جانا ہوتا تو خود چلی جاتی۔ کریم نے اس کے لیے ڈرائیور رکھنا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔ ”مجھے ڈرائیو کرنا اچھا لگتا ہے اور میں راستوں سے بھی واقف ہوں۔“

کریم نے دوبارہ اصرار نہیں کیا۔ شادی کے بعد انہیں لگا وہ جیسے پھر سے جوان نہیں ہوئے ہوں بلکہ پھر سے جی اٹھے ہوں۔ اس سے پہلے ان کی زندگی مردہ اور ڈل تھی مگر اب بھرپور ہو گئی تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگے تھے۔ شاہانہ ان کی ہر ضرورت کا پوری طرح خیال رکھتی تھی۔ ان کا ہر کام خود کرتی تھی۔ وہ ہر روز اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ انہیں شاہانہ ملی ہے۔

☆☆☆

کریم کام میں مصروف تھے کہ ان کے موبائل نے بیل دی۔ انہوں نے ایک نظر اسکرین پر دیکھا، اجنبی نمبر آ رہا تھا۔ عام طور سے انہیں نام سے کال آتی تھی، اجنبی نمبروں سے شاذ ہی کال آتی تھی۔ مگر ان کی عادت تھی کہ وہ ہر کال ریسیو کرتے تھے۔ سوائے اس وقت جب وہ سونے کے لیے لیٹتے تھے اور اس وقت موبائل آف کر دیتے تھے۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو کون بول رہا ہے؟“

”ہارون۔“ دوسری طرف سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔

سیٹھ کریم چند لمحے کے لیے ششدر رہ گئے۔ وہ پہچان گئے تھے، ہارون شاہانہ کے پہلے شوہر کا نام تھا اور وہ آخری فرد ہو سکتا تھا جس کی کال کی وہ توقع کر سکتے تھے۔

”مجھے پہچانا؟“

”ہاں۔“ کریم نے جوابی سرد مہری سے کہا۔ ”کیوں کال کی ہے؟“

”یہ بتانے کے لیے کہ میں تمہارے دفتر کے باہر موجود ہوں اور تم سے ملنے آ رہا ہوں۔ اگر مجھے روکا گیا یا تم نے ملنے سے انکار کیا تو میں وہ سب تمہارے ملازموں سے ضرور شیئر کروں گا جو میں صرف تم سے شیئر کرنے آ رہا ہوں۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”نہیں، اطلاع دے رہا ہوں۔“ ہارون کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تمہیں ہارٹ اٹیک ہو جائے اور شاہانہ اتنی جلدی نام نہاد بیوہ بن جائے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟“

”میں پانچ منٹ میں آ رہا ہوں۔ اپنے سیکریٹری سے کہو مجھے تمہارے کمرے میں پہنچا دے۔“ ہارون نے کہا اور کال کاٹ دی۔ کریم نے موبائل پٹخا تو انہیں احساس ہوا کہ ان کا سانس تیز چل رہا تھا اور اے سی کی خنکی میں بھی ان کے ماتھے پر پسینا آ گیا تھا۔ ان کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ انہوں نے گلاس میں رکھا پانی پیا اور رومال سے چہرہ صاف کر کے اپنے سیکریٹری سے انٹرکام پر رابطہ کیا۔

”ہارون نامی ایک شخص آ رہا ہے، اسے گارڈ سے چیک کرا کے میرے کمرے میں بھیج دو۔“

”یس سر۔“ سیکریٹری نے کہا۔ چند منٹ بعد اس نے کریم سے رابطہ کیا۔ ”سر! ہارون صاحب آ گئے ہیں۔ گارڈ نے کلیئر کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، اسے اندر بھیج دو۔“

دروازہ کھلا اور ایک جوان اور خوش شکل آدمی اندر آیا مگر وہ کریم کو نہایت برا اور مکروہ صورت لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چالاکی اور شرارت ٹپک رہی تھی۔ کریم نے اس کی آمد سے پہلے میز کے نیچے لگا ایک بٹن دبا دیا تھا۔ ایک طرف ایک خفیہ کیمرا لگا ہوا تھا جو نہ صرف ویڈیو بناتا تھا بلکہ اس کمرے میں لی جانے والی ہلکی سی سانس بھی ریکارڈ کر سکتا تھا۔ وہ اس بٹن کے دباتے ہی حرکت میں آ جاتا تھا۔ پینٹ شرٹ میں اس کا مضبوط جسم پھنسا ہوا لگ رہا تھا۔ کریم نے اسے بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی اور رکھائی سے بولے۔ ”میں مصروف آدمی ہوں، جو کہنا ہے مختصر الفاظ میں کہو۔“

جواب میں وہ کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”بات مختصر نہیں ہے۔“

سیٹھ کریم برہم ہو گئے۔ ”میں نے تمہیں بیٹھنے کو نہیں کہا ہے اور تم نے میری بیوی کے بارے میں کیا بکواس کی تھی؟“

”جو عورت پہلے سے شادی شدہ ہو اور دوسری شادی کر لے تو اس کے دوسرے شوہر کے مرنے پر اسے نام نہاد بیوہ ہی کہیں گے۔“

اس بار سیٹھ کریم چونک اٹھے۔ ”پہلے سے شادی شدہ... یہ بکواس ہے... تم نے اسے طلاق دے دی تھی۔“

”اگر میں نے اسے طلاق دی تھی تو اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت تو ہوگا۔“

کریم کو خیال آیا کہ ایسی کوئی چیز شاہانہ نے دکھائی ہی نہیں تھی اور دوسرے نکاح میں اس نے پہلے نکاح کا کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا ورنہ طلاق نامہ پیش کرنا پڑتا۔ کریم کا لہجہ کمزور ہو گیا۔ ”تم نے زبانی طلاق تو دی تھی۔“

”عدالتی معاملات میں کیا زبانی طلاق کی کوئی حیثیت ہوتی ہے؟ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ ہارون کا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا۔ ”لگتا ہے شاہانہ کے حسن نے تمہاری عقل کو گھاس چرنے بھیج دیا تھا اور تم نے اس سے پوچھا تک نہیں۔“

”اس نے بتایا کہ تم نے چار سال پہلے اسے طلاق دے دی تھی۔“

”اور تم نے مان لیا؟“ ہارون ہنسا۔ اس نے دفتر پر ایک نظر ڈالی۔ ”بہت شاندار دفتر ہے۔ میں نے تمہارا بزنس دیکھا ہے۔ تم یقیناً ایک ذہین شخص ہو ورنہ آج اس مقام پر نہ ہوتے۔ تم نے ایسی غلطی کیسے کی سیٹھ کریم۔“

کریم نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ شاہانہ تمہاری بیوی رہی ہے؟“

اس نے اپنے پاس موجود لفافے سے نکاح نامے کی کاپی نکال کر کریم کے سامنے رکھ دی۔ ”دیکھ لو، اس پر شاہانہ کے دستخط اور اس کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی موجود ہے۔ یہ نکاح آفس میں رجسٹرڈ ہے اور باقاعدہ رجسٹرڈ نکاح خواں نے پڑھایا تھا۔ نکاح آفس کے ریکارڈ میں شاہانہ آج بھی میری بیوی ہے۔ یہ تو ہوا قانونی ثبوت... اب کہو تو بتا دوں کہ شاہانہ کے بدن پر کہاں کہاں اور کتنے تل یا نشانات ہیں۔“

خود پر ضبط کرتے ہوئے کریم کو لگا کہ انہیں سچ مچ ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ ان کی میز کی دراز میں پستول موجود تھا اور ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پستول نکال کر اس شخص کو شوٹ کر دیں جو ان کی بیوی کے بارے میں ایسی بکواس کر رہا تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ یہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ وہ غور سے انہیں دیکھ رہا تھا اس بار وہ بولا تو اس کا لہجہ نرم تھا۔ ”سوری، شاید تمہیں شاہانہ کے حوالے سے میری بات بری لگی۔“

کریم نے ایک گلاس پانی اور پیا۔ رومال سے چہرہ صاف کیا اور بولے۔ ”ٹھیک ہے، تم کیا چاہتے ہو؟“

ہارون .... نے مصنوعی حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ”میں کیا چاہتا ہوں... مسٹر کریم! میں اپنی بیوی واپس چاہتا ہوں۔“

”وہ چار سال پہلے تمہاری بیوی تھی اور تمہارا اس سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میاں بیوی میں چار سال جدائی رہے یا بے شک چالیس سال جدائی رہے لیکن اس سے ان میں طلاق واقع نہیں...“

”تم اسے طلاق دے چکے ہو۔“ کریم کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”کوئی عورت ایسی بے حیا نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے اس سے غلطی ہوئی ہو کہ اس نے تم سے تحریری طلاق نامہ نہیں لیا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کس چکر میں یہاں آئے ہو۔“

ہارون مسکرانے لگا۔ ”تم جو چاہے سمجھ سکتے ہو۔ میرا مطالبہ صرف شاہانہ ہے۔“

”تمہیں کیا چاہیے منہ سے بولو... پانچ لاکھ... دس لاکھ...“

”بیس لاکھ... پچاس لاکھ...“ اس نے کریم کی بات کاٹ کر کہا۔ ”بس تمہارے نزدیک یہی قیمت ہے...“ وہ کہتے ہوئے آگے جھکا۔ ”مسٹر... مجھے اپنی بیوی واپس چاہیے... تمہارے پاس دو دن کی مہلت ہے... اس کے بعد میں عدالت جاؤں گا... تم اگر نہیں جانتے ہو تو اپنے وکیل سے پوچھ لینا کہ تم دونوں پر کون کون سے کیس بنیں گے۔“

ہارون جھٹکے سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اس نے نکاح نامے کی کاپی نہیں لی تھی۔ کریم بھائی کو چند سال پہلے انجائنا کی تکلیف ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے انہیں زبان کے نیچے رکھنے والی دوا دی تھی مگر تکلیف ختم ہو گئی تو انہوں نے دوا لینا بھی بند کر دی تھی۔ اس کے باوجود دوا ہمیشہ ان کی میز کی

دراز میں موجود رہتی تھی۔ اس وقت انہیں اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے دوا نکال کر زبان تلے رکھی اور کچھ دیر آنکھیں بند کر کے گہرے سانس لیتے رہے۔ جب حالت سنبھلی تو انہوں نے اٹھا کر نکاح نامہ دیکھا اور پھر اسے تہ لگا کر اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ وہ اٹھ کر باہر آئے اور سیکریٹری سے اپنے آج کے تمام اپائنٹ منٹ کینسل کرنے کا کہہ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاہانہ لاؤنج میں مل گئی۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی مگر کریم کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی۔

"کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہاں، کچھ پریشانی ہے۔" کریم نے اسے غور سے دیکھا۔ "تم بہت خوش لگ رہی ہو؟"

وہ مسکرائی۔ "میرے پاس بہت اچھی خبر ہے لیکن پہلے آپ بتائیے کہ آپ کیوں پریشان ہیں؟"

کریم اسے بیڈ روم میں لائے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ٹہلنے لگے۔ شاہانہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔ "آج ہارون میرے دفتر آیا تھا۔"

شاہانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "ہارون... آپ کا مطلب ہے..."

"ہاں وہی۔"

شاہانہ بپھر گئی۔ "آپ نے اسے دفتر میں آنے کیسے دیا؟ جوتے مار کر نکلوا دیتے۔"

"میں یہی کرتا لیکن وہ..." کریم کہتے کہتے رک گئے۔ "شاہانہ! یہ بتاؤ کہ اس نے تمہیں زبانی طلاق دی تھی یا لکھ کر دی تھی؟"

"زبانی۔" شاہانہ نے سادگی سے کہا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے، طلاق تو زبانی دی جائے یا لکھ کر... طلاق تو ہو جاتی ہے۔"

کریم نے سر پر ہاتھ مارا.... "تم معصوم ہو، تمہیں نہیں معلوم آج کل زمانہ کیسا ہو گیا ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو اس کا دعویٰ عدالت میں تسلیم کر لیا جائے گا کہ اس نے تمہیں طلاق نہیں دی ہے۔"

شاہانہ اب سمجھی اور دم بخود رہ گئی۔ "آپ... آپ کا مطلب ہے وہ ذلیل آدمی چار سال بعد یہ دعویٰ لے کر آیا ہے؟"

"ہاں، اس کے پاس نکاح نامے کی کاپی ہے۔" کریم نے بریف کیس سے کاپی نکال کر اسے دی۔ "رجسٹرار آفس میں تم بدستور اس کے نکاح میں ہو۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔" شاہانہ نے جنونی انداز میں نکاح نامے کی کاپی پھاڑ دی اور اس کے پرزے نیچے پھینک دیے۔ وہ کانپ رہی تھی۔ "کوئی تعلق نہیں ہے اس سے میرا... میں آپ کی بیوی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔" کریم نے اسے سینے سے لگایا تو وہ رونے لگی۔

"آج مجھے اتنی اچھی خبر ملی ہے اور آج ہی آپ یہ بات بتا رہے ہیں۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔

"کیا خبر ہے؟"

شاہانہ نے گہری سانس لی اور اپنا چہرہ صاف کر کے بولی۔ "میں... میں ماں بننے والی ہوں۔"

"سچ میں؟" کریم اچھل پڑے۔ "تم ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟"

"تب ہی تو آپ کو بتا رہی ہوں۔" شاہانہ کا موڈ ٹھیک ہونے لگا۔ "شادی کے بعد میں کتنی شدت سے انتظار کر رہی تھی کہ کب مجھے یہ خبر ملتی ہے۔"

کریم نے اپنی مسرت کا اظہار کیا تو شاہانہ شرما گئی۔ کچھ دیر کے لیے دونوں بھول گئے کہ کیا مسئلہ ان کے سر پر کھڑا ہے۔ جب جذبات اعتدال میں آئے تو انہیں یاد آیا۔ شاہانہ نے فکرمند ہو کر کہا۔ "وہ بہت ہی کمینہ اور گھٹیا شخص ہے۔"

"تم فکر مت کرو، میں اسے دیکھ لوں گا۔" کریم نے کہا۔

"اگر وہ عدالت میں چلا گیا تو ہماری کتنی بدنامی ہو گی۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" سیٹھ کریم نے اسے یقین دلایا۔

"آپ کیا کریں گے، پولیس سے بات کریں گے؟"

"نہیں، پولیس یا عدالت میں جانے سے ہمیں ہی مسئلہ ہو گا۔" کریم نے سوچا۔ "اسے عدالت سے باہر ہی خود نمٹانا ہو گا۔"

"کیا کریں گے آپ... جب وہ کچھ سننے کو تیار نہیں ہے؟" شاہانہ بولی۔ "وہ عدالت تک چلا گیا تو آپ اسے کیسے روکیں گے؟"

"میں کچھ کرتا ہوں۔" کریم نے اسے تسلی دی۔ "میرے پاس ایک طریقہ ہے، اس کا منہ بند کر دوں گا۔"

☆☆☆

ہارون موبائل پر شاہانہ سے رپورٹ لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم نے اپنا پارٹ ٹھیک سے ادا کیا ہے؟ بچے کا سن کر تو بڈھا دیوانہ ہو گیا ہو گا؟"

"ہاں۔" شاہانہ بولی۔ "لیکن ہارون... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے کہا ہے اس کے پاس ایک طریقہ ہے، تمہارا منہ بند کرنے کا۔"

"وہ رقم کی بات کر رہا ہو گا۔" ہارون نے کہا۔

"نہیں، سوچو... وہ کروڑ پتی نہیں ارب پتی ہے۔ اس کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ اگر اس نے اس طاقت کو تمہارے خلاف استعمال کر لیا تو؟... میں نے اس سے بار بار پوچھا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اگر رقم کی بات ہوتی تو وہ مجھے بتا دیتا۔"

ہارون بھی فکرمند ہو گیا۔ اس سے پہلے انہوں نے جن پانچ افراد کو پھانسا تھا، ان میں کوئی اتنا دولت مند نہیں تھا۔ کریم دیکھنے میں شریف ہی لگتا تھا مگر شاہانہ کی بات بھی درست تھی۔ اگر وہ دولت کے استعمال پر تل جاتا تو پولیس سے لے کر گلی کوچوں میں پھرنے والے ٹارگٹ کلرز تک... اس کے پاس بے شمار آپشن ہوتے۔ ہارون بنیادی طور پر بزدل آدمی تھا۔ اس نے شاہانہ سے کہا۔ "تم کیا کہتی ہو؟"

"میرا مشورہ ہے کہ اب اس کے سامنے مت جانا، فون پر بات کرنا اور یہ سم بھی بند کر دو۔ یہ تمہارے نام پر ہے نا؟"

"میں نے ہزار روپے دے کر ایک شخص سے لی تھی۔"

"پھر جب اس سے بات کرنا ہو تب سم آن کرنا۔"

"اس سے لمبی رقم نکلوانی ہے۔" ہارون نے اپنے اندیشے جھٹک دیے۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ یہ آخری بار ہے۔" شاہانہ نے کہا۔ "میں اب تھک چکی ہوں۔"

"بالکل، یہ آخری بار ہے اور پھر ہم یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔" ہارون نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔ لیکن وہ ہر بار ایسے ہی یقین دلاتا تھا۔ وہ چکر باز آدمی تھا۔ اس کا اور شاہانہ کا تعلق سات سال سے زیادہ پرانا تھا۔ انہوں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی۔ شاہانہ ایک اچھے خاندان کی لڑکی تھی مگر وہ کم عمری کی جذباتیت میں آ کر ہارون کے ساتھ بھاگ نکلی۔ انہوں نے شادی کر لی تھی مگر ہارون کو گھر گرہستی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا اصل مقصد دولت کمانا اور عیاشی کرنا تھا۔ وہ مختلف شہروں میں رہے اور ہر جگہ انہوں نے ایسے ہی چکر چلائے۔ شاہانہ اس کی بات ماننے پر مجبور تھی کیونکہ وہ گھر واپس جا نہیں سکتی تھی ورنہ اس کے بھائی اسے زندہ دفن کر دیتے۔ ہارون نے اسے جس لائن پر لگایا تھا، وہ اسی پر چلنے پر مجبور تھی۔ انہوں نے بہت دولت جمع کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ہارون کے کئی دھندے تھے جن سے وہ اچھا کماتا تھا۔ شاہانہ اس کی آلۂ کار بنتے بنتے تنگ آ چکی تھی۔ اب اس کا کہنا تھا کہ وہ دونوں باہر جائیں گے اور یہ آخری کام ہو گا۔

☆☆☆

سیٹھ کریم مسلسل کوشش کر رہے تھے لیکن وہ نمبر بند جا رہا تھا جس سے کل ہارون نے کال کی تھی۔ اس نے دو دن کی بات کی تھی، گویا ان کے پاس کل تک کی مہلت تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ کس حد تک جا سکتے تھے اور ہارون کہاں ٹوٹتا؟ مایوس ہو کر انہوں نے کام پر توجہ دینے کی کوشش کی مگر ان کا ذہن آمادہ نہیں تھا۔ تنگ آ کر انہوں نے تمام فائلیں ایک طرف رکھ دیں اور مانیٹر کی اسکرین بند کر دی۔ انہوں نے سیکریٹری سے بھی کہہ دیا کہ کوئی ان سے نہ ملے اور انہیں کوئی کال ٹرانسفر نہ کی جائے۔ وہ بار بار موبائل کی طرف دیکھتے تھے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جب بھی کال آتی، انہیں پتا چل جاتا مگر وہ اپنی ساری زندگی میں اتنا مضطرب نہیں ہوئے تھے جتنا کہ اس وقت تھے۔ انہیں رہ رہ کر شاہانہ اور اپنے ہونے والے بچے کا خیال آ رہا تھا۔ اگر یہ منحوس شخص درمیان میں نہ آیا ہوتا تو وہ یہ خوشی منا رہے ہوتے۔ وہ پریشان ضرور تھے لیکن ساتھ ہی انہیں یقین تھا کہ وہ اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔ اچانک موبائل کی بیل بجی تو وہ چونکے اور انہوں نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا مگر شاہانہ کا نام دیکھ کر انہیں کچھ مایوسی ہوئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ شاہانہ نے پوچھا۔

"اس کی کال آئی؟"

"نہیں، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"میں نے کہا نا، تم فکر مت کرو... میں سب سنبھال لوں گا۔" کریم نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "شاہانہ! اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلا تو مجھے انگلیاں ٹیڑھی کرنی بھی آتی ہیں۔"

شاہانہ خاموش رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ سے شادی کے بعد میں نے خود کو محفوظ اور خوش

محسوس کیا ہے۔ میں یہ خوشی اور تحفظ کھونا نہیں چاہتی۔"
"ایسا نہیں ہوگا۔" کریم نے کہا اور کال کاٹ دی۔
ابھی وہ موبائل رکھ رہے تھے کہ ہارون کی کال آگئی۔ انہوں نے یہ نمبر محفوظ کرلیا تھا اس لیے اسکرین پر اس کا نام آرہا تھا۔ انہوں نے ذرا توقف کے بعد کال ریسیو کی اور رکھائی سے بولے۔ "ہیلو، کون ہے؟"
"تم اچھی طرح جانتے ہو۔" دوسری طرف سے ہارون کی آواز آئی۔ "سیٹھ کریم! ہنومت... تم میری کال کا انتظار کررہے تھے۔"
"کام کی بات کرو۔"
"وہ تو تم کروگے... بولو کیا فیصلہ کیا ہے؟"
"کیسا فیصلہ؟"
"یہی کہ تم شاہانہ کو واپس کررہے ہو یا نہیں...؟"
"یہ ممکن نہیں ہے، وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"
ہارون ہنسا۔ "تب تو میرا کیس اور مضبوط ہوگا۔ ابھی تو تم دونوں مکر سکتے تھے مگر اس بچے سے تو انکار نہیں کرسکو گے۔"
"ہارون! تم میرے دفتر آؤ، ہم مل بیٹھ کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالتے ہیں۔ عدالت جانا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں بدنام ہوں گا اور ہم مشکل میں پڑ جائیں گے لیکن تمہارا مقصد پھر بھی پورا نہیں ہوگا۔"
"تم دونوں صرف بدنام نہیں ہوگے بلکہ تمہارے خلاف حدود آرڈی نینس کے تحت مقدمہ بنے گا۔"
"یہ بھی بھول جاؤ... میرے پاس دولت ہے، میں بڑے سے بڑا وکیل کرسکتا ہوں۔ تم جھوٹ بول سکتے ہو تو میں گواہوں سے جھوٹ بلوا سکتا ہوں۔ میں ثابت کردوں گا کہ تم نے شاہانہ کو طلاق دی تھی۔"
"مسٹر کریم بھائی... یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔" ہارون نے سرد لہجے میں کہا۔ "دولت میرے پاس بھی ہے اور بڑا وکیل میں بھی کرسکتا ہوں جو تمہارے گواہوں کی دھجیاں بکھیر دے گا۔"
"اس پر معاملہ برسوں چلے گا۔"
"کیوں نہیں، میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ اگر شاہانہ مجھے واپس نہیں ملی تو وہ اور تم بھی سکون سے نہیں رہوگے۔ یہ میڈیا کا دور ہے، ہر چینل پر یہ کیس آئے گا۔"
کریم بھائی سوچ رہے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ان کی ساکھ کا کیا ہوگا؟ اس بار ان کا لہجہ دھیما تھا۔ "دیکھو، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں عدالت جانا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہم مل بیٹھ کر اس کا کوئی اور حل نکالتے..."
"مل بیٹھنے کی بات بھول جاؤ۔" اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "اب ہماری بات فون پر ہوگی۔"
"اوکے، فون پر بات کرتے ہیں۔" کریم نے بحث سے گریز کیا۔ "تمہارے ذہن میں کچھ تو ہوگا کہ اس کا کوئی متبادل حل ہوسکتا ہے۔ شاہانہ کی واپسی کے علاوہ ہم ہر حل پر بات کرسکتے ہیں۔"
ہارون خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "میرے ذہن میں تو کوئی اور حل نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی بیوی واپس لے جاؤں گا۔ تم کہو اگر تمہارے ذہن میں کوئی اور حل ہے؟"
"میں نے تمہیں رقم کی آفر کی تھی، وہ اب بھی برقرار ہے۔"
"تم کیا دے سکتے ہو؟" اس بار ہارون کے لہجے میں لالچ چھپا نہیں رہا تھا۔ "تم ارب پتی آدمی ہو، ممکن ہے اس سے بھی زیادہ دولت مند ہو۔"
"تم یہ چھوڑو کہ میں کتنا دولت مند ہوں، تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ۔"
"دو کروڑ روپے۔" ہارون نے کہا۔ "اگر تم مجھے دو کروڑ روپے دے دو تو میں اپنے مطالبے سے دست بردار ہوجاؤں گا۔"
"یہ بہت بڑی رقم ہے۔"
"تمہارے لیے نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے اس سے زیادہ تو تم ایک مہینے میں کما لیتے ہوگے۔"
سیٹھ کریم کی آمدنی سچ مچ اس سے زیادہ ہی تھی۔ وہ ہول سیلر تھے اور آئے دن قیمتیں بڑھنے سے زیادہ فائدہ انہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ مخصوص قیمت پر بے شمار کمپنیوں سے پورے چھ مہینے کے سودے کرتے تھے اور چھ مہینے تک مال انہیں اسی قیمت پر ملتا تھا، چاہے مارکیٹ میں قیمت کچھ بھی ہوچکی ہو۔ اس لیے خراب کاروباری حالات کا ان پر زیادہ اثر نہیں ہوا تھا۔ سیل کم ہوتی تھی تو قیمت بڑھنے سے خود بہ خود اس کا ازالہ ہوجاتا تھا۔ ان کے خیال میں اگر دو کروڑ دے کر ان کی ہمیشہ کے لیے ہارون سے جان چھوٹ رہی تھی تو یہ برا سودا نہیں تھا۔ اس لیے وہ مان گئے۔ "ٹھیک ہے لیکن مجھے اسٹامپ پیپرز پر طلاق چاہیے۔"
"میں دے دوں گا۔"
"ایسے نہیں۔" کریم نے کہا۔ "پیپرز میں خود بنواؤں گا اور تم اپنے تصدیق شدہ سائن کروگے اور منہ سے بھی دو گواہوں کے سامنے طلاق دوگے... اور یہ سارا پروسیس میرے دفتر میں ہوگا۔"
"میں سامنے نہیں آؤں گا۔" ہارون نے پھر انکار کیا۔
"تو کیا تم پیپرز پر سائن بھی کال پر کروگے؟" کریم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"نہیں، تم رقم دے کر شاہانہ کو بھیجوگے..."
"وہ نہیں آئے گی۔" کریم بھائی بولے۔
"جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔" ہارون کا لہجہ سخت ہوگیا۔ "ورنہ میں فون بند کردوں گا اور پھر ہماری عدالت میں ملاقات ہوگی۔"
"ٹھیک ہے، تم بات کرو۔"
"رقم اور پیپرز شاہانہ لے کر آئے گی۔ رقم ڈالرز میں ہوگی اور وہ اس بینک میں آئے گی جہاں میں اسے بلاؤں گا۔ وہاں بینک منیجر کے سامنے میں پیپرز سائن کروں گا اور وہ سائن کی تصدیق کرے گا۔ اس کے بعد شاہانہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کرائے گی۔ اکاؤنٹ نمبر بھی اسی وقت بتا دوں گا۔"
سیٹھ کریم متفکر ہوگئے۔ "اگر بینک منیجر تمہاری طرف سے گواہ ہوگا تو وہ بعد میں بھی تمہارا فیور کرے گا؟"
"وہ صرف سائن کی تصدیق کرے گا۔" ہارون نے کہا۔ "تم جانتے ہو، وہ بینک ملازم ہوگا اور ایسے کسی چکر میں نہیں پڑے گا۔ تمہارا کام ہوجائے گا۔ اصل اہمیت پیپرز پر سائن کی ہوگی۔"
سیٹھ کریم اس تجویز پر سوچ رہے تھے۔ "شاہانہ کے ساتھ میں بھی آؤں گا۔"
"وہ اکیلی آئے گی۔" ہارون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں کل اسی وقت کال کروں گا، اگر تم نے دو کروڑ روپے کرلیے ہوں اور میری شرط مان لی ہوگی تو بات آگے چلے گی ورنہ معاملہ عدالت میں جائے گا۔"
ہارون نے کال کاٹ دی۔ سیٹھ کریم نے نمبر ملایا تو وہ بند جارہا تھا۔ اس نے نہایت چالاکی سے منصوبہ بنایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ پہلے ہی مسئلے کے مالی حل کے لیے تیار تھا۔ اس لیے جیسے ہی سیٹھ کریم تیار ہوئے، اس نے اپنا منصوبہ سامنے رکھ دیا۔ اگرچہ سارا کام ایک بینک میں تکمیل پاتا لیکن اس کے باوجود سیٹھ کریم کو خدشہ تھا کہ ہارون کوئی شرارت نہ کرجائے۔ وہ غلط سائن کرسکتا تھا اور بعد میں منیجر کسی طرح اس کی ذمے داری نہ لیتا کیونکہ اس کا بینک کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑ گیا تھا۔ سیٹھ کریم نے بے دلی سے کچھ دفتری کام

اہم محرکات

☆ دنیا کی طویل ترین نظم "مہابھارت" ہے۔
☆ ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کا نام "لٹل بوائے" تھا۔
☆ ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بم کا نام "فیٹ مین" تھا۔
☆ ایتھوپیا کا پرانا نام حبشہ ہے۔
☆ سعودی عرب کے شہزادہ سلیمان السعود پہلے مسلمان خلاباز ہیں۔
☆ 16 جولائی 1945ء کو نیو میکسیکو کے صحرا میں پہلا ایٹمی تجربہ کیا گیا۔
☆ میجر عزیز بھٹی شہید، ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے۔

☆☆☆

☆ اردو ادب کا پہلا ناول ڈپٹی نذیر نے "مراۃ العروس" کے نام سے لکھا تھا۔
☆ اردو ادب کے پہلے شاعر امیر خسرو تھے۔
☆ اردو ادب میں سب سے پہلے آپ بیتی، خواجہ حسن نظام نے لکھی۔
☆ اردو ادب میں پہلا افسانہ منشی پریم چند نے لکھا۔
☆ اردو ادب کی پہلی رباعی "ملا وجہی" نے لکھی۔
☆ اردو ادب کا سب سے طویل ناول "علی پور کا ایلی" ہے۔
☆ ترکی کے کمال اتاترک پاشا نے "ری پبلکن پیپلز پارٹی" کے نام سے سیاسی جماعت بنائی تھی۔
☆ برطانیہ واحد ملک ہے جس کا آئین تحریری نہیں۔
☆ پاکستان میں، 1988ء میں اوجڑی کیمپ میں اسلحہ ڈپو میں آگ لگی تھی جس سے سیکڑوں لوگ ہلاک اور کروڑوں کا مالی نقصان ہوا۔
☆ پاکستان کی سب سے بڑی جنگی مشق "ضرب مومن" کے نام سے 1989ء میں ہوئی۔

محمد شایان سعید، شیخوپورہ

نمٹائے۔ اس دوران میں انہوں نے شاہانہ کو مختصراً بتایا کہ ان کی ہارون سے بات ہوئی ہے اور پوری بات وہ گھر آ کر بتائیں گے۔ وہ شام کو جلدی اٹھ گئے۔ گھر میں شاہانہ بے تابی سے ان کی منتظر تھی۔ وہ انہیں دیکھتے ہی لپکی۔

"کیا ہوا... کیا بات ہوئی؟"

"بتاتا ہوں۔" انہوں نے ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ "بالآخر اس تھیلے سے بلی نکل آئی۔"

شاہانہ نے سر ہلایا۔ "میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ وہ لالچی آدمی ہے اور اب تک یوں خاموش تھا کہ میں نے کسی سے شادی نہیں کی تھی۔ جیسے ہی میں نے آپ سے شادی کی اور اس نے محسوس کیا کہ آپ اسے رقم دے سکتے ہیں، وہ کھل کر سامنے آ گیا۔"

کریم نے شاہانہ کو بتایا کہ ہارون نے کیا مطالبہ کیا تھا اور اسے کیسے پورا کرنے کو کہا تھا۔ "اب وہ کھل کر سامنے آیا ہے اس لیے میں بھی اس سے اپنی بات منواؤں گا۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ تمہارے ساتھ میں جاؤں گا۔"

"اگر وہ نہ مانا تو...؟"

"تب میں دیکھ لوں گا۔"

شاہانہ نے کریم کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "آپ اس کی بات مان لیں... میں دیکھ لوں گی۔ میں صرف سائن نہیں لوں گی بلکہ اس پیپرز پر اس کے انگوٹھے کے نشانات بھی لے لوں گی۔ وہ سائن سے مکر سکتا ہے، اپنے انگوٹھے کے نشانات سے تو نہیں مکر سکتا۔"

کریم نے محبت سے اسے دیکھا۔ "میں تمہیں اکیلے نہیں بھیج سکتا... مجھے فکر رہے گی۔"

شاہانہ نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ "مجھے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ اول ہم بینک میں ہوں گے اور پھر مجھے اپنی حفاظت کرنی آتی ہے۔ آخر اتنے عرصے میں ایسے ہی تو اکیلی نہیں رہی ہوں۔"

کریم کا دل نہیں مان رہا تھا مگر شاہانہ نے ان سے منوا لیا کہ وہ رقم لے کر جائے گی اور ہارون سے طلاق کے کاغذات پر دستخط کرا کے لائے گی۔ اگلے دن انہوں نے ہارون کی کال آنے پر اسے بتایا کہ وہ راضی ہیں۔ دو کروڑ روپے کے مساوی تقریباً دو لاکھ ڈالرز تیار ہیں۔ ہارون نے کہا کہ کل صبح شاہانہ یہ رقم لے کر اپنی کار میں نکلے۔ وہ اسے کال کر کے بتائے گا کہ اسے رقم کس بینک میں لانی ہے۔

☆☆☆

شاہانہ اور ہارون کسی بینک میں نہیں بلکہ اس اعلیٰ درجے کے ریستوران میں بیٹھے تھے۔ صبح کا وقت تھا اور لوگوں کا رش بھی ختم ہو چکا تھا اس لیے اب وہاں بہت کم لوگ تھے۔ وہ ایک کونے کی میز پر تھے، یہاں روشنی بھی کم تھی۔ ہارون نے شاہانہ سے پہلا سوال کیا۔ "رقم کہاں ہے؟"

شاہانہ پہلے آئی تھی اور ہارون اس کے بعد آیا تھا۔ اس نے آتے ہی دیکھ لیا تھا کہ شاہانہ کے پاس ایسا کوئی بیگ یا چیز نہیں تھی جس میں دو لاکھ ڈالرز رکھے جا سکتے ہوں۔ شاہانہ نے اس کے سامنے طلاق نامے کے اسٹامپ پیپرز رکھ دیے۔ یہ سیٹھ کریم نے خاص طور سے بیک ڈیٹ کا لیا تھا۔ ہارون چونکا اور اس نے بے یقینی سے کہا۔ "یہ کیا... تم سچ مچ...؟"

"ہاں، تم مجھے سچ مچ طلاق دو گے۔ اگرچہ تم مجھے زبانی طلاق دے چکے ہو۔"

"وہ میں نے تمہاری تسلی کے لیے دی تھی۔" ہارون بولا۔ "ہم دوبارہ شادی کر سکتے ہیں۔"

"نہیں، میں اب ایسا نہیں چاہتی۔" شاہانہ نے انکار کیا۔

ہارون کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"کیوں، کیا اس لیے کہ کریم بھائی ایک دولت مند شخص ہے... جو آرام سے دو کروڑ روپے کسی کے منہ پر مار سکتا ہے... بڈھا ہے تو کیا ہوا؟"

"نہیں، بلکہ اس لیے کہ کل دبئی جانے والی فلائٹ میں تمہاری سیٹ بک ہے۔" شاہانہ نے کہا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "ہارون! صرف تمہاری..."

شاہانہ کی بات پر ہارون کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

"تت... تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"آج کے دور میں کوئی بات معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ یہ آخری کام ہو گا اور اس کے بعد تم چپکے سے فرار ہو جاؤ گے۔ ساری رقم پہلے ہی تمہارے پاس تھی۔ میں یہاں خالی ہاتھ بے یار و مددگار رہ جاتی۔"

ہارون نے خود پر قابو پا لیا اور ڈھٹائی سے بولا۔ "او کے، اب تم بے یار و مددگار نہیں رہو گی۔ تمہارے پاس کریم جیسا شوہر ہے جو بہت دولت مند ہے۔"

"ہاں، وہ بہت دولت مند ہے لیکن اس کی دی ہوئی سب سے قیمتی چیز یہ ہے۔" شاہانہ نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔ ہارون کو جھٹکا لگا۔

"تم... تم... سچ مچ؟"

"ہاں، یہ سچ ہے اور اسی سچ نے مجھے بدل دیا۔ مجھے اپنی پروا نہیں ہوتی لیکن مجھے اپنے بچے کے لیے باپ کا سایہ چاہیے اور اس کی وجہ سے میں کریم جیسے معصوم آدمی کو دھوکا دینے سے بھی بچ جاؤں گی۔"

"اچھا، وہ معصوم آدمی ہے؟ تبھی تمہارے دام میں آ گیا۔" ہارون کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"اس کے باوجود وہ معصوم شخص ہے۔ اس نے مجھ پر آنکھ بند کر کے اعتماد کیا۔"

"اگر اسے معلوم ہو گیا کہ تم ماضی میں کیا کرتی آئی ہو... تو کیا تب بھی اس کا اعتبار برقرار رہے گا؟" ہارون کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"شاید رہے یا شاید نہ رہے۔" شاہانہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مگر اس سے تمہیں بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ آج سے ہمارے راستے الگ ہیں۔ ان پیپرز پر سائن کر دو اور اپنے لیفٹ تھمب کا نشان بھی لگاؤ۔" اس نے پین اور انک پیڈ سامنے رکھ دیا۔

ہارون کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "کیا میں اس کے لیے مجبور ہوں؟"

"ہاں اگر تمہارا اشارہ رقم کی طرف ہے تو وہ موجود ہے لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھے باقاعدہ طلاق دینا ہوگی۔"

اس بار ہارون کا انداز بدل گیا۔ "کہاں ہے رقم؟"

"سائن کرو اور نشان لگاؤ... میں تمہیں رقم دے کر جاؤں گی۔"

ہارون کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے پین اٹھایا اور تمام جگہوں پر سائن کر دیے۔ پھر اس نے انک پیڈ پر بایاں انگوٹھا لگا کر اسے سائن کے ساتھ لگایا۔ اس نے پیپرز شاہانہ کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے انہیں غور سے دیکھا اور مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اس نے اسے اپنے بیگ میں رکھا اور کھڑی ہو گئی۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اسے لے کر بینک... میں آئی اور منیجر سے بیگ طلب کیا۔ اس نے رقم والا بیگ اس کے سیف میں رکھوایا تھا۔ منیجر اسے جانتا تھا۔ اس نے بیگ نکال کر اسے دیا۔ وہ دونوں واپس آئے اور ہارون نے میز پر بیٹھ کر بیگ کھول کر رقم دیکھی۔ مطمئن ہو کر اس نے اسے بند کیا۔ "یعنی یہ ہماری آخری ملاقات ہے؟"

"بالکل... تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اب اس شہر میں نظر نہ آؤ۔"

ہارون مسکرایا اور کھڑا ہو گیا۔ "ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن مجھے یہاں واپس آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

اس کے جانے کے بعد شاہانہ بھی گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے جان بوجھ کر ہارون کو ڈرایا تھا کہ وہ سیٹھ کریم سے نہ ملے۔ وہ خود رقم دینے آئی تھی۔ اسے سچ مچ کریم سے محبت ہو گئی تھی اور اب وہ اس کی بیوی رہنا چاہتی تھی۔ وہ گھر واپس آئی تو کریم نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ شاہانہ نے آنکھیں بند کر کے سوچا، اب یہی اس کا سب کچھ ہے۔ سیٹھ کریم بہت خوش تھے۔ انہیں دو کروڑ روپے کا ذرا بھی غم نہیں تھا، وہ خوش تھے کہ اب شاہانہ کو ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ صبح ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے برابر میں لیٹی شاہانہ کو محبت سے دیکھا اور اس کے بکھرے بال ٹھیک کیے۔ پھر انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ آٹھ بجے ایک فلائٹ دبئی کے لیے پرواز کرے گی۔ ائرپورٹ پر ایک کسٹم آفیسر ہارون کے سامان کی تلاشی کے دوران اس میں ایک چھوٹا سا پیکٹ رکھتا اور سامان کلیئر قرار دیتا۔ کچھ دیر بعد جب یہ سامان دبئی میں چیک ہوتا تو وہاں اس سے ہیروئن نکلتی۔

سیٹھ کریم صرف گھر کی حد تک سادہ تھے۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو وہ بہت اسمارٹ اور چالاک ہو جاتے تھے۔ شاہانہ سے شادی کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں پوری طرح چھان بین کی تھی اور وہ سب جان گئے تھے۔ مگر انہوں نے شاہانہ کو کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اپنے طرزِ عمل میں کوئی فرق آنے دیا۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ تھیلے سے کون سی بلی باہر آتی ہے۔ وہ شاہانہ سے محبت کرتے تھے اور اسی لیے بغیر کسی تفتیش کے انہوں نے اس سے شادی کر لی تھی۔ یہ خیال تو انہیں بعد میں آیا۔ اگر شاہانہ انہیں دھوکا دیتی تو دبئی میں منشیات اسمگلنگ کیس میں ہارون کے ساتھ ہی گرفتار ہوتی۔ مگر اس نے ان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شاہانہ کے اس فیصلے کے صدقے انہوں نے اس کا ماضی معاف کر دیا تھا۔ باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے سوچا کہ ماضی کو دفن کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

قسط :56
اسماقادری
ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں
لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے
روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ
جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ
ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح
ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی
روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایکجیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے
جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے -
پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو-محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں
میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی
ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ
اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے
دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ
بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے
... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا
ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور
کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی
لامتناہی سلسلہ
تقدیر کی فسوں گری،
قسمت کی چالبازی یا
مقدر کا کھیل ..... ملنے اور
بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے ایک گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ چودھری کی بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کرلیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں دم توڑ دیتی ہے۔ ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلا دی جاتی ہے۔ شہریار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہوجاتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک چودھری سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ جاوید علی، را کے چندر سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو مینہ را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو گرفتار کرلیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہریار اندر اور اس کے اہلکاروں پر قابو پالیتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کردیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ شہریار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ شہریار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو را کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تاہم انہیں عارضی طور پر عائشہ نامی عورت کے گھر پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسلم، ماہ بانو کو قید کرنے والوں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی ماہ بانو کے ساتھ قید کرلیا جاتا ہے۔ تاہم وہ ایڈی کی مدد سے قید سے نکل جاتا ہے اور مارک اور دیگر افراد پر قابو پا کے ماہ بانو کو وہاں سے نکال لاتا ہے۔ شہریار، سلو اور ڈاکٹر فرحان ممبئی پہنچ جاتے ہیں اور بھائی جی کے ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں اور اشوک کو مارنے کا پروگرام بناتے ہیں اور اسے ختم کردیتے ہیں۔ ادھر میجر ذیشان، مشابرم خان کو آئرلینڈ بھیجتا ہے تاکہ وہ ماہ بانو اور اسلم کو بازیاب کرا سکے۔ جاوید علی اور سلمان بھارتی حدود میں جا کر فروٹ فارم پر موجود اسلحہ تباہ کردیتے ہیں۔ اسلم جنگل میں سفر کے دوران پروفیسر ہنری کی بائیک کی آواز سن کر اس کا تعاقب کرتا ہے اور دونوں لڑائی کے دوران دلدل میں گر جاتے ہیں۔ ماہ بانو ایڈی کی مدد سے جنگل سے نکل کر کشور تک پہنچ جاتی ہے۔ ادھر شہریار کو را والے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور تشدد کا ہر حربہ آزماتے ہیں۔ سلو کا نریز بھنّا گر سلو کے بارے میں استفسار کرتا ہے تاہم شہریار زبان نہیں کھولتا۔ شہریار کی بے ہوشی کے دوران سلو وہاں پہنچ جاتا ہے اور وہ اور شہریار مل کر را کے تمام اہلکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ تاہم وہ اس جگہ سے نکلنے کا راستہ نہیں ڈھونڈ پاتے۔ اسی دوران میں بھنّا گر وہاں پہنچتا ہے لیکن وہ مین گیٹ سے ہی اپنی گاڑی واپس لے جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بھنّا گر سے بچنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے، یہ سوال پوری شدت سے ان دونوں... کے ذہنوں میں چکرا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ خود بھنّا گر ان تک پہنچنے کے لیے کیا طریقہ کار استعمال کرے گا۔ بظاہر عمارت میں داخلے کا ایک ہی راستہ تھا چنانچہ وہ اس راستے کے سامنے مورچا بند ہوسکتے تھے لیکن زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ یہاں داخلے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہوسکتا ہے جہاں سے بھنّا گر خود اکیلا یا اپنے ساتھیوں سمیت اندر داخل ہوتا اور چپکے سے ان پر قابو پالیتا۔ یہ خفیہ راستہ کہاں ہوگا، وہ نہیں جانتے تھے۔ پھر ایک امکان یہ بھی تھا کہ انہیں زندہ گرفتار کرنے کے بجائے عمارت میں کوئی زہریلی گیس وغیرہ چھوڑ کر وہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن اس امکان کی امید ذرا کم ہی تھی۔ ایک تو اتنی بڑی جگہ گیس کی مدد سے کسی کو ختم کرنا آسان نہیں تھا، دوسرے را والے خواہش مند تھے کہ ان پر قابو پا کر ان سے معلومات حاصل کی جائیں۔ ابھی تک بھنّا گر نے اس سے پوچھا نہیں تھا لیکن شہریار کو اندازہ تھا کہ ڈاکٹر فرحان جمیل کے متعلق بھی ان سے جاننے کی کوشش کی جائے گی۔

”ذرا کمپیوٹر پر توجہ دو۔ اگر عمارت کے اندر بھی کیمرے لگے ہیں تو کمپیوٹر کی مدد سے ہر حصے پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔“ سلو نے سوچ بچار کے بعد مضطرب..... لہجے میں شہریار سے فرمائش کی..... وہ جلدی جلدی کی پیڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔ سلو کا اندازہ درست تھا۔ مین گیٹ کی طرح عمارت کے مختلف حصوں کا بھی یہاں بیٹھے بیٹھے جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ انہیں وہ برآمدہ بھی نظر آیا جہاں سلو نے ایک محافظ پر قابو پا کر اس سے معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ آپریشن روم میں ڈیوٹی پر موجود افراد نے تساہل سے کام لیا اور نگرانی کا فریضہ ڈھنگ سے انجام نہیں دیا ورنہ وہ بہت پہلے ہی پھنس چکے ہوتے۔

”یہاں صرف کوریڈورز نظر آرہے ہیں۔ کمروں کے اندر کیا صورتِ حال ہے، معلوم نہیں چل سکتی۔“

”اتنا بھی بہت ہے۔ وہ عمارت کے کسی بھی حصے سے اندر داخل ہو، ہم تک پہنچنے کے لیے کوریڈور سے تو گزرنا ہی پڑے گا۔“ سلو نے اس کی بات کا جواب دیا ہی تھا کہ اسکرین پر سے اس کوریڈور کا منظر غائب ہوگیا جہاں محافظ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

”وہ آگیا ہے اور اس نے کیمرے کو ناکارہ بنا دیا ہے۔“ سلو سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ بھنّا گر کو ان پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ وہ اس عمارت کے چپے چپے سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ آپریشن روم میں عمارت کے مختلف مناظر دکھانے والے کیمروں کو کہاں کہاں نصب کیا گیا ہے اس لیے اس نے اندر داخل ہوتے ہی ایک کیمرے کو ناکارہ بنا دیا تھا اور وہ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

”اسے اندازہ ہوگا کہ ہم یہاں ہیں اس لیے بہتر ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔“ دوسرا کیمرا بھی ناکارہ بنا دیا گیا تو سلو نے فیصلہ کرلیا اور اس فیصلے پر تیزی سے عمل درآمد بھی کیا گیا۔ البتہ اس سے قبل پوری عمارت کی روشنیاں بجھانا وہ نہیں بھولے تھے۔ ہتھیار انہوں نے مرنے والوں سے پہلے ہی ہتھیا لیے تھے اور اب گھپ اندھیرے میں چوہے بلی کا کھیل جاری تھا۔ دونوں طرف کے لوگ ہی اتنے ہوشیار تھے کہ کہیں کسی کے حرکت کرنے سے کوئی آہٹ پیدا نہیں ہورہی تھی۔ شہریار اور سلو دونوں نے ہی دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتے ہوئے اس جگہ پوزیشن سنبھال لی تھی جہاں کوریڈور ایل کی شکل میں مڑ رہا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ بھنّا گر ان کی تلاش میں آپریشن روم کا رخ ضرور کرے گا اس لیے وہیں رہنا ضروری سمجھا۔ جب آپریشن روم کے کھلے دروازے سے کوئی چیز اندر اچھال کر دروازہ تیزی سے بند کیا گیا تو انہیں اندازہ ہوگیا کہ بھنّا گر وہاں پہنچ چکا ہے۔

وہ ان کے قریب سے اتنی خاموشی سے گزرا تھا کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوسکی تھی۔ یقیناً خود اس نے بھی ان کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا اور وہ اس کی آپریشن روم کے پاس موجودگی کو صرف اس وجہ سے جان پائے تھے کہ اندر اچھالی جانے والی شے نے کسی چیز سے ٹکرا کر ہلکی سی آواز پیدا کی تھی اور دروازے کو تیزی سے بند کرنے کی وجہ سے بھی خفیف سی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ سلو نے اس آہٹ پر ... پھرتی سے برسٹ دے مارا۔ فوراً ہی جوابی فائرنگ ہوئی اور گولیاں عین اس دیوار سے آکر ٹکرائیں جس سے سلو چپکا کھڑا تھا۔ اگر اس نے فائر کرکے وہاں سے ہٹنے میں ذرا بھی تاخیر کی ہوتی تو اس کا انجام برا ہوتا۔ بھنّا گر نے فائر کی آواز پر نہایت سچا نشانہ لیا تھا۔ سلو نے بھی اسی جیسی مہارت کا مظاہرہ کیا اور اپنی پوزیشن تبدیل کرتے ہی فائر کی آواز پر نشانہ لیا لیکن کوئی چیخ یا کراہ سنائی نہیں دی جس کا مطلب تھا کہ بھنّا گر بھی محفوظ رہا ہے۔

اس بار اس نے فائر کرنے کے بجائے ان کی سمت گیس بم اچھالا۔ اندھیرے میں وہ بم کو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن قوتِ شامہ نے کام دکھایا اور بو محسوس کرتے ہی دونوں نے فوری طور پر اپنی سانس روک لی۔ سانس روک کر وہ تیزی سے پیچھے ہٹے تاکہ گیس کی زد سے محفوظ رہیں۔ اس دوران میں وہ یہ اندازہ کرچکے تھے کہ بھنّا گر کے پاس اگرچہ اسلحہ اور مقابلے کے لیے دوسری اشیا موجود ہیں لیکن وہ تنہا ہی ہے۔ شاید اسے خود پر بہت زیادہ اعتماد تھا جو عمارت میں گڑبڑ محسوس کرکے کسی اور کو اپنی مدد کے لیے بلانے کے بجائے خفیہ راستے سے تنہا یہاں پہنچ گیا تھا اور اب صورتِ حال یہ تھی کہ کوئی بھی کسی پر برتری حاصل نہیں کرسکا تھا۔ وہ اندھیرے میں ایک دوسرے کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے پھر رہے تھے۔ اچانک ہی بھنّا گر نے ایک نہایت غیر متوقع حرکت کی۔ وہ آپریشن روم میں گھسا اور اس نے عمارت کی لائٹیں روشن کردیں۔ اندھیرا جو انہیں پناہ فراہم کررہا تھا، یک دم ہی غائب ہوگیا اور وہ پوری طرح عیاں ہوگئے۔ یہ ایک بوکھلا دینے والی صورتِ حال تھی لیکن دونوں ہی نے تیزی سے اپنے اعصاب پر قابو پایا اور قریبی

کمرے کے دروازے سے اندر پہنچ گئے۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں سلو نے بھتاگر کے ساتھیوں کو جہنم رسید کیا تھا اور وہ لاشوں کی صورت فرش پر آڑے ترچھے پڑے تھے......

کمرے کے اندر آ جانے کے بعد انہیں یہ اطمینان ہو گیا... کہ وہ نگرانی کرنے والے کیمروں سے محفوظ ہو گئے ہیں کیونکہ آپریشن روم میں رہ کر انہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ کیمرے صرف برآمدوں کا منظر دکھاتے تھے اور ان میں سے بیشتر کیمرے خود بھتاگر نے ناکارہ بنا دیے تھے۔ البتہ اس برآمدے والے کیمرے کے بارے میں انہیں علم نہیں تھا کہ کام کر رہا ہے یا نہیں کیونکہ بھتاگر کے یہاں تک پہنچنے سے قبل ہی انہوں نے مین سوئچ آف کر دیا تھا۔

''میں فرنٹ سے جاتا ہوں، تم پیچھے سے پہنچنے کی کوشش کرو۔'' سلو نے.... تیزی سے آگے کی حکمتِ عملی طے کی اور ایک نسبتاً کم وزن.... شخص کی لاش اٹھا کر یوں اپنے سامنے کر لی کہ ڈھال کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ دوسری طرف شہریار کمرے کی کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اب اسے عمارت کے نقشے کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپریشن روم تک پہنچنا تھا جہاں بھتاگر مورچا زن ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف کودتے ہی سب سے پہلے اس نے وہاں روشن طاقت ور بلب کو نشانہ بنایا۔ اب کیمرے کے کام کرنے کی صورت میں بھی کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ادھر سلو نے بھی تقریباً یہی حکمتِ عملی استعمال کی اور لاش کو اپنے سینے سے لگائے آگے بڑھتا رہا۔ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ ایک لاش کو اس انداز میں حرکت دینے کے لیے اسے خاصی طاقت صرف کرنی پڑ رہی تھی پھر بھی وہ کسی نہ کسی طور اسے ساتھ لیے آگے بڑھتا رہا۔ وہ خود تو دبے قدموں ہی آگے بڑھ رہا تھا لیکن لاش۔ کے گھسٹنے کی وجہ سے ہلکی سی آواز پیدا ہو رہی تھی جو بے پناہ خاموشی کی وجہ سے صاف سنائی دے رہی تھی۔ البتہ لائٹوں کو نشانہ بنا لینے کی وجہ سے ایک بار پھر اندھیرے کی پناہ ضرور مل گئی تھی۔

آپریشن روم میں موجود بھتاگر کو اس کے سوا کچھ نہیں سوجھا کہ آہٹ پر نشانہ لے۔ اس نے خود بھی آپریشن روم کی لائٹیں بجھا دی تھی۔ چنانچہ دروازہ کھول کر آرام سے فائر کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں اس کے اپنے آدمی کی لاش میں پیوست ہو گئیں اور ظاہر ہے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا لیکن سلو نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے لاش کو دھکا دے کر خود سے دور پھینکا اور اپنا جسم دیوار کے ساتھ سمیٹ لیا۔ لاش کے دور جا کر گرنے سے خاصی آواز پیدا ہوئی اور اس آواز پر بھتاگر فائر نہ کرتا، یہ کیسے ممکن تھا۔ فائر کرنے کے لیے اسے آڑ..... سے نکلنا پڑا... اور یہ سلو کے لیے سنہری موقع تھا۔ اس نے گن کی نال سے نکلنے والے شعلے پر نشانہ لیا اور گولی سیدھی بھتاگر کے جسم میں پیوست ہو گئی لیکن وہ ہوشیار آدمی تھا... فوراً فائر کرتے ہی خود کو محفوظ کرنے کے لیے حرکت میں آ گیا تھا، اس لیے جان بچ گئی اور اسے محض اپنے بازو میں گولی کو جگہ دینی پڑی۔ گولی کھا کر وہ نیچے گرا اور لات مار کر دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ آپریشن روم میں خود کو محفوظ کر چکا تھا۔ شہریار جو پیچھے سے گھوم کر عقبی کھڑکی تک پہنچا تھا، یہ دیکھ کر مایوس ہو گیا کہ اس کمرے کی کھڑکیاں بلٹ پروف ہیں اور وہ وہاں سے بھتاگر کو نشانہ نہیں بنا سکتا۔

''تم بیکار کوششیں کر رہے ہو۔ اس بلڈنگ سے تم میری مرضی کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے۔'' ابھی تک شہریار نے اس کے کسی فائر کے جواب میں فائر نہیں کیا تھا اس لیے وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہاں اس کے مقابل ایک کے بجائے دو افراد ہیں۔

''ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں تم بھی یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ میں نے اس کمرے کے دروازے کے ساتھ بم فٹ کر دیا ہے۔ تم دروازہ کھولو گے تو بم بلاسٹ ہو جائے گا اور تمہارے جسم کے ساتھ ساتھ عمارت بھی ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گی۔'' سلو جو اس دوران میں بہت خاموشی سے دروازے تک پہنچ چکا تھا، دروازے کی کنڈی باہر سے بند کر کے بلند آواز میں بولا۔ اس کی آواز سن کر بھتاگر اچھل پڑا۔

''سلو! تم.... تم یہاں ہو؟'' وہ جیسے ہیجان میں مبتلا ہو گیا۔

''کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا تھا؟'' سلو نے ہنس کر پوچھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ مجھ سے اس انداز میں مقابلہ کرنے والے صرف تم ہی ہو سکتے ہو۔'' بھتاگر نے تسلیم کیا۔

''اور اب تمہیں یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ جیسے میں یہاں آ سکتا ہوں، ویسے ہی واپس بھی جا سکتا ہوں۔''

سلو نے اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو وہ اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گیا اور ترخ کر بولا۔ ''ہماری بلی ہم ہی کو میاؤں کر رہی ہے۔''

''شکر کرو کہ میں تمہیں یہاں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔'' سلو نے جواب دیا۔ حقیقتاً جس طرح بھتاگر آپریشن روم سے باہر نکل کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، وہ بھی اندر جا کر اس کا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی بات کہہ کر شہریار کو اشارہ دیا اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ عمارت کے اس حصے میں جا رہے تھے جہاں سے انہوں نے بھتاگر کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ یہ شہریار کے قید خانے والا حصہ تھا۔ اس حصے کے کیمرے خود بھتاگر نے ناکارہ بنائے تھے اس لیے انہیں نگرانی کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ اب وہ صرف اس خفیہ راستے کی تلاش میں تھے جہاں سے بھتاگر عمارت میں داخل ہوا تھا۔ یہ راستہ تلاش کرنے میں انہیں اس لیے کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ راستہ کھولنے کے بعد بھتاگر نے اسے عجلت میں بند نہیں کیا تھا۔ یہ راستہ اس عقوبت خانے کی ایک الماری کے پیچھے تھا جس میں بہت سے تشدد کے آلات بھرے ہوئے تھے۔ الماری کے کسی سلائڈنگ ڈور کی طرح ایک جانب کھسکائے جانے کے باعث راستہ واضح ہو گیا تھا۔

یہ تنگ سرنگ نما راستہ تھا جہاں سے دو افراد ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بیک وقت نہیں گزر سکتے تھے چنانچہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ یہاں بھی سلو ہی آگے رہا۔ اصل میں شہریار کی جسمانی حالت کی وجہ سے اس نے اب تک زیادہ تر بوجھ خود ہی اٹھایا تھا۔ اب بھی آگے رہ کر کسی خراب صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا لیکن اس بار وہ کسی مشکل سے دوچار نہیں ہوئے۔ خفیہ راستہ عمارت کے قریب ہی ایک خشک نالے میں جا کر کھلا۔ نالے سے باہر بھتاگر کی گاڑی کھڑی تھی لیکن انہوں نے اس کا رخ نہیں کیا اور پیدل چلتے ہوئے... وہاں سے دور نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑے ہتھیار انہیں نظروں میں لا سکتے تھے اس لیے وہ انہوں نے نالے ہی میں پھینک دیے...... اب ان کے پاس صرف ریوالور تھے جو آسانی سے لباس میں چھپائے جا سکتے تھے۔

وہ نالے کے اندر ہی سفر کرتے ہوئے خاصے آگے نکل گئے پھر ایک ایسی جگہ سے باہر نکلے جہاں قریب ہی خاصا بڑا پبلک پارک موجود تھا۔ وہ جنگلا پھلانگ کر پارک میں داخل ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے دو گاڑیوں کو آندھی طوفان کی طرح اس رخ پر جاتے دیکھا جہاں سے وہ ابھی آئے تھے۔ یقیناً بھتاگر نے اپنے ساتھیوں کو کال کر کے بلایا تھا۔ ان دونوں کے پاس اچھی خاصی تعداد میں موجود ان مسلح افراد سے بھڑنے کی نہ تو گنجائش تھی، نہ ہی وہ ایسی کوئی ضرورت محسوس کر رہے تھے اس لیے انہیں نظرانداز کر دیا اور پارک کے مین گیٹ سے باہر نکل کر وہاں کھڑی ٹیکسیوں میں سے ایک کا رخ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھے کسی قریبی ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

ہوائی جہاز میں محوِ سفر ماہ بانو کے ذہن میں بیک وقت کئی خیالات گردش کر رہے تھے۔ کبھی وہ اپنی اس زندگی کے بارے میں سوچتی جب فیصل آباد میں بے بے اور ابا کے ساتھ سکھ چین سے رہتی تھی۔ کبھی پیر آباد میں پیش آنے والے واقعات یاد آتے پھر شہریار کا اپنی مدد کرنا اور خود اس کی محبت میں مبتلا ہو جانا یاد آ جاتا۔ کبھی وہ اسلم کے بارے میں سوچتی جو بالکل اچانک اس کی زندگی میں آیا تھا اور اچانک ہی چلا بھی گیا تھا۔ اسلم اس کی زندگی میں آنے والا وہ کردار تھا جس نے اسے بے تحاشا محبت دی تھی۔ حقیقتاً وہ اس پر جان چھڑکتا تھا اور اپنی جان وار کر اسے ایک بڑی مصیبت سے نجات دلا دی تھی۔ اسلم کی نشانی کو سینے سے لگائے، وہ اس کی محبتوں اور وارفتگیوں کو بغیر کسی ارادے کے سوچے جا رہی تھی۔ اسلم وہ شخص تھا جس نے بغیر صلے کی خواہش کے اس سے اتنی شدید محبت کی تھی کہ وہ اپنا دامن اس کی محبت سے بچا نہیں پائی تھی اور دل میں خود بخود ہی اس کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔

یہ ایک سچ تھا کہ شہریار کی محبت کی جڑیں اپنے بہت اندر تک اتری ہونے کے باوجود اس وقت وہ اسلم کی جدائی پر ملول و مغموم تھی۔ اس کے آنسو چپکے چپکے اس کے دل پر گر رہے تھے۔ ستم یہ تھا کہ ان حالات میں بھی اسے کہیں سکون سے بیٹھ کر اپنا غم منانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ مصطفیٰ خان کا کہنا تھا کہ اس کا جلد از جلد آئرلینڈ سے نکل جانا مناسب تھا کیونکہ ابھی جنگل میں لگی آگ کو بجھانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ آگ بجھنے کے بعد جب زمین ٹھنڈی ہو جاتی تو یقیناً لیبارٹری والے حصے میں خصوصی کارروائی کی جاتی اور بے شک وہاں سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا ہوگا لیکن جدید سائنسی ایجادات سے لیس امریکی ماہرین اس حقیقت کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جاتے کہ وہاں جل کر مرنے والوں میں ماہ بانو کی لاش موجود نہیں ہے... اور یہ جاننے کے بعد یقیناً وہ اس کی تلاش شروع کر دیتے۔

ان کے لیے اس اسپتال تک پہنچنا بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا جہاں ماہ بانو کا علاج اور بچے کی ڈلیوری ہوئی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ اسے فوری طور پر وہاں سے

منتقل کر دیا جائے۔ مصطفیٰ خان کی خواہش پر ڈاکٹر نے مختصر عرصے میں اسے ایسی ادویات استعمال کروادی تھیں کہ وہ نیویارک تک کے فضائی سفر کے قابل ہو گئی تھی۔ زخموں کو چھپانے کے لیے اسے گاؤن نما ایک لمبا سا لبادہ پہنایا گیا تھا اور چہرے کے کچھ حصے کو چھوڑ کر اس نے اسکارف اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ بیشتر زخم چھپ گئے تھے۔ ناک کے قریب ایک ہلکی سی خراش نظر آرہی تھی لیکن وہ ایسی نہیں تھی کہ کسی کو چونکانے کا سبب بن جائے۔ اتفاق سے اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی اس لیے اسے کسی ہمسفر کے سوال جواب کا سامنا کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑ رہی تھی۔ یوں بھی امریکی ذرا ایسے دبے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں... بلاوجہ کسی سے غیر ضروری گفتگو کر کے اسے پریشان کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

یوں وہ بڑے سکون سے سفر کر رہی تھی اور جو بے سکونی تھی، بس اس کے اندر ہی تھی۔ اپنے بچے کے بارے میں اس کے ذہن میں بہت سے تفکرات تھے۔ ایک ہاتھ ناکارہ ہونے کا تو پہلے ہی علم ہو گیا تھا، مزید ڈاکٹر نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے بچہ ذہنی طور پر مکمل تندرست نہ ہو۔ ایسے بچے کے لیے تو ہر ماں ہی پریشان ہوتی ہے اور اس کی پریشانی اس لیے دگنی تھی کہ اس کی اپنی زندگی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں وہ اپنے بچے کی سکون سے اچھے طور پر پرورش کیسے کر پاتی؟ خدشات اور اندیشوں کے باوجود اس نے امید اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور زندگی کے اس امتحان سے بھی پوری ہمت سے گزر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے دوران پرواز ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیں بھی مقررہ وقت پر لے کر ایک گلاس جوس بھی لے لیا تھا۔ وہ آگے کی جدوجہد کے لیے اپنی توانائی بحال رکھنے کی اہمیت سے خوب واقف تھی۔

اسے بلتستان کے برف زار میں ایوالانچ کا شکار ہو جانے والے عمران کی باتیں کبھی نہیں بھولتی تھیں اور اندر کہیں یہ یقین موجود رہتا تھا کہ اللہ کسی نہ کسی مقصد کے لیے اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اب بھی زندگی کی ایک راہ نکل ہی آئی تھی۔ اس کی زندگی کو طوفانوں کی زد میں لانے والے چودھری کے بیٹے مراد شاہ نے اسے اپنے تعاون کی پیشکش کی تھی۔ وہ خود اس کے ساتھ نہیں آیا تھا لیکن اسے اپنے اپارٹمنٹ کا پتا دے کر یہ یقین دہانی کروادی تھی کہ وہاں اس کی بیوی شاہدہ اس کے استقبال کے لیے موجود ہو گی اور واقعی اس کا یہ دعویٰ غلط ثابت نہیں ہوا۔ وہ جب بچے اور اپنے چھوٹے سے سفری بیگ کے ساتھ مراد شاہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچی تو شاہدہ نے اتنے خلوص سے اس کا استقبال کیا کہ اسے یقین آگیا کہ وہ زندگی کے کچھ دن یہاں ستا کر سکون سے آگے کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ ویسے بھی وہ اتنی خوش نصیب تو بہرحال تھی کہ بدترین حالات میں بھی تنہائی کا عذاب جھیلنے سے بچ جاتی تھی اور اسے خودبخود ہی قدرت کی طرف سے بہت سے سہارے مل جاتے تھے۔ اب بھی مصطفیٰ خان، بلقیس، کشور، آفتاب اور مراد شاہ سمیت کتنے ہاتھ تھے جنہوں نے اسے تھام رکھا تھا اور وہ اللہ سے شکوہ نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

''میں بھٹناگر پر نظر پڑتے ہی سمجھ گیا تھا کہ ہمارا مشکل وقت شروع ہو گیا ہے۔ کوئی آثار نہ ملنے کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور ہمارے تعاقب میں ہو گا اور اس خیال نے مجھے اتنا وحشت زدہ کیا کہ میں سونے کے لیے بستر پر لیٹ ہی نہیں سکا اور میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خاموشی سے نگرانی کرنی چاہیے۔ میں نے بستر پر تکیے جما کر اوپر چادر اوڑھائی اور خود چھت کے راستے پڑوس کے بنگلے میں کود گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر بھٹناگر میری تلاش میں وہاں تک پہنچا تو مجھے غائب پا کر اس کا ذہن پڑوس میں ضرور جائے گا اسی لیے میں وہاں بھی نہیں رکا اور سامنے والے بنگلے میں جا گھسا۔ بس مجھے اتنی ہی مہلت ملی۔ اس کے بعد میں نے وہاں دو گاڑیوں کو آکر رکتا دیکھا اور سمجھ گیا کہ میرے خدشات کے مطابق بھٹناگر وہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ لوگ بہت دیر تک بنگلے کی نگرانی کرتے رہے اور میں سامنے والے بنگلے سے سب دیکھتا رہا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور مختلف سمتوں میں پھیلے ہونے کی وجہ سے میں اکیلا ان سب سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اپنی جگہ پر دُبکا رہا۔ پھر جب وہ لوگ بنگلے میں داخل ہوئے تو میرے پاس موقع تھا کہ وہاں سے فرار ہو جاؤں لیکن میں جانتا تھا کہ وہ تمہیں گرفت میں لے لیں گے اور میں تمہیں بے یارومددگار چھوڑ کر جانے کی خودغرضی نہیں دکھا سکا چنانچہ موقع دیکھ کر ایک گاڑی کی ڈکی میں گھس گیا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بھٹناگر کو اس کے ٹھکانے پر ہی انجام سے دوچار کروں گا۔ تمہیں جس گاڑی میں لے جایا گیا، میں اسی کی ڈکی میں بند ساتھ پہنچ گیا لیکن عمارت میں چہل پہل ہونے کی وجہ سے مجھے فوری طور پر ڈکی سے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا۔ کئی گھنٹوں تک میں مختصر سی جگہ پر

پسینے میں شرابور پڑا رہا پھر موقع دیکھ کر باہر نکلا۔ مجھے ڈر تھا کہ یہ را کا ٹھکانا ہے تو یہاں کیمروں سے نگرانی کا انتظام بھی ہو گا، چنانچہ بہت احتیاط سے ایک کمرے تک رسائی حاصل کی۔ وہ کمرا اپنی ترتیب کے اعتبار سے گیسٹ روم لگ رہا تھا۔ میں وہاں اٹیچڈ باتھ میں چھپ گیا کہ موقع دیکھ کر باہر نکلوں گا لیکن کسی نے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیا اور میں وہاں پھنس رہ گیا۔ کافی غوروخوض کے بعد مجھے وہاں سے باہر نکلنے کی ایک راہ دکھائی دی۔ باتھ روم میں ایک ہوادان موجود تھا اور میں اس کا شیشہ نکال دیتا تو باہر نکل سکتا تھا لیکن ظاہر ہے میں شیشہ توڑ کر نہیں نکال سکتا تھا۔ مجھے احتیاط کرنی تھی اور اسے فریم سمیت اس طرح نکالنا تھا کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے میرے پاس اوزار بھی نہیں تھے۔ میں نے کمرے اور باتھ روم کی تلاشی لی تو اپنے مطلب کی کچھ چیزیں مل گئیں۔ ان کی مدد سے میں نے بڑی جدوجہد سے فریم سمیت ہوادان کو کھولنے بند کرنے والا شیشہ نکالا اور بالٹی پر چڑھ کر دوسری طرف جھانکا تو انکشاف ہوا کہ اس طرف بھی باتھ روم ہی ہے۔ میں نے جس وقت جھانکا، وہاں ایک آدمی نہا رہا تھا۔ میں نے اس کو نہیں چھیڑا کہ اس کا کوئی ساتھی دوسری طرف موجود کمرے میں ہوا تو میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔ را کے کسی ٹھکانے پر میں اندھا دھند کارروائی کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس شخص کے غسل سے فارغ ہو کر باہر نکلنے کے بعد بھی بہت دیر سُن گُن لیتا رہا پھر جب مجھے لگا کہ وہاں کوئی نہیں ہے تو دوسری طرف اتر گیا۔

''باتھ روم سے کمرے میں جھانکا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے میں جا کر چابی کے سوراخ سے باہر کا جائزہ لینے لگا تب مجھے تمہاری چیخیں سنائی دیں اور سمجھ گیا کہ حسب دستور وہ معلومات اگلوانے کے لیے تشدد سے کام لے رہے ہیں۔ چیخوں کی آواز سے مجھے سمت کا بھی اندازہ ہو گیا کہ تم کہاں ہو لیکن اس سے قبل کہ میں باہر نکل کر کچھ کرنے کا سوچتا، تمہاری چیخیں بند ہو گئیں اور میں نے بھٹناگر کو ایک آدمی کے ساتھ اسی کمرے کی طرف آتا دیکھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ میں فوری طور پر باتھ روم کے درمیان موجود چوکھٹے سے گزر کر پہلے والے باتھ روم میں چلا گیا لیکن کان اس طرف ہی لگائے رکھے۔ بھٹناگر اور اس کا ساتھی کمرے میں آئے اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تم پر بے پناہ تشدد کرنے کے باوجود اب تک کچھ اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ دوسرے بھٹناگر میری تلاش میں پاگل ہو رہا تھا اور کسی بھی طرح مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے اسے کئی جگہ فون کر کے ہدایتیں دیتے ہوئے سنا۔ پھر وہ اپنے ساتھی ماتحت کو وہاں سے روانہ ہونے کی اطلاع دے کر چلا گیا۔ اس کی غیر موجودگی سے مجھے خاصا اعتماد محسوس ہوا اور پھر ایک مناسب وقفے سے میں نے کارروائی شروع کر دی۔ آگے کے سارے واقعات سے تو تم خود واقف ہو۔'' ایک بہت عام سے ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے کے بعد وہ سکون سے بیٹھے تو سلو نے اسے ساری داستان کہہ سنائی۔ اس ساری تفصیل کو سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ خوش قسمتی قدم قدم پر سلو کی ہم رکاب رہی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ سلو وہاں تمام عرصہ گاڑی کی ڈکی اور پھر کمروں میں چھپا رہا... جہاں نگرانی کرنے والے کیمرے نصب نہیں تھے۔ دوسرے را والے خود اپنے ٹھکانے کے محفوظ ہونے کے یقین کی وجہ سے نگرانی کے معاملے میں بے پروائی برت رہے تھے اور مستقل طور پر یہ کام نہیں ہو رہا تھا ورنہ حالات مختلف بھی ہو سکتے تھے۔

''ہم بھٹناگر کو بے بس کر کے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، اس بات پر وہ سخت مشتعل ہو گا اور اس نے شہر میں ہر طرف اپنے آدمیوں کا جال بچھا دیا ہو گا اس لیے ہم اس ہوٹل میں بھی خود کو زیادہ دیر تک محفوظ تصور نہیں کر سکتے۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچنا ہو گا۔'' وہ ہوٹل پہنچنے سے قبل کچھ دوائیں میڈیکل اسٹور سے خریدتے ہوئے لائے تھے جن میں سے زیادہ تر پین کلرز اور اینٹی بائیوٹک تھیں اور زخم صاف کرنے کا کچھ سامان بھی تھا۔ راہ چلتے انہوں نے ٹھیلے پر پرانے کپڑے بیچنے والے سے پینٹ شرٹ کا ایک ایک جوڑا بھی خرید لیا تھا۔ پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ سلو کے پاس اس کا پرس محفوظ تھا لیکن کسی بڑی دکان کا انہوں نے جان بوجھ کر رخ نہیں کیا تھا کہ ایسی جگہوں پر نگرانی کا زیادہ ڈر ہوتا ہے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد سب سے پہلے شہریار نے گرم پانی سے غسل کیا پھر سلو نے اس کے زخموں کی صفائی کر کے ان پر مرہم لگایا۔ اچھی بات یہ تھی کہ شہریار کے سارے زخم جسم کے ایسے حصوں میں تھے جو لباس میں چھپ گئے تھے ورنہ زخمی نظر آنے کی صورت میں تو وہ لوگ فوراً ہی مشکوک سمجھ لیے جاتے۔ انہوں نے کمرے میں ہی سادہ مگر پُرغذائیت کھانا منگوایا اور کھانے کے بعد شہریار نے دوائیں بھی کھا لیں۔ اس دوران میں وہ اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے

بارے میں بھی سوچتے رہے تھے۔

”ہمیں عبدالرحمان سے رابطہ کرنا ہوگا۔ فی الحال وہی لوگ ہمیں محفوظ ٹھکانا بھی فراہم کرسکتے ہیں اور پھر اپنے آدمیوں کے لیے تو ہمیں ویسے بھی ان کے پاس جانا ہی ہے۔“ اس کا اشارہ ڈاکٹر فرحان اور کلام کی طرف تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ فی الحال ہمارے لیے یہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ شہر کی فضا اب بھی معمول پر نہیں ہے۔ اشوک کے قتل کے اثرات اب تک محسوس ہورہے ہیں اور بے شک بازار کھل گئے ہیں لیکن ان میں پہلے جیسی گہما گہمی نہیں ہے۔ لوگ زیادہ بلند آواز سے بات تک نہیں کررہے ہیں۔“ سلو نے اس کی تائید کرتے ہوئے حالات کی گمبھیرتا کا ذکر کیا۔ یہ سچ تھا کہ انڈر ورلڈ کے اتنے بڑے ڈان کے قتل کے بعد ممبئی جیسا بڑا شہر بھی فوراً معمول پر نہیں آسکا تھا اور فضا کچھ ڈری سہمی سی تھی۔

”میں عبدالرحمان سے بات کرتا ہوں۔ اس کا نمبر مجھے یاد ہے۔“ آخرکار شہریار فیصلہ کرکے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پاس موبائل نہیں تھا اور اس ہوٹل میں گاہکوں کو کمرے کے اندر فون کی سہولت نہیں دی گئی تھی۔ بس انٹرکام موجود تھے جن سے روم سروس سے رابطہ کیا جاسکتا تھا اس لیے اسے کال کرنے کے لیے استقبالیہ کاؤنٹر تک جانا پڑا۔ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے اس نے احتیاطاً ٹھیلے ہی سے خریدی گئی سیکنڈ ہینڈ پی کیپ کو اس طرح جھکا کر لگا رکھا تھا کہ چہرے کا کافی حصہ چھپ گیا تھا۔ استقبالیہ کلرک نے اس کی فرمائش پر فوراً ہی ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف کھسکا دیا۔ اس نے یادداشت میں محفوظ عبدالرحمان کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری بیل پر کال ریسیو کرلی گئی۔

”میں بات کررہا ہوں۔“ عبدالرحمان کی آواز سن کر وہ احتیاط سے بولا۔ اسے امید تھی کہ بغیر نام بتائے بھی عبدالرحمان اسے صرف آواز سے پہچان جائے گا۔ اس کا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

”وہیں رکو، میرے آدمی خود تمہیں لینے آرہے ہیں۔“ جواب میں اسے عبدالرحمان کی نہایت سنجیدہ آواز سنائی دی۔ اس نے اس سے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کہاں سے بات کررہا ہے اور اپنی بات کہہ کر فوراً ہی فون بند کردیا۔ شہریار الجھا ہوا کمرے میں واپس پہنچا اور سلو کو ساری بات بتائی۔

”ہوسکتا ہے عبدالرحمان اس ہوٹل کا فون نمبر پہچانتا ہو اس لیے اسے تم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہو۔“ سلو نے اندازہ لگایا۔

”شاید... لیکن مجھے عبدالرحمان کا انداز کچھ غیر معمولی محسوس ہوا تھا۔“ وہ ابھی تک تذبذب میں تھا اور چھٹی حس کسی گڑبڑ کا الارم بجا رہی تھی۔

”حالات ہیں ہی غیر معمولی۔ اشوک کے قتل کی انویسٹی گیشن کرنے والے بھائی جی سمیت اس کے گینگ کے ہر اہم آدمی کے موبائل فونز... انڈر آبزرویشن... ہوئے ہوں گے اس لیے عبدالرحمان محتاط ہوگا۔“ سلو کی بات میں وزن تھا اس لیے اسے قائل ہونا پڑا اور وہ اس خیال سے بستر پر لیٹ گیا کہ جب تک عبدالرحمان کے بھیجے بندے نہیں پہنچتے، تھوڑی دیر ستالے۔ ابھی اسے لیٹے ہوئے مشکل سے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ فائر کی آواز سنائی دی اور پھر تو گویا بھونچال ہی آگیا۔ تابڑ توڑ ہوتی اس فائرنگ میں ہر طرح کا ہتھیار استعمال ہورہا تھا اور صاف محسوس ہورہا تھا کہ دو گروہ آپس میں متصادم ہوگئے ہوں۔ فائرنگ کی آوازوں میں لوگوں کی چیخ و پکار، بھاگ دوڑ اور دکانوں کے شٹر گرنے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

”یہ تو لگتا ہے کہ اسی ہوٹل کے باہر فائرنگ ہورہی ہے۔“ سلو بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور آوازوں سے اندازہ لگا کر بولا۔

”شاید عبدالرحمان کے آدمی پہنچ گئے ہیں اور انہی کا کسی سے مقابلہ ہورہا ہے۔“ شہریار کی یہ قیاس آرائی حالات کے تناظر میں بالکل درست تھی۔ جب سے اشوک کا قتل ہوا تھا بھائی جی اور اس کے گروہ کے افراد میں بری طرح ٹھنی ہوئی تھی اور وہ جگہ جگہ ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ اب بھی ایسا ہی لگتا تھا کہ قرب و جوار میں موجود اشوک کے گینگ کے افراد نے بھائی جی کے آدمیوں کو پہچان لیا تھا اور دونوں گروہوں میں تصادم ہوگیا تھا۔

”باہر نکل کر جائزہ لیتے ہیں۔“ آخرکار انہیں کمرے سے نکلنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ فائرنگ اتنی شدت سے ہورہی تھی کہ بارود کی بو ان کے کمرے تک در آئی... اتنی شدید فائرنگ میں وہ اپنے کمرے سے باہر نکلنے والے اکیلے ہی تھے ورنہ باقی افراد تو دروازے بند کرکے اندر دبک گئے تھے۔ استقبالیہ کاؤنٹر تک خالی پڑا تھا اور یقیناً کلرک اپنی جان بچانے کے لیے کہیں چھپ گیا تھا۔ پتلونوں کی جیبوں میں رکھے اپنے اپنے ریوالور کے دستوں پر گرفت مضبوط کیے وہ ابھی ہال میں پہنچے ہی تھے کہ دو افراد بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف

تھی جبکہ دوسرا ہلکی مشین گن سنبھالے ہوئے تھا۔ ان دونوں کو وہ عبدالرحمان کے ساتھ پہلے بھی دیکھ چکے تھے اس لیے فوراً ہی شناخت کرلیا۔ وہ دونوں بھی انہیں پہچان گئے۔

”ہم تم دونوں کو کور دیں گے، تم گیٹ سے رائٹ سائڈ پر موجود بلیک پجیرو تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ ہری اپ۔ عبدل بھائی کا فون آیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ تمہیں جلدی یہاں سے نکالیں ورنہ اور نفری پہنچ جائے گی۔“ ان میں سے ایک نے جلدی جلدی ان پر صورتِ حال ظاہر کی تو وہ تیزی سے حرکت میں آگئے۔ باہر گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں اور انہیں ان برستی گولیوں سے بچ کر گاڑی تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ گیٹ سے باہر جھانکتے ہی انہیں باہر گرم میدانِ کارزار کا اندازہ ہوگیا۔ دونوں طرف کے لوگ اپنی گاڑیوں کے علاوہ مختلف جگہوں پر مورچا زن تھے۔ وہ گیٹ پر پہنچے تو سامنے موجود بیوٹی سیلون کی چھت سے ان پر فائرنگ کی گئی۔ وہ فوراً سائڈوں میں دبک گئے۔

”ہم دونوں پوری شدت سے سامنے اور لیفٹ پر فائرنگ کریں گے۔ باہر والے بھی ہماری مدد کریں گے۔ تم دونوں کو بس اتنا کرنا ہے کہ چند سیکنڈ کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر گاڑی تک پہنچ جاؤ۔ گاڑی بلٹ پروف ہے۔ تمہیں لے کر آسانی سے نکل جائے گی۔“ پہلے والے نے ہی ذرا بلند آواز میں بولتے ہوئے پلان ان کے سامنے رکھا جو تھا تو خطرناک لیکن موجودہ صورتِ حال میں اس پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شہریار نے سر کی جنبش سے اپنی رضامندی ظاہر کی اور جیسے ہی ان کے ہمدردوں نے تین تک گنتی گن کر کے فائرنگ کا آغاز کیا، وہ حرکت میں آگئے۔ گیٹ سے بمشکل دو ڈھائی گز دور کھڑی گاڑی تک پہنچنا اس وقت پُلِ صراط پر سے گزرنے کے مترادف تھا۔ ان کے اطراف میں مختلف اقسام کی گنوں کے دہانے یوں گولیاں اگل رہے تھے کہ ان کے شور میں کان پڑی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ البتہ عبدالرحمان کے آدمیوں کی حکمتِ عملی اس حساب سے کامیاب رہی کہ پوری قوت سے مقابل پر فائر کھول دیے جانے کے سبب وہ اپنے مورچوں میں دبک جانے پر مجبور ہوگئے اور کوئی یہ جرأت نہیں کرسکا کہ سر باہر نکال کر نشانہ لیتا۔ چنانچہ انہوں نے گولیوں کی دہشت زدہ کردینے والی آوازوں میں پجیرو تک کا فاصلہ جھکے جھکے تیزی سے طے کرلیا۔ ان کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آگئی۔ پجیرو کو حرکت میں آتا دیکھ کر مخالفین نے اس کی طرف کئی فائر کیے لیکن گاڑی کے بلٹ پروف ہونے کی وجہ سے ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا اور وہ تیزی سے وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

ابھی وہ موڑ تک ہی پہنچے تھے کہ سامنے سے ایک پولیس جیپ نمودار ہوئی۔ پولیس والوں نے بھانپ لیا کہ گاڑی جائے ہنگامہ سے فرار ہورہی ہے چنانچہ اسے رکنے کا اشارہ دیا لیکن ظاہر ہے قانون کے رکھوالوں کے اشارے پر رکنے والا وہاں تھا ہی کون؟ ڈرائیور بے نیازی سے پجیرو کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ پولیس والوں نے مشتعل ہوکر کئی فائر کیے، ان کا نشانہ درست بھی رہا ہوگا تو پجیرو کا کیا بگڑنے والا تھا۔ وہ آگے بڑھتی رہی، ادھر پولیس والے بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے جیپ... ان کے پیچھے لگادی۔

”انہیں سبق سکھانا ہی پڑے گا۔“ ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص نے عقب نما آئینے میں تعاقب میں آتی جیپ کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اپنی سائڈ کا شیشہ نیچے کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں دور مار رائفل ہے۔ رائفل کی نال کو کھڑکی سے باہر نکال کر اس نے اپنا زاویہ ذرا سا تبدیل کیا اور سکون سے نشانہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی انہوں نے فائر کی آواز کے ساتھ ٹائر پھٹنے کا دھماکا سنا اور پوری رفتار سے تعاقب میں آتی جیپ بری طرح الٹ گئی۔ فائر کرنے والے نے رائفل کی نال اندر کی اور دوبارہ شیشہ چڑھا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اسی وقت ڈرائیور نے مین روڈ چھوڑ دی اور پجیرو کو ایک بغلی سڑک پر موڑ دیا۔ اس کے بعد وہ اسے اتنے موڑوں سے گھما کر ایک چوڑی گلی میں لے گیا کہ کسی نئے بندے کے لیے راستے کا تعین ممکن ہی نہیں تھا۔ گلی میں پہنچ کر اس نے ایک گیٹ کے سامنے ہارن دیا۔ فوراً ہی گیٹ کھل گیا اور پجیرو کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ وہاں پورچ میں ایک گاڑی پہلے سے ہی کھڑی.... تھی جس کی ظاہری حالت اتنی خراب تھی کہ لگتا تھا مالک اس سے سوتیلی اولاد والا سلوک کرتا رہا ہے۔ اسے دیکھ کر شک گزرتا تھا کہ وہ سڑک پر چلنے کے قابل بھی نہیں ہوگی اور دل سے اتری بیوی کی طرح یونہی ایک طرف پڑی رہتی ہوگی۔ پجیرو کے سامنے تو وہ بالکل ہی کھچاڑا محسوس ہورہی تھی۔

”یہاں سے آگے تم لوگوں کو اس گاڑی میں جانا ہوگا۔“ گاڑی کی حالتِ زار دیکھ کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص سے یہ جملہ سننا انہیں بہت عجیب لگا تھا۔

”عبدل کہاں ہے؟“ شہریار نے اس سے پوچھا۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد اب وہ پہلی بار ایک دوسرے سے

بات کر رہے تھے۔

"یہ گاڑی تم لوگوں کو جہاں پہنچائے گی، عبدل بھائی وہاں تم سے خود کانٹیکٹ کرلے گا۔" اس نے انہیں بتایا۔ گفتگو کے اس چھوٹے سے سلسلے کے دوران ہیرو کا ڈرائیور اتر کر اس کھٹارا گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ ان سے گفتگو کرتے شخص نے اپنی جگہ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ وہ لوگ سمجھ گئے کہ یہاں انہیں صرف گاڑی کی تبدیلی کے لیے لایا گیا ہے۔ یہ آدمی ہیرو کو لے کر کسی طرف نکل جاتا اور وہ دوسری گاڑی میں کسی اور سمت نکل جاتے۔ اس بار انہوں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے نیچے اتر گئے۔ ہیرو کا انجن فوراً بیدار ہوا اور ان کے گاڑی میں بیٹھنے تک وہ کھلے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ وہ جس کھٹارا گاڑی میں سوار ہوئے تھے اس کا انجن بھی فوراً ایک غراہٹ کے ساتھ بیدار ہوا اور ہیرو کے پیچھے ہی وہ بھی باہر نکلی۔ گاڑی کے نکلتے ہی گیٹ تیزی سے بند ہوگیا۔ گاڑی اپنی ظاہری حالت کے مقابلے میں چلنے میں بہت شاندار تھی اور بہت روانی سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ وہ نوٹ کر رہے تھے کہ ڈرائیور مرکزی شاہراہوں سے گزرنے سے حتی الامکان گریز کر رہا ہے۔ یہ ان کے حق میں بہتر تھا۔ بڑی شاہراہوں پر چیکنگ کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ گاڑی کے سفر کی سمت سے انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ ساحلی علاقے کی طرف لے جائے جارہے ہیں۔ فضا میں آنے والی تبدیلی نے بھی اس اندازے کی تصدیق کردی۔ ساحلی ہواؤں کا لمس اور خوشبو ایسی جداگانہ ہوتی ہے کہ آدمی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی لے جایا جائے تو وہ بتا سکتا ہے کہ سمندر کے قریب ہے۔

بھائی جی کا گروہ جتنا پھیلا ہوا تھا اور جس قدر وسائل رکھتا تھا، اس کا ایک ٹھکانا ساحلی علاقے میں ہونا کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن انہیں حیرت.... ہوئی جب ڈرائیور رہائشی بنگلوں کے قریب سے کنی کترا کر گزر گیا اور وہ اس سے بہت آگے ایک ایسی بستی میں پہنچ گئے جہاں زیادہ تر کچے مکان بلکہ جھونپڑیاں موجود تھیں۔ راستے میں جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے اور بچے آدھے ادھورے لباس میں اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ فضا میں مچھلی اور جھینگوں کی بساند بھری ہوئی تھی اور اس تازگی اور فرحت کا دور دور تک احساس نہیں تھا جسے سمندری ہوا سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کی گاڑی ایک کچے مکان کے سامنے رکی تو مکان کا زنگ آلود دروازہ یوں کھل گیا جیسے کوئی دروازے سے لگا ان کی آمد کا منتظر ہو۔

"آپ لوگوں کو یہاں رہنا ہوگا۔ عبدل بھائی بعد میں خود آپ سے رابطہ کرلیں گے۔" ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر ان دونوں کو اطلاع دی اور پھر مکان سے نکلنے والے ادھیڑ عمر آدمی کی طرف متوجہ ہوگیا جس نے خانوں والی لنگی کے ساتھ فقط ایک بنیان پہن رکھی تھی۔

"صاحب لوگوں کا خیال رکھنا ماچھو! یہ عبدل بھائی کے خاص مہمان ہیں۔"

"تم بے فکر رہو۔ ماچھو ان پر اپنی جان وار دے گا۔" اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر اس نے شاید مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی آواز اتنی کرخت تھی کہ دوستانہ پن کا تاثر نہیں ابھرتا تھا۔ ان دونوں کے پاس سوال جواب کی گنجائش نہیں تھی اس لیے خاموشی سے گاڑی سے اتر کر ماچھو کی معیت میں مکان میں داخل ہوگئے۔ ماچھو انہیں جس کمرے میں لے گیا، اس کی حالت مکان کی بیرونی حالت کے مقابلے میں بہت اچھی تھی۔ دیواروں کا رنگ و روغن تو بے شک اڑا ہوا تھا لیکن فرش پر قالین ڈال کر اس پر ایک صاف ستھری چادر بچھائی گئی تھی اور دیوار کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے رکھے گئے تھے۔ انہوں نے ان گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ڈاکٹر فرحان اور کلام کو دیکھا تو بھونچکے رہ گئے۔

"آپ دونوں یہاں کب پہنچے؟" شہریار نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

"ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی عبدالرحمان کے آدمی ہمیں یہاں پہنچا کر گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تم دونوں بھی یہاں پہنچنے والے ہو۔" ڈاکٹر فرحان نے جواب دیا تو ان کے لہجے میں بھی تفکر تھا۔ وہ سب محسوس کر رہے تھے کہ حالات میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ جب سے ان کا بھائی جی اور عبدل سے رابطہ ہوا تھا، ان کے ٹھکانے بے شک بدلتے رہے تھے لیکن ہمیشہ انہیں بہترین رہائش گاہوں میں رکھا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک انتہائی پسماندہ بستی کے ایک کچے مکان میں موجود تھے۔

"کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے جو ہمیں یہاں بھیج دیا گیا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بظاہر مچھیروں سے آباد اس بستی میں اکثریت جرائم پیشہ افراد کی ہے۔" سلو نے اپنے خیال کا اظہار کرنے کے ساتھ دعویٰ کیا۔

"میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا کیونکہ بڑے گینگ ہر طبقے میں اپنی رسائی رکھتے ہیں اور ان کی جڑیں ہر طرف پھیلی.... ہوتی ہیں... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں یہاں کیوں پہنچایا گیا؟"

"فرار کروانے کے لیے۔ وہ ہمیں سمندری راستے سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اب تک خاموش بیٹھے کلام نے اس سوال کا جواب دیا تو وہ سب چونک گئے۔ واقعی ان چاروں کو اکٹھا اس جگہ پہنچانے کا یہی مقصد ہوسکتا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ان میں سے کسی کو اس بارے میں آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور بہت تیزی سے عمل شروع ہوگیا تھا۔ شاید بھائی جی جرائم کی سلطنت کا بے تاج بادشاہ بننے سے قبل ان لوگوں کو وہاں سے نکال دینا چاہتا تھا جنہوں نے اشوک کا کانٹا نکالا تھا۔

"چائے صاحب۔" وہ چاروں سوچ بچار میں مصروف تھے کہ ماچھو ایک ٹرے میں چائے کے چار کپ لیے چلا آیا۔ بھدے نظر آنے والے وہ کپ صاف ستھرے تھے اس لیے انہیں اس میں موجود دودھ پتی چائے کو پینے میں تامل نہیں ہوا۔

"عبدل بھائی کا فون آیا تھا، بولے جب تک میں نہیں آجاتا، مہمانوں کو ٹی وی دکھاؤ اور خاطر واطر کرو۔ اپن آپ لوگوں کے لیے مرغی ذبح کر کے پکوائے گا۔ آپ کا من کچھ اور کھانے پینے کو بولتا ہے تو بتاؤ۔ ادھر دیسی سے لے کر ولایتی تک سب ملتا ہے۔" آخر میں اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا تھا۔

"کچھ نہیں چاہیے۔ تم ٹی وی کھول دو۔" اس کی پیشکش کا شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ بھی مزید کچھ کہے بغیر حرکت میں آگیا اور ایک میز پر کروشیے کے نمونے سے ڈھکے ٹی وی کی نقاب کشائی کر کے اس کا بٹن آن کردیا۔ ساتھ ہی ریموٹ بڑے احترام سے لا کر شہریار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ٹی وی کھلتے ہی ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ موت کی تکلیف ثبت ہوجانے والا وہ چہرہ بھائی جی کا ہے، اسے پہچان لینے کے باوجود یقین کرنا مشکل تھا۔ وہ چاروں ہی پوری توجہ سے ٹی وی دیکھنے لگے۔ جو تفصیلات سامنے آئیں، ان کے مطابق بھائی جی نے پنکھے سے پھندا لگا کر خودکشی کی تھی۔ لاش سب سے پہلے اس کے ذاتی ملازم نے دیکھی تھی جو یہ معلوم کرنے اس کے کمرے میں گیا تھا کہ سونے کے اوقات نہ ہونے کے باوجود بھائی جی پچھلے دو گھنٹے سے کوئی کال کیوں اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔ پولیس نے جو ابتدائی تحقیق کی تھی، اس کے مطابق کمرے کی ہر چیز ترتیب سے موجود تھی اور ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے جس سے گمان کیا جاسکے کہ اس خودکشی میں کسی دوسرے فرد کا ہاتھ ہے۔ البتہ اتنا ضرور بتایا گیا تھا کہ بھائی جی نے خودکشی سے

قبل بڑی مقدار میں شراب نوشی کی تھی۔

حزن و ملال کی تصویر بنا عبدالرحمان خبروں میں نمایاں تھا جس نے نم آنکھوں کے ساتھ بتایا تھا کہ وہ صرف تین گھنٹے قبل بھائی جی کے ساتھ تھا اور اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ خودکشی کرسکتے ہیں۔ ہر نیوز چینل پر بھائی جی کی موت کی خبر تواتر سے نشر کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف طرح کے تبصرے کیے جارہے تھے۔ انڈر ورلڈ کے دو بڑے مخالفین کی اتنے کم وقفے سے اموات نے بھونچال سا پیدا کردیا تھا۔ سوالات اٹھائے جارہے تھے کہ یہ اموات کسی سازش کا نتیجہ ہیں یا محض اتفاق؟ ان حالات میں جبکہ بھائی جی ممبئی کا بے تاج بادشاہ بننے جارہا تھا، ایسے کیا اسباب بنے کہ وہ خودکشی پر مجبور ہوگیا؟ بھائی جی کی خودکشی کے عوامل پر غور و خوض کرنے کے ساتھ ساتھ دبی زبان میں یہ قیاس آرائیاں بھی کی جارہی تھیں کہ یہ خودکشی کے بجائے قتل بھی ہوسکتا ہے اور اس قتل کے محرکات میں اشوک کی موت کے بدلے سے لے کر کس کو بھائی جی کی موت سے زیادہ فائدہ پہنچے گا؟ ان ساری باتوں کا دبی زبان سے ہی سہی، جائزہ لیا جارہا تھا۔ ان چاروں کے لیے ہی یہ صورتِ حال نہایت گمبھیر اور عجیب تھی اور وہ بھی مختلف طرح کی باتیں سوچ رہے تھے۔

ان کی سوچوں اور تفکرات سے بے نیاز ماچھو ان کی مہمان داری کے انتظام میں مصروف تھا۔ آوازوں سے انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ ماچھو کے ساتھ اس کی بیوی بھی اس مکان میں موجود ہے جس نے مرغی ذبح کرنے کے دوران میاں کو بے شمار ہدایتیں دی تھیں۔ کمال یہ تھا کہ اس کی آواز بھی ماچھو کی طرح ہی کرخت اور پاٹ دار تھی اور چھوٹے سے گھر میں گونجتی پھر رہی تھی۔ وہ باقاعدہ ان کے سامنے نہیں آئی تھی لیکن اس نے ان سے پردہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ چاروں منہ ہاتھ دھونے اور دوسری ضروریات کے لیے ماچھو کی راہنمائی میں باتھ روم تک گئے تھے تو اس عورت سے بھی سامنا ہوا تھا۔ وہ ماچھو کے مقابلے میں خاصی کم عمر لیکن مضبوط ہاتھ پیروں کی دبنگ عورت معلوم ہوتی تھی۔ مرغی اس نے دیسی انداز میں مگر مزیدار بنائی تھی۔ وہ ذہنی طور پر الجھے ہوئے نہ ہوتے تو اس سے صحیح طور پر انصاف کرسکتے تھے لیکن ابھی تو صرف پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ہی کھاسکے تھے۔

"اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں صاحب؟" کھانے کے بعد ماچھو ایک بار پھر ان کے لیے چائے لے کر

آیا تو عاجزی سے دریافت کیا۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے وہ شہریار کی دوائیں ساتھ نہیں لے سکے تھے۔ سلو نے ماچھو سے ان کے بارے میں معلوم کیا کہ کیا وہ کسی میڈیکل اسٹور سے مل سکتی ہیں۔

"میڈیکل اسٹور جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ نام لکھ کر دے دو۔ ادھر بستی میں سے ہی سب مل جائے گا۔ ادھر کا ڈاکٹر بھی سارا حساب کتاب جانتا ہے۔ آپ بولو تو اسے یہاں لے کر آجاتا ہوں۔ اپنا ہی آدمی ہے۔" جواب میں ماچھو نے پیشکش کی لیکن انہوں نے صرف دواؤں کے نام لکھ کر دینے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ پرچہ لے کر باہر نکل گیا اور ان کی توقع کے خلاف صرف دس منٹ بعد ہی دواؤں کے ساتھ واپس آگیا۔ شہریار نے پانی کے ساتھ دوائیں کھالیں۔ زخموں کی مرہم پٹی دوبارہ کرنا فی الحال ضروری نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں انہوں نے ڈاکٹر فرحان اور کلام کو زبردستی سونے کے لیے لٹا دیا۔ بستر کا انتظام ماچھو کر گیا تھا۔ سلو اور شہریار بھی بستر پر نیم دراز ہو گئے۔ یہاں وقت گزاری کے لیے ان کے پاس ٹی وی دیکھنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ اچانک ہی وہاں ایک بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ اس نیوز کے مطابق بھائی جی کے دیرینہ ساتھی عبدالرحمان نے اس کی خودکشی کی وجہ تلاش کرلی تھی۔ وجہ پاکستان سے آنے والی ایک ای میل تھی جس کے مطابق پاکستان میں مقیم بھائی جی کی محبوبہ اگلی دنیا سدھار گئی تھی۔

اتنے دبنگ آدمی کی موت کی ایسی وجہ سامنے آنے پر بڑے بڑے مبصروں کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔ وہ خود بھی بھائی جی کی داستانِ عشق سے واقف تھے اس لیے وجہ سامنے آنے پر ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔ بھائی جی نے انہیں یہاں سے نکالنے کے جو وعدے وعید کیے تھے، اس کے لیے بس وہ عبدالرحمان سے امید کرسکتے تھے کہ وہ ان وعدوں کو ایفا کرے گا۔ آثار بھی ایسے ہی محسوس ہوتے تھے۔ آنے والی اس نئی خبر پر کچھ دیر تبصرہ کرنے کے بعد بالآخر وہ دونوں بھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ شہریار اور سلو کو تو نہ جانے کتنے گھنٹوں بعد سونا نصیب ہوا تھا چنانچہ وہ بہت گہری نیند سوئے۔ رات کے آخری پہر آہٹوں پر ان کی آنکھیں کھلیں۔ وہ عبدالرحمان تھا جو ان سے ملنے آیا تھا۔

"تم لوگوں کی نیند ڈسٹرب کی اس کے لیے سوری... پر اپن سالا بھی کیا کرتا۔ میڈیا والے ایسے جونک موافق چمٹ گئے تھے کہ جان چھڑانا مشکل ہوگئی۔ فرصت ملتے ہی سب سے پہلے ادھر آیا ہوں۔ معلوم ہے تم لوگ بھی اس سچویشن پر بڑا پریشان ہوگا۔" ان کے قریب ہی بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے اس نے بولنا شروع کردیا۔

"ہاں، ہم پریشان تو تھے لیکن تمہاری مصروفیت کا بھی اندازہ تھا۔ بھائی جی کی اچانک موت کا بہت افسوس ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس سانحے پر بہت ڈسٹرب ہو گے۔ بھائی جی کے بعد تو ساری ذمے داری تمہارے سر پر ہی آگئی ہوگی نا۔ اس موقع پر پبلک کو سنبھالنا، گینگ کو منظم رکھنا اور میڈیا سے نمٹنا واقعی آسان نہیں ہے۔" شہریار نے ہمدردانہ لہجے میں بولتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔ وہ تھکا ہوا ضرور تھا لیکن غم زدہ نظر نہیں آرہا تھا جو کہ بھائی جی کے قریب ترین ساتھی کی حیثیت سے اسے نظر آنا چاہیے تھا بلکہ اسے تو یوں محسوس ہوا تھا کہ اس کی بات سنتے ہوئے عبدل کے ہونٹوں پر مبہم سی پُراسرار مسکراہٹ بھی چمکی تھی۔

"اپن اس سارے لفڑے سے نمٹ لے گا۔ ایک نہ ایک دن تو ایسا ہونا ہی تھا۔ تم لکی ہو کہ ٹائم پر ہوگیا ورنہ تمہارے لیے ادھر سے نکلنے کے راستے اور بھی تنگ ہو جاتے۔" عبدالرحمان کے یہ الفاظ انکشاف کا درجہ رکھتے تھے لیکن بہت کچھ وضاحت طلب تھا جو اس نے ان کے سوالوں پر واضح کیا۔

"اپن کے دھندے کا رول ہے کہ کام کوئی بھی پکڑے پھر سامنے والی پارٹی سے چیٹنگ نہیں کرتا ہے۔ اپن تم لوگوں کا احسان مند تھا کہ ایک موقع پر تم نے ہمارا مدد کیا تھا۔ بعد میں تمہارا بھائی جی سے بھی ڈیلنگ ہوگیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر تم اشوک کا کانٹا نکال دیتا ہے تو وہ تم کو تمہارے ساتھیوں سمیت ادھر سے نکال دے گا لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی۔ اپن کو بتائے بغیر را والوں سے کانٹیکٹ کیا اور اس سالے بھنا گرے ڈیلنگ کرلیا کہ اگر را اس کو اشوک کے کیس سے الگ کردیتی ہے تو وہ دو پاکستانی دہشت گردوں کو گرفتار کرنے میں اس کی مدد کرے گا۔ اس نے سارا سیٹنگ ایسے بنایا کہ تم کو شک ہی نہ ہو کہ اس کام میں اس کا ہاتھ ہے۔ بعد میں جب اپن کو پتا چلا کہ ایسا لفڑا ہوگیا ہے تو اپن بہت گرم ہوا اور بھائی جی کو اپنے دھندے کے اصول یاد دلائے لیکن وہ سالا اپن کی بات کو ایسے ٹال دیا جیسے اپن کوئی سڑک چھاپ غنڈا ہو۔ بولنے لگا عبدل اتو ملازم ہے، ملازم رہ مجھے ڈکٹیشن مت دے۔ اپن نے بھی فیصلہ کرلیا کہ اسے بتا دے گا کہ عبدل کے بغیر وہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے پاس باس کی کرسی ضرور تھی لیکن اسے اس کرسی پر جمائے رکھنے والا تو عبدل تھا نا؟ گینگ میں چند کو چھوڑ کر

کون ہوگا جو عبدل کی بات پر بھائی جی کی بات کو اہمیت دے۔ سب سالا لوگ جانتا ہے کہ جو عبدل بھائی بولے، وہی کرنے کا ہے، پر بھائی جی کو یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ نمک حلالی کے واسطے اپن نے بہت سر پھوڑا، پر وہ نہ مانا۔ تم دونوں بھنا گر کی قید سے نکل کر جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے، وہاں بھائی جی کے بندے نے تمہیں دیکھ کر اطلاع دے دی تھی۔ جب تم نے اپن کو وہاں سے فون کیا تو اپن تمہیں وہاں سے نکالنے کی ترکیب ہی کر رہا تھا، پر بھائی جی پہلے ہی پارٹی تیار کرکے تمہیں پکڑنے بھیج چکا تھا۔ آگے تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ میرے آدمیوں نے کتنی مشکل سے تمہیں وہاں سے نکالا اور یہاں پہنچا دیا۔" وہ آنکھیں پھاڑے یہ ساری داستان سن رہے تھے۔ ممبئی کے ایک ڈان کا نمبر ٹو ان کی خاطر اپنے باس کے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ عجب ہی انہونی ہوئی تھی لیکن جرائم کی دنیا کا طریقہ کار دیکھا جائے تو یہ اتنی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔ یہاں پر نمبر ٹو کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نمبر ون کی جگہ لے لے۔ اس کے لیے وہ اندرونِ خانہ کوشش بھی کرتا رہتا ہے جیسا کہ عبدالرحمان بھی یقیناً کرتا رہا تھا اور بھائی جی کے وفاداروں کو اپنا وفادار بنا رکھا تھا۔ نمبر ون کی جگہ لینے کے لیے ہر طرح سے تیار عبدالرحمان کو بہانہ بھائی جی نے خود فراہم کردیا۔ اس نے اپنے باس ہونے کے زعم میں عبدالرحمان کی انا کو ٹھیس پہنچائی اور پیمانہ چھلک پڑا۔ اگر بھائی جی اس موقع پر نرمی اور مصلحت سے کام لیتا تو ممکن تھا گاڑی کچھ برس اور بھی چل جاتی لیکن اب تو وقت اپنی چال چل چکا تھا۔

"ان حالات میں کیا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بھائی جی کی موت خودکشی کے بجائے قتل تھی؟" عبدالرحمان کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے شہریار نے اس سے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ تم لوگ لکی ہو۔ تمہاری لک نے اپن کا کام آسان کردیا۔ بھائی جی کی داستانِ عشق تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ سچ مچ اپنی محبوبہ پر بہت مرتا تھا اور اتفاق دیکھو کہ یہ سارا چکر شروع ہوا تو اس کے مرنے کی خبر آگئی۔ خبر سن کر وہ بہت اداس ہوا اور غم غلط کرنے کو شراب پر شراب چڑھانے بیٹھ گیا۔ اپن کو اس کا دکھ برداشت نہیں ہوا اور اسے مکتی دلا دی۔ محبوبہ کے ساتھ ساتھ ویزا لگنے پر وہ تو خوش ہی ہوا ہوگا نا؟ اوپر دونوں کی روحوں کا ملن ہوگیا ہوگا اور اس سے بڑھ کر اپن اس کے لیے کیا کرسکتا تھا؟" بھولی صورت کے ساتھ یہ سوال کرتا ہوا عبدالرحمان انہیں اپنا ایک اور روپ دکھا گیا تھا ورنہ اب تک تو وہ اسے بھائی جی کے وفادار کے طور پر ہی دیکھتے آئے تھے۔

"تم نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ہمیں تمہارے ان معاملات سے کچھ لینا دینا بھی نہیں ہے۔ میں تو تم سے بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم ہم سے کیا وعدہ پورا کرو گے یا ہمیں اپنے طور پر کچھ بندوبست کرنا ہوگا؟" مقامی حالات سے

ان کا کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے شہریار نے براہِ راست اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حوالے سے سوال کیا۔

''اگر کچھ کرنے کا نہیں ہوتا تو تم لوگوں کو یوں مارا ماری کرکے یہاں تک لاتے ہی کیوں؟ اپنے پورے چار بندے کام آگئے ہیں تمہیں وہاں سے نکال کر لانے میں۔ آگے بھی بہت کچھ دیکھنا پڑے گا۔ پر تم پھکر مت کرو۔ ادھر تم ایک دم محفوظ ہے۔ اس بستی کا بچہ بچہ تمہاری حفاظت کرے گا۔ کسی مائی کے لال میں اتنا دم نہیں ہے کہ عبدل کی اجازت کے بغیر اس بستی میں قدم رکھ سکے۔ اگر کوئی غلطی سے آبھی گیا تو ادھر وہ زبان نہیں ہے جو تمہارے بارے میں ایک شبدھ بھی اگل سکے۔'' اس نے سینہ ٹھونک کر دعویٰ کیا۔

''تم ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے کیا انتظام کررہے ہو؟ کیا ہمیں سمندر کے راستے سے بھیجنے والے ہو؟'' شہریار کے لیے مطمئن ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔

''ایک دم ٹھیک سمجھا تم نے۔ ابھی تفصیل میں جانے کا ٹیم نہیں ہے۔ اپن کو واپس بھی جانا ہے۔ کفن دفن کا سارا انتظام اپن کو ہی دیکھنا ہوگا، پر تم فکر نہ کرو... تمہارا کام بھی چالو ہے۔ بیس بائیس گھنٹے سے زیادہ تمہیں ادھر نہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ اپن ایک بار پھر تم سے کہتا ہے کہ بے پھکر ہوکر رہو۔ کھاؤ پیو اور خوب دل بھر کر آرام کرو تاکہ آگے سفر کے لیے فریش ہوجاؤ۔'' وہ بلا کا پُراعتماد تھا اور اس کے انداز سے لگتا تھا کہ واقعی ہر چیز اس کے کنٹرول میں ہے۔

''تم کہتے ہو تو ہم بے فکر ہوجاتے ہیں۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ہمارے لیے یہ زندگی اور موت سے بھی بڑھ کر معاملہ ہے۔ ہماری جانیں چاہے چلی جائیں لیکن ہمیں ڈاکٹر صاحب کو یہاں سے بحفاظت نکالنا ہے۔'' شہریار نے اسے احساس دلایا تو وہ جواب میں اس کا شانہ تھپک کر جانے کے لیے کھڑا ہوگیا پھر کچھ یاد آنے پر پلٹا۔

''وہ جو گاندھی نگر میں عائشہ نام کی لڑکی تم نے ڈیری فارم پر چھوڑی تھی، وہ بھی ادھر ممبئی آگئی ہے۔ اشوک کی موت کے بعد جو ہنگامہ ہوا تھا، اس کا فائدہ اٹھا کر میرے بندوں نے اسے گاندھی نگر سے نکال دیا۔ وہ تم لوگوں سے ملنا چاہتی تھی اس لیے وہ اسے ممبئی لے آئے لیکن میں نے اسے روک رکھا ہے۔ اگر تم چاہو تو تمہاری اس سے بات کروادی جائے گی۔'' اس موقع پر عائشہ کے بارے میں خبر سن کر وہ اپنی جگہ ہل کر رہ گیا۔ یہاں کے ہنگاموں میں عائشہ تو اس کے ذہن سے محو ہوگئی تھی۔ ان کی مدد کے جرم میں اس بے چاری نے بڑا نقصان اٹھایا تھا۔ اس کی تو زندگی ہی الٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کا شوہر کمال جس کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، جان سے چلا گیا تھا اور وہ ہاسٹل میں مقیم اپنی اکلوتی بیٹی سے بھی محروم ہوگئی تھی کہ اس سے رابطہ کرنے کی صورت میں خود نظروں میں آجاتی اور پاکستانی دہشت گردوں کی مدد کرنے کے جرم میں ذلت و رسوائی کے ساتھ ساتھ شدید سزا بھی بھگتنی پڑتی۔ اس عائشہ کو وہ بیچ منجدھار میں چھوڑ کر کیسے جاسکتے تھے۔

''اس سے میری بات کروادینا۔'' فیصلہ پل میں ہی ہوگیا۔ عائشہ اس سے جو بھی مطالبہ کرتی، اسے تسلیم کرنا تھا کہ اس کا قرض اتارنے کی یہی ایک صورت تھی۔

☆☆☆

پاکستان کے ایک اہم ائربیس پر دہشت گردوں کے حملے کی خبر بہت حیرت اور دکھ کے ساتھ سنی گئی۔ حملہ کرنے والے دہشت گرد بے حد تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس تھے اور انہوں نے اتنی منصوبہ بندی اور ہوشیاری سے یہ کام کیا تھا کہ لگتا تھا وہ وہاں کے چپے چپے سے پوری طرح واقف ہوں۔ انہیں اس کمزور پوائنٹ کے بارے میں بھرپور آگہی تھی جہاں سے وہ ائربیس پر داخل ہوسکتے تھے۔ وہ نہ صرف نہایت آسانی سے ان ممنوعہ حدود میں گھس گئے تھے بلکہ اپنے لیے کئی مضبوط مورچے حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے تھے۔ حملے کے پہلے ہی گھنٹے میں انہوں نے وہاں کھڑے جنگی جہازوں میں سے ایک کو مکمل طور پر تباہ کردیا تھا جبکہ دوسرے کو جزوی نقصان پہنچا تھا۔ وہاں موجود سپاہی اور افسران ان دہشت گردوں سے نمٹنے کی بھرپور کوشش کررہے تھے لیکن انہیں شدید مزاحمت کا سامنا تھا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ اپنے تین جوانوں کی شہادت کے ساتھ کئی کے زخمی ہونے کا صدمہ اٹھا چکے تھے۔ تمام حساس اداروں کو فوری طور پر اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ کرنل توحید تک بھی جو اتفاق سے لاہور میں ہی سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے، یہ خبر پہنچائی گئی۔ فوراً ہی وہاں ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی اور نقشوں کی مدد سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جانے لگی کہ حملہ کس طرف سے ہوا ہوگا۔

عمر فاروق بھی اس میٹنگ میں شامل تھے۔ انہوں نے تمام جزئیات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں اس وقت ہمارے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ فی الحال ہم ائربیس کو دشمن کے آدمیوں سے خالی کروائیں اور اپنی سالمیت پر پڑنے والی اس کاری ضرب کا بھرپور جواب دیں۔ ہمیں حالات پر کنٹرول پانے میں جتنی دیر لگے گی، اتنا ہی ہمارا امیج خراب ہوگا۔ ایک طرف دہشت گردوں کے حوصلے بلند ہوں گے تو دوسری طرف عوام کا مورال گرے گا اور وہ سوچیں گے کہ جو فورسز اپنی حفاظت نہیں کرسکتیں، وہ ملک و قوم کے لیے کیا کریں گی۔''

عمر فاروق کی بات دلیل سے پر تھی، چنانچہ کرنل صاحب بھی غصہ چھوڑ کر عملی اقدامات میں مصروف ہوگئے۔ ان سے درپردہ تعاون کرنے والے بہت لوگ تھے۔ انہوں نے سی ایف پی جیسے خفیہ ادارے کی بنیاد یونہی تو نہیں رکھی تھی چنانچہ جب انہوں نے کام شروع کیا تو تمام مطلوبہ معلومات و تفصیلات منٹوں میں ان تک پہنچنے لگیں۔ ہیڈ کوارٹر میں موجود ہر فرد اس وقت بے حد مصروف تھا۔ فون کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دھڑا دھڑ فیکس اور ای میلز موصول ہورہی تھیں۔ اس سارے عمل کی کرنل صاحب خود نگرانی کررہے تھے۔ ذیشان، عمر فاروق اور ان کے دیگر ساتھی بھرپور معاونت کررہے تھے۔ کرنل صاحب نے اپنے تعلقات کی بنیاد پر ہی یہ منظوری حاصل کرلی تھی کہ اس معاملے کو سی ایف پی بھی ہینڈل کرنے میں مدد کرے گی۔ آپریشن کے لیے درکار تمام اسباب و وسائل کا انتظام کیا جارہا تھا۔ وہ لاہور سے دو ٹیموں کی شکل میں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے روانہ ہوئے تو ان میں سے ایک ٹیم کو وزیرآباد نامی گاؤں میں جبکہ دوسری کو جمال پورہ میں اترنا تھا کیونکہ انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی گاؤں سے ہی ائربیس تک رسائی حاصل کی گئی ہوگی۔

رات کے اندھیرے میں ہیلی کاپٹرز کی یہ پرواز خطرناک تھی لیکن ماہر پائلٹس نے کامیاب لینڈنگ کی۔ ائربیس پر جاری فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں اردگرد کے دیہاتوں تک پہنچ رہی تھیں اور وہاں کے لوگ خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ عورتیں گھروں کے اندر اپنے بچوں کو گودوں میں چھپائے بیٹھی تھیں تو مرد ہراساں سے باہر ٹولیوں کی شکل میں جمع تھے اور اس نہ سمجھ آنے والی صورت حال پر مختلف تبصرے کررہے تھے۔ سی ایف پی کے افراد کے علاوہ بھی وہاں فورسز کے دوسرے افراد موجود تھے جن کے گھیرے کی وجہ سے دیہاتی ایک حد سے آگے بڑھ کر ائربیس کی طرف نہیں جاسکتے تھے۔ جمال پورہ میں اترنے والی ٹیم میں جاوید علی اور سلمان بھی شامل تھے۔ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ دہشت گردوں کی طرف سے پاکستان کی مختلف جیلوں میں بند پانچ ایسے دہشت گردوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے جنہیں پچھلے چھ ماہ میں گرفتار کیا گیا تھا اور ان پر جاسوسی، بم دھماکوں اور اغوا جیسے سنگین جرائم کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔ اپنا مطالبہ پورا نہ کیے جانے کی صورت میں انہوں نے ائربیس پر موجود دیگر طیاروں کو بھی تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔

''یہ بڑی عجیب سی سچویشن سامنے آئی ہے۔ اتنا بڑا اور منظم حملہ صرف پانچ دہشت گردوں کو رہا کروانے کے لیے کرنا میرے نزدیک تو حماقت ہے۔ اس کے مقابلے میں تو یہ کہیں آسان ہوتا کہ یہ لوگ کسی عوامی ادارے پر قبضہ کرکے وہاں کے لوگوں کو یرغمال بنالیتے یا پھر جیل توڑ کر اپنے آدمی آزاد کروانا بھی آسان رہتا۔ آخر ان لوگوں نے یہ راہ ہی کیوں اختیار کی؟'' جاوید علی کے قریب موجود سلمان نے ملنے والی اطلاع پر تبصرہ کیا۔

''مجھے بھی یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔ جس انداز سے حملہ ہوا ہے، وہ کسی مقامی تنظیم کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں بڑی طاقتیں انوالو ہوں گی اور ظاہری مقصد سے زیادہ اصل مقصد دنیا کو یہ باور کروانا ہوگا کہ پاکستان میں سیکیورٹی کی صورت حال کتنی ناقص ہے۔ پھر بعد میں یہ ایشو اٹھایا جائے گا کہ اتنی نااہل فورسز رکھنے والے ملک کو ایٹم بم جیسا خطرناک ہتھیار رکھنے کی اجازت دینا دنیا کے امن کے لیے نقصان دہ ہے۔ دہشت گرد کبھی بھی اسی انداز میں کہوٹہ تک بھی رسائی حاصل کرلیں گے اور پھر دنیا میں قیامت برپا ہوجائے گی۔'' وہ دونوں طے شدہ پروگرام کے تحت محتاط روی سے اس برساتی نالے کی طرف بڑھ رہے تھے جس کے ساتھ ساتھ قائم ائربیس کی باؤنڈری وال میں نقب لگا کر دہشت گردوں نے

وہاں تک رسائی حاصل کی تھی۔
پشت پر بندھے تھیلوں کے ساتھ کیے جانے والے اس پیدل سفر میں انہوں نے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا۔ جاوید علی کی پشت پر اس کے تھیلے کے علاوہ سرفنگ بورڈ بھی نظر آرہا تھا جو اس نے خود فرمائش کرکے اپنے لیے منگوایا تھا۔ سلمان کے علاوہ اس کے دوسرے ساتھی مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر اپنا طے شدہ کردار ادا کرنے مختلف سمتوں میں روانہ ہوگئے تھے۔ وہ برساتی نالے کے قریب پہنچے تو اس کی پرشور آواز پوری طرح سنائی دینے لگی۔ پچھلے دنوں بہت شدید بارشیں ہوئی تھیں اس لیے نالے میں خاصی طغیانی تھی۔ قریب پہنچ کر جاوید علی نے پیروں سے بورڈ باندھنے کا کام شروع کردیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ ایک اور خطرناک تجربہ کرنے جارہا تھا۔

آخرکار جاوید علی نے اپنا کام مکمل کیا اور نالے میں چھلانگ لگادی۔ آسمان پر موجود چاند کی مدھم روشنی میں سلمان نے اس کا ہیولا دیکھا۔ وہ متلاطم نالے کے پانی پر اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوگیا تھا اور نالے کے چوڑے پاٹ کو عبور کرنے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ وہ تقریباً وسط میں پہنچا ہوگا کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ گولی کی آواز کے ساتھ ہی وہ جس طرح جھکا، سلمان کو لگا کہ وہ گولی کی زد میں آگیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ایک شاندار قلابازی لگائی اور وہ اپنی سابقہ پوزیشن سے کافی دور چلا گیا۔ اس دوران میں سلمان اندازہ لگاچکا تھا کہ فائر کس طرف سے کیا جارہا ہے۔ وہ عقبی دیوار کے قریب موجود واچ ٹاور تھا جہاں سے کسی فرد نے فائرنگ کی تھی اور اب بھی مسلسل کررہا تھا۔ مستقل ایک ہی ہتھیار کے استعمال کی وجہ سے سلمان سمجھ گیا کہ وہ شخص تنہا ہے۔ ظاہر ہے انہیں اس طرف سے کسی کی آمد کی امید کم ہی ہو گی اس لیے ایک آدمی بھی کافی سمجھا گیا ہوگا۔ پھر وہ آدمی تھا بھی بہترین پوزیشن پر وہ وہاں سے دور دور تک نظر رکھ کر آنے والوں کو روک سکتا تھا۔ فاصلہ بہت زیادہ ہونے کے باوجود سلمان نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے اپنی رائفل سے فائرنگ کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس کی یہ ترکیب کسی حد تک کارگر رہی اور اس آدمی نے آوازوں سے اس کی موجودگی کی سمت کا اندازہ لگا کر جوابی فائر مارا۔ اس دوران جاوید علی کو کچھ اور آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔

”عقبی واچ ٹاور پر ایک آدمی موجود ہے اور ہماری طرف فائرنگ کررہا ہے؟“ سلمان نے اپنے آپریٹس پر یہ خبر آگے بڑھائی۔

”اس کی توجہ اپنی طرف کیے رکھو۔ ہم اسے نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ اسے یہ جواب دینے والے عمر فاروق تھے جو ان کی ٹیم کے ساتھ جمال پورہ آئے تھے، وہی اس ٹیم کو کمانڈ کررہے تھے۔ سلمان جو پہلے ہی فائرنگ کے ذریعے واچ ٹاور پر موجود بندے کو ڈسٹرب کررہا تھا، ان کی ہدایت پر مزید شدت سے فائرنگ کرنے لگا۔ ادھر جاوید علی کا بھی پانی پر سفر جاری تھا۔

اسے اندازہ تھا کہ جیسے جیسے فاصلہ کم ہوگا، واچ ٹاور والے کے لیے اسے نشانہ بنانا آسان ہوتا جائے گا لیکن اس ڈر سے وہ اپنا سفر نہیں روک سکتا تھا بلکہ ڈر تو شاید سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہاں تو پھر اس جنون نے پنجے گاڑ لیے تھے کہ وطن کے دشمنوں کو ان کے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ اس جنون میں وہ اس گولی کو بھی خاطر میں نہیں لایا جو اس کے کان کی لو کو تقریباً چھو کر گئی تھی اور جس کی گرماہٹ اس نے بہت اچھی طرح محسوس کی تھی۔ اگر صرف ایک انچ کا فرق پڑ جاتا تو گولی اس کی کنپٹی میں اتر سکتی تھی۔ اس نے تیزی سے قلابازی لگا کر اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کا توازن بگڑا اور وہ خود کو تندی سے بہتے پانی پر جمائے رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ عین اسی وقت اس نے فضا میں ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ وہ جانتا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے ساتھ عمر فاروق موجود ہیں چنانچہ فوراً ان سے مخاطب ہوا۔

”اسے ہٹ مت کیجیے گا سر! بس میرے پہنچنے تک الجھائے رکھیں۔“

”اوکے۔“ عمر فاروق نے اسے جواب دیا۔ ساتھ ہی ہیلی کاپٹر فضا میں بلند نظر آنے لگا۔ ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر واچ ٹاور والے کے اوسان یقینی طور پر خطا ہوئے اور وہ جاوید علی کو بھول کر اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ ہیلی کاپٹر کو مار گرائے لیکن ماہر پائلٹ نے اسے محفوظ فاصلے پر رکھا ہوا تھا اور مہارت سے بار بار اس کا رخ بدل لیتا تھا۔ پائلٹ کے ساتھ موجود عمر فاروق کی گن شعلے اگل اگل کر واچ ٹاور والے کو ڈرا رہی تھی کہ وہ کسی بھی لمحے نشانہ بن سکتا ہے لیکن حقیقتاً انہوں نے ایک بھی ایسا فائر نہیں کیا تھا جو اسے نشانہ بنا سکے بلکہ فاصلے کی وجہ سے اسے نشانہ بنا ہی نہیں سکتے تھے... ہاں، اپنے لائحہ عمل سے

انہوں نے اسے گھن چکر ضرور بنا کر رکھ دیا تھا۔ چند منٹوں کے اس کھیل میں جاوید علی بہت تیزی سے نالا عبور کر کے باؤنڈری وال کے اس حصے تک پہنچ چکا تھا جہاں سے دہشت گردوں نے نقب لگائی تھی۔ باؤنڈری وال سے واچ ٹاور تک کا فاصلہ طے کرنا بھی اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ اوپر پہنچا تو سرتاپا سیاہ لباس میں ملبوس نقاب پوش ہیلی کاپٹر سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپریٹس پر مسلسل کسی کو پکار رہا تھا لیکن دوسری طرف سے اسے کوئی جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔

''بس اب ہتھیار پھینک دو۔۔۔ یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔'' اس نے اپنی گن کی نال نقاب پوش کی کھوپڑی سے لگاتے ہوئے کہا۔ یہ گن اس نے باؤنڈری وال سے اندر داخل ہونے سے قبل اپنے بیگ سے نکالی تھی جبکہ سرفنگ بورڈ کو وہ نالے کے قریب ہی اتار کر پھینک آیا تھا۔

نقاب پوش نے سر سے لگی گن کے باوجود اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور بھڑک کر اس کی طرف پلٹا لیکن جاوید علی اسے اتنی مہلت دینے والا نہیں تھا کہ وہ اس پر فائر کر سکے۔ اس نے اپنی گن کو پوری قوت سے اس کے ہاتھ پر مارا، نتیجتاً ہاتھ کے زخمی ہونے کے ساتھ ہی وہ نہتا بھی ہو گیا۔ پھر بھی اس نے کمال جرأت سے کام لیا اور خالی ہاتھ ہی اس سے بھڑ گیا۔ جاوید علی اسے گولی مار سکتا تھا لیکن مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہ شخص زندہ درکار تھا چنانچہ خود بھی گن ایک طرف اچھال کر اس کے حملے کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ نقاب پوش اپنے جسم کی پوری قوت صرف کر کے اسے واچ ٹاور سے نیچے دھکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خاصا توانا آدمی تھا اور جاوید کا وزن اس کے مقابلے میں کہیں کم تھا لیکن اس موقع پر اس نے ہوشیاری سے کام لیا اور نقاب پوش کے پیٹ میں تابڑ توڑ کئی ایسے مکے مارے کہ اس کی قوت کم ہو گئی اور وہ اپنے بچاؤ کی کوشش کرنے لگا۔ اس موقع پر جاوید نے اپنے سر سے اس کی ناک کو نشانہ بنایا۔ وار کاری تھا چنانچہ اس کی ناک سے خون بہہ کر نقاب کو تر کرنے لگا۔

جاوید علی کے بازو اس کی گرفت سے آزاد ہو گئے اور پل بھر کے لیے اسے یوں لگا کہ وہ شخص چکرا کر گرنے والا ہے لیکن یہ صرف ایک دھوکا تھا۔ اس نے گرتے گرتے بڑی ہوشیاری سے ٹانگ کے ساتھ بندھا خنجر کھینچ نکالا تھا۔ جاوید علی کو لمحے بھر کے لیے خنجر کی چمک دکھائی دی اور پھر اس کے بازو میں درد کی لہری دوڑ گئی۔ اگر وہ خودکار ردعمل کے طور پر دائیں جانب جھک نہ گیا ہوتا تو خنجر سیدھا اس کے دل میں ہی اترتا۔ اس جان لیوا حملے سے بچنے پر وہ ایسے شیر کی طرح بھڑک اٹھا جس پر کسی نااہل شکاری نے گولی چلا کر اسے زخمی کر دیا ہو۔ اپنے ان بپھرے ہوئے تیوروں کے ساتھ وہ نقاب پوش پر جھپٹا تو پھر وہ اسے سہار نہ سکا۔ جاوید علی کے حملوں میں اتنی تیزی تھی کہ وہ دفاع کی کوشش میں نڈھال ہو گیا لیکن نہ تو دوبارہ اس پر حملہ کر سکا اور نہ ہی اپنے دفاع میں کامیاب رہا۔ جلد ہی اس نے ہاتھ پیر ڈال دیے۔

''میں نے اسے قابو کر لیا ہے سر۔'' اس نے غیر متوازن سانسوں کے دوران عمر فاروق کو اطلاع دی۔

''ہم دیکھ چکے ہیں جوان۔ تم وہیں ٹھہرو۔ ہم تمہاری مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں۔'' انہوں نے اسے جواب دیا تو وہ مطمئن ہو کر پہلی بار اپنے بازو کے زخم کی طرف متوجہ ہوا۔ خنجر گوشت میں اچھا خاصا اتر گیا تھا اور زخم سے متواتر خون بہہ رہا تھا۔ خون روکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ انتظار کرنے لگا۔ ائربیس کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں لیکن ہر فرد کا دائرہ کار طے کر دیا گیا تھا اور وہ یہاں سے ہٹ کر کہیں اور دخل اندازی کرنے کی اجازت نہیں رکھتا تھا۔ ویسے بھی بے ہوش شخص کو عمر فاروق کے حوالے کرنے سے پہلے اس کا یہاں سے ہٹنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ جلد ہی وہ اس تک پہنچ گئے۔

''آرمی نے ائربیس کو تقریباً کلیئر کروا لیا ہے۔ اس بندے کو ہم اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ اس سے ہمیں بہت سی اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں لیکن خیال رہے کہ کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے پائے۔ دہشت گردوں کے لیے یہ شخص ہمارے سے زیادہ قیمتی ہے۔ اپنے راز کی حفاظت کے لیے وہ اسے ہم سے چھیننے یا اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔'' بے ہوش حالت میں گرفتار شخص کو پوری چابک دستی سے ہیلی کاپٹر میں منتقل کرنے کے دوران عمر فاروق نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دی جس پر سب نے بیک زبان ''یس سر'' کہا۔

''جاوید! تم زخمی ہو، اس لیے ہیلی کاپٹر میں قیدی کے ساتھ واپس جاؤ گے۔ میں اور باقی ٹیم یہاں کے معاملات نمٹا کر بعد میں واپس آئیں گے۔'' ان کا دوسرا حکم نامہ جاوید علی کے لیے تھا جس پر عمل کرنے میں اسے اس لیے اعتراض نہیں تھا کہ وہ اپنے حصے کا کارنامہ انجام دے چکا تھا اور اطلاعات مل رہی تھیں کہ حالات اب انڈر کنٹرول ہیں، جلد ہی سب کلیئر کر لیا جائے گا۔

☆☆☆

ماہ بانو نیویارک میں مراد شاہ کے اپارٹمنٹ میں سکون سے رہ رہی تھی۔ وہ یہاں پہنچی تھی تو بہت دکھی اور شکستہ حال تھی۔ شاہدہ نے پورے خلوص سے اس کی دل جوئی اور خدمت کی۔ ننھی عالیہ بھی اس کا دل بہلانے کا ایک سبب بنی۔ اپنی پیاری پیاری باتوں سے وہ گھنٹوں اس کا دھیان بٹائے رکھتی اور اکثر کوئی نہ کوئی ایسا معصومانہ جملہ بول دیتی کہ ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ در آتی۔ پھر اس کا اپنا بیٹا بھی تھا جس کا جسمانی عیب اسے دکھی کرتا تو دوسری طرف وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتی کہ اتنے نامساعد حالات میں بھی اس مالک نے اس کے بچے کی زندگی محفوظ رکھ کر اسے جینے کا جواز مہیا کر دیا تھا۔ وہ یہاں آئی تھی تو بالکل گم صم تھی، یہاں تک کہ بچے کا نام بھی نہیں رکھ پائی تھی۔ شاہدہ نے اس طرف اس کا دھیان دلایا اور ساتھ ہی اصرار بھی کیا تو اس نے بہت سوچ سمجھ کر اس کا نام مجاہد رکھا۔ وہ بچہ دنیا میں آنے سے قبل ہی اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتا رہا تھا اور نہ جانے ماں کے شکم میں جاری اس جہدِ مسلسل کے دوران کن کن مراحل سے گزرا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ ناکارہ ہو گیا تھا۔ ماہ بانو جانتی تھی کہ آگے بھی اسے اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی ہو گی۔ اس کے کچھ نادیدہ دشمن تھے جو شاید اسے ماں کی گود کی گرمی سے محروم کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ ان دشمنوں سے بچ جاتا تو بھی اسے نارمل لوگوں میں اپنے وجود کو تسلیم کروانے کے لیے سخت محنت و جدوجہد کرنی پڑتی اس لیے اس کا نام مجاہد بالکل ٹھیک تھا۔

اس کے نیویارک واپس آنے کے چار دن بعد مراد شاہ بھی واپس آ گیا۔۔۔۔ اس سے انہیں وہ خبریں ملیں جو۔۔۔ ٹی وی مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ خبروں سے انہیں یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ جنگل میں لگی آگ پر قابو پا لیا گیا ہے اور آگ لگنے کی وجوہات کا کھوج لگایا جا رہا ہے۔ جنگل میں زیرِ زمین کسی خفیہ لیبارٹری کے وجود کو تو ظاہر ہے وہ تسلیم نہیں کرنے والے تھے اس لیے ان کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہاں ہونے والے دھماکوں کی خبر میڈیا کو دیتے۔ ان حالات میں زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ آگ لگنے کی وجہ قدرتی عوامل کو قرار دیا جائے گا۔ البتہ درونِ خانہ جو کارروائیاں چل رہی تھیں، ان کی خبریں مراد شاہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ آگ بجھنے اور اس کی حدت کم ہونے کے انتظار میں امریکی تحقیقی اداروں کو کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ اگرچہ انہوں نے ایڈی اور ڈاکٹر طارق کی لاشوں کے علاوہ بائیکس تک ابتدا میں ہی رسائی حاصل کر لی تھی لیکن یہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ لیبارٹری میں کیا گڑبڑ ہوئی ہے۔ ایڈی کے علاوہ انہیں باقی تجرباتی بچوں کی جھلسی ہوئی لاشیں بھی مل گئی تھیں۔ انہوں نے لیبارٹری کے تباہ ہو جانے اور پھر جل کر خاکستر ہو جانے کے باوجود بہت سے نتائج اخذ کر لیے تھے۔

اپنی تحقیقات سے وہ یہ بھی جان چکے تھے کہ جس وقت لیبارٹری تباہ ہوئی، پروفیسر ہنری وہاں موجود نہیں تھا لیکن وہ پروفیسر اور اسلم کی دلدل میں دھنس جانے والی لاشیں دریافت نہیں کر سکے تھے۔ اس بارے میں جو چند لوگ آگاہ تھے، ظاہر ہے وہ انہیں حقائق سے آگاہ کرنے والے نہیں تھے اور کوئی اتفاق ہی آنے والے وقت میں ان لاشوں کو منظر پر لا سکتا تھا۔ بہرحال، وہ یہ جان چکے تھے کہ اس حادثے سے پہلے ماہ بانو وہاں سے نکل چکی تھی کیونکہ وہاں انہیں اس کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں ملے تھے۔ اس انکشاف پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ سارا فساد ماہ بانو کو وہاں سے نکالنے کا تھا۔ چنانچہ اس کی تلاش میں انہوں نے سب سے پہلے مصطفیٰ خان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ظاہر ہے اس نے اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا اور بتایا کہ اسلم اور ماہ بانو کو اس نے ہم وطن ہونے کے ناتے اپنے پاس ملازمت اور پے انگ گیسٹ کی سہولیات ضرور دے رکھی تھیں لیکن وہ ان کی نجی زندگی۔۔۔ سے قطعی ناواقف تھا۔ ماہ بانو کے غیاب پر اس نے اخلاقی طور پر قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اسلم کی مدد بھی کی تھی لیکن اس سے آگے کے حالات سے وہ ناواقف تھا کہ ماہ بانو کا دیوانہ شوہر اسلم اپنی بیوی کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹکتا رہا اور اس نے کیا کچھ کیا۔

مصطفیٰ خان کے پاس اپنی کاروباری اور ملازماتی مصروفیات کی ایک طویل تفصیل تھی جس کی روشنی میں اس نے یہ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ اتنی مصروفیات کے بعد اس کے پاس کسی اور سرگرمی میں حصہ لینے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ مصطفیٰ خان ایک معزز آدمی تھا جو ایک اچھے عہدے پر ملازمت کرنے کے علاوہ نمایاں کاروباری شخصیت بھی تھا۔ اس اعتبار سے اس کے اونچے طبقے میں اچھے تعلقات بھی تھے اس لیے تحقیقاتی اداروں نے اس سے زبانی کلامی تو بہت سختی سے تفتیش کی لیکن دباؤ میں لینے میں ناکام رہے۔ البتہ اس کی خفیہ نگرانی کی جا رہی تھی جس سے مصطفیٰ خان ناواقف نہیں رہا تھا۔ پولیس والوں کا دوسرا نشانہ آفتاب اور کشور تھے جن کے دونوں ہی خاندانوں سے

دوستانہ مراسم تھے۔ ان دونوں میاں بیوی نے بھی یہی موقف اختیار کیا کہ وہ بے شک ماہ بانو کے اچانک غائب ہو جانے پر پریشان تھے لیکن پولیس سے مدد کی توقع رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اسلم کے بارے میں ان کا بھی یہی بیان تھا کہ ماہ بانو کو تلاش کرنے کے جنون میں وہ کہاں گیا انہیں اس کا کوئی علم نہیں۔

آفتاب معاشی طور پر کوئی بہت مضبوط آدمی نہیں تھا لیکن ایک صحافی تھا جس نے امریکا کے مقامی اخبارات میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی۔ ایک صحافی کو وہ غیر ضروری طور پر تنگ کرتے تو انہیں بھی عوام کو اس سوال کا جواب دینا پڑتا کہ جنگل کی آگ اور ماہ بانو اور اسلم کے غیاب کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اس لیے فی الحال ان کی طرف سے کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا گیا تھا لیکن سمجھنے والے سمجھ سکتے تھے کہ یہ صرف وقتی خاموشی ہے اور وہ لوگ اتنی آسانی سے چپ ہو کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اپنی کھوج کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لیے وہ ہر ہر امکان پر کام کرتے جیسا کہ انہوں نے اسٹور پر ماہ بانو اور اسلم کے کولیگز کو ٹٹولنا شروع کر دیا تھا اور ان سب باتوں سے ہٹ کر یہ جاننے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے کہ جنگل والے حادثے کے فوراً بعد ماہ بانو نے آرلینڈو سے نیویارک تک کا سفر کیا تھا لیکن اس کے بعد وہ تاریکی میں تھے اور انہیں اس بات کا پتا نہیں چل رہا تھا کہ نیویارک میں ماہ بانو کہاں گئی ہے۔

”وہ بہت اسمارٹ ہیں۔ تمہارے کیس میں چند اتفاقات نے انہیں حقائق تک پہنچنے میں تاخیر کا شکار کر دیا ہے لیکن وہ جس انداز سے کام کرتے ہیں، ہمیں ان سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ کسی بھی وقت یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ ابھی انہیں نہیں معلوم لیکن جلد وہ جان لیں گے کہ جن تاریخوں میں یہ سب کچھ ہوا، لگ بھگ انہی تاریخوں میں کشور کا بھائی مراد شاہ نیویارک سے آرلینڈو گیا تھا میرے پاس وہاں جانے کا جواز موجود ہے اور میں یہ بھی ثابت کر سکتا ہوں کہ تمام عرصے میں، میں اپنی کمپنی کی طرف سے مہیا کیے گئے ہوٹل کے کمرے میں ہی مقیم رہا اور میں تمہیں جانتا تک نہیں... بلکہ میرا تو خاندانی ناچاقی کی وجہ سے اپنے بہن بہنوئی سے بھی میل جول نہیں ہے لیکن وہ اتنی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ان پر اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہیں یہاں سے کہیں اور شفٹ کر دوں۔“ اسے حالات سے آگاہ کرنے کے بعد مراد شاہ نے اپنی رائے پیش کی تو وہ تھوڑی سی متوحش ہو گئی۔

”کہاں... اتنے چھوٹے بچے کے ساتھ میں اکیلی کہاں رہوں گی؟“ اس کا اندرونی اضطراب اس کے لہجے میں در آیا۔

”مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے لیکن تمہاری اور بچے کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔ میں تمہیں جس جگہ منتقل کروں گا، وہاں تمام ممکنہ سہولیات بھی فراہم کر دوں گا تا کہ تمہیں کسی بھی وجہ سے پریشان ہونا اور باہر نکلنا نہ پڑے۔“ مراد شاہ نے اسے تسلی دی۔

”پھر بھی وہ یہاں میرے اتنے دن قیام کا سراغ تو لگا سکتے ہیں؟“ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

”اس کے لیے بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ میں نے چیک کر لیا ہے کہ داخلی گیٹ پر نصب کیمرے نے تمہاری جو تصویر لی ہے، وہ واضح نہیں ہے اور کوئی بھی چادر اوڑھے مشرقی عورت ویسی ہی دکھائی دے سکتی ہے جیسی تم اس تصویر میں نظر آ رہی ہو۔ تمہارے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ شاہدہ کی ایک پاکستانی دوست بھی حال ہی میں ماں بنی ہے اور ہم نے اسے اس بات کے لیے راضی کر لیا ہے کہ وہ کسی پوچھ گچھ کے جواب میں یہ کہہ دے کہ ان تاریخوں میں وہ یہاں آئی تھی اور شاہدہ کی مہمان رہی تھی۔“ مراد شاہ کا ہوم ورک مکمل تھا۔ دراصل اسے کچھ مشورے مصطفیٰ خان نے بھی دیے تھے جن کی روشنی میں اس نے یہ سب ترتیب دے ڈالا تھا ورنہ بنیادی طور پر تو وہ سیدھے سیدھے راستے پر چلنے والا صاف ستھرے کردار کا آدمی تھا جس کا چالبازیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ اپنے چالباز و شاطر باپ سے وراثت میں کچھ نہیں لے سکا تھا۔

”میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں مراد شاہ صاحب! مجھے امید نہیں تھی کہ ان حالات میں آپ میری اس حد تک مدد کریں گے کہ خود کو مشکل میں ڈال لیں گے۔“ ماہ بانو نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس سب کے بدلے مراد شاہ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

”تمہیں میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے ماہ بانو! میں تو خود تمہارا مقروض ہوں اور بس اس قرض کا کچھ حصہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ یاسیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ماہ بانو کے سامنے اعتراف کیا۔ اس وقت صرف وہ دونوں ہی لاؤنج میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ شاہدہ کچن میں مصروف تھی جبکہ عالیہ مجاہد کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ چند دن کے بچے سے دنیا جہاں

کی باتیں کرنا ان دنوں اس کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تھا۔

”آپ شاید سانپ کے ڈسنے والے واقعے کا ذکر کر رہے ہیں لیکن وہ تو بہت معمولی سی مدد تھی جو انسانیت کے ناتے مجھے کسی بھی شخص کی کرنی ہی چاہیے تھی۔“ اپنی انگلی میں موجود زہر مہرہ پتھر انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ یہ انگوٹھی اسے ہمیشہ گل مینا کی یاد دلاتی تھی۔

”اس مدد کے حوالے سے بھی میں تمہارا مقروض ہوں لیکن اصل قرض تو مجھ پر اباجی نے چڑھایا ہے۔ کشور مجھے بتا چکی ہے کہ تمہاری زندگی کو یہاں تک لانے میں انہوں نے کتنا بھیانک کردار ادا کیا ہے۔ ان کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے میں خود کو تمہارا مجرم و مقروض تصور کرتا ہوں اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان حالات سے نکلنے میں تمہاری مدد کروں۔ اس کے لیے اگر مجھے کچھ مشکل اٹھانی پڑتی ہے تو کوئی بات نہیں۔ احساسِ ندامت کے مقابلے میں یہ بوجھ ذرا کم ہی ہوگا۔“ اس کی پورے خلوص سے کہی بات نے ماہ بانو کو دنگ کر دیا۔ یہ تو شیطان کے پیٹ میں ولی والی مثل تھی۔ چودھری جیسے سفاک آدمی کا بیٹا اتنا حساس ہو سکتا ہے، یہ تو کبھی اسے گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

”آپ کی صورت میں، میں پیر آباد کا مستقبل روشن دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے بہت برجستگی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”فی الحال تو میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اس ماحول میں خود کو بالکل مس فٹ محسوس کرتا ہوں۔“ مراد شاہ نے شانے اچکا کر جواب دیا۔

”نہیں، آپ کو اس انداز سے نہیں سوچنا چاہیے۔ سسٹم کو بدلنے کے لیے وہاں آپ جیسے شخص کی بہت ضرورت ہے۔“ اپنی عادت کے مطابق وہ اسے سمجھانے لگی۔

”مستقبل میں کبھی ایسا موقع آیا تو میں اپنے بارے میں تمہارے ان کمنٹس کو یاد رکھوں گا۔“ مراد شاہ نے کہا اور مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ حالات کی سختی نے اسے خاصا کمزور کر دیا تھا اور حزن و ملال سے گھرا چہرہ زرد زرد نظر آتا تھا لیکن وہ جو اس کی قدرتی ملاحت اور کشش تھی، وہ اب بھی اس کے ساتھ تھی۔ مراد شاہ بھی اس سے متاثر ہوا تھا اور ایک مرد کی حیثیت سے اس کے لیے اپنے دل میں کشش بھی محسوس کی تھی لیکن اپنے باپ کی طرح بے لگام جذبات سے زیر ہونے والا نہیں تھا۔ خاندانی روایات کے تحت ہی سہی، اس نے شاہدہ کے ساتھ زندگی نبھانے کا عہد کیا تھا اور پوری دیانت داری سے یہ عہد پورا

کرتے رہنا چاہتا تھا چنانچہ فوراً ہی اپنی نظروں کا رخ موڑ لیا۔

”آپ نے یاد رکھا تو یہ میری عزت افزائی ہوگی۔“ ماہ بانو جو اس کی نظروں کا خود پر ٹھہرنا اور پھر پلٹنا محسوس کر چکی تھی، پورے اعتماد سے بولی۔ حالات نے اسے اتنی صلاحیت تو عطا کر دی تھی کہ وہ نگاہوں کی زبان سمجھ سکے۔ مراد شاہ کی نگاہوں میں اس کے لیے کوئی ناپاک جذبہ نہیں تھا۔

”ارے ہاں، میں تمہیں ایک اہم خبر تو دینا بھول ہی گیا۔ پاکستان میں تمہارا ایک شناسا مشابرم خان ہوا کرتا تھا۔ وہ بھی آج کل یہاں امریکا میں ہے۔ مصطفیٰ خان نے مجھے تمہارے لیے یہ پیغام دیا تھا کہ جلد مشابرم خان تمہارے پاس ہوگا اور اس کی موجودگی سے تم خود کو کافی محفوظ تصور کرو گی۔“ مراد شاہ کو یاد آیا تو اسے پیغام دیا۔ مشابرم خان کا نام سن کر وہ سچ مچ خوش ہو گئی۔

”واقعی خان یہاں موجود ہے؟ وہ تو بہت بہادر اور نیک دل آدمی ہے۔ آپ کی اس سے ملاقات ہوئی ہے؟“

”نہیں۔“ اس کے اشتیاق سے پوچھے گئے سوال کا اس نے نفی میں جواب دیا۔ ”میں اس سے ملا نہیں ہوں، بس مصطفیٰ خان نے مجھے اس کے بارے میں تمہیں بتانے کو کہا تھا۔“ اس جواب کو سن کر ماہ بانو سوچ میں پڑ گئی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب وہ کسی مشکل میں ہوتی ہے تو شہریار سے وابستہ کوئی نہ کوئی شخص اس کی مدد کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے۔ مصطفیٰ خان نے بھی تو اب تک شہریار کے حوالے سے ہی اس کی اتنی مدد کی تھی اور اب مشابرم خان اس کا محافظ بن کر آنے والا تھا۔ یعنی وہ جس نے اس سے رابطہ نہ رکھنے کا عہد لیا تھا، خود اس کے حال سے بے خبر نہیں رہتا تھا اور کسی نہ کسی طور اپنی موجودگی کا احساس دلا جاتا تھا۔

”تم کہاں کھو گئی ہو؟ دیکھو بچے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اسے کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔ شاہدہ بھی کھانے کے لیے آواز دے رہی ہے۔ بچے کو دیکھ کر ڈائننگ ٹیبل پر آ جاؤ۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں پھر میں تمہاری دوسری رہائش کا بندوبست کرنے نکل جاؤں گا۔“ مراد شاہ کی آواز اسے اس کی سوچ سے باہر نکال کر لائی تو وہ ”جی“ کہتی ہوئی تیزی سے وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ شہریار عادل کو اس کی فکر تھی یا نہیں، اس بات سے زیادہ اب اسے اس بات کی فکر کرنی تھی کہ وہ اسلم کے بیٹے مجاہد کی ماں ہے جس کی اسے ہر دم حفاظت کرنی ہے۔

☆☆☆

”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں عائشہ! ہماری وجہ

سے آپ بہت مشکل میں پڑ گئی ہیں۔"

"مجھے آپ کے شرمندہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ آپ کی شرمندگی میری زندگی کی مشکلات کو دور نہیں کر سکتی۔ میں اپنے ملک میں اجنبی ہو گئی ہوں اور خود کو بچانے کے لیے چوروں کی طرح چھپتی پھر رہی ہوں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میری کچھ سمجھ نہیں آتا کہ میں اپنے دامن پر ملک دشمن کا داغ لے کر اب اس ملک میں کیسے رہ سکتی ہوں؟ یہ لوگ تو مجھے نشانِ عبرت بنا دیں گے اور میں اپنے عزت دار باپ کے لیے کلنک کا ٹیکا بن جاؤں گی۔ میری بیٹی ابھی چھوٹی ہے لیکن وہ اس طعنے کو سنتے ہوئے بڑی ہو گی کہ اس کی ماں ملک دشمن تھی تو وہ بھی مجھ سے نفرت کرے گی۔" وہ جو بہت ضبط والی تھی، اس کی آواز سنتے ہی پھٹ پڑی۔ شہریار اس کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ ان کی مدد کر کے وہ اپنا سب کچھ گنوا چکی تھی اور اتنے دنوں سے ایک ڈیری فارم پر عدم تحفظ کے احساس کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ پہلے اس کی زندگی کا ایک مقصد تھا۔ وہ کمال کا علاج کروا کر اسے نشے کی لت سے آزاد کروانا چاہتی تھی پھر اس کی بیٹی تھی جس کے لیے یقیناً اس کے دل میں بہت اونچے اونچے خواب تھے لیکن یک دم سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور وہ وطن کی غدار ٹھہرائی جا چکی تھی۔ ایسے حالات میں جبکہ خود اس کے لیے یہاں کی زمین تنگ پڑ چکی تھی، وہ کسی اور کے لیے کیا کر سکتی تھی۔ اس کا پریشان ہونا بالکل فطری تھا۔

"کیا آپ ہمارے ساتھ یہاں سے چلیں گی عائشہ؟" وہ بے اختیار ہی اس سے یہ سوال کر بیٹھا۔

"جی...!" وہ بے حد حیران ہو کر صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں پوری سنجیدگی سے آپ کو یہ پیشکش کر رہا ہوں۔ ہم لوگ عنقریب یہاں سے نکلنے والے ہیں اور آپ چاہیں تو آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے گا کہ یہ سفر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم اپنی زندگیوں کے رسک پر یہاں سے نکلیں گے۔" اس نے سنجیدگی سے اپنی پیشکش کو دہراتے ہوئے اس پر صورتِ حال بھی واضح کر دی۔

"زندگی کا رسک تو مجھے یہاں بھی ہے۔ میں قانون کے ہاتھ آ گئی تو وہ لوگ کوئی مجھے پھولوں کے ہار تو نہیں پہنائیں گے۔ ذلت بھری موت یا موت سے بدتر قید ہی میرا نصیب ہو گی۔" اس نے یاسیت زدہ لہجے میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ کامیابی سے منزل پر پہنچ جانے کی صورت میں کم از کم آپ کو نئے سرے سے عزت دار زندگی کے آغاز کا موقع تو ملے گا۔"

"لیکن میری بیٹی... اس ملک سے نکل جانے کی صورت میں مجھے ہمیشہ کے لیے اس سے محروم ہونا پڑے گا اور اس کی جدائی مجھے جیتے جی مار دے گی۔" وہ بلک اٹھی۔ بیٹی سے جدائی کا خیال ہی اسے تڑپا دینے کے لیے کافی تھا۔

"ابھی آپ اپنی زندگی بچانے کی کوشش کریں۔ انسان زندہ رہے تو بہت سے امکانات کے در کھلے رہتے ہیں۔ فی الحال تو آپ کے لیے یہ اطمینان کافی ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی خیریت سے ہے اور ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ اس کے والد بھی یقیناً اس کی خبر گیری کرتے رہیں گے پھر بعد میں جیسے ہی موقع ملے گا، اسے آپ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وہ وعدہ ہے جو اپنے زندہ نہ رہنے کی صورت میں بھی پورا کرنے کے لیے میں اپنے لوگوں کو پابند کر جاؤں گا۔ میری ذات سے آپ کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی کی میرے پاس یہی ایک صورت ہے۔" بہت مضبوط لہجے میں کہے گئے ان الفاظ نے عائشہ کو تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں ڈال دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں راضی ہوں۔" آخر کار اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اوکے، اب آپ عبدل یا اس کا جو بھی ساتھی آپ کے قریب ہے، اس سے میری بات کروائیں۔" عائشہ کا فیصلہ سن کر اس نے اس سے کہا۔ اگلے ہی لمحے عبدالرحمان کا ساتھی حسین لائن پر تھا۔

"عبدل سے کہنا کہ یہ عورت بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گی اس لیے اسے بھی ہمارے پاس ہی پہنچا دیا جائے۔ اور ہاں، اس کے علاوہ مجھے ایک لیپ ٹاپ، یو ایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس کے ساتھ چاہیے۔ کیا اس کا انتظام ہو جائے گا؟" اس نے حسین سے براہ راست اپنے مطلب کی بات کی۔

"بالکل سر! میں عبدل بھائی سے بات کرتا ہوں۔ امید ہے کہ ایک گھنٹے بعد دونوں آپ کے پاس ہوں گے۔" اس کا اشارہ عائشہ اور لیپ ٹاپ کی طرف تھا۔ شہریار نے اوکے کہہ کر سلسلہ منقطع کیا اور موبائل ماچھو کے حوالے کر دیا۔ یہ ماچھو کا ہی سیٹ تھا جو اس نے عائشہ کی کال آنے پر اسے لا کر دیا تھا۔ ماچھو نے جب اسے سیٹ تھمایا تھا تو وہ پل بھر کے لیے

حیران رہ گیا تھا کیونکہ وہ بلیک بیری تھا لیکن پھر اسے سمجھ آ گئی تھی کہ ماچھو کے ساتھ "ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں" والا معاملہ تھا۔ اس بظاہر غربت زدہ نظر آنے والی بستی میں بے حد غریب نظر آنے والا وہ مچھیرا حقیقتاً عبدل کا خاص آدمی تھا جو شاید ان کے گینگ کی اسمگلنگ کے بہت سے معاملات سنبھالتا تھا اس لیے وہ قانون کی پکڑ سے بچنے کے لیے بلیک بیری جیسا محفوظ سیٹ استعمال کر سکتا تھا۔ ویسے یہ بھی ممکن تھا کہ عبدل محض ان کی وجہ سے ماچھو کو وہ سیٹ دے کر گیا ہو۔ جرم کی دنیا کا بہت تجربہ کار بندہ ہونے کی وجہ سے وہ قانون اور تحقیقاتی اداروں کے طریقہ کار سے بھی خوب واقف تھا اس لیے اس نے اگر انہیں یہاں چھپایا تھا تو چھپائے رکھنے کے لیے معقول انتظامات بھی لازمی کیے ہوں گے۔

"عائشہ کو ساتھ لے جا کر کہیں ہم مشکل میں نہ پڑ جائیں۔ بے شک وہ جرأت مند عورت ہے لیکن اس طرح سمندر کے راستے خفیہ طور پر نکلنے میں کوئی بھی بدترین واقعہ ہو سکتا ہے۔ وہ ایسے حالات کو کیسے فیس کرے گی؟" وہ کال سے فارغ ہوا تو سلو نے اس کے فیصلے پر اعتراض کیا۔

"اس کے سوا... کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔ یہاں رہ کر بھی وہ ماری جائے گی۔" سلو کو کسی معاملے میں بے جا دخل اندازی کرنے کی عادت نہیں تھی اور شہریار جانتا تھا کہ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا ہے اس لیے نرمی سے اسے جواب دیا۔

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے میاں۔ ہم اس بچی کو یہاں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ اس نے بہت کڑے وقت میں ہماری مدد کی تھی، اب ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ اس کی مدد کریں۔" ڈاکٹر فرحان نے اس گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے شہریار کی حمایت کی تو سلو نے شانے اچکا کر "جیسی آپ کی مرضی" کہا اور بے نیازی سے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس محدود جگہ پر ان کا یہی مشغلہ رہ گیا تھا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد وہ مسلسل ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ صبح کی خبروں میں بھی سب سے زیادہ فوقیت بھائی جی کی خودکشی کے واقعے کو ہی دی گئی تھی۔ ان خبروں کے درمیان اچانک ہی ایک بریکنگ نیوز چلنے لگی اور اسکرین پر تین خاکے دکھائے جانے لگے۔ یہ خاکے سلو، شہریار اور ڈاکٹر فرحان کے تھے اور بہت واضح تھے۔ خاکے دکھاتے ہوئے یہ بتایا جا رہا تھا کہ یہ تینوں خطرناک دہشت گرد ہیں جنہوں نے بھارت بھر میں دہشت گردی کی خطرناک وارداتیں کی ہیں اور اب یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اس لیے تمام خواص و عوام سے اپیل کی جاتی ہے کہ اپنے اطراف پر گہری نظر رکھیں اور جہاں کہیں بھی یہ افراد نظر آئیں، فوراً اطلاع دیں۔ اطلاع دینے کے لیے کئی ٹیلی فون نمبرز بھی بتائے گئے پھر معمول کی نشریات اور خبروں کے دوران ان کے خاکوں کے ساتھ یہ اپیل بار بار دہرائی جاتی رہی۔

ان کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا اس لیے زیادہ پریشان نہیں ہوئے۔ البتہ ڈاکٹر فرحان کے چہرے پر ضرور کچھ اضطراب نظر آنے لگا۔ شہریار نے ان کا ہاتھ تھام کر دباتے ہوئے انہیں خاموش تسلی دی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ جب تک وہ یہاں سے نکل نہ جاتے، ان کے لیے حالات بہرحال غیر یقینی ہی تھے۔ ایک گھنٹے سے کچھ منٹ اوپر گزرے تھے کہ ماچھو نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ باہر ایک گاڑی کھڑی تھی جس سے عائشہ اتر کر اندر آئی۔ اس کے پیچھے ہی ایک نوجوان شہریار کا مطلوبہ سامان لے کر اندر داخل ہوا۔ منٹوں میں اس نے پورا سسٹم سیٹ کر دیا۔ لیپ ٹاپ کی بیٹری پوری طرح چارج تھی اور اسے فوری طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود شہریار نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ عائشہ کے ساتھ آنے والا اپنا کام نمٹا کر فوراً روانہ ہو گیا لیکن جانے سے قبل یہ بتا گیا کہ کسی بھی ضرورت کے تحت اسے کال کیا جا سکتا ہے، وہ فوراً حاضر ہو جائے گا۔ وہ دیکھنے میں بہت اسمارٹ تھا اور کسی گینگ کا بندہ نہیں لگتا تھا لیکن جس طرح اس نے ان لوگوں سے مکمل بے نیازی برتی تھی اور اپنے کام سے کام رکھا تھا، اس سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ گینگ میں پڑھے لکھے اور ہنرمند نوجوانوں کو بھی اس قسم کی ضروریات کے لیے رکھا گیا ہے جو شاید مار دھاڑ تو نہیں کر پاتے ہوں گے لیکن اپنی مجبوریوں کی اچھی قیمت وصول کرنے کے بعد گینگ سے اپنی وفاداری نبھاتے رہتے ہوں گے۔

نوجوان چلا گیا تو وہ عائشہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گئی تھی اور اس کے رنگ و روپ پر بھی فرق پڑا تھا لیکن بہرحال اب بھی اپنی عمر سے کہیں کم اور نوعمر سی لڑکی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ دوبارہ وہی گفتگو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہوئی جو وہ پہلے ہی فون پر بھی کر چکے تھے۔ پھر اسے ماچھو کی بیوی کے پاس بھیج دیا گیا تاکہ وہ مردوں سے ہٹ کر ذرا اطمینان سے آرام کر لے۔ درپیش سفر کے خیال سے وہ سب ہی آرام اور جسمانی توانائی بحال کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ سلو

کو چھوڑ کر ان تینوں نے طاقت کی ادویات بھی لی تھیں۔ ساتھ ہی ہاتھ پیر کھولنے کے لیے صبح ناشتے سے قبل ہلکی پھلکی ورزش بھی کر ڈالی تھی۔ وہ خود کو سفر کے لیے ممکنہ طور پر فٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہریار نے ایک دن میں ہی اچھا خاصا سنبھالا لے لیا تھا اور اس کے زخم بھرنے لگے تھے۔ ڈاکٹر فرحان اور کلام پر بھی بھائی جی کی اتنے دن کی میزبانی نے اچھا اثر ڈالا تھا اور امید کی جاسکتی تھی کہ وہ سفر کی تکالیف کو برداشت کر جائیں گے۔ سلو تو خیر تھا ہی بالکل فٹ کیونکہ وہ خود کو فٹ رکھنے کا ہنر جانتا تھا اور کسی بھی مشن کے دوران ہونے والی چھوٹی موٹی انجری سے خود ہی نمٹ لیتا تھا۔

ظہر کے وقت ٹی وی پر بھائی جی کی نمازِ جنازہ اور تدفین کی خبریں دکھائی گئیں۔ جنازے میں لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی اور کئی افراد پھوٹ پھوٹ کر روتے نظر آئے تھے۔ خود عبدالرحمان بڑا دل گرفتہ نظر آرہا تھا اور تعزیت کرنے والوں سے عاجزی سے مل رہا تھا۔ دو بجے ماچھو نے دسترخوان لگا دیا۔ اس بار عائشہ کے ساتھ ماچھو کی بیوی بھی دسترخوان پر بیٹھی اور اپنی کرخت آواز میں میزبانی کے فرائض انجام دیتی رہی۔ کھانے کے بعد انہیں ان کی فرمائش پر سبز قہوہ پیش کیا گیا اور پھر وہ لوگ قیلولے کے اعلان کے ساتھ تکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

اس وقت شہریار نے لیپ ٹاپ کھولا اور اپنا خاص اکاؤنٹ کھول کر پاکستان میں رابطہ کرنے لگا۔ اس اکاؤنٹ سے کی جانے والی کال پکڑنا آسان نہیں تھا۔ اگر کہیں ان کی گفتگو سن بھی لی جاتی تو لوکیشن کا تعین اس سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اس کے باوجود بھارت آنے کے بعد اس نے مشکل سے ایک آدھ بار ہی اس سہولت کا استعمال کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر جگہ بڑے بڑے ماہر بیٹھے ہیں اس لیے احتیاط کرتا رہا تھا۔ پہلی ہی کوشش میں اس کا پاکستان میں رابطہ ہو گیا۔ توقع کے مطابق کال ریسیو کرنے والا ذیشان ہی تھا۔

''کیسے ہو یار! کیا حال ہے تمہارا؟ تم نے تو کئی دنوں سے اپنی کوئی خیر خبر ہی نہیں دی۔'' اس کی آواز سن کر وہ جذباتی ہو گیا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور انشاء اللہ ہم کامیابی کے ساتھ جلد واپس آرہے ہیں۔'' اس نے ذیشان کو خوش خبری سنائی۔

''شاندار... یہ تو تم نے واقعی بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ پھر بتاؤ ہم کب تمہارا استقبال کریں؟'' وہ آواز سے ہی بے حد خوش محسوس ہو رہا تھا۔

''ابھی فائنل پروگرام میرے سامنے نہیں ہے لیکن امکان یہی ہے کہ ہم آج رات ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ جو پارٹی ہمیں یہاں سے نکلنے میں مدد دے رہی ہے، اس نے دبئی تک پہنچانے کی آفر کی ہے۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''یعنی تم لوگ سمندر کے راستے نکلنے والے ہو؟'' ذیشان نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا۔

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے تصدیق کی۔

''بندوبست پکا ہے نا؟ یہ نہ ہو کہ تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ؟'' ذیشان متفکر ہو گیا۔

''پارٹی اسٹرونگ ہے، باقی اس طرح کے کاموں میں رسک تو ہوتا ہی ہے۔'' اس نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

''تم فائنل پروگرام طے کر کے مجھے بتاؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بتا دوں گا لیکن پلیز یار! تم اتنے پریشان مت ہو۔ انشاء اللہ ہم صحیح سلامت پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' اس نے ذیشان کو تسلی دی۔

''انشاء اللہ۔'' اس نے جواباً صرف اتنا ہی کہا۔

''تم سناؤ تمہاری طرف کیا خبریں ہیں؟'' وہ موضوع بدل گیا۔

''خبریں تو خاصی گرما گرم ہیں۔ تمہارے پیچھے یہاں بھی بہت کچھ ہوتا رہا ہے لیکن ابھی تفصیل بتانے کا موقع نہیں ہے۔ تم لوگ واپس آجاؤ تو پھر آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔'' وہ اسے ٹال گیا۔

''یہاں خبروں میں ائربیس پر حملے کا ذکر کیا جا رہا ہے، وہ کیا چکر ہے؟'' بھائی جی کی موت کی خبر کے ساتھ جو چند خبریں میڈیا پر جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکی تھیں، ان میں سے ایک خبر پاکستان کے ایک ائربیس پر دہشت گردوں کے قبضے کی خبر بھی تھی جسے سن کر وہ لوگ بے حد مضطرب ہوئے تھے اور اب وہ ذیشان سے اس بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

''وہ...'' ذیشان نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ ہمارے انہی کرم فرماؤں کی مہربانی تھی جن سے ہم مستقل برسرِپیکار ہیں۔ شکر ہے ہم اس سچویشن سے نمٹنے میں کامیاب ہو گئے اور دہشت گرد اپنے انجام کو پہنچ گئے۔'' ذیشان کی کوشش تھی کہ اس سے معاملے کو بہت ہلکے انداز میں لے تاکہ اس کی ٹینشن میں اضافہ نہ ہو۔

''ہاں، یہ اچھی بات ہے لیکن جو ہوا، وہ بہت غلط تھا۔ اس سے دنیا کو ہمارے بارے میں بہت غلط پیغام چلا گیا ہے۔'' وہ افسردہ تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اغیار کی سازشوں کے ساتھ ساتھ اپنوں کی غداری کے ہاتھوں بھی نقصان اٹھاتے رہے ہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔'' ذیشان نے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا۔ اپنے ہی ایک بھائی بند کی غداری نے اس کے شانے جھکا دیے تھے اور وہ حقیقتاً بہت افسردہ تھا۔

''جانے دو یار! جب تک ہماری دھرتی کے وفادار زندہ ہیں، غداروں کو ان کے انجام تک پہنچاتے رہیں گے۔'' اس نے فوراً ذیشان کی دلجوئی کی پھر ایک بار پھر موضوع بدل گیا۔

''باقی دوسرے معاملات تو ٹھیک چل رہے ہیں نا؟ مجھے فرصت نہیں مل سکی کہ سام انکل کی طرف والوں کی خیر خیریت لے سکوں۔'' اس کا اشارہ امریکا میں مقیم اپنے دوستوں کی طرف تھا۔

''ہاں، وہاں بھی خیریت ہے۔'' ذیشان اسے ماہ بانو کی موجودہ مشکلات سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے مختصر جواب دیا۔ اس نے بھی مزید تفصیل نہیں پوچھی اور ضروری تفصیلات معلوم ہو جانے کے بعد دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ کمرے میں موجود اس کے ساتھیوں نے بھی یہ گفتگو سنی تھی لیکن کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اپنی اپنی جگہ پر خاموش پڑے رہے۔ یونہی اونگھتے ہوئے شام ہو گئی۔ ماچھو کی بیوی نے انہیں شام کی چائے پیش کی۔ چائے پی کر وہ سب خود کو اپنے اپنے طور پر فریش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماچھو کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صحن تو وہاں بالکل ہی برائے نام تھا اس لیے وہ اس بڑے کمرے تک ہی محدود رہنے پر مجبور تھے جہاں انہیں ٹھہرایا گیا تھا اور جگہ کے مطابق ہی ہلکی پھلکی ورزشیں کر رہے تھے۔

''عبدل بھائی نے بولا ہے آج رات روانگی ہے۔ دو بجے کے بعد کسی بھی ٹیم ریڈی رہنا۔ گاڑی آپ لوگوں کو لینے آجائے گی۔ سمندر میں لانچیں تیار کھڑی ہیں۔ آپ لوگوں کے سوار ہوتے ہی چل پڑیں گی۔'' مغرب کے بعد ماچھو نے انہیں پیغام دیا تو سب ہی سنجیدہ ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ پل صراط جیسے نازک سفر پر روانہ ہونے والے ہیں جس میں کامیابی اور ناکامی کے امکانات کے تناسب کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

''ایک بات تو بتاؤ ماچھو۔ کل سے ہم لوگ یہاں ہیں، تمہارے گھر پر مسلسل گاڑیاں آجا رہی ہیں، لوگ متوجہ تو ہوتے ہوں گے؟ حکومت کا کوئی مخبر بھی ہماری موجودگی کی خبر لیک آؤٹ کر سکتا ہے... خفیہ ادارے تو اس قسم کی بستیوں پر خصوصی نظر رکھتے ہیں؟'' وہ کل سے اس بارے میں سوچ رہا تھا، اس وقت ماچھو سے پوچھ ہی بیٹھا۔

''کسی... میں جرأت نہیں ہے کہ یہاں قدم رکھ سکے۔'' اس نے ایک بڑی گالی کے ساتھ دعویٰ کیا۔ ''بستی کا ہر آدمی اپن کا آدمی ہے اور کوئی اجنبی سالا ادھر پھٹک بھی نہیں سکتا۔ کوئی غلطی سے بھی ادھر آجائے تو اس کا سب اگلا پچھلا اگلوا کر ہی اس کی زندگی موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اپن نے پہلے بھی تم سے کہا تھا، ایک دفعہ پھر کہہ رہا ہوں کہ بالکل بے فکر ہو کر ادھر رہو۔ لانچ تک پہنچانے تک اپن تمہاری فل گارنٹی لیتا ہے۔ ادھر سے آگے وہ لوگ معاملہ سنبھالے گا جن کا عبدل بھائی نے ڈیوٹی لگایا ہو گا۔'' اسے اپنے انتظام کی مضبوطی پر پورا بھروسا تھا اور شاید غلط بھی نہیں تھا۔ ایک ایسی بستی میں جہاں سب کے مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہوں اور سب ایک گینگ سے ہی تعلق رکھتے ہوں کسی اجنبی کے لیے داخلہ واقعی ممکن نہیں تھا۔ وہ ماچھو سے پھر کوئی سوال نہیں کر سکا البتہ ذیشان سے رابطہ کر کے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔

''میری کرنل صاحب سے اس سلسلے میں بات ہوئی ہے۔ انہوں نے آگے کہیں ڈوریاں ہلائی ہیں اور بات چائنا تک پہنچ گئی ہے۔ چین کا ایک بحری بیڑہ اس وقت انڈین سی میں موجود ہے اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم لوگ دبئی کا رخ کرنے کے بجائے ان تک پہنچ جاؤ۔ وہ تم لوگوں کو ریسیو کر کے محفوظ ٹھکانوں تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں گے۔'' ذیشان نے اسے ایک بالکل ہی حیران کن خبر سنائی۔ چین کی پاکستان سے دوستی میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن چین کی طرف سے انہیں ایسا فیور ملے گا، اس کی وہ ایک فیصد بھی امید نہیں رکھتا تھا۔

''میری کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ آخر یہ معاملہ چائنا تک پہنچا کیسے؟ اور وہ ہماری اس طرح کی مدد کے لیے کیوں تیار ہے؟'' اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے۔'' ذیشان نے جواب دیا اور پھر ذرا تفصیل سے بتایا۔ ''ڈاکٹر صاحب جن حیاتیاتی ہتھیاروں کی تیاری پر کام کر رہے تھے، وہ اصل میں ہمیں

نہیں چین کو درکار ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ چین نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات ہماری حکومت سے مستعار مانگ رکھی تھیں۔ خود ہمارے لیے تو اس طرح کے تجربات شاید بیکار ہی ثابت ہوتے کیونکہ خطے میں ہمارا سب سے بڑا حریف بھارت اور تقریباً ایک جیسے ماحول....... کی وجہ سے ہم اس کے خلاف یہ ہتھیار استعمال نہیں کرسکتے۔''

''اوہ آئی سی۔'' اسے اس معاملے میں چائنا کی دلچسپی کی وجہ سمجھ آگئی۔ یقینی طور پر پاکستان کی حکومت اس تعاون کے بدلے چین سے بھی بہت کچھ حاصل کررہی ہوگی اور اس صورت میں ڈاکٹر فرحان کا صحیح سلامت بھارت سے انخلا اور بھی ضروری ہوگیا تھا۔ یہ قومی سلامتی اور اپنے سب سے ہمدرد ملک کے ساتھ دوستی کا معاملہ تھا۔

''تم روانگی کے بعد بھی مجھ سے رابطے میں رہنے کی کوشش کرنا تاکہ میں تم لوگوں کی لوکیشن سے واقف رہوں۔ ساتھ ہی میں تمہیں ایک فریکوئنسی بھی نوٹ کروادیتا ہوں۔ لانچ کے کھلے سمندر میں پہنچنے کے بعد تم اس فریکوئنسی پر براہِ راست چائنا والوں سے بھی رابطہ کرسکتے ہو۔'' ذیشان نے اسے فریکوئنسی کے ساتھ کوڈ ورڈز وغیرہ بھی نوٹ کروائے اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔ نو بجے انہیں رات کا کھانا کھلا دیا گیا۔ اب ان کے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ٹی وی کھول کر خبریں دیکھنا بھی بیکار لگ رہا تھا کیونکہ اب مقامی خبروں میں ان کی دلچسپی کا کوئی عنصر باقی نہیں رہا تھا۔ بوریت اور اعصاب زدگی کی اس کیفیت میں وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ ان پانچوں میں صرف ڈاکٹر فرحان تھے جنہوں نے وقت کا بہتر مصرف تلاش کرلیا تھا۔ نماز وہ پانچوں وقت ہی پابندی سے پڑھتے تھے۔ آج عشاء کی نماز ہمیشہ سے زیادہ طویل ادا کی اور ساتھ ہی خصوصی نوافل بھی ادا کیے۔ نوافل کے بعد نہایت رقت سے طویل دعا مانگنے کے بعد بھی وہ مسلسل تسبیحات اور ورد...... میں مصروف رہے۔ عائشہ بھی زرد چہرہ لیے شاید زیرِلب کچھ پڑھ رہی تھی لیکن ان پر واضح نہیں تھا۔ ماچھو نے ان پانچوں کو سفر کے لیے لباس بھی فراہم کردیے تھے جن کی رنگت سیاہ تھی اور وہ چست جینز اور سیاہ جیکٹوں پر مشتمل تھے۔ عائشہ بھی ایسے ہی لباس میں ملبوس تھی اور مزید اسمارٹ اور ینگ لگ رہی تھی۔

سوا بارہ بجے کے قریب یہ اعصاب زدہ کردینے والا انتظار ختم ہوا اور انہوں نے دروازے پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنی۔ ماچھو نے اپنی جنوں جیسی پھرتی کے ساتھ جاکر دروازہ کھولا اور پھر اندر آکر انہیں بتایا کہ ان کی روانگی کا وقت ہوگیا ہے۔ وہ لوگ ایک ایک کرکے گاڑی میں سوار ہوگئے۔ یہ سیاہ رنگ کی لینڈ کروزر تھی جو رات کی تاریکی کا حصہ بن کر نہایت خاموشی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ گاڑی میں انہیں بریف کرنے کے لیے حسین موجود تھا۔ وہی مون ہوٹل کا منتعلیق سا منیجر جس کے بارے میں عبدالرحمان کے رائٹ ہینڈ ہونے کا انکشاف بھی ان پر ان دو دنوں میں ہی ہوا تھا۔ اس وقت اس نے بھی سوٹ بوٹ کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''بھٹناگر پاگلوں کی طرح آپ لوگوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی لیکن زخمی ہونے کے باوجود اس نے آرام سے بیٹھنا قبول نہیں کیا ہے۔ صبح عبدل بھائی کے پاس بھی آیا تھا۔ ان سے آپ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکی بھی دی کہ اگر ہماری طرف سے آپ لوگوں کی مدد کی گئی تو گینگ کا انجام برا ہوگا۔ وہ اس حوالے سے خاص طور پر تفتیش کرتا رہا کہ کل ایک ہوٹل کے سامنے ہمارے ہی گینگ کے دو گروہوں کا آپس میں تصادم کیوں ہوا؟ عبدل بھائی نے اسے ٹال دیا کہ وہ آپس کی رنجش کی وجہ سے ہوا تھا۔ گینگ کے دو لڑکوں میں کسی لڑکی کی وجہ سے رقابت تھی۔ ان میں سے ایک کل لڑکی کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں تھا کہ دوسرے کو اطلاع مل گئی اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوٹل پر چڑھ دوڑا۔ پہلے والے نے بھی اپنے حمایتیوں کو بلالیا اور یوں ذرا سی بات پر بڑا جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ لڑکوں کو اس سلسلے میں پہلے ہی بریف کردیا گیا تھا اس لیے بھٹناگر کے آدمیوں نے ان سے پوچھ تاچھ کی تو انہوں نے بھی یہی کہانی سنائی۔ اس وقت سب سمجھ رہے ہیں کہ اب سب کچھ عبدل بھائی ہی ہیں اس لیے ہر ایک وہی کہے گا جو وہ چاہیں گے۔ عبدل بھائی نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ اشوک کی جگہ اس کا گینگ سنبھالنے والے کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا ہے اور اسے پیغام دیا ہے کہ آپس میں جھگڑے بغیر اگر ہم اپنا کام کرتے رہیں تو دونوں ہی فائدے میں رہیں گے۔ اس کی طرف سے بھی پوزیٹیو جواب آیا ہے۔'' راستے میں حسین انہیں تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ انہیں مقامی حالات سے دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر بھٹناگر کو عبدالرحمان پر شک ہے تو وہ اتنی آسانی سے ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور ان تک رسائی کی کوئی راہ ضرور ڈھونڈ رکھی ہوگی۔ اس خدشے کا اظہار حسین کے سامنے بھی کردیا گیا۔

''ہم اس امکان کو رد نہیں کرسکتے۔'' حسین نے اعتراف کیا۔ ''بستی کی حد تک تو ہر ایک سمجھتا ہے کہ یہاں کسی اجنبی کی گنجائش نہیں لیکن یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ آپ لوگ سمندر کے راستے فرار ہونے کی کوشش کریں گے، بھٹناگر وہاں ضرور کوئی کارروائی کرے گا۔ اس خدشے کو سامنے رکھتے ہوئے عبدل بھائی نے انتظام کردیا ہے کہ انڈیا کی سمندری حدود تک ان کے آدمی لانچوں میں آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے موجود رہیں گے۔ اس کے بعد کھلے سمندر میں خطرہ اتنا زیادہ نہیں رہے گا۔'' اپنے طور پر وہ انہیں تسلی دے رہا تھا لیکن وہ لوگ پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ بھٹناگر چاہتا تو کھلے سمندر میں بھارتی نیوی سے مدد لے کر ان کو گرفتار کرواسکتا تھا۔ عبدالرحمان بھی نیوی سے ٹکرانا مناسب نہیں سمجھتا ہوگا اس لیے اس نے آگے کی ذمے داری قبول نہیں کی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کی ذمے داری تھی بھی نہیں۔ اس نے ان کو بھارتی حدود سے نکال دینے کا وعدہ کیا تھا جو وہ پوری ذمے داری سے پورا کرنے جارہا تھا۔ باقی تو انہیں اپنی تقدیر پر اور زورِ بازو پر ہی سب کچھ کرنا تھا۔

''آپ لوگوں کو جن لوگوں کے ساتھ روانہ کیا جارہا ہے، وہ ماہی گیروں کا ایسا قبیلہ ہے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ سمندر کے سینے پر سفر کرتے ہوئے گزرتا ہے۔ یہ لوگ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور خوشی و غم، موت و زندگی سب سمندر میں ہی منانا پسند کرتے ہیں۔ سمندر سے شکار کے علاوہ اسمگلنگ پر بھی ان کی گزراوقات کا دارومدار ہے۔ یہ ہر طرح کی اجناس کے ساتھ ساتھ انسانی اسمگلنگ میں بھی حصہ لیتے ہیں لیکن آپ لوگ ان کے قیدی نہیں ہوں گے۔ آپ کو ہتھیار فراہم کیے جائیں گے اور یہ اختیار ہوگا کہ کسی بھی نازک موقع پر خود فیصلہ کریں۔ وہ لوگ آپ کو آپ کی خواہش پر مشورے اور تجاویز ضرور دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان سے معاملات طے ہوچکے ہیں۔ اگر انہیں کوئی نقصان اٹھانا پڑا تو اس کی ادائیگی عبدل بھائی خود کریں گے۔ اسباب سے لے کر افراد تک ہر شے کی قیمت کا تعین پہلے سے کیا جاچکا ہے۔'' حسین انہیں جو تفصیلات بتا رہا تھا، انہیں سن کر اندازہ ہورہا تھا کہ عبدالرحمان نے مختصر وقت میں بڑا کام کردکھایا ہے حالانکہ وہ خود ذاتی طور پر بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف سے بھائی جی کی آخری رسومات کا سلسلہ تھا تو دوسری طرف اس کی موت کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال سے نمٹنے کا مرحلہ تھا۔ پھر پولیس اور ایجنسیوں کا دباؤ الگ ہوگا۔

شہریار نے راستے میں ہی ذیشان کو ای میل کرکے اپنی پوزیشن اور چائنا والوں کی مدد قبول کرنے کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ انہیں بھارتی حدود کے بجائے کھلے سمندر میں گھیرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کال کرنے سے گریز یوں کیا تھا کہ وہ حسین کے علم میں بھی یہ بات نہیں لانا چاہتا تھا کہ آگے ان کی مدد کے لیے کوئی اور موجود ہوگا۔

گھاٹ پر پہنچ کر حسین نے گاڑی روک لی۔ وہاں کچھ اور لوگ ان کے منتظر تھے جو پوری طرح مسلح تھے۔ انہیں بھی ان کی پسند کے مطابق ہلکا اور بھاری ہر طرح کا اسلحہ فراخ دلی سے فراہم کردیا گیا۔ عائشہ کی زندگی میں یقیناً یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی بھاری مقدار میں اسلحہ دیکھ رہی تھی چنانچہ اس کے چہرے کے تاثرات میں خوف کی پرچھائیاں نمایاں تھیں تاہم اس نے بھی ایک پسٹل لے کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

گھاٹ سے حسین ان سے مصافحہ کرکے رخصت ہوگیا اور انہیں لانچ میں سوار کروادیا گیا۔ یہ ایک بڑی لانچ تھی جس میں پہلے ہی سے ایک خاندان موجود تھا۔ ان کے چہروں کی جھلسی ہوئی رنگت اور ہاتھ پیروں کی سختی گواہی دے رہی تھی کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ سمندر میں سخت جدوجہد کرتے ہوئے گزارا ہے۔ ان کی لانچ کے ساتھ ہی دوسری لانچ بھی کھڑی تھی جس میں عبدالرحمان کے آدمی سوار ہوئے تھے۔ خود انہوں نے الگ الگ لانچوں میں تقسیم ہونے کے بجائے ایک ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔ دونوں لانچوں نے ایک ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ بے انتہا بوڑھے نظر آنے والے ایک آدمی نے ان کے پاس آکر بطور سردار اپنا تعارف کروایا اور پھر مختصر الفاظ میں یہ بات سمجھائی کہ ان کے ساتھ سفر کرنے کے لیے ان لوگوں کا ان جیسا نظر آنا ضروری ہے۔ وہ لوگ بوڑھے کی بات سے فوراً متفق ہوگئے اور تھوڑی دیر بعد ہی ان کپڑوں میں ملبوس نظر آنے لگے جو بوڑھے نے انہیں فراہم کیے تھے۔ یہ کپڑے انہوں نے اپنے پہلے والے لباس کے اوپر ہی پہن لیے تھے۔ ہاتھ پیروں اور چہرے کی رنگت کی تبدیلی کے لیے انہوں نے وہ محلول استعمال کیا جو بوڑھے کے حکم پر ایک نوجوان نے ان کے سامنے ہی تیار کیا تھا۔ اس نے ایک بڑے پیالے میں تیل ڈال کر اس میں راکھ جیسی کوئی شے ملائی تھی۔ انہوں نے یہ محلول اپنے جسموں پر ملا تو رنگت تو

بے شک تبدیل ہوگئی لیکن تیل کی بو نے طبیعت مکدر کردی۔ وہ شاید مچھلی کا تیل تھا جس سے تیز بو آرہی تھی۔
بہر حال، انہیں اسے برداشت کرنا پڑا۔ عائشہ کو البتہ بہت دیر تک ابکائیاں آتی رہیں۔ وہ ناز و نعم میں پلی بڑھی ایک بڑے گھرانے کی لڑکی تھی جس نے شاید کبھی گمان بھی نہیں کیا ہوگا کہ اس کی زندگی ایسے مراحل سے بھی گزرے گی۔ ان کا سفر تیزی سے جاری رہا۔ آگے جاکر ان کے ساتھ مزید دو لانچیں شامل ہوگئیں جن کے بارے میں بوڑھے نے بتایا کہ ان کا تعلق بھی اس کے خاندان سے ہے۔ لانچوں کو طاقتور انجن چلا رہے تھے اس لیے فاصلہ تیزی سے طے ہورہا تھا۔ سمندر بھی خوش قسمتی سے پُرسکون تھا اور اس سے زیادہ اضطراب وہ اپنے اندر محسوس کررہے تھے۔ یہ اضطرابی کیفیت اس وقت مزید بڑھ گئی جب اچانک ایک بڑی لانچ سامنے سے نمودار ہوئی اور انہیں رکنے کا اشارہ کیا جانے لگا۔ ان کے ہاتھ خودبخود ہی اپنے ہتھیاروں کی طرف بڑھ گئے۔
"نہیں، کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ پہلے مجھے آنے والوں سے بات کرنے دو۔" بوڑھے نے تحکمانہ لہجے میں کہا پھر لانچ کی رفتار کم کرنے کو کہا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ دبکے صورت حال کا اندازہ لگانے لگے۔ بوڑھا اب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بڑی مہارت سے اپنا توازن قائم رکھے ہوئے تھا۔ دوسری لانچ قریب پہنچی تو اس نے ان سے گفت وشنید شروع کردی، وہ کوسٹ گارڈ والے تھے جنہوں نے بوڑھے کو شناخت کرلیا تھا۔
"رنگھاوا! یہ تم ہو؟" پہچاننے والے نے اسے اس کے نام سے پکارا۔
"ہاں، میں اپنے پریوار کے ساتھ سفر پر جارہا ہوں۔" بوڑھے نے باوقار انداز میں جواب دیا۔ وہ کہیں سے بھی گھبرایا ہوا محسوس نہیں ہورہا تھا۔
"اس بار تم نے جلدی سفر کا آغاز نہیں کردیا؟ تم تو ہفتہ بھر کے لیے ٹھہرنے والے تھے نا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
"اس بار ہمارا سارا مال وقت سے پہلے اچھے داموں بک گیا ہے۔ اس لیے ہم نے مزید رکنا غیر ضروری سمجھا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ ہم اگنا قبیلے والے سمندر سے زیادہ دور رہنا پسند نہیں کرتے۔ خشکی پر ہم اپنی مجبوریوں کی وجہ سے آتے ہیں اور اس بار مجبوری جلدی ختم ہوگئی تھی۔" بوڑھے نے اسے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ ہم تمہاری راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔" وہاں سے انہیں اجازت مل گئی اور سفر ایک بار پھر پوری رفتار سے شروع ہوگیا۔
"عام طور پر ہم لانچ کے انجن کھلے سمندر میں پہنچنے تک ہی چلاتے ہیں یا پھر اس وقت جب شدید ضرورت ہو۔ ہمیں ہفتوں اور مہینوں سمندر میں گزارنا ہوتے ہیں اس لیے ڈیزل کا خرچہ نہیں کرسکتا۔ اس بار صرف تم لوگوں کے لیے ہم پورا سفر انجن چلا کر طے کریں گے اور صرف اتنی دیر کے لیے انجن بند ہوں گے کہ انہیں تھوڑا آرام مل سکے۔" کوسٹ گارڈ والوں سے نمٹ کر سفر کا آغاز ہوا تو بوڑھے نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔
"ہم غریب لوگ ہیں اور اپنی غربت میں خوش بھی رہتے ہیں لیکن ان... کو رشوت دینے کے لیے ہمیں غیر قانونی کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔" اس نے دور ہوتی کوسٹ گارڈ کی لانچ کی طرف اشارہ کرکے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے بتایا۔
"ہمارا عشق سمندر ہے۔ سمندر میں رہنے سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی خوشی نہیں ہے لیکن اگر ہم ان کے منہ نوٹوں سے بند نہ کریں تو یہ ہمارا جینا مشکل کردیں۔" بوڑھا اب نہیں اپنی غیر قانونی سرگرمیوں کی وجہ سے آگاہ کررہا تھا۔ اس کے پاس انہیں سنانے کے لیے بہت سی داستانیں تھیں جنہیں سنتے ہوئے انہیں سفر ذرا آسان لگنے لگا تھا ورنہ ہر طرف پھیلے سمندر کی تاریکیوں میں ان کے لیے ہولناکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

ڈیوڈ نے تیسری دفعہ ویڈیو ریوائنڈ کرکے اسکرین پر نظر آنے والے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ یہ ائربیس والے واقعے میں ہلاک ہونے والے دہشت گردوں اور فوجی شہدا کی تصویریں تھیں۔ تمام تصویروں کو ایک بار پھر اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔
"کیا تمہیں یقین ہے کہ ان تصویروں میں تمام ہلاک شدگان کی تصویریں موجود ہیں؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے ساتھ بیٹھے پانڈے سے دریافت کیا۔
"بالکل جناب! میں نے پاک فوج کی میڈیا کے لیے جاری کردہ تصاویر کے علاوہ بھی اپنے ایک ذریعے سے یہ تصاویر حاصل کی ہیں اور ان میں کسی ہلاک شخص کی تصویر مس نہیں ہوئی؟" پانڈے نے پورے یقین سے جواب

دیا۔
"تو پھر سمجھ لو کہ بہت بڑی گڑبڑ ہوچکی ہے۔" ڈیوڈ نے اسے بتایا۔
"کیسی گڑبڑ؟" پانڈے جسے اب تک ڈیوڈ کے اضطراب کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی، حیرت سے پوچھنے لگا۔ اس آپریشن میں اس کا حصہ صرف اتنا تھا کہ وہ ڈیوڈ کو کمانڈوز کی مطلوبہ تعداد مہیا کردے اور جمال پورہ میں قائم اپنے سیٹ اپ کو یہ ہدایت کردے کہ ان لوگوں کو ڈیوڈ کی طرف سے ملنے والے احکامات کی پابندی کرنی ہے۔ ڈیوڈ طے شدہ کوڈ کے ذریعے ان لوگوں سے ایک فرضی نام سے بات چیت کرتا رہا تھا۔ اس کے حکم کے مطابق مدرسے میں موجود بھارتی ایجنٹ کارروائی کے آغاز سے قبل ہی منظر سے غائب ہوگئے تھے اور پیچھے صرف وہ لوگ باقی بچے تھے جو انجانے میں آلۂ کار بن کر.... اپنے تئیں دین کی خدمت انجام دے رہے تھے۔
"ان تصاویر میں میرے ایک کمانڈو کی تصویر شامل نہیں ہے۔" ڈیوڈ نے انکشاف کیا تو پانڈے اچھل پڑا۔
"لیکن کیوں؟ پاک فوج کے ترجمان کی طرف سے تو اعلان کیا گیا ہے کہ تمام حملہ آور ہلاک ہوگئے ہیں... پھر آپ کا کمانڈو کہاں چلا گیا؟ کیا وہ وہاں سے فرار ہوگیا تھا؟ لیکن ایسی صورت میں اسے آپ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔"
"مجھے یقین ہے کہ وہ گرفتار ہوگیا ہے۔" ڈیوڈ نے نہایت تشویش کے عالم میں اپنا خدشہ بیان کیا۔
"لیکن کسی شخص کے زندہ گرفتار ہونے کا تو بالکل بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ میرے اپنے ذرائع نے بھی ایسی کوئی اطلاع نہیں دی۔" پانڈے نے غیر یقینی اعتراض کیا۔
"یہ ان کی ہوشیاری ہے۔ گرفتار ہونے والے سے معلومات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اس کی گرفتاری کو خفیہ رکھا ہے۔" اس جیسے شاطر کے لیے درست اندازے قائم کرنا کیا مشکل تھا۔
"میں ایک بار پھر اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ایسی بات ہے تو میرے ذرائع اسے کھوج نکالیں گے۔" پانڈے نے دعویٰ کیا جس پر ڈیوڈ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا کیونکہ پانڈے کی تصدیق کے بغیر بھی وہ اپنے خیال پر راسخ ہوچکا تھا۔
"اگر کوئی زندہ گرفتار ہوا ہے تو یہ ہمارے لیے برا شگون ہے۔ پہلے ہی ہم اس آپریشن میں مطلوبہ کامیابی

نخریلی بیوی

جیک چوری کے الزام میں پکڑے جانے کے بعد جج کے پاس پیش ہوا۔
جج نے سوال کیا۔ "اس بات کو تم قبول کرتے ہو کہ تم نے تین بار کپڑے کی دکان میں چوری کی؟"
"جی جناب میں قبول کرتا ہوں۔" جیک نے جواب دیا۔
جج نے پھر سوال کیا۔ "کیا تم بتانا گوارا کرو گے کیا چیز تم نے تین بار چوری کی؟"
جیک نے جواب دیا۔ "عالی جناب! میں نے عورتوں کی ایک شرٹ چوری کی۔"
"صرف ایک شرٹ؟" جج نے پوچھا۔ "مگر تم نے تو تین بار ایک دکان میں چوری کی؟"
"جی جناب، میں تین بار دکان میں داخل ہوا۔ دو بار میں دکان میں اس لیے گیا کہ چرائی ہوئی شرٹ واپس کردوں۔"
"واپس کردوں؟ میں سمجھا نہیں۔" جج نے کہا۔
جس پر جیک نے جواب دیتے ہوئے کہا۔
"جناب عالی میری بیوی گلوریا کو شرٹ کا ڈیزائن پسند نہیں آیا اسی لیے دوبار بدلنے گیا تھا کہ تیسری بار پکڑا گیا۔"

کچن کے اصول

حامد تازہ تازہ کالج سے فارغ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ایک بڑی کمپنی میں نوکری کی درخواست دی۔
انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو مالک نے حامد کو دیکھتے ہی کہا۔
"ہماری کمپنی کے اصولوں میں ایک اصول یہ ہے کہ کام کرنے والے کو صاف ستھرا رہنا ضروری ہے اور میں امید کرتا ہوں تم سے کہ جب تم میرے کمرے میں داخل ہوئے تو تم نے اپنے جوتے کو باہر رکھے پائدان پر اچھی طرح رگڑ کر صاف کرلیا ہوگا؟"
"جی جناب، میں نے ایسا ہی کیا۔" حامد نے جواب دیا۔
اس پر مالک نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک اور چیز میں بتاتا چلوں کمپنی کے اصولوں کے مطابق سچ بولنا بہت ضروری ہے۔ اور دروازے کے باہر کوئی پائدان نہیں ہے، تمہاری اطلاع کے لیے۔"

(جاوید کاظمی، کراچی)

حاصل نہیں کر سکے۔'' وہ جو اپنے تئیں شاید ائربیس کو کھنڈر بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا، صورتِ حال پر مایوسی سے تبصرہ کرنے لگا۔ اس کی یہ مایوسی اتنی غلط بھی نہیں تھی۔ ڈیوڈ نے اس کے سامنے جو پلان رکھا تھا، اس کے مطابق تو ان کے کمانڈوز کو ائربیس پر ٹھیک ٹھاک تباہی پھیلانے کے بعد وہاں سے زندہ سلامت نکل جانا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں اندر موجود بڑوں میں سے ایک غدار سے معاملات طے ہوگئے تھے لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس غدار کی تصویر بھی مرنے والوں میں شامل تھی۔ پتا نہیں کیسے وہ زد میں آگیا تھا لیکن ان کا سارا پلان الٹ کر رہ گیا تھا اور وہ اپنے قیمتی کمانڈوز سے محروم ہوگئے تھے۔

''خیر... ہم سو فیصد بھی ناکام نہیں رہے۔ تم آنے والے دنوں میں غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے تبصرے سننا۔ مجھے یقین ہے کہ سب متحد ہو کر ایک ہی بات کہیں گے کہ پاکستان دہشت گردوں کا مرکز ہے اور اس جیسے ملک کے پاس ایٹم بم کی موجودگی عالمی امن کے لیے سخت خطرناک امر ہے۔'' ڈیوڈ کے بارہ بجاتے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ دوڑی۔ پانڈے نے بھی اس کے خیال کی تائید کی لیکن اپنی پاکستان دشمنی میں شدت کی وجہ سے وہ اتنے پر قناعت نہیں کر سکتا تھا اور اب تو اس پر اپنے کمانڈوز کی ہلاکت کا بدلہ لینے کی دھن بھی سوار تھی چنانچہ ڈیوڈ کو قائل کرنے میں کامیاب رہا کہ انہیں کوئی اور کارروائی بھی کرنی چاہیے۔

''میں ایک کام پہلے سے سوچ کر آیا تھا۔ اپنے خاص ایجنٹس سے مجھے جو رپورٹس ملی تھیں، ان میں کرنل توحید نامی ایک شخص کا خصوصیت سے ذکر ہوتا تھا اور ہم یہ اندازہ لگا سکے تھے کہ ہمارے سامنے موجود خفیہ ایجنسیوں کے علاوہ جو ایک نامعلوم خفیہ ادارہ کام کر رہا ہے، اس کا کرنل توحید سے گہرا تعلق ہے۔ ہمیں کسی بھی طرح اس شخص تک رسائی حاصل کرنی ہوگی۔'' ڈیوڈ نے بہت سوچ سمجھ کر اسے اپنے اگلے قدم سے آگاہ کیا تو وہ چونک اٹھا۔ کرنل توحید کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

''آپ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے جناب۔ یہ شخص تو پہلے ہی ہماری لسٹ پر موجود ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری ایک ذہین ایجنٹ ڈاکٹر ماریا ماری گئی تھی۔ ڈاکٹر ماریا کی ماں سنتھیا ہماری سینئر ایجنٹ تھی اور اس نے کرنل سے بدلہ لینے کے لیے اسے بم بلاسٹ میں مروانے کی کوشش کی تھی لیکن کرنل اپنے خفیہ گارڈز کی کارکردگی کی وجہ سے بچ نکلا۔ بعد میں ہم اس تک رسائی کا موقع نہیں تلاش کر سکے اور اتفاق سے ہماری قابل ایجنٹ سنتھیا جو اس سلسلے میں سب سے زیادہ ایکٹیو تھی، ایک مشن کے دوران ہلاک ہوگئی۔ ہمارے کئی مقامی ایجنٹس بھی لاپتا یا ہلاک ہوگئے اس لیے ہم آج کل یہاں کچھ مشکلات کا شکار تھے۔ آپ جس آفر کے ساتھ آئے تھے، اس نے ہمیں بہت امیدیں دلائی تھیں لیکن جو تھوڑی بہت کامیابی ہمارے حصے میں آئی ہے، اس کی ہمیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔'' پانڈے اسے جتانا نہیں بھولا تھا کہ اس کے منصوبے پر عمل کرنے سے انہیں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا تھا۔ اس موقع پر ڈیوڈ نے اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ ڈاکٹر ماریا اور سنتھیا حقیقت میں موساد کی ایجنٹس تھیں جو طویل عرصے تک را میں رہ کر ڈبل ایجنٹ کا کردار نہایت خوبی سے ادا کرتی رہی تھیں اور وہ اپنی ان خاص ایجنٹس کی وجہ سے بھی کرنل توحید تک پہنچنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر ہم اپنے اپنے ذرائع سے کرنل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب دونوں کے پاس قابلِ ذکر معلومات جمع ہو جائیں گی تو ایک میز پر بیٹھ کر پلان ڈسکس کریں گے اور اس بار تم برابری کی بنیاد پر پوری پلاننگ میں حصہ لو گے تاکہ کسی ناکامی کی صورت میں کسی ایک فریق کو ذمے دار نہ قرار دیا جا سکے۔'' ڈیوڈ نے منٹوں میں سارا پروگرام طے کر کے پانڈے کو جتا دیا کہ وہ سارا ملبا خود پر ڈالنے کی کوشش کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ پانڈے کے پاس جواب میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ جب ڈیوڈ نے وہاں سے روانگی کا قصد کیا تو وہ اس سے مصافحہ کر کے الوداع کہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکا۔ البتہ ڈیوڈ کے پاس سوچنے اور کرنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ کرنل کو اغوا کروانے میں اس لیے دلچسپی رکھتا تھا کہ اپنے ان دشمنوں تک رسائی حاصل کر سکے جو یہاں ان کی کامیابی میں مسلسل روڑے اٹکا رہے تھے اور وہ یہاں بہت کچھ کرنے کے باوجود حالات کو مکمل طور پر اپنے قابو میں کرنے میں ناکام تھے۔ مخالفین اس کے کمانڈوز کو خاموشی سے گرفتار کر کے جتنا جان سکتے تھے، کرنل کے ہاتھ آجانے کی صورت میں نہ صرف اس کا مداوا ہو جاتا بلکہ بونس میں کئی گنا زیادہ معلومات حاصل ہونے کا امکان تھا۔ بس کرنل ان کے ہاتھ آجاتا۔ اس کے بعد تو وہ را والوں کو بھی گھاس ڈالنے والا نہیں تھا۔ را کا ساتھ تو بس اس نے اپنے مفادات کی خاطر قبول کیا تھا کہ اس خطے میں پاکستان سے اتنی نفرت رکھنے والا دوسرا کوئی کارآمد حلیف ملنا ذرا

مشکل تھا۔

☆☆☆

تحقیقات کے نتیجے میں صورتِ حال کافی واضح ہوگئی تھی۔ ائربیس پر حملے کی کارروائی میں جمال پورہ میں برسوں سے قائم مدرسے نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ بیس پر حملہ کرنے والے کمانڈوز مدرسے کی اس مہمان جماعت اور تعمیراتی عملے کے بہروپ میں آئے تھے جو مدرسے کے توسیعی منصوبے کا جائزہ لینے کے بہانے سے وہاں پہنچی تھی۔ ان کا سازوسامان بھی تعمیراتی سامان کی آڑ میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ ائربیس کا قریب ترین گاؤں ہونے کی وجہ سے جمال پورہ کے راستے میں ایک چوکی قائم کی گئی تھی لیکن چوکی پر موجود عملے نے مدرسے کے حوالے پر کچھ نرمی اور غفلت سے کام لیا اور پیک شدہ سامان کو کھول کر دیکھے بغیر یونہی سرسری جائزہ لے کر گزر جانے دیا۔ مدرسے کے منتظم اور اس کے خاص نائبین کی جمال پورہ سمیت اردگرد کے دوسرے دیہاتوں میں بھی اچھی شہرت تھی اور لوگ ان کی عزت کیا کرتے تھے۔ حملے سے قبل وہ لوگ سرِشام ہی کسی بہانے جمال پورہ سے نکل گئے تھے اور پیچھے جو لوگ بچے تھے ان کی جان خوامخواہ مصیبت میں آگئی تھی۔ تحقیقاتی ادارے ان سے تفتیش کر رہے تھے لیکن وہ کچھ بھی بتانے سے قاصر رہے تھے۔ وہ دو افراد جو منتظم اور اس کے نائبین کی غیر موجودگی میں مہمان جماعت کی میزبانی پر مامور تھے، صرف اتنا بتا سکے تھے کہ رات کے کھانے کے بعد جماعت کے ایک فرد نے اصرار کر کے خود چائے بنائی تھی۔ یہ چائے ان دونوں کو بھی پیش کی گئی تھی جسے پینے کے بعد وہ ساری رات بے حد گہری نیند سوتے رہے اور انہیں خبر نہیں ہو سکی کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس بات کے گواہ خود وہ سپاہی تھے جنہوں نے ان دونوں کو گرفتار کیا تھا۔ گہری نیند میں سوئے ہوئے ان دونوں افراد کو سپاہی بہت مشکل سے اٹھا کر لائے تھے۔ ان کے طبی معائنے سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ انہیں کوئی شدید نشہ آور دوا استعمال کروائی گئی ہے۔

''بدبخت دشمن نے بہت نازک مقام پر اپنی جگہ بنا رکھی ہے۔ اب تک ہم ایسے کتنے مدرسے دریافت کر چکے ہیں جہاں کا انتظام ملک اور مذہب دشمنوں کے ہاتھ میں تھا لیکن یہ اتنا نازک معاملہ ہے کہ ہم کھل کر کارروائی کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ کچھ کرتے ہیں تو ہمارے اپنے ہی لوگ احتجاج کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔'' رپورٹس کا جائزہ لیتے کرنل توحید نے تبصرہ کیا۔

''احتجاج کرنے والے بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہیں سر... بے شمار مدرسے ایسے ہیں جہاں لوگ پورے خلوص سے دین کی خدمت کر رہے ہیں لیکن جب اس طرح کے بیانات سامنے آتے ہیں جن سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مدرسوں میں دہشت گرد تیار کیے جا رہے ہیں تو ظاہر ہے ان کے خلوص کی توہین ہوتی ہے۔'' ذیشان نے اپنا نکتۂ نظر پیش کیا۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ ہماری پوزیشن بڑی نازک ہے۔ ایک طرف دنیا شور مچاتی ہے کہ پاکستانی مدرسوں میں انتہا پسند اور دہشت گرد تیار کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف اپنوں کا تعاون نہ ملنے کی وجہ سے ہم اپنی صفوں میں چھپے دشمنوں سے نجات حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔'' انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں سر! یہ تو حکمرانوں اور سیاست دانوں کی ذمے داری ہے کہ افہام و تفہیم سے اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کریں۔ ہم تو صرف ڈائریکٹ ایکشن لینے والے لوگ ہیں۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خیر، یہ بتاؤ کہ جو بندہ پکڑا گیا ہے اس نے کچھ اگلا یا نہیں؟ اس کے حوالے سے مجھ پر بڑی ذمے داری ہے۔ میں نے دوسری ایجنسیوں کو اس بات کی ہوا نہیں لگنے دی ہے کہ ہم کسی شخص کو زندہ گرفتار کر لانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ مجھ سمیت گنتی کے بس چند افراد ہی اس حقیقت سے باخبر ہیں اور یہ جاننے کے لیے بے چین ہیں کہ تم اس شخص سے کیا معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہو۔'' انہوں نے ذرا سی ٹانگیں پھیلاتے ہوئے دریافت کیا۔ ان کا زیادہ تر وقت سی ایف پی کے ہیڈ کوارٹر میں ہی گزر رہا تھا۔ کسی ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہوتی تو وہاں سے جاتے ورنہ یہیں موجود رہتے۔ اس عرصے میں انہوں نے آرام بھی بہت کم کیا تھا۔ ذیشان سمیت باقی عملے کا بھی یہی حال تھا۔

''ابھی ہم نے اس سے ابتدائی تحقیقات ہی کی ہیں لیکن بہرحال یہ اگلوانے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ یہ موساد اور را کا مشترکہ منصوبہ تھا اور دونوں طرف کے کمانڈوز نے ہی اس کارروائی میں حصہ لیا تھا۔ پکڑے جانے والے شخص کا تعلق موساد سے ہے اور اس نے بتایا ہے کہ ان کے فرار کے انتظامات مکمل تھے لیکن عین وقت پر ان کا اس شخص سے رابطہ نہیں ہو سکا جس سے ان کا معاملہ ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اور اس کے ساتھی وہاں پھنس گئے۔'' ذیشان نے

انہیں اب تک کی حاصل شدہ معلومات فراہم کیں۔

''اس بدبخت غدار کے بارے میں، میں جانتا ہوں جس نے دولت کی خاطر مادرِ وطن کا سودا کر ڈالا تھا۔ وہ خبیث اپنے اردلی کے ہاتھوں ہی انجام کو پہنچا۔ اس اتنے بڑے عہدے دار کے مقابلے میں ایک معمولی اردلی نے اپنی حب الوطنی کو ثابت کر دکھایا۔ آپریشن کے بعد جن زخمیوں کو اسپتال پہنچایا گیا، ان میں وہ شدید زخمی اردلی بھی شامل تھا۔ اس نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس نے اپنے صاحب کی کسی سے کی جانے والی گفتگو سن لی تھی۔ وہ کسی سے وعدہ کر رہا تھا کہ اس کے آدمیوں کو وہاں سے بحفاظت نکالنے کا انتظام ہو جائے گا اور اس کام کو یقینی بنانے کے لیے وہ خود یرغمالی بن کر ان کے ساتھ جائے گا۔ محب وطن اردلی سے اپنے افسر کی یہ گفتگو برداشت نہیں ہوئی اور وہ سینہ تان کر اپنی حیثیت کا خیال کیے بغیر اس سے سوال جواب کرنے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ افسر نے پہلے تو اسے بھی لالچ کے جال میں پھنسانا چاہا لیکن جب کامیاب نہیں ہوا تو دھمکیوں پر اتر آیا اور اردلی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ اردلی اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اور اس شخص کو جہنم رسید کر دیا لیکن اس اثنا میں وہاں کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اردلی بھی دفاع کے لیے لڑنے والوں میں شامل ہو گیا اور گولیوں کا نشانہ بنا۔ اس کی جان شاید اسی لیے اٹکی ہوئی تھی کہ یہ حقیقت بیان کر سکے۔ وہ اسپتال میں جامِ شہادت نوش کر کے وطن کا بیٹا ہونے کا حق ادا کر گیا۔ میرے بس میں ہوتا تو اسے اکیس توپوں کی سلامی دیتا اور اس کی قبر پر کتبہ لگاتا کہ یہاں وطن کا قابلِ فخر بیٹا سو رہا ہے لیکن میری مجبوری دیکھو کہ میں غدارِ وطن کے تابوت کو بھی سبز پرچم میں لپیٹ کر دفن ہوتے دیکھوں گا اور دنیا کو یہ حقیقت نہیں بتا سکوں گا کہ یہ شخص دشمنِ وطن ہے اور ہرگز بھی اس لائق نہیں کہ اس کے ناپاک وجود کو میرے ملک کے پاک پرچم میں لپیٹ کر اس کی مقدس زمین میں دفن کیا جائے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس شخص کی لاش کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھانے کے لیے دیتا لیکن افسوس میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا کہ مجھے اس خاکی وردی کی عزت بھی بچانی ہے۔ میں ایک غدار کے کرتوت سامنے لا کر عوام کا تمام فورسز پر سے اعتماد ختم نہیں کر سکتا اسی لیے یہ کڑوا گھونٹ پینے پر مجبور ہوں۔''

کرنل توحید اس کے سامنے یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے شدید جذباتی ہو گئے تھے۔

''یہ ہمارا مقدر ہے سر! ہم ہمیشہ سے اس معاملے میں بدقسمت ثابت ہوئے ہیں کہ ہر بار اپنوں ہی کی غداریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے درمیان غدار نہ ہوتے تو اغیار کی سازشیں کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ ہم تو وہ بدنصیب ہیں کہ اپنا آدھا وطن گنوا کر بھی کوئی سبق حاصل نہیں کر سکے اور آج ان حالات سے گزر رہے ہیں کہ ہر شخص آنے والے وقت سے خوف زدہ ہے۔ لیکن پھر بھی میں اس وطن کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں کیونکہ جب میں بہت سے ایسے پُرخلوص لوگوں کو دیکھتا ہوں جو اس وطن کے لیے جان بھی نچھاور کرنے سے نہیں گھبراتے تو مجھے اندھیرے میں امید کی کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ جاوید علی، سلمان، شہریار... کتنی لمبی فہرست ہے میرے پاس ان افراد کی جو سب کچھ بھول کر اس وطن کے لیے جینا اور اس پر مرنا چاہتے ہیں... پھر کیوں میں اپنے وطن کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہوں؟'' ذیشان کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

کرنل توحید نے اس کی تائید کی اور کافی کے اس کپ کی طرف متوجہ ہو گئے جو ذیشان نے اس گفتگو کے دوران الیکٹرک کیتلی میں تیار کرنے کے بعد ان کے سامنے رکھا تھا۔

''میں شہریار کی واپسی کا شدت سے منتظر ہوں۔ اس کے یہاں آنے پر ہم مل کر کچھ اہم معاملات نمٹائیں گے۔ اس عرصے میں ہم چودھری والے معاملے میں خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے ہیں اور دوسرے معاملات میں الجھے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چودھری سے بھی نمٹ ہی لینا چاہیے۔ ایک شخص کا کردار سامنے ہوتے ہوئے اسے اتنی چھوٹ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ صرف ایک عام ظالم و جابر جاگیردار ہوتا تب بھی گوارا تھا لیکن منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ سے اس کی وابستگی نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی جائے۔''

کافی پیتے ہوئے وہ کرنل صاحب کے ساتھ اپنا مستقبل کا پروگرام ڈسکس کرنے لگا۔

''تم ٹھیک سوچ رہے ہو لیکن ابھی شاید شہریار کو واپس آنے میں کچھ وقت لگے۔ پہلے تو وہ لوگ چین پہنچیں گے پھر وہاں سے ان کی پاکستان واپسی ہوگی۔''

''جہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا اور سہی... فی الحال تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر فرحان اور اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ یار زندہ صحبت باقی تو بس اللہ میرے یار کو سلامت رکھے۔ وہ صحیح سلامت واپس پہنچ گیا تو انشاء اللہ مستقبل میں ہم مل کر بہت کچھ کر گزریں گے۔'' ذیشان نے بہت خلوص سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''انشاء اللہ... وہ ضرور واپس آئے گا۔ اللہ بھی جانتا ہے کہ اس وطن کو تمہارے اور اس جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔'' کرنل صاحب نے بھی خلوصِ نیت سے اس کی تائید کرتے ہوئے امید کا اظہار کیا۔ یہ امیدیں اور دعائیں ہی تھیں جو بہت دور سمندر کا سینہ چیر کر آگے بڑھنے والے مسافروں کے لیے زادِ راہ بننے والی تھیں۔

☆☆☆

''آہ...'' عالیہ نے اس کے بازو پر بندھی پٹی کھولی تو وہ آہستہ سے کراہا۔ پٹی زخم سے چپک گئی تھی اس لیے اسے الگ کرتے ہوئے تھوڑی تکلیف ہوئی تھی۔

''اتنے بڑے بڑے زخم تو شوق سے کھا لیتے ہو اور اب بچوں کی طرح آوازیں نکال رہے ہو۔''

عالیہ نے ڈپٹنے کے انداز میں کہا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔ ''زخم میں شوقیہ نہیں لگواتا ہوں بس یہ تو وہ تمغے ہیں جو میرے حبِ وطن کا ثبوت بن کر دشمن کے ہاتھوں خود ہی میرے جسم پر سج جاتے ہیں۔''

''اس حساب سے تو ہمیں دشمنوں ہی کو دعائیں دینی چاہئیں۔ تم زخمی ہوتے ہو تب ہی تو گھر کا رخ کرتے ہو۔ میں تو بے چاری آنٹی کے حوصلے کی داد دیتی ہوں کہ وہ کیسے اتنے اتنے عرصے تک تنہا رہ جاتی ہیں۔'' وہ اس کے زخم کی صفائی کرتے ہوئے خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔

''وہ ایک شہید کی بیوہ ہیں اور جانتی ہیں کہ ان کا بیٹا وطن کا ایک سپاہی ہے جس کی ان سے بھی زیادہ اس وطن کو ضرورت ہے۔ وہ اپنی ممتا کی قربانی دیتی ہیں تو کئی ماؤں کی ممتا پُرسکون رہتی ہے۔'' اس نے نہایت سنجیدگی سے اپنی صفائی پیش کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی تمہیں ان کے احساسات کا خیال کرنا چاہیے۔ وطن کی محبت میں وہ تم سے دوری کا عذاب سہہ تو لیتی ہیں لیکن آخر ہیں تو ایک ماں ہی... ناجن کی زندگی میں تمہارے سوا کچھ نہیں ہے اور یقیناً تمہارے حوالے سے ان کے دل میں بہت سے خواب بھی بسے ہیں۔ تم اپنی مصروفیات میں انہیں ان کے خوابوں سے محروم کرنے کی زیادتی نہیں کر سکتے۔ ان کا بھی تم پر کوئی حق ہے۔'' زخم پر جیل نما کوئی کریم پھیلاتے ہوئے وہ اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔

''کیا امی نے تم سے اس سلسلے میں کوئی شکایت کی ہے؟'' جاوید علی نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

''نہیں۔'' عالیہ نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ ''وہ شکوے شکایات کرنے والی خاتون نہیں ہیں۔ میں نے خود یہ بات محسوس کی ہے۔ وہ میرے ساتھ تمہاری باتیں کرتی ہیں۔ تمہاری پیدائش سے لے کر ایک ایک لمحہ انہیں ایسے ازبر ہے جیسے یہ سب ابھی ابھی ان کی نظروں کے سامنے ہو رہا ہو۔ تم کیا چیز شوق سے کھاتے ہو، تمہیں کون سا رنگ پسند ہے، تم کتنی خوش الحانی سے قرأت کرتے ہو، ان کی زبان پر ہر وقت یہی باتیں ہوتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنی شدت سے تمہیں مس کرتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ میں یہاں ہوں تو انہیں مجھ سے اپنے دل کی بات کہنے کا موقع تو مل جاتا ہے۔ میں چلی گئی تو وہ پھر سے تنہا ہو جائیں گی اور تم وہی کبھی کبھار بھولے بھٹکے گھر آیا کرو گے۔'' اس کی ڈریسنگ کرتے ہوئے وہ دکھی سے لہجے میں بولتی جا رہی تھی۔

''تو تم یہاں سے جانے کا کیوں سوچتی ہو؟ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤ نا۔'' جاوید علی نے بہت بے ساختگی سے اس سے فرمائش کی جس پر اس کے کچھ کچھ جاپانی لگنے والے نقوش میں حیرت جاگی۔

''میں ہمیشہ یہاں کیسے رہ سکتی ہوں؟ تم نے مجھے مشکل حالات میں سہارا دیا اس کے لیے میں دل سے تمہاری شکر گزار ہوں لیکن مجھے ساری زندگی تم پر بوجھ بن کر رہنا گوارا نہیں۔'' اپنی حیرت پر قابو پا کر اس نے جاوید علی کو جواب دیا۔

''کچھ بوجھ انسان خوشی سے اٹھاتا ہے۔ تم میری زندگی کی ساتھی بن جاؤ گی تو تمہارے ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا جواز بھی پیدا ہو جائے گا اور امی کو پوتا پوتی کی شکل میں میرا بہترین نعم البدل ملے گا تو ان کی تنہائی بھی ختم ہو جائے گی۔'' اس نے گویا چٹکیوں میں سارا مسئلہ حل کر دیا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں کسی بھی طرح تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تم میرے مقابلے میں کم عمر اور خوش شکل ہو... اور فرض کرو ان دونوں باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو میرا ماضی ایسا نہیں ہے کہ میں تم جیسے شخص کا ساتھ ڈیزرو کروں۔'' وہ ڈریسنگ مکمل کر چکی تھی چنانچہ سامان سمیٹتے ہوئے ذرا خفا سے لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

''پہلے دو فرق تو تم نے خود بھی تسلیم کر لیے ہیں کہ نظر انداز کیے جا سکتے ہیں اور تیسری بات کی میرے لیے اہمیت

نہیں ہے۔ گناہ سے سچے دل سے تائب ہو جانے والا اللہ کے ہاں کسی نومولود بچے کی طرح پاک ہو جاتا ہے تو پھر میں کون ہوتا ہوں تمہارے ماضی کے حوالے کو یاد رکھنے والا؟ میں تو بس اس لڑکی کو جانتا ہوں جو میرے گھر میں ویسے ہی رہتی ہے جیسے کسی شریف لڑکی کو رہنا چاہیے۔ جسے میرے گھر کو سجانا سنوارنا اچھا لگتا ہے۔ جو میری ماں سے میری پسند کے کھانے بنانا سیکھتی ہے... جس نے میری ماں کی تنہائیاں بانٹ لی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ جو بھی انہیں تنہا چھوڑ کر میکے نہیں جائے گی اور میں جب بھی واپس گھر آؤں گا، مجھے اپنی منتظر ملے گی۔'' بہت سنجیدگی سے بولتے بولتے وہ آخر میں ذرا نیم مزاحیہ لہجے میں بولا تو عالیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''ابھی سے بیویوں جیسی ظالمانہ نظروں سے تو مت گھورو یار... ابھی تو میں نے تمہیں صرف پروپوز کیا ہے۔'' وہ ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے مسخرے پن سے بولا تو عالیہ کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی جسے اس نے تیزی سے چھپا لیا لیکن یہ مسکراہٹ تو جاوید علی کے دل پر نقش تھی۔ شازمین جو بہت مختصر عرصے کے لیے اس کی زندگی میں آئی تھی، ایسے ہی تو مسکراتی تھی۔ نازک اندام، حسن و رعنائی کا پیکر کم عمر سی شازمین اور کچھ کچھ جاپانی نقوش رکھنے والی پختہ عمر عالیہ میں یہی واحد قدرِ مشترک تھی جو جاوید علی کا دل اس کی طرف کھینچتی تھی۔ عالیہ کی مسکراہٹ اسے شازمین کی مسکراہٹ یاد دلا دیتی تھی۔ شازمین کو وقت کے جبر نے اس سے چھین لیا تھا لیکن وہ عالیہ کو اپنا کر اسے تو ایک نئی زندگی دے سکتا تھا۔ یہ لڑکی جو گناہوں کی دلدل سے نکل آئی تھی، اگر اس کا ساتھ پا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ و مامون ہو جاتی تو یہ سودا کوئی برا تو نہیں تھا۔ اس کے گھر کو عالیہ جیسی خیال رکھنے والی لڑکی کی ضرورت تھی۔

''تو پھر میں امی سے بات کروں؟'' اس نے عالیہ کی نیم رضامندی کو محسوس کرتے ہوئے اسے چھیڑنے کے انداز میں پوچھا۔

''ہو سکتا ہے انہیں اعتراض ہو۔ وہ ماں ہیں، انہوں نے تمہارے حوالے سے کچھ اور خواب دیکھ رکھے ہوں گے۔'' وہ کسی بچی کی طرح مضطرب اور خوف زدہ نظر آئی۔

''تو چلو ابھی یہ بات کلیئر کر لیتے ہیں۔'' وہ اتنی تیزی سے بستر سے اتر کر اس کا ہاتھ تھام کے کمرے سے باہر لے گیا کہ عالیہ ''ارے ارے، رکو تو سہی'' بولتی ہی رہ گئی اور وہ اس کمرے میں جا پہنچے جہاں جاوید علی کی والدہ بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں۔ جاوید علی، عالیہ کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوا تو وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا امی کہ کیا آپ کو عالیہ کو اپنی بہو بنانے میں کوئی اعتراض ہو سکتا ہے؟'' عالیہ کے جز بز ہونے کی پروا کیے بغیر اس نے شوخی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' ان کے جواب نے اس کی شوخی ہوا کی، وہیں عالیہ کا چہرہ بھی زرد پڑ گیا۔

''مجھے یہ اعتراض ہے کہ میرا نالائق بیٹا جو ماں کو اتنے دنوں بعد اپنی شکل دکھاتا ہے میری بہو کو بھی ایسے ہی ستائے گا اور اس بے چاری کی زندگی بھی میری طرح تمہاری راہ دیکھتے ہوئے ہی گزر جائے گی۔ اگر یہ اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن بعد میں مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرے کہ مجھے خبردار نہیں کیا۔'' ان کی نہایت سنجیدگی سے کہی بات کا اختتام ایک زیرِلب مسکراہٹ پر ہوا تھا۔ ان دونوں کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں۔

''پکا وعدہ... میں کبھی آپ سے شکایت نہیں کروں گی۔'' عالیہ بے ساختہ جا کر ان سے لپٹ گئی۔

''یاہو... لڑکی نے ہاں کر دی۔'' جاوید علی نے خوشی کا مظاہرہ کرنے کے لیے دونوں بازو ہوا میں لہرانے کی کوشش کی لیکن زخم کو لگنے والے جھٹکے نے رکنے پر مجبور کر دیا۔

''بس تیار ہو جاؤ۔ تمہیں اپنے میاں ایسی ہی زخمی اور ٹوٹی پھوٹی حالت میں دستیاب ہوا کریں گے۔'' جاوید علی کی والدہ نے عالیہ کو ہوشیار کیا۔

''مجھے قبول ہے۔'' عالیہ کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ چمکی جو جاوید علی کے دل کو بھاتی تھی اور دل کے اندر تک یہ اطمینان اتر گیا کہ بے شک وہ شازمین کو تو نہیں پا سکا لیکن اس کی مسکراہٹ ہمیشہ عالیہ کی صورت میں اس کے پاس رہے گی اور اس کی ہمراہی میں وہ سکون سے ان دشمنوں سے نمٹتا رہے گا جنہوں نے شازمین سے اس کی زندگی چھینی تھی۔

☆☆☆

بھارت کی سمندری حدود پار کرتے ہی وہ لانچ واپس چلی گئی تھی جس پر عبدالرحمان کے آدمی ان کی حفاظت کے لیے سوار تھے۔ اب تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لیے وہ لوگ بھی خاصی حد تک پُرسکون ہو گئے تھے اور سکون کے احساس نے ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار اتار دیا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ سب ہی سوتے چلے گئے۔ پھر دوبارہ آنکھ ایک زبردست جھٹکے سے کھلی۔ ہر ایک ہڑبڑا کر نیند سے جاگا۔ صبح نمودار ہونے لگی تھی اور رات کی تاریکی میں سیاہ لگنے والے سمندر نے بھی ہلکے سرمئی رنگ کی چادر اوڑھ لی تھی۔ دور افق پر پھوٹتی سورج کی کرنوں سے چاندی میں نہائے پرندے حصولِ رزق کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

''وہ ادھر... ادھر ایک لانچ ہے، اس پر سے لانچر فائر ہوا ہے۔ ہمارا لانچ بال بال بچا ہے۔'' بوڑھے رنگھاوا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ایک لانچ کی طرف اشارہ کیا۔ لانچ خاصے فاصلے پر تھی لیکن اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اس پر ان کے دشمن ہی سوار ہیں۔ ان سب نے تیزی سے ہتھیار سنبھال لیے۔ رنگھاوا اپنے خاندان کے مردوں کو بھی ہدایات دینے لگا۔ شہریار نے ٹیلی اسکوپ رائفل ہاتھ میں سنبھال کر پوزیشن لی اور اس لانچ کی طرف دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ ماہی گیری کے لیے استعمال ہونے والی ایک عام لانچ تھی لیکن اسے اس پر موجود مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ ایک شخص پر اسے بھشا گر کا شبہ ہوا تھا لیکن اتنی دور سے نقوش واضح نہیں تھے۔ ان کی لانچ چلانے والے نے لانچ کا رخ ذرا سا بدل کر اس کی رفتار بڑھا دی تھی، اس وجہ سے فاصلے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا لیکن وہ بھی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے بھی جواب میں اپنی لانچ کی رفتار میں اضافہ کر لیا۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ انہیں روکنے کے لیے فائر کریں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ گولیوں نے پیچھے آنے والی لانچ کا کچھ بگاڑا یا نہیں لیکن ان کی طرف سے دوبارہ ایک اور لانچر فائر کیا گیا۔ اس بار لانچر اس لانچ کے قریب آ کر گرا جس پر رنگھاوا کے قبیلے کی عورتیں اور بچے بڑی تعداد میں سوار تھے۔ لانچر گرنے کی وجہ سے سمندر میں پیدا ہونے والے تلاطم نے لانچ کو بری طرح ڈولنے پر مجبور کر دیا۔ عورتوں اور بچوں کے منہ سے بے ساختہ ہی چیخیں بلند ہوئیں اور یکایک انہوں نے ایک بچے کو لانچ سے سمندر میں گرتے دیکھا۔ اس منظر کو دیکھ کر کئی مردوں کے منہ سے بھی چیخیں نکل گئیں۔ بچہ ڈھائی تین سال سے زیادہ کا نہیں تھا اور سمندر میں بری طرح ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ یکایک سلو نے اپنے ہاتھ میں موجود گن پھینکی اور سمندر میں کود گیا۔ وہ اچھا تیراک رہا ہو گا جب ہی اس نے یہ جرأت کی تھی لیکن سمندر بپھرا ہوا تھا اور لانچر پھٹنے کی وجہ سے اس میں مزید دائرے بن رہے تھے جو تیراک کو نیچے کی طرف بھی کھینچ سکتے ہیں۔

''اب ان کو جواب دینا ضروری ہو گیا ہے۔'' رنگھاوا غصے سے بڑبڑایا اور پھر بلند آواز میں کچھ ہدایتیں دینے لگا۔ زبان ان کے لیے اجنبی تھی اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھ سکے۔ ویسے بھی اس وقت ان کی توجہ سلو کی طرف زیادہ تھی جو سمندری موجوں کا مقابلہ کرتا ڈوبتے ابھرتے بچے تک پہنچنے میں تقریباً کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسری لانچ پر موجود جوان اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ مدد کے لیے بھی تیار نظر آ رہے تھے۔ سلو نے ڈوبتے بچے کے قریب پہنچ کر اس کے لمبے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور اسے لانچ کی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن اسی وقت ایک تیز لہر آئی اور اس کا لانچ سے فاصلہ بڑھ گیا۔ بچے کو بہرحال اس نے اپنی گرفت سے نہیں نکلنے دیا تھا۔ اس کی مدد کے لیے کوشاں نوجوانوں میں سے ایک نے لمبی سی ایک رسی کا پھندا بنا کر اس کی طرف پھینکا۔ پہلی کوشش ناکام رہی اور ہوا نے پھندے کو سلو تک پہنچنے نہیں دیا۔ نوجوان نے ہمت نہیں ہاری اور آخر تیسری کوشش میں وہ کامیاب رہا۔ سلو نے تیزی سے رسی کو تھام کر اپنی کمر کے گرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ سے یہ کام آسان نہیں تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ نے بچے کو تھاما ہوا تھا۔ آخر کافی جدوجہد کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ لانچ پر موجود نوجوان اس کی مدد کرنے لگے۔ اس دوران میں بوڑھے کی ہدایت پر عمل شروع ہو گیا تھا اور ان کی طرف سے پے در پے تین لانچر متعاقب لانچ پر فائر کیے گئے تھے۔ دو لانچر تو لانچ کے دائیں بائیں جا کر گرے جبکہ تیسرے نے لانچ کے اگلے حصے کو نشانہ بنایا۔ یہ وار کارگر ثابت ہوا اور پیچھے آنے والی لانچ الٹ گئی۔

''بس اب نکل چلو۔'' رنگھاوا نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ لانچیں مزید رفتار سے حرکت میں آ گئیں۔ سلو اور سمندر میں گرنے والے بچے کو اس اثنا میں لانچ پر سوار کروایا جا چکا تھا اور ایک نوجوان بچے کے پیٹ سے پانی نکال کر اسے طبی امداد دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان چند منٹوں میں ہی سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ موت کے منہ سے بال بال بچ کر نکلے تھے۔

''تمہارے پاس یہ انتظام بھی ہو گا، مجھے امید نہیں تھی۔'' شہریار لانچ میں سیدھے کھڑے رنگھاوا کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ ماتھے پر ہتھیلی کا چھجا سا بنائے دور ڈوبتی لانچ کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ اپنی بقا کے لیے رکھنا پڑتا ہے اور اس بار تو عبدل بھائی کی بھی مہربانی تھی۔ انہوں نے پیغام بھیجا تھا کہ یہ میرے خاص مہمان ہیں، ان کی حفاظت کے لیے جو چاہتا ہے مانگ لے لیکن کام پورا کرنا۔“ رنگھا دا نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

”شکر ہے وہ بچہ بچ گیا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔“ پچھلی لانچ کی طرف دیکھتے ہوئے شہریار نے تبصرہ کیا۔

”وہ سمندر کا بیٹا ہے میرا پوتا... ہم سب سمندر میں رہنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ سمندر ہمارا دوست ہے۔ یہ ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ میرے بعد میرا بیٹا اور پھر پوتا سردار ہوگا۔ آج وہ سمندر میں ڈوبنے سے بچا ہے، کل اس کی لہروں پر کھیلتا پھرے گا۔ تمہارے ساتھی کی مدد کا شکریہ لیکن اگر وہ جلدی نہ کرتا تو تم دیکھتے کہ ہمارا اپنا کوئی جوان اسے بچانے کے لیے سمندر میں کود جاتا۔ تم اسے احسان فراموشی مت سمجھنا۔ میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ بوڑھا بہت تجربہ کار اور سمجھ دار تھا۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ شہریار کو وہ اچھا لگا تھا۔ عام آدمیوں سے ذرا مختلف اور قدرے پُراسرار سا۔

”آؤ چل کر ناشتا کرتے ہیں۔“ پیچھے سے کسی عورت کی آواز سنائی دی تو وہ شہریار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ناشتے میں انہیں کسی خاص انداز سے پکی مچھلی، خشک ڈبل روٹی اور چائے پیش کی گئی۔ یہ ناشتا ان کے لیے بہت مختلف تھا لیکن برا نہیں لگا۔

”مجھے بتایا گیا تھا کہ مجھے اس سفر میں فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔“ ناشتے کے بعد شہریار نے بوڑھے سے ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ہم دبئی نہیں جانا چاہتے اس لیے تمہیں اپنے سفر کی سمت تبدیل کرنی ہوگی۔“ شہریار نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

”کس طرف جانا ہے؟“ بوڑھے نے بغیر کسی بحث کے اس سے دریافت کیا۔

”یہ میں تمہیں تھوڑی دیر میں بتاؤں گا۔ اس سے پہلے تم مجھے ریڈیو تک لے چلو۔“

”ٹھیک ہے آؤ۔“ اس نے اس بار بھی اعتراض نہیں کیا اور اسے اپنے ساتھ ریڈیو روم تک لے گیا۔ شہریار نے ذیشان کی بتائی ہوئی فریکوئنسی ملا کر اس پر رابطہ کیا اور دوسری طرف سے ضروری معاملات طے کرتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے بوڑھے کو اپنے سفر کی سمت بتائی۔

”ٹھیک ہے لیکن کیا تم ضروری سمجھتے ہو کہ میرے قبیلے کی دوسری دونوں لانچیں بھی ہمارے ساتھ ہوں؟“ بوڑھے نے اس سے دریافت کیا۔

”نہیں، وہ اپنے معمول کے راستے پر جا سکتے ہیں۔“ شہریار نے اسے اجازت دی۔ اسے ویسے بھی اس خیال سے وحشت ہو رہی تھی کہ معصوم بچے اور عورتیں ان کے ساتھ نشانہ بن جائیں۔ بچے کے لانچ سے گرنے کا منظر اس کے ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔

”اس لانچ میں موجود عورتوں اور بچوں کو بھی دوسری لانچوں میں بھیج دو۔“ اس نے بوڑھے سے مطالبہ کیا جس کو اس نے منظور کر لیا۔ منتقلی کے اس عمل میں کچھ دیر کے لیے ان کا سفر رکا اور پھر لانچیں مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے کو نظر آتے رہے پھر دھندلاہٹ غالب آ گئی۔ اب ان کے پاس حدِ نگاہ پھیلے سمندر کو دیکھنے یا ایک دوسرے سے لایعنی باتیں کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اب بھی اندر سے ڈرے ہوئے تھے کہ پھر گھیرے جائیں گے لیکن فی الحال کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر یکا یک موسم میں تبدیلی ہونے لگی۔ آسمان جس پر پہلے چند ایک ہی بادل کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے، یکا یک سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا اور سورج کی کرنیں ان تک پہنچنے میں ناکام ہونے لگیں۔

”شاید بارش ہونے والی ہے۔“ شہریار نے اندازہ لگایا۔

”نہیں۔“ بوڑھے نے اس کی تردید کی۔ ”طوفان آنے والا ہے۔“ اس کے پُراسرار لہجے میں کیے گئے اس اعلان نے سب کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ان میں سے کوئی بھی سمندر میں سفر کا تجربہ نہیں رکھتا تھا اور کہاں ایک لانچ میں کھلے طوفان کا سامنا کرنا۔ اسی وقت ایک دوسری افتاد ٹوٹی جب کنٹرول روم میں ڈیوٹی دیتے شخص نے بوڑھے کو آ کر بتایا۔

”ہماری لانچ کو گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ تین بڑی لانچیں ہیں۔“

اس خبر کو سن کر انہیں اندازہ ہوا کہ ابھی تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا گیا ہے۔

یہ پرپیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

رسیا

سکندر علیم

فراریت پسندی اور گریز ہر شخص کا شیوہ نہیں ہوتا... کچھ لوگ اپنے اردگرد بسے نفوس اور ماحول سے بالکل کٹے ہوئے اور لاتعلق رہنا پسند کرتے ہیں... اپنی من پسند دنیا لاشعور سے شعور تک انہیں مکمل گرفت میں رکھتی ہے... جانوروں اور انسانوں کے مابین قدرِ مشترک کا جان لیوا احوال...

ایک چالاک و جہاں دیدہ جادوگرنی کی نشست و برخاست کے ڈرامائی و سنسنی آمیز سلسلے

مس بارکر کو جوتشیوں سے عشق تھا۔ ان کے اطراف میں چھائی ہوئی مخصوص طلسمی فضا، ان کی صوفیانہ اور مسحور کن رسمیں جو یہ پیش گوئی کرنے والے اپنے پیشے میں استعمال کرتے تھے، اسے بے حد دل فریب لگتی تھیں۔

چائے کی پتیاں، قسمت کا حال بتانے والی تاش کی گڈیاں، ہاتھ کی لکیروں سے قسمت کا حال بتانا اور منطقۃ البروج کے اشارات، ان سب کا اپنا ایک طلسم اور سحر تھا لیکن مس بارکر ان سب پر کرسٹل بال کو ترجیح دیتی تھی۔ اس

کا انوکھا حسن خاص طور پر جب وہ اپنے سیاہ رنگ کے ویلوٹ پیڈسٹل پر ایک جگمگاتے ہیرے کے مانند رکھا ہوا ہوتو اس کا یہ نظارہ مس بارکر کے وجود میں ایک سنسنی دوڑا دیتا تھا۔

وہ دل وجان سے اس بلوری گولے پر یقین رکھتی تھی۔

گرمیوں کا سیزن اپنے اختتام پر تھا۔ مس بارکر اپنی پرانی لیکن قابلِ اعتبار پلائی ماؤتھ کوپے میں میڈم آئیز یلڈا سے ملنے شہر جارہی تھی۔ وہ خانہ بدوشوں کی بوڑھی ملکہ تھی جو پانچ ڈالر کے عوض لوگوں کے مستقبل کا حال بتایا کرتی تھی۔

اس وقت وہ بوڑھی جپسی ملکہ کے روبرو میز کے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ مس بارکر کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑرہی تھی۔

وہ بوڑھی جوتشن اس جگمگاتے کرسٹل بال پر اپنے نازک ہاتھ پھیرنے کے ساتھ کچھ بے ربط الفاظ بھی بڑبڑارہی تھی۔ اس کی کلائیوں کی ہڈیاں نمایاں تھیں اوران پر گوشت کی تہ برائے نام دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نظریں بلوری گولے پر سحرزدہ انداز میں جمی ہوئی تھیں جیسے کہ اس کے اندر چھپے ہوئے گہرے رازوں کو مادی طور پر نکالنے کی کوشش کررہی ہوں۔ پھراچانک اس کے منہ سے حیرت کا کلمہ بلند ہوا۔

مس بارکر خود پر مزید قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے؟“

بوڑھی جپسی ملکہ نے ناراض نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے جھریوں سے بھرے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات نمایاں تھے۔

”مادام، میں خاموشی پر اصرار کروں گی۔ کشف کے مناظر مکمل اور بے خلل توجہ چاہتے ہیں۔“

مس بارکر اپنی کرسی پر پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ خوشی کے باعث اس کا نازک بدن تھرتھرا رہا تھا۔

بوڑھی جپسی ملکہ نے چند مرتبہ اور بلوری گولے پر ہاتھ پھیرا پھر سرگوشی کے انداز میں رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ ”مجھے ایک پیغام ملنا شروع ہوگیا ہے۔“ ساتھ ہی اس کی آنکھیں ایک پُراسرار روشنی سے چمکنے لگیں اور اس کے چہرے پر ایک ماورائی سے تاثرات چھاگئے۔

”مجھے ایک براؤن گھر نظر آرہا ہے جس کی کھڑکیاں سفید رنگ کی ہیں... وہ کھڑکیاں ہلکے بنفشی اور زرد گلابی پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں...“

”یہ میرا گھر ہے۔“ مس بارکر نے چہچہاتے ہوئے کہا لیکن پھر بوڑھی جپسی ملکہ کی تیوریوں پر سیاہ بل دیکھتے ہی خاموشی اختیار کرلی۔

”ایک آدمی... ایک نوجوان آدمی... گھر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔ یوں معلوم ہورہا ہے جیسے اسے کسی شے یا کسی فرد کی تلاش ہے...“

مس بارکر نے ایک گہرا سانس لیا اور آگے کی جانب جھک کر اس بلوری گولے میں نمودار ہونے والے عکس کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

بوڑھی جپسی ملکہ کی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ اس کی ڈرامائی خودکلامی جاری تھی۔

”وہ نوجوان دروازے کی جانب بڑھ رہا ہے... وہ دستک دے رہا ہے... دروازہ کھل گیا ہے، وہ سرِتسلیم خم کرتے ہوئے مسکرا رہا ہے... وہ مکان کے اندر داخل ہورہا ہے۔“ پھر وہ جوتشن خاموش ہوگئی اور صبر آزما نظروں سے کرسٹل بال کو دیکھنے لگی۔

مس بارکر کے چہرے سے بے تابی عیاں ہونے لگی۔ تب جپسی ملکہ نے دھیرے دھیرے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور مس بارکر کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے بولی۔ ”تصویر دھندلی ہوتی جارہی ہے۔“

مس بارکر اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ”ایک آدمی... وہ بھی نوجوان! کتنی عمدہ بات ہے۔ فیلیشیا کتنی خوش ہوجائے گی۔ یاد رہے کہ وہ نوجوان میرے لیے نہیں ہے اور کتنا عرصہ گزر چکا ہے، ہم شہر سے اتنی دور رہتے ہیں کہ کوئی بات چیت کرنے والا شاذونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہاں، فیلیشیا کا دل مسرت سے جھوم اٹھے گا۔“

مس بارکر نے اپنے پرس میں سے ایک نوٹ نکالا اور بوڑھی جپسی جوتشن کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”اس مرتبہ بس اتنا ہی کافی ہے، تھینک یو۔“ مس بارکر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

مس بارکر خوشی سے سرشاری کے عالم میں اپنی پرانی کار سڑک پر ٹریفک کے درمیان اس طرح دوڑا رہی تھی کہ اس نے راستے میں تین مرتبہ سرخ سگنل پر رکنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور ایک بار ایک راہ گیر اس کی کار کی زد میں آنے سے بال بال بچا۔

پھر اس نے اپنی کار اس کچے ناہموار راستے پر ڈال دی۔ کار اچھلتی کودتی اس کے چھوٹے سے کاٹیج کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہ کار سے اتر کر تیزی سے کاٹیج میں داخل

ہوئی اور بلند آواز سے بولی۔ ”بے حد شاندار خبر ہے، ڈیئر۔ ہمارے یہاں کوئی ملاقاتی آنے والا ہے۔“

پھر وہ ہفتہ غیر معمولی طور پر طویل ہوگیا۔

مس بارکر روزانہ بے تابی سے ملاقاتی کا انتظار کرتی رہی۔ وہ بے صبری کے ساتھ اپنے گھریلو کام کاج نمٹانے میں مصروف رہی۔ اس کی آنکھیں مسلسل اس کچے بل کھاتے ہوئے راستے پر مرکوز رہتی تھیں جو اس کے گھر کی جانب آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی خواہش کی طاقت سے وہ آنے والا ملاقاتی سڑک پر نمودار ہوجائے گا۔

اتوار کی صبح بارش شروع ہوگئی اور موسم بھی سرد تھا۔ مس بارکر کا مزاج اس روز موسم کی طرح ناخوش گوار تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کو تھا اور خود کو پُرسکون رکھنے کے لیے اس نے لگے بندھے کاموں میں مصروف کیا ہوا تھا۔

لنچ پر وہ چڑچڑی سی ہورہی تھی اور اس کیفیت میں اس نے گرما گرم سوپ سے اپنی زبان بھی جلا ڈالی۔

فیلیشیا بھی نروس تھی۔ مس بارکر تشویش کے تاثرات لیے اسے فرش پر ادھر سے اُدھر ٹہلتے دیکھ رہی تھی۔

”فکر مت کرو، مائی ڈیئر۔“ مس بارکر نے کہا جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ”مجھے یقین ہے کہ آج وہ یہاں پہنچ جائے گا۔“ اور مس بارکر کا یقین درست ثابت ہوگیا۔

شام کے دھندلکے سے پہلے افق پر ایک شخص کا ہیولا نمودار ہوا۔ وہ نوجوان تھا اور لباس سے شکاری لگ رہا تھا۔ اس کی رائفل بے پروائی سے اس کے کاندھے پر جھول رہی تھی۔

مس بارکر اپنے لیونگ روم کی کھڑکی سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص تذبذب کے انداز میں خودرو پودوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرتے ہوئے کاٹیج کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اور پھر مس بارکر کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے تھم سی گئی جب اس نے پورچ پر اس کے بھاری قدموں کی آواز سنی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کی دستک نے دیر سے چھائی ہوئی خاموشی کو توڑ دیا۔

مس بارکر نے دستک کا جواب دینے سے قبل ایک منٹ تک انتظار کیا پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو اس کا سامنا اس نوجوان سے ہوا جس کے چہرے پر معذرت خواہانہ مسکراہٹ طاری تھی۔

”گڈ ایوننگ میڈم۔“ نوجوان نے ملائم لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے کہ میں اپنا راستہ بھٹک گیا ہوں۔ کیا آپ مجھے مین روڈ تک پہنچنے کا راستہ سمجھا سکتی ہیں؟“

گلوکار

اشرف کو اپنے گلے پر بہت ناز ہے۔ وہ میوزیشن بننا چاہتا تھا لیکن اس کے والد اسے انجینئر بنانا چاہتے ہیں۔ ایک دن وہ بولا۔ ”کل ایک آدمی نے میری بہت بے عزتی کی۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تمہیں گانا آتا ہے؟“

”تو اس میں کیا بے عزتی ہوئی؟“

”دراصل اس وقت میں گارہا تھا۔“

کوئٹہ سے حسن سردار کا چٹکلا

مس بارکر نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

”تم بے چارے۔“ مس بارکر کسی مرغی کی طرح کڑکڑائی۔ ”اس سرد موسم میں تو تمہاری قلفی جم گئی ہوگی۔ اندر آجاؤ اور کچھ دیر کے لیے اپنے جسم کو گرمائش پہنچالو۔“

نوجوان نے ممنونیت کے ساتھ مس بارکر کی پیشکش قبول کرلی۔ اس نے اندر آنے کے بعد اپنی جیکٹ اور شکاری جوتے اتار دیے اور چنگاریاں چھینٹی آگ کے روبرو آگیا۔

”جب سے میں گھر سے نکلا ہوں، یہ پہلا گرم ترین مقام ہے جو مجھے میسر آیا ہے۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے حقیقت میں بے حد شرمندگی محسوس ہورہی ہے کہ آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔“

”شرمندہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، نوجوان۔ یہ پہاڑیاں خاصی دشوار گزار ہیں اگر آپ ان سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم وہ پہلے فرد نہیں ہو جو اپنا راستہ بھول گیا ہے۔“ یہ کہہ کر مس بارکر نے تنقیدی نظروں سے نوجوان کا جائزہ لینا شروع کیا۔

نوجوان کا قد خاصا لانبا اور شانے چوڑے تھے۔ بال کریو کٹ انداز میں ترشے ہوئے تھے۔

”اس کی عمر پچیس برس سے زیادہ کی ہرگز نہیں ہوسکتی۔“ مس بارکر نے قیاس لگایا۔ ”ہاں، فیلیشیا بے حد خوش ہوجائے گی۔“

”میں تمہارے لیے گرما گرم چائے لے کر آتی ہوں۔“ مس بارکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پلیز، خود کو یہ تکلیف نہ دیں۔" نوجوان نے تیزی سے کہا۔ "میں یہاں صرف ایک منٹ ٹھہروں گا اور پھر اپنی راہ روانہ ہو جاؤں گا۔"

"لیکن میں اصرار کر رہی ہوں۔" مس بارکر نے کہا اور ٹی پاٹ کے نیچے آگ سلگا دی۔ "اس علاقے میں کوئی ذی روح شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے اور تم یقیناً ایک بوڑھی عورت کی اس خواہش سے انکار نہیں کرو گے کہ وہ تمہارے ساتھ چند منٹ بات چیت کرلے... کیا تمہیں انکار ہے؟"

"نہیں میڈم، جیسی آپ کی خوشی۔ آپ نہایت مہربان خاتون ہیں، شکریہ۔" نوجوان سر تسلیم خم کرتے ہوئے مسکرا دیا۔

"کتنا نفیس نوجوان ہے۔" مس بارکر نے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے خود سے کہا پھر چائے کا کپ نوجوان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لو... جب تک تم چائے پیو، میں چند کوکیز لے کر آتی ہوں۔"

نوجوان نے کھولتی ہوئی چائے کا کپ لے لیا پھر جب اس نے ایک ہلکا سا گھونٹ بھرا تو مس بارکر دبے پاؤں کمرے سے نکل گئی۔ وہ تیزی سے نعمت خانے کی طرف بڑھی جہاں محفوظ کی ہوئی کھانے پینے کی اشیا اور ٹن میں بند غذائیں سجی ہوئی تھیں۔ اس نے دور کارنر کے ایک شیلف سے ایک بکس اٹھا لیا۔ اس نے بکس کھول کر اس میں موجود موتیوں کے ہینڈل والا ایک چھوٹا سا ریوالور باہر نکال لیا پھر دھیمی آواز میں گنگناتے ہوئے واپس لیونگ روم کی جانب چل پڑی۔

☆☆☆

شیرف برجز نہایت خوش اخلاقی سے مس بارکر سے مخاطب تھا۔

"سوری، میں نے آپ کو تکلیف دی مس بارکر۔" اس نے کہا۔ "ہم ایک گمشدہ شکاری کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ اتوار کی صبح سویرے اپنے گھر سے نکلا ہوا تھا اور واپس نہیں لوٹا۔ وہ ایک نوجوان ہے جس کے بال سنہری اور کریوکٹ اسٹائل میں تراشیدہ ہیں۔ کیا آپ نے اس حلیے کے کسی شخص کے بارے میں اطراف میں کہیں کچھ سنا تو نہیں؟"

مس بارکر نے کپ میں گرم چائے انڈیلی اور کپ شیرف کی جانب بڑھا دیا۔ شیرف نے سر کی جنبش سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کپ تھام لیا۔

"اوہ، نہیں تو۔" مس بارکر نے کہا۔ "میرا آخری ٹرپ گزشتہ ہفتے شہر کی جانب ہوا تھا۔ اس کے بعد سے تو میں نے کسی ذی روح کو نہیں دیکھا۔ میں امید کرتی ہوں کہ وہ شخص ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔"

شیرف نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے پائپ کا ایک کش کھینچا۔ "یہ احمق شکاری مجھے پاگل کر دیتے ہیں۔ وہ پیدل دشوار تھکا دینے والا سفر کرتے ہوئے ان پہاڑیوں میں آ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں یہاں کے تمام راستوں سے واقفیت ہے... اور وہ ہمیشہ یا تو راستہ بھٹک جاتے ہیں یا سواری نہ ہونے کی بنا پر کہیں پھنس جاتے ہیں یا کسی نہ کسی مشکل میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اور بدترین بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے اقربا میرے پاس آتے ہیں اور مجھ سے معجزوں کی توقع کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر شیرف نے توقف کیا اور ماچس جلا کر اپنے پائپ کے تمباکو کو سلگانے لگا۔

"یہ اس سال غائب ہونے والا تیسرا شکاری ہے۔"

مس بارکر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ "کتنے افسوس کی بات ہے، کوئی بھی اس چھوٹے سے کھیل کی خاطر اپنی زندگی کا خطرہ کیوں مول لیتا ہے۔ میں یہ بات کبھی نہیں سمجھ سکتی۔"

"میرا خیال ہے کہ انہیں اندازہ نہیں ہوتا۔" شیرف برجز نے رخصت ہونے کے ارادے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ویل، مس بارکر! اب میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" اس نے اپنا ہیٹ پہنا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "چائے کا بے حد شکریہ، میڈم۔"

پھر باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا تو جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔ "ارے ہاں، بائی دا وے آپ کے تیندوے کے اس چھوٹے سے بچے کا کیا حال ہے؟"

مس بارکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ "اوہ فیلیشیا! وہ اب بڑی ہو گئی ہے، شیرف۔ جانتے ہو اب وہ ایک سال سے زیادہ کی ہو گئی ہے۔"

"کیا یہ حقیقت ہے؟" شیرف برجز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ویسے... آپ جیسی خاتون کے لیے ایسا جانور پالنا واقعی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اسے دیکھ کر تو میرا آدھا دم نکل جاتا ہے۔"

"اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" مس بارکر نے کہا۔ "فیلیشیا بلونگڑے کی طرح شریف اور بے ضرر ہے اور وہ لوگوں کی بے حد رسیا ہے۔"

استادی

طاہر جاوید مغل

محبت کے بغیر زندگی کا تصور بہت بیزار کن ... اجاڑ... بیابانوں جیسا ہے... اس کی زندگی میں اچانک ہی تبدیلی کی ایک لہر رونما ہوئی... اور پھر اس کے شب و روز بدلتے چلے گئے... اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ان دیکھی محبت کا خمیازہ کتنا دردناک اور انجام دگرگوں ہوتا ہے... ایک متحرک... تروتازہ اور توانا نوجوان کی دلچسپ و شگفتہ سرگزشت... جسے محبوبہ کے ساتھ ساتھ ایک استاد کی رہنمائی بھی مل گئی تھی...

آپ کے محبوب لکھاری کی
تازہ بہ تازہ تحریر جو تادیر آپ کے
لبوں پر مسکان اور ذہن کو جکڑے رکھے گی

وہ ستمبر کی ایک خوشگوار شام تھی۔ ساری بات ایک "میسیج" سے شروع ہوئی۔ اپنے فون پر یہ میسیج دیکھ کر میں تھوڑا حیران بھی ہوا تھا، لکھا تھا۔ "کیا آپ اکیلے اور اداس ہیں؟"

اگر یہ میسیج کسی لڑکی کا تھا تو میں یقیناً اکیلا اور اداس ہی تھا۔ اداسی ظاہر کرنے کا اس سے بہتر موقع اور بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس جواب کے بعد ایس ایم ایس کے ذریعے سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ

شروع ہوا۔ اس نے اپنا نام عافیہ بتایا اور وہ تمام اشارے دیے جن سے پتا چلا کہ یہ سلسلہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

یقیناً یہ ایک خوب صورت تصور تھا۔ ان گنت خوش خیالیاں ذہن میں اودھم مچانے لگیں۔ نرم گرم گفتگو، سیر سپاٹا، آنکھ مچولی اور پھر قربت کے لمحے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک خاص چیز سے مشروط تھا اور شرط یہی تھی کہ یہ عافیہ واقعی لڑکی ہو اور اپنے بیان کے مطابق تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہو اور میرے گمان کے مطابق خوب صورت بھی ہو۔

بہرحال ہمارے ٹیلی فونک رابطے کا سلسلہ جاری رہا۔ میری سب سے پہلی خواہش یہی تھی کہ میں اس کی آواز سنوں۔ آواز کے بعد یقیناً شکل دیکھنے کی باری آتی اور پھر دیگر ”باریاں“ درجہ بدرجہ...

میں لاہور کی ایک اچھی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ والد صاحب کا قالینوں کا مناسب کاروبار تھا۔ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھے لاڈ پیار میں سے بھی زیادہ حصہ ملا ہوا تھا۔ والدین نے لڑکی کی پسند والا معاملہ بھی مجھ پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔ یعنی وہ سارے حالات موجود تھے جو ایک اچھی ڈراما سیریل شروع کرنے کے لیے ہیرو کو درکار ہوتے ہیں۔

عافیہ سے رابطہ ہونے کے قریباً دو ہفتے بعد میں نے پہلی بار اس کی آواز سننے میں کامیابی حاصل کی۔ آواز خوب صورت تھی اور جوان بھی۔ اب صبر مزید مشکل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے پریشان کن خیالات بھی ذہن میں آتے رہے تھے۔ آواز تو ریڈیو آرٹسٹس کی بھی بڑی خوب صورت ہوتی ہے لیکن وہ سارے حسین و جمیل تو نہیں ہوتے۔

بہرحال خدا خدا کر کے چھوٹے چھوٹے کئی دیگر مرحلے طے ہوئے اور ایک روز جناح گارڈن کی پہاڑی کے ایک پہلو میں میری اور عافیہ کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔ وہ نومبر کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ اس دوپہر میں، میں نے جس لڑکی کو عافیہ کے روپ میں دیکھا، وہ اس دوپہر سے بھی زیادہ چمکیلی اور شفاف تھی۔ درحقیقت صورت نے اس کی آواز کو اور آواز نے صورت کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

اس کے بعد کا سفر ہم دونوں نے بڑی تیزی تیزی طے کرنا شروع کیا۔ وہ مجھے کامران کے بجائے کامی کہہ کر بلانے لگی۔ میں اسے عافیہ کے بجائے عافی کہنے لگا۔ عافی کے بیان کے مطابق وہ جہلم کی رہنے والی تھی۔ یہاں پڑھائی کے سلسلے میں اپنی بڑی خالہ کے پاس قیام پذیر تھی۔ عافی کے تایا جان وحید مختار صاحب جہلم میں گورنمنٹ سرونٹ تھے۔ سڑکیں بناتے تھے اور کبھی کبھی غصے میں ہوتے تھے تو بنی ہوئی سڑکوں کو ادھیڑنا بھی شروع کر دیتے تھے۔ کئی سال پہلے اپنے والدین کی حادثاتی موت کے بعد سے عافی اپنے تایا جان کے پاس ہی رہتی تھی۔ اب پتا نہیں کہ عافی کی بیان کردہ ان معلومات میں سے کتنی درست تھیں۔

بہرحال ہمارا معاملہ مسلسل آگے بڑھتا رہا جیسے کوئی ٹرین اسٹیشن سے نکلنے کے بعد دھیرے دھیرے رفتار پکڑتی ہے اور پکڑتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایک دفعہ جب ٹرین اپنے ہلارے میں آجاتی ہے تو پھر کسی موٹر سائیکل یا کیری ڈبے کی طرح اسے ایک دم نہیں روکا جا سکتا۔ اگر اسے روکنا بھی ہو تو آہستہ آہستہ رفتار کم کرنا ہوتی ہے۔ بریک اپلائی کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ٹرین ایک دم روک دی جائے تو پھر ٹرین، مسافروں اور پٹری وغیرہ کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ یوں لگا کہ دنیا اندھیر ہو گئی اور اب محبت کے شہیدوں میں نام لکھوانے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

اس دن اچانک ہی عافی کا فون آیا تھا۔ یہ کال اس نے اپنے سیل فون کے بجائے، ایک پی سی او سے کی تھی۔ اس نے ہانپی ہوئی لرزاں آواز میں بس اتنا کہا۔ ”کامی! بہت بُرا ہوا ہے۔ خالو جان نے میرے سیل فون پر میرے اور تمہارے میسج پڑھ لیے ہیں۔ انہوں نے جہلم سے تایا ابو کو بلا کر فون ان کے حوالے کر دیا ہے۔ جو مجھ پر بیتی ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ بس اتنا کہنے کے لیے ہی فون کیا ہے کہ اب میرا انتظار نہ کرنا۔ ہمارا ساتھ شاید بس اتنا ہی تھا۔“

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس موقع پر مشہور فلمی ہیروز نے کون کون سے مشہور ڈائیلاگ بولے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، وہ اثر رکھتی ہے۔ میں نے بس اتنا ہی کہا۔ ”عافی! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ اب کم از کم میرے پاس تو واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”میں کیا کروں کامی! میں بالکل مجبور ہو گئی ہوں۔ مجھے تو یہی لگ رہا ہے کہ تایا ابو ایک دو دن میں مجھے واپس جہلم لے جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ...“ اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

”کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میری شادی بڑی جلدی قادر سے کر دی جائے گی۔ تایا ابو، تائی امی، خالہ، چچا سب بہت غصے میں ہیں۔ میں تمہیں زیادہ دکھ دینا نہیں چاہتی اس لیے ہمت کر کے تمہیں ابھی سب کچھ بتا رہی ہوں۔ اب ہمارا ملنا ممکن نہیں ہے۔ یہ چھری ہمارے گلے پر پھرنی ہی پھرنی ہے اس لیے جتنی جلدی پھر جائے اتنا ہی اچھا ہے۔“ وہ سسک پڑی۔

”میں ایسا نہیں ہونے دوں گا عافی! تم مجھے اپنا...“

مگر دوسری طرف فون بند ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ وہی کچھ ہوا جو دلیپ کمار اور ندیم کے ساتھ کم و بیش دس پندرہ فلموں میں انٹرول سے پہلے پہلے ہو چکا ہوتا ہے۔ ہیروئن بچھڑ جاتی ہے اور ہیرو کو اس کا اتا پتا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن میرے پاس اتنا پتا تو تھا کہ عافی مدینہ کالونی میں کہیں رہتی ہے۔ مدینہ کالونی بہت بڑی نہیں تھی مگر اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی کہ میں ایک ایک دروازے پر دستک دے کر عافی کے تایا سے شرف ملاقات کی توقع رکھتا۔ اس کام میں چھ سات مہینے تو لگ جاتے اور عافی کی شادی قادر سے یقیناً اتنی دیر ٹلنے والی نہیں تھی۔ قادر کے بارے میں عافی نے پہلی ملاقاتوں میں یہی بتایا تھا کہ وہ اس کے تایا کے دوست کا بیٹا ہے اور کافی عرصے سے ان کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ میں اسی روز مدینہ کالونی جا پہنچا۔ رات گئے تنگ گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ سینے میں آگ روشن تھی اور دل میں یہ امید تھی کہ شاید کہیں عافی کا کوئی کھوج مل جائے۔ نظر سیکڑوں بار موبائل اسکرین کی طرف بھی اٹھ چکی تھی مگر ناامیدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگلے روز اور اس سے اگلے روز بھی میں نے گلیوں میں چکراتے ہوئے گزارا۔ مدینہ کالونی صحرا تھی اور میں مجنوں کے روپ میں بھٹک رہا تھا۔ تیسرے روز دوپہر کے وقت میں اچانک بھونچکا رہ گیا۔ ٹریفک کے اشارے پر میں نے ایک نیلی سوزوکی کار میں عافیہ کو دیکھا۔ وہ بڑی اداس سی کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی۔ کار میں ایک دو اور افراد بھی تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میری طرف دیکھتی یا میں اسے متوجہ کرتا، اشارہ کھل گیا اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے گاڑی کا نمبر پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ بھی ادھورا ہی پڑھ سکا۔ گاڑی ٹریفک میں گم ہو گئی۔ بہرحال، اتنا معلوم ہو گیا کہ یہ جہلم کا نمبر ہے۔

☆☆☆

اب میں کشتیاں جلا کر جہلم جا رہا تھا (میں نے جس طرح کشتیاں جلائی تھیں، ان میں یقیناً میرا ایک سمسٹر بھی جل گیا تھا) میں بذریعہ بس لاہور سے جہلم کے لیے روانہ ہوا۔ شومئی قسمت میں نے جس بندے کے ساتھ سیٹ شیئر کی، وہ بڑا سنکی قسم کا تھا۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہو گی۔ کلین شیو، آنکھوں پر ہلکا سیاہ چشمہ، سر پر پی کیپ۔ وہ مسلسل مجھے شک کی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے میں ابھی جیب سے کوئی ہینڈ گرینیڈ قسم کی چیز نکالوں گا اور بس والوں کو یرغمال بنا لوں گا یا پھر کسی طرح کا آتشیں ہتھیار نکال کر اس شخص کی پسلیوں سے لگا دوں گا اور اغوا برائے تاوان کا مرتکب ہو جاؤں گا۔

آخر میں نے زچ ہو کر ان صاحب سے پوچھا۔ ”آپ میری وجہ سے پریشان تو نہیں؟“

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ مسلسل میری طرف دیکھ رہے ہیں۔“

”تو دیکھنا کیا جرم ہے؟“ وہ ہولے سے مسکرائے۔

اس کے بعد ہماری باتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہونے میں نہیں آیا۔ میں جنہیں خاموش طبع سمجھ رہا تھا، وہ جب بولے تو گفتگو کے دریا بہا دیے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے اندر میں انہیں اپنے بارے میں تقریباً سب کچھ بتا چکا تھا۔ جواباً انہوں نے بھی کافی کچھ بتایا۔ وہ تاحال غیر شادی شدہ تھے۔ لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ کسی وقت مارشل آرٹ سے بھی تھوڑی بہت دلچسپی رہی تھی۔ دنیا میں ان کا بس ایک بھائی تھا۔ وہ کاروباری شخص تھا۔ یہ حضرت جن کا اپنا نام حسنات تھا، اپنے آبائی مکان میں ایک ٹیوشن اکیڈمی چلا رہے تھے۔ بڑی مزاحیہ گفتگو، بڑی سنجیدگی سے فرماتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی حرکات و سکنات پر جاسوسی ادب کا اثر ہے۔

جب میں نے انہیں عافی کے بارے میں اور اس کے تایا کی زبردستی کے بارے میں بتایا تو جلد ہی کسی سرکاری سراغ رساں کی طرح ان کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ وہ پُرسوچ انداز میں بولے۔ ”ایسے کیسوں میں عموماً تایا یا چچا وغیرہ کا ذاتی مفاد بھی ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ... ان تایا صاحب کا کوئی بیٹا ہو، کوئی نکما اور مجہول سا بیٹا جس سے وہ عافیہ کی شادی کرنا چاہتے ہوں تاکہ اس یتیم لڑکی کی ساری جائداد ان کے قبضے میں آسکے؟“

”مجھے تو ایسا نہیں لگتا جی... اور نہ ہی یہ لگتا ہے کہ عافی کے والدین اس کے لیے کوئی بہت زیادہ پراپرٹی چھوڑ کر گئے ہیں۔“

”لیکن بیٹا جی، خوب صورتی بھی تو پراپرٹی ہی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عافیہ کی خوب صورتی سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ اپنے مجہول سے، بدصورت سے

بیٹے کے لیے ایک خوب صورت دلہن اینٹھنا چاہتے ہوں۔“ وہ مجھ سے چند سال ہی بڑے ہوں گے لیکن مجھے بیٹا جی فرما رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ”پتا نہیں کہ ان کا بیٹا ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو بدصورت بھی ہے یا نہیں۔“

ان کی گندمی پیشانی کی لکیریں کچھ اور گہری ہوگئیں۔ ذرا دیر مراقبے میں رہنے کے بعد انہوں نے خیال آفرینی کی۔ ”یہ عافیہ کے تایا کا بیرونِ ملک تو آنا جانا نہیں ہے؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ مجھے ان کے بارے کچھ معلوم نہیں۔ شکل بھی نہیں دیکھی میں نے ان کی۔“

وہ بدستور پُرسوچ انداز میں بولے۔ ”آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ کیا پتا وہ شخص مجرمانہ ذہن رکھتا ہو۔ ایسے لوگ منشیات کی اسمگلنگ کے لیے لڑکیوں کو... خاص طور پر خوب صورت لڑکیوں کو چارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔“

”لیکن وہ ان کی سگی بھتیجی ہے جی۔“

”محبت اور جرم میں سب کچھ جائز ہوتا ہے بیٹا جی۔“ انہوں نے محاورے کی ٹانگ توڑتے ہوئے کہا۔ ”ان لوگوں کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک سب کچھ ان کا گروہ یا مافیا ہی ہوتا ہے۔ مافیا سمجھتے ہو نا تم؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولے۔ ”آج کل ایسے کیس بہت عام ہو رہے ہیں... تم اس مافیا والے چکر کو اپنے ذہن سے مت نکالو۔“

”ٹھیک... ٹھیک ہے جی لیکن جو کچھ عافیہ نے مجھے بتایا تھا، اس کے مطابق اس کے تایا نے اس کی شادی اپنے ایک قریبی دوست کے بیٹے سے کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔“

”دیکھا... تمہیں کہا تھا نا۔ اس معاملے میں کوئی ہیر پھیر ضرور ہے۔ یہ عافیہ کے تایا کا دوست یقیناً کوئی بہت بڑا کاروباری شخص ہوگا یا پھر سرکاری افسر ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ قرضے وغیرہ دیتا ہو یا پھر ایکسائز اور ٹیکسیشن وغیرہ میں ہو بلکہ میرا اندازہ ہے کہ ایکسائز و ٹیکسیشن وغیرہ میں ہی ہوگا۔ عافیہ کا تایا اس سے بہت بڑی بڑی رعایتیں حاصل کرنے کا آرزومند ہوسکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایسا ہی ایک بہت بڑا کیس انڈیا میں سامنے آیا ہے۔ سونے کے تاجر ڈاڈا بھائی کا نام سنا ہوا ہے تم نے...“ اس کے بعد حسنات صاحب نے ایک طولانی قصہ شروع کردیا۔ اس قصے میں مافیا بھی تھی اور تھوڑی تھوڑی انڈرورلڈ بھی۔ ایک فرنچ کٹ داڑھی والا ڈان ٹائپ بندہ بھی تھا جس کی جڑیں آگے جا کر کہیں را اور موساد وغیرہ سے بھی ملتی تھیں۔ میرا سر گھوم کر رہ گیا۔

میں نے حسنات صاحب کو بتایا تھا کہ میں جہلم میں کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا۔ ”اگر ہوٹل میں ہی ٹھہرنا ہے تو میرے گھر پر رہو۔ اگر تمہیں کوئی جھجک محسوس ہو رہی ہو تو بے شک پے انگ گیسٹ بن جاؤ۔ ابھی پچھلے دنوں پنجاب یونیورسٹی کے دو اسٹوڈنٹ میرے پاس رہ کر گئے ہیں۔ چار روز کے چار ہزار روپے دے رہے تھے، میں نے منع کیا مگر زبردستی جیب میں ڈال کر چلے گئے۔“

انہوں نے بالواسطہ مجھے بھاؤ تاؤ بھی بتا دیا۔ میں نے نیم رضامندی ظاہر کردی۔ جناب حسنات نے بتایا تھا کہ بس اسٹینڈ پر ان کا ڈرائیور گاڑی لے کر آئے گا۔ ہمارے بس سے اترنے سے پہلے ہی ان کی گاڑی آچکی تھی مگر اسے گاڑی کہنے کے لیے کافی رعایت اور بہت سی چشم پوشی سے کام لینا پڑا۔ 1970ء کے لگ بھگ کا کوئی ماڈل تھا۔ جابجا مرہم پٹی کی گئی تھی۔ جس کو جناب نے ڈرائیور کا نام دیا تھا، وہ یقیناً ان کی اکیڈمی کا ہی کوئی ہونہار اسٹوڈنٹ تھا۔ اس کی مسیں بھیگے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ حسنات صاحب نے اس کا نام فاضل احمد بتایا۔

فاضل کو اس کی نشست سے ہٹا کر حسنات صاحب نے گاڑی خود ڈرائیو کی۔ میں نے ان کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھنے کا اعزاز حاصل کیا... ساتھ ساتھ جہلم شہر کا نظارہ بھی ہو رہا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے حسنات صاحب بار بار عقب نما آئینے پر نظر ڈالتے تھے بلکہ زیادہ تر وہ عقب نما آئینے میں ہی دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اپنے تعاقب سے باخبر رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس نہایت سنجیدہ کوشش میں ایک بار انہوں نے گاڑی تقریباً ایک رکشے کے پیچھے ٹھونک دی اور دوسری مرتبہ غلط موڑ کاٹتے کاٹتے بچے۔

حسنات صاحب کا گھر انہی کی طرح آثارِ قدیمہ کا نمونہ تھا۔ عقبی احاطہ کھنڈر کا منظر پیش کرتا تھا۔ سامنے والے حصے میں چونکہ ان کی رہائش تھی اس لیے وہ قدرے بہتر حالت میں تھا۔ یہ گھر جائیداد کی تقسیم میں ان کے بڑے بھائی نے انہیں دیا تھا۔ اب یہ گھر یقیناً اپنی بدقسمتی پر آنسو ٹپکاتا ہوگا۔

رات کھانے کے بعد حسنات صاحب نے میری داستانِ غم ایک بار پھر پوری تفصیل سے سنی اور عافیہ کی تلاش کے سلسلے میں مفید مشورے بھی دیے۔ وہ بار بار پوچھ رہے

تھے کہ میں اپنی تلاش کس طرح شروع کرنا چاہتا ہوں اور کیا میرے ہاتھ میں کوئی چھوٹا موٹا سراغ ہے؟ انہیں یقین تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا سراغ ضرور ہوگا۔ اس حوالے سے انہوں نے دو انگلش اور تین چار اردو ناولز کے حوالے دیے اور بتایا کہ لڑکی جب کہیں غائب ہوتی ہے تو اپنے پیچھے کوئی چھوٹا موٹا کلیو چھوڑ کر جاتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی مرحوم دادی کی مثال بھی دی جو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئی۔

کچھ دیر بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے لاہور میں اس نیلی کار کی نمبر پلیٹ دیکھی تھی جس میں عافیہ کے تایا اسے جہلم لے کر آئے ہیں تو حسنات صاحب بے حد خوش ہوئے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نمبر پلیٹ پوری نہیں پڑھ سکا، اس کے پہلے دو ہندسے ہی دیکھ سکا ہوں تو ان کی خوشی دیدنی ہوگئی۔ جوش سے آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی۔ یہ صورتِ حال ان کے جاسوسی مزاج کے عین مطابق تھی۔ ان کی ساری خفیہ حسیات بیدار ہوگئیں۔ پوچھا۔ ”کیا پڑھا تھا تم نے؟“

میں نے بتایا۔ ”جہلم... 38 اس سے آگے دو ہندسے اور تھے۔“

”زبردست... یعنی یہ سو کا پھیر ہے بلکہ ننانوے کا۔ 3801 سے لے کر 3899 تک کوئی نمبر بھی ہوسکتا ہے۔ گاڑی کا رنگ اور ماڈل کیا تھا؟“

”رنگ نیلا اور ماڈل میرے اندازے کے مطابق 2005ء کے آس پاس تھا۔“

حسنات صاحب نے سگریٹ سلگایا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولے۔ ”اس کا مطلب ہے کہ مافیا... میرا مطلب ہے عافیہ کے تایا کے پاس ایک ایسی نیلی سوزوکی سوئفٹ ہے جس کا نمبر 3801 سے لے کر 3899 کے درمیان ہے۔ ویری سمپل، ویری ویری سمپل بیٹا جی۔ یہاں گاڑیوں کے رجسٹریشن آفس میں نادر ملکو میرا دوست ہے۔ میرے ایسے سارے کام وہی کرتا ہے۔ فی گاڑی 300 روپے لیتا ہے مگر چونکہ یہاں لمبا آرڈر ہے قریباً ننانوے گاڑیوں کا ریکارڈ اسے دیکھنا ہوگا اس لیے میں اس سے رعایت کروالوں گا۔ چودہ پندرہ ہزار روپے میں مان جائے گا۔“

شدید قسم کی چرب زبانی کا مظاہرہ کرکے موصوف نے مجھ سے پانچ ہزار روپے اسی وقت وصول کرلیے۔ باقی پانچ چھ ہزار یا اس سے زائد کام ہونے کے بعد دینے طے پائے۔ بہرحال خوشی کی بات یہ تھی کہ میرے شدید شبہات کے باوجود رقم دینے کے بعد تیسرے روز یہ کام ہوگیا۔ دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ حسنات صاحب نے بڑے جیمز بانڈ اسٹائل میں ایک لسٹ میرے سامنے رکھی۔ اس لسٹ میں کُل ننانوے گاڑیوں کی تفصیل تھی۔ ان ننانوے میں سے سوزوکی... سوئفٹ کاریں صرف چودہ تھیں۔ ان چودہ میں سے نیلگوں کاروں کی تعداد چھ تھی، یعنی اب ہمیں صرف چھ عدد کاروں کے مالکان کو دیکھنا تھا اور پتا کرنا تھا کہ ان میں سے عافیہ کے ساتھ کس کا تعلق تھا۔ ایک دفعہ عافیہ کے تایا ابو کا کھرا ہاتھ آجاتا تو پھر یہ پتا لگانا بھی اتنا مشکل نہیں تھا کہ عافیہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

حسنات صاحب اس چھان بین کے سلسلے میں بھی مجھ سے پوری فیس وصول کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے حیلے بہانوں سے مجھے بتایا کہ ان کی کھٹارا گاڑی کو اس بھاگ دوڑ کے سلسلے میں کتنا ایندھن درکار ہوگا اور اس میں کیا کیا رسک چھپے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی اشاروں کنایوں میں انہیں بتا دیا کہ میں نہ صرف اپنے قیام و طعام کے اخراجات برداشت کروں گا بلکہ جو مزید تعاون وہ میرے ساتھ فرمائیں گے، اس کا مناسب معاوضہ بھی ادا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس بُری بھلی گاڑی موجود تھی اور وہ اس شہر کے راستوں اور پیچ و خم سے بھی آشنا تھے۔ کافی حد تک سنکی ہونے کے باوجود وہ میرے لیے کارآمد ثابت ہوسکتے تھے۔

پچھلے دو دن سے میں ایک الجھن شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ حسنات صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ اس مکان کے عقبی حصے میں ایک اکیڈمی چلا رہے ہیں۔ میں نے شام کے وقت اکیڈمی کے اسٹوڈنٹ بھی دیکھے تھے۔ یہ سب میٹرک یا فرسٹ ایئر سیکنڈ ایئر کے اسٹوڈنٹ لگتے تھے۔ میں نے انہیں مکان کے عقبی حصے کی طرف ایک کلاس روم نما جگہ پر جاتے بھی دیکھا لیکن اس کے بعد اس کمرے سے کسی طرح کی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ نہ ہی یہ اندازہ ہوا کہ وہاں کسی کو پڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے بجائے گھر کے عقبی احاطے کے کھنڈر نما کمروں سے ہلکی پھلکی آوازیں ضرور آتی رہیں۔ یوں لگتا تھا کہ کلاس روم تو خالی ہے لیکن اس کے عقب میں کچھ ہو رہا ہے۔ دو دن تو میں نے یہ تجسس برداشت کیا پھر اس بھید کو پانے کے لیے اس راہداری میں گھسا جو عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔ حسنات صاحب نے مجھے ادھر جانے سے منع کیا تھا لیکن جب ہمارے جدِ امجد منع

کرنے سے منع نہیں ہوئے تھے اور گندم کا دانہ چکھا تھا تو میں کیسے رک جاتا۔ تھوڑا بہت اثر شاید حسنات صاحب کی محبت کا بھی تھا جو ہروقت جاسوسی کہانیوں کا کردار بنے رہتے تھے۔

میں راہداری سے گزر کر عقبی حصے میں آیا۔ کلاس روم کے اندر جھانک کر دیکھا، وہ یکسر خالی تھا۔ ہمت کرکے میں مزید پیچھے چلا گیا۔ ایک دروازے کو بے آواز کھولتے ہوئے میں ایک طویل اور تاریک برآمدے میں داخل ہوا۔ یہاں ایک قطار میں کئی کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ پرانی طرز کی ان اکثر کھڑکیوں میں روشنی بجھی تھی۔ ایک بند کھڑکی کے پیچھے سے ہاہو کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ میں نے احتیاط سے چار پانچ ادھ کھلی کھڑکیوں میں جھانکا۔

مجھے عجیب وغریب مناظر نظر آئے۔ پہلے کمرے میں پانچ چھ اسٹوڈنٹ ایک طویل میز کے سامنے کھڑے تھے۔ میز پر مختلف قسم کے تالے رکھے تھے۔ یہ لڑکے ان تالوں کو ٹیڑھے میڑھے تاروں اور پیچ کش وغیرہ سے کھولنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس سے اگلے کمرے میں یقیناً جوڈو کراٹے ہورہے تھے مگر یہ کھڑکی چونکہ بند تھی اس لیے میں بس ہاہو کی آوازیں ہی سن پارہا تھا۔ تیسرے کمرے کی کھڑکی میں بس تھوڑی سی درز موجود تھی۔ میں نے اندر جھانکا۔ اس ہال نما کمرے میں پختہ اینٹوں کی ایک دس بارہ فٹ اونچی دیوار بنائی گئی تھی اور اس پر کانچ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ تین لڑکے اس دیوار کو مختلف طریقوں سے پھاندنے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک لڑکا دوسرے کو کندھوں پر اٹھاتا تھا۔ وہ کندھوں پر کھڑا ہوجاتا تھا اور پھر دیوار پر لگے نکیلے کانچ پر کوئی جیکٹ یا بوریا وغیرہ ڈال کر دوسری طرف دھم سے کود جاتا تھا۔ حضرت حسنات صاحب بھی بطور انسٹرکٹر بنفس نفیس یہاں موجود تھے۔ میرے سامنے ہی انہوں نے ایک نوآموز لڑکے کے کان کھینچے اور پھر اسے خود دیوار پر سے کود کر دکھایا۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ حضرت یہاں علاقے کے من چلے لڑکوں کو جاسوسی کی تربیت دے رہے تھے۔ یعنی انہیں جیمز بانڈ، شرلاک ہومز، حمیدی فریدی اور پتا نہیں کیا کچھ بنا رہے تھے۔

دو تین کھڑکیاں چھوڑ کر ایک اور کھڑکی میں مجھے ایک رخنہ نظر آیا۔ یہاں سے جھانکا۔ یہ مکان کا ایک خستہ حال کمرا ہی تھا۔ یہاں موجود چار پانچ اسٹوڈنٹس میں سے ایک لڑکی بھی تھی۔ عمر تیئیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ اس نے جینز اور جوگرز پہن رکھے تھے۔ یہ سب لوگ ایک دروازے پر مشق فرمارہے تھے۔ دروازے کے اوپری حصے میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ وہ شیشے کو قلم سے کٹ لگاتے تھے پھر اس پر غالباً گوند والا کاغذ چپکاتے تھے اور اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ لڑکی دلکش تھی۔ میں اس کے جسم کے پیچ وخم کو غور سے دیکھ رہا تھا، جب میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی وزنی چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔ آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی عقب سے کیکڑے کی طرح مجھ سے چمٹ گیا۔

"فاضل... انور... راجو..." اس نے مدد کے لیے آوازیں دیں۔

میں جان گیا کہ یہ خود حسنات صاحب ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں کسی مخالف گروہ کا ناہنجار ایجنٹ نہیں، ان کا اپنا ہی پے انگ گیسٹ ہوں لیکن انہوں نے پیچھے سے میری گردن اتنے زور سے جکڑ رکھی تھی کہ میری آواز ہی نہیں نکل پائی۔ اپنے چھریرے جسم کے برعکس ان میں کافی زور تھا۔ جب میری سانس بالکل بند ہونے لگی تو میں نے بڑے ادب سے ایک ٹکر ان کی ناک پر جڑ دی۔ یہ ٹکر میں نے سر کے عقبی حصے سے لگائی تھی۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ ایک ہی ٹکر ان کا کام تمام کردے گی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے تاریک فرش پر گر پڑے اور ساکت ہوگئے۔

میں پلٹ کر ان پر جھکا۔ "حسنات بھائی... حسنات بھائی۔" میں نے پکارا اور انہیں جھنجوڑا۔

اسی دوران میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں تیزی سے میرے قریب آگئیں۔ یہ سب حسنات صاحب کے ہونہار اسٹوڈنٹس تھے۔ فیمیل اسٹوڈنٹ نے جس کا نام بعد میں افشاں معلوم ہوا، تاریکی میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر لائٹ کا سوئچ آن کیا اور اس طویل کھنڈر برآمدے میں زرد روشنی پھیل گئی۔ افشاں کے علاوہ دیگر طلبا نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ ہم سب حسنات صاحب کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ افشاں عرف افشی نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھے رہے، غالباً اپنے چکراتے دماغ کو سنبھال رہے تھے۔ تب یکایک انہوں نے غیر متوقع حرکت فرمائی۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم میری ٹانگوں سے چمٹے اور زور لگا کر مجھے پشت کے بل گرادیا۔ اس کے بعد پھرتی سے میرے سینے پر چڑھ بیٹھے اور میری گردن کو کوئی آرم لاک قسم کی چیز لگادی۔

میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی۔ تین چار سیکنڈ بعد وہ خود ہی میرے سینے سے اٹھ گئے اور ناصحانہ انداز میں بولے۔ "آئندہ احتیاط رکھنا۔"

"یہ... یہ کیا ہوا تھا سر؟" ہونہار اسٹوڈنٹ فاضل نے پوچھا۔

"ٹ... ٹریننگ تھی۔ چلو سب لوگ اپنی اپنی کلاسز میں جاؤ۔" اسٹوڈنٹس کی ابھی پوری تشفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تذبذب میں تھے، بہرحال وہ لوٹ گئے۔

حسنات صاحب کی پتلون اور سوئٹر گردآلود فرش کی وجہ سے لتھڑ گئے تھے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر بیرونی کمرے میں لے آئے۔ یہ کمرا اکیڈمی کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دروازہ بند کرکے مجھے صوفے پر بٹھایا۔ اپنے کپڑوں کی جھاڑ پونچھ کی۔ ان کی ناک کے پاس رخسار پر گومڑ سا نمودار ہوگیا تھا۔ کچھ دیر آئینے میں اسے دیکھتے رہے پھر دھیمی آواز میں بولے۔ "بڑی بے وقوفی کی تم نے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ اس طرف نہیں آنا، اوپر سے تم نے یہ حرکت کردی۔"

"مجھے اندھیرے میں بالکل پتا نہیں چلا حسنات بھائی کہ یہ آپ ہیں۔" میں نے سفید جھوٹ بولا۔

"لیکن جو کچھ ہوا، اس سے میری ساکھ تو خراب ہوئی نا۔ اسٹوڈنٹس کے لیے استاد رول ماڈل ہوتا ہے... اب دیکھو، اس بات کو سنبھالنا ہے۔ وہ جو میں نے ٹریننگ والی بات کی تھی، اس پر قائم رہنا۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔"

"اگر کوئی پوچھے تو کیا کہو گے اس سے؟"

"یہی کہ ہم... ٹریننگ کررہے تھے بے ہوش ہونے کی۔"

"جتنے زور سے تم نے ٹکر ماری ہے تمہارا سر خالی تو نہیں ہونا چاہیے لیکن بات پھر بے وقوفی کی کررہے ہو۔ بے ہوش ہونے کی ٹریننگ نہیں کررہے تھے بلکہ بے ہوش بننے کی ٹریننگ۔ کوئی لڑکا پوچھے تو کہہ دینا کہ سر مجھے بتارہے تھے کہ اندھیرے میں کوئی اچانک حملہ کرکے تم پر غالب آجائے تو کس طرح تھوڑی دیر کے لیے بے ہوشی کا ڈراما کرنا ہے اور اس کے بعد دفعتاً اس کی ٹانگوں سے چمٹ کر اسے فرش پر گرانا ہے، یعنی کاؤنٹر اٹیک۔"

"ٹھیک ہے بھائی... ایسے ہی کہوں گا اور ایک بار پھر اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔"

"بس، اس غلطی کی تلافی یہی ہے کہ اس بات کو اب

پیاری بیوی

وہ کار میں موٹروے پر چلا جارہا تھا کہ ایک پولیس افسر نے تعاقب کرکے اسے ایک جگہ روک لیا۔

"ہاں جناب...! کیا مسئلہ ہے؟ کیوں روکا ہے مجھے؟"

"یہاں رفتار کی حد ساٹھ ہے... آپ اسّی کی رفتار پر جارہے تھے۔"

"ہرگز نہیں... میں پچاس پر گاڑی چلا رہا تھا۔"

"اوہ ڈارلنگ!" مسافر کی بیوی نے دخل اندازی کی۔ "تم پورے سو کی رفتار پر گاڑی اڑا رہے تھے۔"

مسافر نے اپنی بیوی کو خشمناک نظروں سے گھورا۔

افسر نے کہا۔ "اور تمہاری گاڑی کی عقبی لائٹ بھی ٹوٹی ہوئی ہے جو حادثے کا سبب بن سکتی ہے۔"

"اوہ... مجھے علم نہیں کہ وہ کب اور کیسے ٹوٹی۔"

"میں پچھلے تین ہفتوں سے تمہیں بتا رہی ہوں۔" بیوی ایک بار پھر بولی۔ "لیکن تمہارے پاس لائٹ بدلوانے کا وقت ہی نہیں ہے۔"

"اور تم نے سیٹ بیلٹ بھی نہیں باندھی ہوئی ہے۔" افسر نے قدرے توقف کے بعد الزامات کی فہرست میں اضافہ کیا۔

"تم بائیک سے اترے تو میں نے بیلٹ کھولی تھی۔" مسافر نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں ڈارلنگ... تم کبھی بیلٹ نہیں باندھتے۔ یہ تمہاری عادت بن گئی ہے۔" بیوی بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"بکواس بند کرو۔" مسافر مڑ کر اپنی بیوی پر غرایا۔ "ورنہ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

"کیا آپ کے شوہر آپ سے ہمیشہ اسی طرح بات کرتے ہیں؟" افسر نے عورت سے پوچھا۔

"نہیں۔" جواب ملا۔ "بس نشے میں ہوتے ہیں تو ذرا غصہ دکھانے لگتے ہیں۔"

اوکاڑہ سے سعدیہ خاور کی معصومیت

سنبھالنا ہے اور بہتر ہے کہ آج سے تم بھی اسٹوڈنٹس میں شامل ہو جاؤ۔ تم نے دیکھ تو سب ہی کچھ لیا ہے۔ یہ اکیڈمی دراصل ایک طرح کا ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ہے...“

انہوں نے اپنی آواز مزید دھیمی کرلی اور مجھے اس انسٹی ٹیوٹ کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگے۔ وہ اپنے تئیں اسکاٹ لینڈ کی طرز پر ایک بہت بڑا تفتیشی ادارہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس عظیم مقصد کی طرف اپنے پہلے قدم اٹھا چکے تھے۔ مادرِ وطن کو ہر قسم کے سماج دشمن عناصر، خفیہ تنظیموں اور مافیاز وغیرہ سے پاک کرنا ان کا اولین عزم تھا۔ اس عظیم مقصد کے پیشِ نظر وہ ہر طرح کی قربانی بھی دے رہے تھے۔ داخلہ فیس معاف تھی۔ ماہانہ فیس بھی کسی سے لی جا رہی تھی اور کسی سے نہیں۔ بلکہ نیمیل اسٹوڈنٹ کو تو وہ اپنے پلے سے بھی دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اس کی ایک مثال افشاں تھی۔ اس نے کئی مہینے سے ایک روپیا فیس نہیں دی تھی بلکہ کھانے پینے کی مد میں اکثر ان کا خرچہ کروا دیتی تھی۔ وہ بے آسرا لڑکی تھی۔ ماموں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے لیے حسنات بھائی کے دل میں نرم گوشہ موجود تھا بلکہ شاید نرم گرم گوشہ۔

اس روز میں بھی باقاعدہ اکیڈمی کے اسٹوڈنٹس میں شامل ہو گیا۔ حسنات بھائی کو چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں کھاتے پیتے گھرانے سے ہوں اور افورڈ کر سکتا ہوں اس لیے انہوں نے مجھ سے ٹکا کر فیس وصول کی یعنی دو ہزار روپے ماہانہ۔ کراٹے کی کلاس کے لیے وہ علیحدہ پانچ سو وصول کرنا چاہتے تھے لیکن میری درخواست پر انہوں نے مجھے اس کلاس سے استثنیٰ دے دیا۔ شاید انہیں اپنی ناک پر پڑنے والی دھواں دھار ٹکر بھی یاد آ گئی تھی۔

میں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ عافیہ کی تلاش کا کام بھی جاری ہو چکا تھا۔ ہم نے ٹوٹل چھ لوگوں تک پہنچنا تھا کہ ان میں سے عافیہ کے تایا ابو کون ہو سکتے ہیں۔ ان چھ میں سے کسی کار کے مالک کا نام مختار نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ مختار گھر کے کسی اور فرد کا نام ہو یا پھر ہو سکتا تھا کہ عافیہ نے یہ نام ہی غلط بتایا ہو۔

حسنات بھائی کی کھٹارا کار پر ہم دو جگہوں پر تو جا چکے تھے۔ دونوں جگہوں پر ناکامی ہوئی تھی۔ پہلی کار ایک گجراتی کارخانے دار کی تھی۔ اس کی بیٹی ڈیڑھ دو سال کی تھی۔ اس کی کوئی بہن وغیرہ بھی نہیں تھی۔ یہ لوگ سیالکوٹی لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔ دوسری گاڑی ایک سرکاری ملازم کی تھی۔ اس کی بیوی بچے کہیں لوشگی میں رہتے تھے اور وہ یہاں سروس کر رہا تھا۔ یہ بندہ بھی ہرگز عافیہ کا تایا نہیں ہو سکتا تھا، نہ ہی یہاں سے کوئی اور سراغ ملا۔

اب چار لیڈریس مزید رہ گئے تھے۔ یقیناً ان میں سے ہی کوئی ادھیڑ عمر شخص ایسا تھا جو سرکاری افسر تھا۔ یہ عافیہ کا تایا ابو تھا اور عافیہ کو کہیں چھپا کر بیٹھا ہوا تھا۔ عافیہ کی آخری فون کال اور اس کی دلگیر آواز میرے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ یہ آواز جیسے مجھے پکارتی تھی اور کہتی تھی۔ ”کامران! کیا ہمارے ساتھ بھی وہی ہوگا جو اس سے پہلے نامور عاشقوں کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے؟ کیا ہم بھی بچھڑ جانے کے لیے ملے تھے؟“

ایک روز سہ پہر کے وقت میں باہر کے دفتر نما کمرے میں بیٹھا تھا۔ حسنات بھائی اندر کراٹے اور قفل شکنی کی کلاسیں لینے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد انہوں نے سیل فون کی کلاس لینا تھی۔ اس کلاس میں موبائل فون کے ذریعے خفیہ تصویر کشی، آڈیو ریکارڈنگ اور دیگر خرافات کی تربیت دی جاتی۔ آج میری صرف ایک کلاس تھی اس لیے مجھے باہر دفتر کی ڈیوٹی سونپ دی گئی تھی۔ دفعتاً ایک بھاری بھرکم شخص تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس کی مونچھیں جیسے طیش سے پھڑپھڑا رہی تھیں اور آنکھوں میں خون کی سرخی تھی۔ ان حضرت کے ساتھ حسنات بھائی کا ہونہار شاگرد فاضل تھا۔ اس سترہ اٹھارہ سالہ اسٹوڈنٹ کے چہرے پر کئی ڈینٹ تھے۔ نچلا ہونٹ سوجا ہوا تھا، گریبان بھی چاک نظر آ رہا تھا۔ موچھیل شخص اندر آتے ہی دہاڑا۔

”کہاں ہے وہ تمہارا الو کا پٹھا پروفیسر؟“

”آ... آپ کون؟“

”اس سے کہو قاسم آیا ہے۔ تمہاری جان کو رونے کے لیے۔ اگر وہ خود باہر نہیں آیا تو میں اندر چلا جاؤں گا اور پھر لڑکوں کے سامنے اس کی وہ مٹی پلید ہوگی کہ منہ چھپاتا پھرے گا۔“

”وہ... تو اندر کلاس لے رہے ہیں۔ پڑھا رہے ہیں سیکنڈ ایئر والوں کو۔“

”بکومت۔“ وہ چنگھاڑا۔ ”مجھے پتا ہے کہ وہ لنگور کی اولاد کون سی کلاس لے رہا ہے۔ بیڑا غرق کر رہا ہے محلے کے بچوں کا۔ جوکر اور بھانڈ بنا رہا ہے ان کو اپنی طرح۔ مجھے سارا پتا ہے اکیڈمی کے پیچھے جو چڑیا گھر کھول رکھا ہے اس کتے نے۔ بلاؤ اس کو نہیں تو میں جا رہا ہوں اس کے کھوپڑے پر اینٹ مارنے۔“

میں ڈر کر اندر چلا گیا۔ عقبی حصے میں حسنات بھائی لڑکوں کی ایک ٹولی کو نقلی داڑھی اور مونچھ وغیرہ لگانا سکھا رہے تھے۔ اس ریڈی میڈ میک اپ کے ذریعے شکل تبدیل کرنا بھی ان کی ٹریننگ میں شامل تھا۔ انہوں نے ناک میں چھوٹے چھوٹے اسپرنگ پھنسا رکھے تھے جن کی وجہ سے ناک حیرت انگیز طور پر چوڑی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے جب انہیں آفت کی اطلاع دی تو ان کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ بے ساختہ فرمایا۔ ”بھائی صاحب آئے ہیں۔“

انہوں نے جلدی جلدی داڑھی مونچھ چہرے سے علیحدہ کی اور بال درست کرتے ہوئے ساتھ چل دیے۔ جسم پر لرزہ سا طاری تھا۔ گھبراہٹ میں ناک کے اندر سے اسپرنگ نکالنا بھول گئے تھے۔ اس کی وجہ سے ناک مضحکہ خیز نظر آ رہی تھی۔ میں بتانا چاہ رہا تھا لیکن اسی دوران میں ہم قاسم صاحب کے روبرو پہنچ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہی حسنات بھائی کے بڑے بھائی ہیں جن کا نام سن کر وہ اکثر جل تُو جلال تُو پڑھتے رہتے ہیں۔

اپنے ہونہار شاگرد کی درگت دیکھ کر حسنات بھائی کچھ اور گھبرا گئے۔ ”یہ... یہ کیا ہے بھائی جان؟“ انہوں نے پوچھا۔

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں تجھ سے کہ یہ کیا ہے... یہ کیا ہے؟“ قاسم صاحب چنگھاڑے۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”تُو نے تباہ کر دیا ہے علاقے کے بچوں کو۔ مجھے نہیں لگتا تُو زیادہ دیر جیل سے باہر رہ سکے گا۔ بہت بُری حالت ہوتا ہے تیری... بہت بُری۔ اور یہ نتھنے کیوں پھلا رہا ہے تُو... نظر نیچی کر اپنی۔“

”مم... مگر بھائی جان اس کو کیا ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے کیا کیا ہے اس نے؟“ وہ ہکلائے۔

”یہ پوچھ اس نے کیا نہیں کیا۔ اس کے ہوش ٹھکانے نہیں رہے۔ کھانے پینے کا اس کو ہوش نہیں ہے۔ پڑھائی اس کی چھوٹ چکی ہے۔ محلے بھر سے گالیاں یہ کھا رہا ہے اور اب تو نوبت تھانے کچہری تک چلی گئی ہے۔“

”تھ تھ... تھانے تک... میں ابھی آیا۔“ حسنات بھائی تیزی سے باہر نکل گئے۔ قاسم صاحب نے انہیں پکارا لیکن انہوں نے سنی اَن سنی کر دی۔ میں سمجھا کہ وہ کسی واقف کار کو فون کرنے یا مدد کے لیے بلانے گئے ہیں لیکن بعد ازاں پتا چلا کہ وہ ذرا باتھ روم تک گئے تھے۔

موچھیل قاسم صاحب زبردست پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ میں نے انہیں نارمل کرنے کے لیے جلدی سے جوس منگوایا۔ دراز میں سے آلو کے چپس نکال کر ان کے سامنے رکھے۔ دو چار محبت بھری باتیں کیں اور ہولے سے انہیں بتایا کہ اس نامعقول اکیڈمی وغیرہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تو لاہور سے ایک مہمان کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔ ویسے ہی شومئی قسمت دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ قاسم صاحب کا غصہ تو رفع نہیں ہوا مگر اس میں اتنی کمی ضرور واقع ہو گئی جتنی آج کل پیٹرول کی قیمتوں میں ہوتی ہے۔ میرے استفسار پر انہوں نے آگ بگولے لہجے میں بتایا۔ ”یہ فاضل میرے محلے دار ارشاد بھٹی کا بیٹا ہے۔ چند مہینے پہلے تک اچھا بھلا تھا پھر اس لنگور کے ہتھے چڑھ گیا۔ اب یہ تقریباً دیوانہ ہے۔ گھر میں سگی ماں کو کہتا ہے کہ وہ کسی مافیا کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے، اس لیے اس سے پہلے جیسا سلوک نہیں کرتی۔ باپ کو کبھی اسمگلر اور کبھی ایف آئی اے کا ایجنٹ قرار دیتا ہے۔ چند دن پہلے اس کی بہن سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ اس کے فون کی سم کہیں چھت پر گر گئی۔ وہ رات کو ٹارچ کی مدد سے سم ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے فتویٰ لگا دیا کہ یہ ہیروئن فروشوں کے مقامی گروہ سے ملی ہوئی ہے۔ چھپ چھپ کر باتیں کرتی ہے۔ رات کو چھت پر چڑھ کر گروہ کے سرغنہ کو ٹارچ کی مدد سے خفیہ اشارے دیتی ہے۔ بڑے بھائی نے اس بات پر تھپڑ مارا تو جواباً اس کی زیرِ ناف ایسا گھونسا رسید کیا کہ بے چارے کا اپنڈکس پھٹ گیا۔ وہ چار دن اسپتال میں پڑا رہا۔ عقل ملاحظہ کرو... عقل ملاحظہ کرو اس سور کی۔“ طیش میں آ کر موچھیل قاسم صاحب اپنی جگہ سے اچھلے اور ایک زوردار جھانپڑ فاضل کی گدی پر مارا۔ وہ کرسی سے گرتے گرتے بچا لیکن بولا کچھ نہیں۔

قاسم صاحب نے کچھ وقت سانسیں درست کرنے میں لگایا پھر بولے۔ ”مجھے تو اس حرام زادے کی وہ ساری خبیث حرکتیں یاد بھی نہیں آ رہیں جو اس لنگور کی ٹریننگ کی وجہ سے اس نے کی ہیں۔ پچھلے سے پچھلے ہفتے کی بات سن لو۔ اس کا تایا رات کو دیر سے گھر آیا۔ اس نے کندھے پر لکڑی کا ایک چھوٹا تنا رکھا ہوا تھا۔ گھر میں جلانے کے لیے لایا تھا۔ اس نے کھڑکی کھول کر صحن میں دیکھا پھر گھر کا پچھلا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور گلی کے چوکیدار کو بتایا کہ کوئی مشکوک بندہ ان کے گھر میں راکٹ لانچر لے کر گھوم رہا ہے۔ عقل ملاحظہ کرو... عقل ملاحظہ کرو... اوئے کسی نابینا عورت کے بچے، تجھے لکڑی اور راکٹ لانچر میں فرق نظر نہیں آتا؟“ وہ خاموش رہا۔

”راکٹ لانچر۔“ قاسم صاحب نے ایک بار پھر

دانت پیس کر کہا اور ایک اور جھانپڑ فاضل کی گردن پر لگایا۔ اس مرتبہ وہ پھر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔

وہ سانسیں درست کر کے بولے۔ ”چلو، یہ باتیں گھر کے اندر تک ہی رہتیں تو بھی گوارا تھیں مگر اب تو اس خبیث کا خبط گھر سے باہر بھی نکل آیا ہے۔ محلے میں ایک مولوی صاحب ہیں، کچھ ہی عرصہ پہلے کرایہ دار کے طور پر آئے ہیں۔ یہ پتا نہیں کہاں سے باتیں نکال کر لے آتا ہے۔ ان کے بارے میں کہتا پھرتا ہے کہ یہ دراصل ہندو ہیں۔ انہوں نے بھیس بدلا ہوا ہے۔ یہ دہشت گردی وغیرہ کے چکر میں یہاں آئے ہیں۔ عقل ملاحظہ کرو.... عقل ملاحظہ کرو اس ہونہار کھوجی کی۔ لوگ اس کی باتوں پر ہنستے ہیں مگر اس کا خبط کم ہونے کے بجائے بڑھتا رہا۔ اب آج اس نے کیا کیا ہے۔ پوچھو، ذرا اس سے پوچھو۔“ عقل ملاحظہ کرو ان کا تکیہ کلام تھا۔

میں نے زخمی فاضل کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی گردن کچھ مزید جھکالی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ قاسم صاحب زہر خند لہجے میں بولے۔ ”مولوی صاحب کا سات آٹھ سال کا ایک بیٹا ہے۔ جناب آج اسے کھینچ کر ایک کمرے میں لے گئے، یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ اس کی مسلمانی ہوئی ہے یا نہیں۔ عقل ملاحظہ کرو... ایک ہزار بے وقوفوں کو جمع کرو تو یہ اس کی ایک انگلی کے برابر نہیں ہیں۔ لوگ تو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں اور یہاں تو پہلے ہی بتنگڑ بلکہ بتنگڑو تھا۔ لڑکے کا شور سن کر آس پاس کے دکان دار جمع ہو گئے۔ یہ اندر لڑکے سے کھینچا تانی فرما رہے تھے۔ اب کیا سمجھے ہوں گے لوگ۔ انہوں نے مار مار کر اس کا دنبہ بنا دیا۔ وہ تو سیدھا تھانے لے جا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے اس کا باپ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے فون کر کے مجھے بلا لیا۔ سو پاپڑ بیلے ہیں تو اس الو کے پٹھے کی جان چھوٹی ہے لوگوں سے...“

بات کرتے کرتے قاسم کو ایک دم حسنات کا خیال آیا۔ وہ پھنکار کر بولے۔ ”اب کہاں دفع ہو گیا ہے وہ فساد کی جڑ۔ کہیں دیوار شیوار پھاند کر تو نہیں نکل گیا؟“

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ دیوار شیوار پھاندنے میں تو حضرت ماسٹر تھے۔ بہرحال وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ پتا چلا کہ حسنات صاحب اس چار دیواری میں کہیں بھی نہیں ہیں۔ طوفان کے آثار دیکھ کر انہوں نے کسی مناسب جگہ سے راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔ قاسم صاحب کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ انہوں نے چھوٹے بھائی پر غائبانہ گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ اس سے ایسے ایسے رشتے جوڑے جو کسی صورت وقوع پذیر ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ پھر انہوں نے دھکا دے کر دفتر کا اندرونی دروازہ کھولا اور دندناتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کی طرف بڑھے۔ برآمدے میں ہی انہیں ایک لٹھ پڑی نظر آ گئی۔ آثار سے لگتا تھا کہ وہ اس لٹھ کو پولیس کے اختیارات کی طرح بے دریغ استعمال کریں گے اور اپنے سامنے والی ہر شے کو توڑ پھوڑ ڈالیں گے مگر اسی دوران میں حسنات صاحب کی فیمیل شاگرد ایک میل شاگرد کے ہمراہ آگے بڑھی۔ اس نے منت سماجت کر کے قاسم صاحب کا راستہ روکا۔ میں بھی ہمت کر کے اس کارِ خیر میں شریک ہو گیا اور ہم کسی نہ کسی طرح قاسم صاحب کو واپس دفتر میں لانے میں کامیاب ہوئے۔ قاسم صاحب نے چنگھاڑتے ہوئے آخری نوٹس دے دیا اور ہمیں پابند کیا کہ ہم یہ نوٹس حسنات تک پہنچا دیں۔ اس نوٹس کے مطابق حسنات صاحب کو دس دن کے اندر اندر اپنا یہ کباڑ خانہ ختم کرنا تھا یا پھر دما دم مست قلندر کے لیے تیار ہو جانا تھا۔

☆☆☆

شروع میں تو ایسا ہی لگا تھا کہ بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی میں پانی پت چھڑ جائے گی مگر دو تین بعد محسوس ہوا کہ صورتِ حال کسی حد تک کنٹرول میں آ گئی ہے۔ ایک دو ساتھی اسٹوڈنٹس کی زبانی بھی مجھے پتا چلا کہ قاسم صاحب اور حسنات بھائی میں ون ٹو ون ملاقات ہوئی ہے اور قاسم صاحب کا پارا کچھ نیچے آ گیا ہے۔

ہم نیلی کار والے چار مالکان کو ٹٹول چکے تھے، اب پانچویں کی باری تھی۔ اس کا نام شاہد محمود تھا اور وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ اس سے ملنا اور اس کی ٹوہ لینا کافی آسان تھا۔ شاہد محمود گھر میں بھی شام کے وقت کلینک چلاتا تھا۔ ہم بطور مریض اس کے پاس جا سکتے تھے اور اس میں ایسا جھوٹ بھی کیا تھا۔ مریضِ عشق تو میں تھا ہی۔ بات صرف سات آٹھ سو روپے فیس کی تھی اور میں یہ بھرنے کے لیے تیار تھا۔

ہم سہ پہر کے وقت حسنات صاحب کی عجوبہ کار میں نکلے اور جی ٹی روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر شاہد محمود کی کوٹھی اسی علاقے میں تھی۔ ہم نے ایک جگہ سینما کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی۔ اس سے آگے ہمیں پیدل جانا تھا۔ ہم ایک بھری پُری سڑک سے گزر رہے تھے جب حسنات بھائی بُری طرح چونکے۔ انہیں اپنے عقب میں کوئی بندہ نظر آیا تھا۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ یہ شلوار قمیص والا ہٹا کٹا شخص تھا اور ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا تیزی سے حسنات بھائی کی طرف آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ ہاتھ سے کچھ اشارے بھی

کر رہا تھا۔ حسنات بھائی کا رنگ اڑ گیا۔ میرا ہاتھ تھام کر برق رفتاری سے چلنے لگے اور پھر سرِ راہ ایک ہوٹل میں گھس گئے۔

”کون ہے یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک... ایجنسی کا بندہ ہے۔“ وہ ہکلائے۔

ہوٹل میں رش تھا۔ حسنات بھائی سیدھے باتھ روم کی طرف گئے اور ایک میں داخل ہو گئے۔ میں سٹپٹایا ہوا وہیں کھڑا رہا۔ وہ ہٹا کٹا شخص دندناتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھ پر بھی اس کی نظر پڑی لیکن اس نے صرف حسنات بھائی کو ہی دیکھا تھا اور اب انہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ سخت طیش میں تھا۔ اس نے ہر طرف نظر دوڑائی پھر تن کر ہوٹل کے بیرونی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

”یا اللہ خیر۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

کچھ دیر بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ میں دنگ رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ حسنات بھائی خالی باتھ روم میں داخل ہوئے ہیں مگر اس میں سے تو ایک اور بھائی صاحب بھی نکل رہے تھے۔ ان کی کھچڑی داڑھی اور ہونٹوں پر جھکی ہوئی بھاری مونچھیں تھیں۔ انہوں نے نیلے رنگ کا ایک ڈبی دار کوٹ پہن رکھا تھا اور ناک کافی چپٹی تھی۔

میں حیرت زدہ ان کی طرف دیکھ رہا تھا جب انہوں نے میرے کان میں فرمایا۔ ”چلو آ جاؤ۔“

میں اچھل کر رہ گیا۔ یہ حسنات بھائی ہی تھے۔ واہ، کیا جاسوسی کہانیوں جیسا دھوبی پٹکا مارا تھا انہوں نے۔ حقیقی زندگی میں تو ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ میں واقعی ششدر رہ گیا۔ انہوں نے اپنا کوٹ الٹ کر پہن لیا تھا۔ اسے دونوں طرف سے پہنا جا سکتا تھا۔ بڑی نفیس داڑھی مونچھ چپکالی تھی اور ناک میں وہی اسپرنگ پھنسا لیے تھے جو شکل کو کیا سے کیا بنا دیتے تھے۔ رہی سہی کسر موٹے شیشوں کی عینک نے پوری کر دی تھی جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں دوگنا بڑی نظر آ رہی تھیں۔

وہ بڑے اعتماد سے ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے اور ہٹے کٹے شخص کے پاس سے گزرتے ہوئے... راہگیروں میں شامل ہو گئے۔ میں ان سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ جیسا کہ دو تین دن بعد معلوم ہوا، یہ ہٹا کٹا شخص کسی ایجنسی کا بندہ نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹی سی موبائل فون شاپ چلاتا تھا۔ اس سے حسنات صاحب وقتاً فوقتاً ایزی لوڈ کرواتے رہتے تھے۔ اپنی چرب زبانی کی بدولت وہ اس بے چارے سے اب تک ادھار قریباً ڈھائی ہزار کا ایزی لوڈ کروا چکے تھے اور نادہندہ بنے ہوئے تھے۔ بہرحال ابھی یہ قصہ ختم نہیں ہوا۔ تبدیل شدہ حلیے کے ساتھ ہم ہوٹل سے آدھ پون کلومیٹر دور ہی آئے ہوں گے کہ ایک گوشے سے دو افراد عقاب کی طرح حسنات بھائی پر جھپٹے اور انہیں اٹھا کر ایک پھل فروش کی ریڑھی پر دے مارا۔ وہ ان کو گریبان سے کھینچ رہے تھے اور چلا رہے تھے۔ شور سن کر دو افراد مزید آ گئے اور اس کارِ خیر میں شمولیت اختیار کی۔ گندم کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ ایک زوردار گھونسا مجھے بھی لگا۔ کچھ لوگوں نے درمیان میں آ کر بیچ بچاؤ کروایا۔ حسنات بھائی کی داڑھی ایک طرف سے کھسک گئی تھی جسے انہوں نے بائیں ہاتھ سے دبا رکھا تھا اور ظاہر یہی کر رہے تھے کہ یہاں چوٹ لگی ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ داڑھی کو اس کے اصل مقام پر رکھنے میں کامیاب رہے۔ کھینچا تانی میں ان کی ناک کے ایک نتھنے میں سے اسپرنگ بھی نکل گیا تھا۔ اب ایک طرف سے پچکی ہوئی ناک مزید مضحکہ خیز لگنے لگی تھی۔ یہ لوگ حسنات بھائی پر مسلسل چلا رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں مناسب جگہوں پر ناقابلِ اشاعت گالیاں بھی شامل تھیں۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا، اس سے مجھے یہی پتا چلا کہ حسنات بھائی کو آڑے ہاتھوں لینے والا ایک قریبی موٹر ورکشاپ کا ہیڈ مستری ہے۔ حسنات بھائی نے پچھلے سال اس ورکشاپ سے اپنی کھٹارا کا انجن تبدیل کروایا تھا اور پھر لمبی ٹرائی کا بہانہ کر کے نکل لیے تھے۔

بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ پولیس کو بلانے تک نوبت آ سکتی تھی۔ حسنات بھائی لرزتے کانپتے میری طرف آئے اور ایک طرف لے جا کر دھیرے سے بولے۔ ”تمہارے پاس چھ ہزار روپے ہوں گے؟“

خوش قسمتی سے اتنے روپے میری جیب میں موجود تھے۔ میں نے یہ روپے حسنات بھائی کو دیے۔ کافی تُو تکار کے بعد انہوں نے ورکشاپ کے بپھرے ہوئے مالک اور ہیڈ مستری سے اپنی جان چھڑائی۔

جاسوسی اور چھان بین کا سارا مزہ کرکرا ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم اپنا آج کا مشن ادھورا چھوڑ کر واپس ٹریننگ سینٹر کی طرف چل دیے۔ راستے میں، میں نے حسنات بھائی سے پوچھا۔ ”یہ کیسے ہو گیا حسنات بھائی؟“

وہ بولے۔ ”اسی کو کہتے ہیں بیڈ لک۔ بھیس بدل کر ہم ایجنسی کے بندے (ایزی لوڈ والے) سے تو بچ گئے مگر یہ جو دوسری پارٹی ہے اس نے پہچان لیا۔ دراصل انہوں نے مجھے اسی داڑھی مونچھ والے روپ میں دیکھا ہوا تھا۔“

''یعنی اگر آپ اپنے اصل حلیے میں ہوتے تو ان سے بچ جاتے؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور اداس بکرے کی طرح گردن جھکالی۔ نازک صورتِ حال کے باوجود میں بمشکل اپنی ہنسی روک سکا۔ جسے وہ بیڈ لک کہہ رہے تھے، وہ دراصل شامتِ اعمال تھی۔ کھینچا تانی کے دوران میں ان کا پاؤں بری طرح مڑ گیا تھا اور وہ لنگڑا کر چل رہے تھے۔ اس موچ کی وجہ سے میرے لیے بڑی مناسب صورتِ حال پیدا ہوئی۔ اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ بہرحال باقی سارے راستے میں حسنات بھائی مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کرتے رہے کہ ورکشاپ والوں نے بالکل ناجائز پیسے لیے ہیں۔ وہ انہیں مزہ چکھا سکتے تھے لیکن صرف اس لیے چپ رہے کہ اس لڑائی کی وجہ سے ایک مقامی مافیا کو زبردست فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ مافیا کا لفظ وہ جگہ جگہ اتنے تواتر سے استعمال کرتے تھے کہ اب تو میرے منہ سے بھی کسی وقت عافیہ کی جگہ بے ساختہ مافیا نکل جاتا تھا اور دیکھا جائے تو عافیہ کے جابر خیالات نے کسی مافیا ہی کی طرح ہمہ وقت مجھے گھیرا ہوا تھا۔ اس کی یادیں رات کے اندھیرے میں شب خون مارتی تھیں اور مجھے لہولہان کر دیتی تھیں۔

اگلے دو دن حسنات بھائی نے اپنی چوٹوں کی ٹکور کرنے میں گزارے۔ اس دوران میں ایک بار قاسم صاحب بھی اکیڈمی میں تشریف لائے۔ ان کا پارا بالکل ٹھنڈا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے حسنات بھائی سے بھی سیدھے منہ بات کی۔ چائے کی چسکیاں بھی لیں۔ جلد ہی مجھے اس کایا پلٹ کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ حسنات بھائی کی ٹیمیل اسٹوڈنٹ یعنی لیڈی کمانڈو افشاں قاسم بھائی کے آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔

حسنات بھائی کے ایک شاگرد انور عرف کھل نائیک نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''حسنات بھائی کا پھینکا ہوا کانٹا نگل لیا ہے قاسم بھائی نے۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ چالاک عورت ارسطو جیسے دانشور کو بھی گھوڑا بنا کر اس پر سواری کر سکتی ہے۔''

انور عرف کھل نائیک نے اس روز مجھے افشاں کے بارے میں مزید باتیں بھی بتائیں۔ پتا چلا کہ یہ بی بی اکیڈمی کے اولین شاگردوں میں سے ہے۔ شروع شروع میں حسنات بھائی کا ارادہ تھا کہ اس سے شادی فرمائیں گے اور چند سالوں میں تیزی سے بچے پیدا کر کے اپنے گھر کی ہی ایک سیکرٹ سروس بنا لیں گے مگر یہ بی بی بے راہ رو نکلی۔ ٹریننگ کے بعد اس نے سماج دشمن عناصر کو کچلنے کے بجائے چوریاں شروع کر دیں۔ آٹھ دس ماہ تک غائب رہی پھر ایک روز پتا چلا کہ سرائے عالمگیر کی ایک حوالات میں بند ہے۔ حسنات بھائی نے بمشکل اس کی ضمانت کروائی۔ اب یہ پھر ٹریننگ وغیرہ لے رہی ہے مگر اب اس سے شادی کا خیال حسنات بھائی نے دل سے نکال دیا ہے۔

چند روز کے اندر ہی افشاں نے قاسم بھائی کا سارا زہر نکال دیا تھا۔ وہ ریشہ خطمی ہو رہے تھے بلکہ ایک دن تو انہوں نے ہماری اکیڈمی کا سرسری سا دورہ بھی فرمایا۔ ہم اپنی ٹریننگ میں مصروف تھے۔ میری قفل شکنی کی کلاس ہو رہی تھی۔ حسنات بھائی ہم دو لڑکوں کو بتا رہے تھے کہ ہنضمی قفل میں اندر کی طرف لگی ہوئی چابی کو کس طرح باہر نکالا جاتا ہے۔ انہوں نے دروازے کی نچلی درز میں سے ایک چوڑا اخبار اندر گھسا دیا تھا اور ایک آہنی سلائی سے چابی کو چھیڑ کر اسے اخبار پر گرانے کی کوشش فرما رہے تھے۔ فربہ اندام قاسم بھائی افشاں کی معیت میں اندر داخل ہوئے۔ کچھ دیر خاموشی سے معائنہ کرتے رہے پھر جوڈو کراٹے کی کلاس کی طرف نکل گئے۔ ان کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سارے بکھیڑے کو نالائقی کا عروج سمجھتے ہیں لیکن چشم پوشی کر رہے ہیں۔ تیز طرار افشاں انہیں ساتھ ساتھ بریفنگ بھی دے رہی تھی۔ میں نے قاسم صاحب کو شروع میں بتایا تھا کہ میں اکیڈمی کے شاگردوں میں شامل نہیں۔ اب یہ جھوٹ بھی کھل گیا تھا۔ بہرحال افشاں کے ہوتے ہوئے اب کوئی ڈر خطرے والی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی شوخ حرکتوں سے ادھیڑ عمر قاسم صاحب کو کم از کم وقتی طور پر تو مسمرائز کرنے میں کامیاب تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ایک بار قاسم صاحب کی ٹویوٹا پر مشکوک قسم کی لانگ ڈرائیو پر بھی جا چکی ہے۔

تیسرے دن مجھے اکیلے ہی نیلی کار والی تفتیش پر نکلنا پڑا۔ ورکشاپ والوں کی عزت افزائی کے بعد حسنات صاحب کے پاؤں میں جو موچ آئی تھی، وہ ابھی پوری ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور یوں وہ ابھی تک خود کو ریٹائرڈ ہرٹ تصور کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک احمق شاگرد کا خستہ حال اسکوٹر مجھے فراہم کر دیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ اس اسکوٹر کا کرایہ بھی اپنے بل میں ایڈجسٹ کریں گے۔ نیلی کار والے جس پانچویں ایڈریس پر مجھے پہنچنا تھا، وہ مجھے ازبر ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ ایک شاہد محمود نامی ڈاکٹر صاحب تھے۔ میں بطور مریض ان کے پاس حاضری دے سکتا تھا اور کلینک کے کسی ملازم سے مزید سن گن بھی لے سکتا تھا لیکن یہ ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی۔

وہ کچھ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔ ابھی میں کلینک کے قریب ہی پہنچا تھا کہ دو افراد کلینک میں سے نکلتے نظر آئے۔ میرے سر پر جیسے کسی نے سو کلو کا بم پھوڑ دیا تھا۔ ان دو افراد میں سے ایک تو فربہ اندام قاسم صاحب تھے۔ دوسری سرو قد وآہو چشم عافیہ تھی۔ وہ قدرے کمزور بلکہ بیمار نظر آتی تھی۔ قاسم صاحب کے ساتھ سر جھکا کر چلتی وہ ان کی ٹویوٹا کار میں آ بیٹھی۔ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے سرپٹ دوڑتے دل کو بمشکل سنبھالا اور اسکوٹر پر ٹویوٹا کار کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

پندرہ منٹ کا یہ سفر رہائشی علاقے کی ایک کوٹھی پر ختم ہوا۔ گیٹ پر قاسم جاہ کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ بالآخر میں نے مافیا... میرا مطلب ہے عافیہ کا سراغ پا لیا تھا لیکن ذہن میں بہت سے سوالات بھی ابھر رہے تھے جن میں سے اہم ترین سوال یہی تھا کہ قاسم بھائی سے مافیا... میرا مطلب ہے عافیہ کا کیا تعلق ہے؟ پھر ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں کوندا، کہیں یہی تو عافیہ کے تایا جان نہیں ہیں؟ عین ممکن تھا کہ عافیہ نے ان کا نام غلط بتایا ہو، اگر ایسا تھا تو پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس نے اپنا نام بھی غلط بتایا ہو۔

اسی دوران میں میں نے ایک نوجوان پٹھان لڑکے کو کوٹھی میں سے نکلتے دیکھا۔ اس کے حلیے سے ظاہر تھا کہ وہ ڈرائیور یا گھریلو ملازم ہے۔ وہ سائیکل پر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے اسکوٹر اس کے پیچھے لگا دیا۔ وہ ایک ٹینٹ سروس والے کے پاس جا رکا۔ میں بھی اسکوٹر سے اتر کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ ٹینٹ سروس والے سے کوٹھی کی لائٹنگ اور شامیانوں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ کہیں یہ... کہیں یہ عافیہ کی شادی کی تیاریاں ہی تو نہیں تھیں؟ منہ خشک ہو گیا، سینہ سلگ اٹھا۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ لڑکا معلومات لے کر فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکے سے علیک سلیک کی۔

''میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جی فرمائیں، ام سن رہا ہے۔''

''یہاں نہیں برادر! اہم بات ہے، بیٹھ کر کرنے والی ہے۔''

بے نیازی

ایک صاحب مجسٹریٹ کے پاس کچھ کاغذات کی تصدیق کرانے گئے۔

''سکونت کہاں ہے؟'' مجسٹریٹ نے دریافت کیا۔

''کس کی...... میری۔''

''ہاں، آپ کی۔''

''برنس روڈ۔''

''کیا کام کرتے ہیں؟''

''کون؟ میں؟''

''ہاں... ہاں... آپ!''

''ایک سرکاری ادارے میں ملازم ہوں۔''

''عمر کیا ہے؟''

''کس کی؟ میری؟''

''نہیں میری۔'' مجسٹریٹ نے جلا کر کہا۔

''میرا خیال ہے آپ کی عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔'' نہایت اطمینان سے جواباً کہا گیا۔

کراچی سے عائشہ خرم کی شگفتگی

وہ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد بیٹھ گیا۔ میں نے ٹپٹا کر کہا۔ ''یہاں نہیں بیٹھنا برادر، آؤ میرے ساتھ۔''

قریباً دس پندرہ منٹ بعد ہم ایک قریبی ریستوران میں بیٹھے دودھ پتی پی رہے تھے اور سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ رحیم نامی یہ لڑکا کافی عرصے سے قاسم بھائی کا گھریلو ملازم تھا۔ بہرحال آج کل وہ ان سے بہت نالاں تھا۔

رحیم کو مکمل طور پر شیشے میں اتارنے میں مجھے آدھ پون گھنٹا مزید لگا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں لاہور میں اسے اپنی قالین فیکٹری میں زبردست ملازمت دے سکتا ہوں اور اس کے دن پھر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوشش کر کے میں نے اسے تھوڑی نقدی بھی دی۔ دھیرے دھیرے رحیم گل نے بولنا شروع کر دیا۔ اس کی گفتگو سے مجھ پر پے در پے انکشافات ہوئے۔ پہلا انکشاف تو یہی تھا کہ قاسم بھائی ہی عافیہ کے تایا ابو ہیں اور دوسرا انکشاف یہ تھا کہ عافیہ کا وہ نام جس سے اسے پکارا جاتا ہے، عافیہ نہیں مہناز ہے۔ عافیہ کا تو کسی کو پتا بھی نہیں تھا۔ یہ نام اس کے دادا

مرحوم نے رکھا تھا یعنی پورا نام مہناز عافیہ تھا لیکن استعمال مہناز ہی ہوتا تھا اور اب پرسوں اس کی شادی کی رسم دھوم دھام سے انجام دی جارہی تھی۔

دیگر لوگوں کی طرح رحیم گل کو بھی معلوم تھا کہ مہناز عافیہ کی شادی اس کی مرضی ومنشا کے بغیر کی جارہی ہے اور اس میں اس کے تایا کا مطلب پوشیدہ ہے۔ وہ اپنے امیر کاروباری دوست سے رشتے داری بنا کر کاروباری فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھید بھی کھلا کہ عافیہ نے احتیاطاً اپنے تایا ابو کا اصل نام ہی نہیں اصل کام بھی چھپایا تھا۔ وہ سرکاری ملازم نہیں بلکہ سرکاری ٹھیکے دار تھے۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر کے طور پر مختلف تعمیرات کے ٹھیکے لیتے تھے۔ شاید انہوں نے کوئی ایک آدھ سڑک بھی بنائی ہو۔

رحیم گل نے ایک اور اہم انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹی بی بی نے کچھ دن پہلے گھر سے بھاگنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس کے بعد سے قاسم صاحب نے اس کو کوٹھی کے ایک پچھلے کمرے میں بند کر چھوڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شادی کے بعد ہی اسے وہاں سے نکالے گا۔“

”لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں نے ان دونوں کو کہیں باہر سے آتے دیکھا ہے؟“

”خو، وہ چھوٹی بی بی کو ڈاکٹر شاہد صاحب کے پاس لے کر گیا تھا اس کے دوادارو کے لیے۔ یہ ڈاکٹر شاہد ٹھیکے دار صاحب کا گہرا دوست ہے نا۔“

ایک دم میرے ذہن میں نیا خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اچھا... کبھی ایسا بھی ہوا ہے، ٹھیکے دار صاحب نے ڈاکٹر شاہد کی کار استعمال کی ہو؟ میرا مطلب ہے، ایک دو دن کے لیے ان کی کار کہیں لے کر گئے ہوں؟“

رحیم گل نے اپنی گرم ٹوپی اتار کر سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی، کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ ایسا ابھی پچھلے ہی دنوں ہوا ٹھیکے دار جی چھوٹی بی بی صاحب کو لاہور لینے کے لیے ڈاکٹر جی کی کار پر ہی گیا تھا۔ اس کا اپنا گاڑی ذرا خراب تھا۔“

اب ساری بات سمجھ میں آرہی تھی۔ کڑی سے کڑی مل گئی تھی۔ ٹھیکے دار قاسم بھائی ڈاکٹر شاہد کی کار پر لاہور سے عافیہ کو لینے گئے تھے اور میں نے اس کار کا ادھورا نمبر پڑھا تھا۔

رحیم گل، ٹھیکے دار قاسم بھائی کے ذاتی معاملات سے خوش نہیں تھا۔ اسے ان کے چال چلن کے حوالے سے بھی شکایات تھیں۔ اب یہ بات بھی اس کے لیے تکلیف دہ تھی کہ جناب نے ایک ایسی لڑکی سے عشق لڑانا شروع کر دیا ہے جو ان کی بھتیجی عافیہ سے دو چار سال ہی بڑی ہوگی۔ رحیم گل کا اشارہ یقیناً حسنات بھائی کی فیمیل اسٹوڈنٹ افشاں کی طرف تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ چور چوری سے باز آبھی جائے تو ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ یہ لڑکی ماہر سراغ رساں بنتے بنتے بڑے پائے کی نوسرباز بن گئی تھی۔

بہرحال ان ساری باتوں کا تعلق مجھ سے نہیں تھا۔ مجھ سے تو عافیہ کا تعلق تھا اور اس زبردستی کی شادی کا تعلق تھا جو دو روز بعد ہونے جارہی تھی۔ رحیم گل کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ عافیہ اس شادی سے ہرگز خوش نہیں ہے۔ اس نے اپنے تایا کے شکنجے سے نکلنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی اور اب بیمار پڑی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جس آگ میں میں سلگ رہا ہوں، وہ بھی اس میں جل رہی ہے۔ اب مجھے کچھ کرنا تھا اور فوری طور پر کرنا تھا۔ اب تو میں حسنات بھائی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ ان کے بھی گمان میں نہیں تھا کہ میں جس لڑکی کو ڈھونڈنے یہاں وارد ہوا ہوں اور جگہ جگہ کی خاک چھان رہا ہوں، وہ ان کی بھتیجی ہے اور ان کے جابر بڑے بھائی کی تحویل میں ہے۔

رحیم گل معصوم تھا لیکن اتنا نہیں۔ اس کے ذہن میں یقیناً کھد بد جاری تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں ٹھیکے دار قاسم بھائی کی بھتیجی کے سلسلے میں اتنی دلچسپی کیوں ظاہر کر رہا ہوں؟ آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

”کامران بھائی، ام پوچھنا چاہتا ہے کہ چھوٹی بی بی سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“

”بڑا پاک تعلق ہے رحیم گل۔“

”کیا چھوٹی بی بی آپ کا بہن ہے؟“

جی چاہا کہ چائے دانی اس کے سر پر دے ماروں۔ وہ شادی سے پہلے ہی میرا نکاح توڑنا چاہ رہا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے سمجھایا کہ اس کے علاوہ بھی بہت سے پاک رشتے ہوتے ہیں جن میں ایک دوسرے کا دکھ درد دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا جاتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ رحیم گل میری جتنی مدد کر سکتا تھا، کر چکا ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ اب اس گھر میں جو کچھ بھی کرنا تھا، مجھے اکیلے ہی کرنا تھا۔ میں نے تیزی سے منصوبہ بندی شروع کر دی۔

☆☆☆

وہ جہلم کی ایک سرد رات تھی۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ یہی کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا۔ میں محترم حسنات بھائی کے فراہم کردہ اسکوٹر پر خاموشی سے نکلا اور اسی کوٹھی میں پہنچ گیا جس کے گیٹ پر ٹھیکے دار قاسم جاہ کے نام کی پلیٹ لگی تھی۔ میں حسنات بھائی کی ٹریننگ کے مطابق دن کے وقت بڑی اچھی طرح کوٹھی کا حدود اربعہ دیکھ چکا تھا۔ کوٹھی کے عقب میں دو خالی پلاٹ تھے اور گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔ میں اسکوٹر کو بند کر کے ان پلاٹس کی طرف لے گیا۔ اسکوٹر کو اسٹینڈ پر دیوار کے بالکل ساتھ کھڑا کیا۔ اسکوٹر پر کھڑا ہوا تو دس گیارہ فٹ اونچی دیوار تک آسانی سے ہاتھ پہنچ گیا۔ دیوار کے بالائی کنارے پر لوہے کا جنگلا تھا جس پر برچھیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ حسنات بھائی کی کلاس میں پڑھا ہوا سبق مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میں نے اپنی وزنی جیکٹ کو دہرا کر کے برچھیوں پر رکھا اور ان کی کاٹ سے بچتا ہوا دھم سے تاریک صحن میں کود گیا۔ سبق نمبر 12 کی مثال نمبر 3 کے مطابق کچھ دیر وہیں بیٹھا سن گن لیتا رہا پھر پنجوں کے بل چلتا ہوا اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ میری جیب میں جو چیزیں تھیں، ان میں ایک رومال تھا جو ایک شاپر میں اچھی طرح لپیٹا گیا تھا۔ ایک مڑا تڑا تار تھا۔ کچھ چابیاں اور اسی طرح کی دیگر اشیا تھیں۔ سب سے پہلے میرا واسطہ ایک بھمبھی قفل سے پڑا۔ خوش قسمتی سے قفل میں اندر کی طرف چابی موجود تھی۔ میری آنکھوں کی چمک دگنی ہوگئی۔ اپنی ٹریننگ آزمانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے ایک مڑا تڑا اخبار نکالا اور اسے سیدھا کر کے دروازے کی نچلی درز سے اندر گھسا دیا۔ اس کے بعد جیب سے ایک آہنی کیل نکالی اور کیل کی مدد سے چابی کو چھیڑا۔ وہ اندر کی طرف پھیلے ہوئے اخبار پر گری۔ میں نے اخبار باہر کھینچ لیا۔

”واہ استاد جی۔“ دل سے بے ساختہ آواز نکلی۔

میں نے چابی سے قفل کھولا اور اندر چلا گیا۔ یہاں میں نے ایک کھڑکی کا شیشہ حسنات بھائی کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق توڑا۔ پہلے شیشہ کاٹنے والے قلم سے شیشے پر ایک چوکور کٹ لگایا پھر اس کٹ پر گوند والا کاغذ چپکا دیا اور ہاتھ سے ہلکی سی چوٹ لگا کر شیشہ توڑ دیا۔ شیشہ چونکہ کاغذ سے چپکا ہوا تھا لہٰذا اندر نہیں گرا اور اس کے گرنے سے شور بھی پیدا نہیں ہوا۔ میں نے خلا میں ہاتھ ڈال کر اندر سے چٹخنی کھول دی اور ایک مستطیل کمرے میں گھس گیا۔ سچ کہتے ہیں کہ محنت انسان کو سونا بنا دیتی ہے اور اگر اچھا استاد بھی مل جائے تو سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے۔

کل رحیم گل کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ عافیہ ٹی وی لاؤنج کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہے اور اس کمرے سے باہر لاؤنج میں خود تایا صاحب کا بستر ہوتا ہے۔ پورے گھر میں تازہ رنگ وروغن کی بو تھی۔ یہ رنگ وروغن بھی یقیناً شادی کی تیاریوں کا حصہ تھا۔ ٹی وی لاؤنج کے ایک سرے پر مجھے ٹھیکے دار قاسم بھائی کا بیڈ نظر آگیا۔ میں نے انہیں ان کے تن وتوش سے پہچانا۔ وہ سرتاپا لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ میں نے جیکٹ کی جیب سے شاپر بیگ نکالا۔ اس میں کلوروفام سے بھیگا ہوا رومال موجود تھا۔ حسنات بھائی نے لیکچر کے دوران بتایا تھا کہ جاسوسی دنیا کے سارے سپر اسٹارز یعنی علی عمران کرنل فریدی، حمیدی اور میجر پرمود وغیرہ اسی طرح کے رومال سونگھا کر مجرموں کو بے ہوش کرتے تھے اور پھر ان کو اغوا کر کے قارئین سے تاوان وصول کرتے تھے۔ حسنات بھائی کی تربیت کے عین مطابق میں قاسم بھائی کے سرہانے پہنچا۔ رومال کو چٹکی میں پکڑا، لحاف کا سرا ذرا سا اٹھایا اور رومال کو ہولے ہولے اس جگہ لہرانا شروع کیا جہاں میرے اندازے کے مطابق ان کی ناک تھی۔ اس ساری کمانڈو کارروائی کے دوران میں بس یہیں پر مجھ سے تھوڑی سی غلطی ہوئی تھی۔ لحاف کی وجہ سے مجھے پتا نہیں چلا۔ قاسم بھائی کا سر دوسری طرف تھا اور میں پاؤں کی طرف رومال لہرا رہا تھا۔ جب اچانک پرلی جانب سے موصوف نے لحاف میں سے سر نکال کر مجھے دیکھا تو میں خود بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف اور حیرت کا دریا بہنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ چلّاتے یا اس طرح کی کوئی اور نامعقول حرکت کرتے، میں کرکٹر جونٹی روڈ کی سی پھرتی سے ان پر جا پڑا۔ رومال میں نے بڑی سختی سے ان کے باڑ جیسے منہ میں گھسا دیا اور نتھوں سمیت پورے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ وہ کافی جسیم اور زور آور تھے مگر جو کچھ ہوا، ڈرون کی سی پھرتی سے ہوا تھا۔ وہ مزاحمت بھی اتنی ہی دکھا سکے جتنی ہم ڈرون پر دکھاتے ہیں۔

وہ بے ہوش ہوگئے۔ کمرے کی چابی مجھے ان کے تکیے کے نیچے سے مل گئی۔ مقفل کمرے کو کھولنے سے پہلے میں نے تصدیق کی کہ اندر عافیہ ہی ہے۔ کی ہول میں سے اس کی لرزتی کانپتی آواز سنائی دی تو میں نے قفل کھول دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ششدر تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میں اور آپ کئی رومانی فلموں میں دیکھ چکے ہیں لیکن سین دیکھنے اور سین کا حصہ ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ جذباتی معانقہ، وہ تڑپ، وہ گرمی، وہ گداز یہ سب کچھ لفظوں میں

بیان نہیں کیا جاسکتا۔

''میرے ساتھ چلوگی؟'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں۔''

''کہاں تک؟''

''جہاں تک تم کہو۔'' اس نے کہا اور چہرہ میری جیکٹ میں چھپالیا۔

جی چاہا کہ اس سے پوچھوں کیا وہاں تک چلوگی جہاں تک راجیش کھنہ لے کر گیا تھا... شرمیلا ٹیگور کو فلم ارادھنا میں اور گانا گایا تھا روپ تیرا مستانہ لیکن یہ نازک وقت ایسے جذبات انگیز سوالوں کا نہیں تھا۔ ہم وہاں سے نکل آئے۔ کچھ دیر بعد میں حسنات کے فراہم کیے ہوئے اسکوٹر پر ہی ان کی بھتیجی کو بٹھا کر وہاں سے لے جارہا تھا۔

اس سے آگے کہانی میں دو تین موڑ جلدی جلدی آئے اور کہانی ختم ہوگئی۔ اگلے ہی روز ہم دونوں نے کورٹ میں جاکر شادی کرلی۔ اسی روز میں نے گھر والوں کو اپنے اعتماد میں لے کر اور انہیں اپنی مجبوریاں بتا کر اس شادی سے آگاہ کردیا اور انہوں نے اس شادی کو قبول بھی کرلیا۔ اب مجھے کوئی ڈر یا خطرہ نہیں تھا۔ ٹھیکے دار قاسم بھائی کتنا بھی اودھم مچالیتے، قبلہ والد صاحب بہ آسانی ان سے نمٹ سکتے تھے۔ ویسے بھی جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

شادی کے تیسرے دن میں نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ٹی وی نیوز میں ایک فوٹیج دیکھی اور اس فوٹیج نے اس سارے قصے کا مزہ دوبالا کردیا۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ''کل جہلم کے ایک رہائشی مکان میں بھڑکنے والی آگ کے حوالے سے ایک فوٹیج ہمیں مل گئی ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یہ آگ دو سگے بھائیوں کے باہمی تنازعے کا نتیجہ تھی اور جان بوجھ کر لگائی گئی تھی۔''

میں منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ فوٹیج میں سرخ دائرے کے ذریعے جس شخص کو دکھایا گیا، وہ یقیناً فربہ اندام قاسم بھائی ہی تھے۔ موصوف ایک بڑی لٹھ لے کر حسنات بھائی کی جاسوسی اکیڈمی میں گھسے ہوئے تھے۔ ہر طرف توڑ پھوڑ مچارہے تھے پھر انہوں نے کلوروفارم اور اسپرٹ وغیرہ کی بوتلوں کو آگ دکھادی۔

تب ایک دوسرے دائرے میں حسنات بھائی کو دکھایا گیا۔ دونوں سرخ دائرے آگے پیچھے دوڑے۔ قاسم بھائی والا دائرہ پیچھے تھا۔ قاسم بھائی نے لٹھ گھما کر حسنات بھائی کی تشریف پر رسید کی پھر دوسری پھر تیسری۔ حسنات بھائی پھرتی سے دیوار پر چڑھ گئے اور دوسری طرف کودے، یہ سڑک تھی۔ شومئی قسمت ایک بھونڈر رکشا تیزی سے آیا اور حسنات بھائی سے ٹکرایا۔ یہ چوٹ بھی غالباً وہیں پر لگی جہاں لٹھ کی چوٹیں لگی تھیں۔ حسنات بھائی دور تک لڑھک گئے اور واویلا کرنے لگے۔ لوگ ان کے گرد جمع ہوچکے تھے۔

☆☆☆

ان واقعات کو اب تین چار ماہ گزر چکے تھے۔ میں اور عافیہ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔ میں اسے عافیہ ہی کہتا ہوں۔ رحیم گل ہماری قالین فیکٹری میں اچھی ملازمت کررہا ہے۔ افشاں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ اس نے پھر منحرف ہوکر چوریاں وغیرہ شروع کردی ہیں۔ قاسم بھائی پر آتش زنی کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے اور ان کی بیوی روٹھ کر میکے بیٹھی ہوئی ہے۔ حسنات بھائی نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر پراپرٹی کا کام شروع کردیا ہے۔ دریائے جہلم کے خشک راستے پر کہیں انہوں نے کوئی کالونی بنانے کا پروگرام ترتیب دیا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ جگہ دریا کے اندر ہی واقع ہو۔ کہتے ہیں کہ چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ حسنات صاحب بھی جاسوسی اور سنسنی خیزی کے خول سے پوری طرح باہر نہیں نکلے۔ پچھلے دنوں ان کی مجوزہ کالونی کا ایک بروشر میری نظروں سے گزرا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''دھماکا ٹاؤن... ایشیا میں اپنی طرز کا پہلا رہائشی منصوبہ۔ ہر پلاٹ قبضہ مافیا کی دسترس سے دور۔ انڈر ورلڈ کے لوگوں سے بھی تقریباً سارے معاملات طے۔ اسکول، مسجد، جاسوسی اکیڈمی، کراٹے سینٹر، دہشت گردی سے تائب ہوجانے والوں کے لیے ایک مکمل علیحدہ بلاک۔ ٹاؤن کی اپنی بجلی، اپنا پانی، گیس کے لیے بھی اپنا کنواں کھودا گیا ہے اور الحمدللہ گیس بھی نکل آئی ہے (اگر واقعی ایسا تھا تو یقیناً انہوں نے سوئی ناردرن والوں کا کوئی پائپ پھوڑا ہوگا) ٹاؤن میں سیکیورٹی کا زبردست انتظام ہے۔ چالیس فٹ اونچی چار دیواری، مین گیٹ اور دیگر گیٹس پر مشین گنوں والے خونخوار قبائلی چوکیدار۔ گلیوں میں رات کے وقت خوف ناک شکلوں والے جسیم کتے چھوڑے جائیں گے جو ذرا سے شک پر ہر مقامی و غیر مقامی شخص کو پھاڑ کھائیں گے، انشاءاللہ...''

تو قارئین... میں یہی کہہ سکتا ہوں عقل ملاحظہ کریں... عقل ملاحظہ کریں...!

محافظ

شہناز احمد

دوسروں کی جانوں کی حفاظت کے ذمّے دار کبھی کبھی اپنی جان بھی خطرے کی نذر کردیتے ہیں... ایک ایسے ہی محافظ کی کارکردگی اور امتحان کی کٹھن گھڑیاں جہاں اپنے ساتھ مجرم کو بچانا بھی لازمی تھا...

عادت کے طفیل زندگی کی بازی جیت لینے والے شخص کی ہوشیاری...

میرا نام ریمنڈ مارٹن ہے۔

پیشے کے اعتبار سے میں ایک باڈی گارڈ ہوں۔ مجھے اس شعبے میں کافی عرصہ ہوگیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میری شہرت کافی اچھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ملازمت کے دوران میں کچھ لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑ گئے۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں... کیونکہ اچھے سے اچھا ڈاکٹر بھی کئی مرتبہ مریضوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ تو پھر ایک باڈی گارڈ کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟

میری زندگی کا سب سے بڑا اور ہولناک واقعہ اس وقت پیش آیا جب مجھے ایک شخص الفریڈ میرل نے فون کیا۔ وہ میری خدمات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اپنی سابقہ بیوی سے جھگڑا چل رہا تھا اور وہ اس سے جلد ملاقات کرنے والی تھی۔

''ہم دونوں ایک دوسرے سے اس قدر نفرت کرتے ہیں کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ وہ کل اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ مجھ سے ملنے آرہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے مجھے قتل کروا کر یہی ظاہر کرے گی کہ یہ ایک حادثہ ہے۔''

میں اس کی پریشان کن صورت دیکھتے ہوئے اس کی

کہانی سن رہا تھا۔
''اس سلسلے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہے تاکہ میرے ساتھ کوئی تو ہو جو وہاں موجود ہو۔''
آدھے گھنٹے کے بعد مجھے کسی خاتون کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام کیتھی اسٹین ہے اور وہ صرف ایک روز کے لیے میری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہے۔
''دراصل کل میں اپنے سابقہ شوہر سے میٹنگ کرنے جا رہی ہوں۔ وہ اس قدر ظالم اور خطرناک ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طریقے سے قتل کروا دے گا۔ اس کی دو وجوہ ہیں، ایک تو اس کی میرے لیے نفرت اور دوسرے مالی مفادات۔
''ہماری شادی کچھ سال پہلے ہوئی تھی اور ہم دونوں نے الیکٹرونکس کا بزنس شروع کیا تھا۔ یہ ہم دونوں کے نام پر تھا۔ شرط یہ تھی کہ اس کے اثاثے ہم دونوں میں برابر تقسیم ہوں گے اور اگر ہم میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے تو اس کا شیئر بھی دوسرے فریق کو مل جائے گا۔''
تو یہ بات تھی جس کی وجہ سے الفریڈ ٹیرل نے مجھے ہائر کیا تھا۔ اس نے مجھے پوری بات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ بس بیوی سے خطرے کا ذکر کیا تھا۔
میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں نوٹ کیا ہے کہ عام طور پر قاتل کو نفرت کے علاوہ مالی مفادات بھی میسر ہوتے ہیں جس سے ان کا کیس مضبوط ہو جاتا ہے۔
''عجیب اتفاق ہے کہ الفریڈ ٹیرل نے ابھی آدھا گھنٹا پہلے ہی فون کر کے مجھے باڈی گارڈ کی حیثیت سے منتخب کر لیا ہے۔'' میں نے کیتھی کو آگاہ کیا۔
دوسری طرف کچھ لمحوں کے لیے خاموشی ہو گئی اور پھر ایک قہقہے کی گونج میرے کانوں تک پہنچی۔
''چلو پھر تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے تمہاری فیس نہیں دینی پڑے گی کیونکہ اگر تم وہاں پہلے ہی موجود ہو گے تو وہ مجھے یا میرے بوائے فرینڈ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ ہمارے ساتھ ایک عینی شاہد ہو گا۔''
''ہاں، کہتی تو آپ ٹھیک ہیں۔'' میں نے اقرار کیا۔
''ٹھیک ہے، کل ملتے ہیں کانفرنس میں۔'' اس کی آواز میں بڑی چہک تھی۔ میں بھی سمجھ گیا کہ اسے اب مجھ سے کوئی اور بات نہیں کرنا۔
اگلے روز میں میٹنگ سے دو گھنٹے پہلے ہی مسٹر ٹیرل کے گھر پہنچ گیا۔
اس کا نہایت شاندار گھر تھا۔ منفرد انداز کا شاہانہ ولا۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی انتہائی خوب صورت لان آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا... کٹی ہوئی گھاس پھول اور ہموار قسم کی باڑ۔ درختوں کی ایک قطار دلفریب منظر دکھا رہی تھی۔
دروازے کی بیل بجائی تو کسی صاحب نے دروازہ کھولا۔ ''میں ریمنڈ مارٹن ہوں۔ پلیز الفریڈ ٹیرل صاحب کو مطلع کر دیں۔ میں ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''
''میں ہی الفریڈ ٹیرل ہوں۔'' دبلے پتلے نحیف قسم کے شخص نے بغیر مسکراہٹ کے کہا۔ ''اندر آ جائیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے دروازہ ذرا تھوڑا سا کھول دیا۔
میں شرمندہ ہو گیا کیونکہ میں اسے گھریلو ملازم سمجھا تھا۔
''آیئے، میں آپ کو پورا گھر دکھا دوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ کیا کیا، کہاں کہاں رکھا ہوا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے ایک ایک کمرا کر کے پورا گھر دکھانا شروع کر دیا۔
گھر بہت بڑا اور شاندار تھا۔ ہمیں اس کو دیکھتے ہوئے تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ گھر دکھانے کے بعد اس نے کہا۔
''آیئے، ہم برآمدے میں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔ آج دن بہت خوب صورت ہے۔ اندر بیٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' مسٹر ٹیرل نے کہا۔ ''ہم میٹنگ یہیں کر لیں گے۔''
باہر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم وہیں بیٹھ گئے۔ سامنے خوب صورت لان نظر آ رہا تھا۔
اس نے ایک لمبا سگار نکالا، اسے سلگایا اور کش لینے لگا۔
''آج سب ملازم چھٹی پر ہیں؟'' میں نے پہلا سوال کیا۔
''بہت عرصہ ہوا میں نے ملازم رکھنے بند کر دیے ہیں کیونکہ میں سوچتا ہوں کہ جو شخص اپنے ملنے والوں کے لیے اپنا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا، ملازم سے کھلواتا ہے تو اسے کسی کو بھی اپنے گھر پر ملاقات کے لیے نہیں بلانا چاہیے۔ میرے یہاں ایک عورت ہفتے میں چار بار آتی ہے۔ گھر کی صفائی ستھرائی کے ساتھ کپڑے دھو جاتی ہے۔ باہر لان وغیرہ کے لیے میں نے ایک گارڈننگ کمپنی سے معاہدہ کیا ہوا ہے۔ وہ اس کو ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک رکھتے ہیں۔ اپنا کھانا میں خود ہی بناتا ہوں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔
''اس میٹنگ کا مقصد کیا ہے؟'' میں نے ذرا آگے ہو کر پوچھا۔
''بس ادھر اُدھر کی بکواس کرنا... بونگیاں مارنا۔'' پہلی مرتبہ میں نے اس کے پتلے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی۔
''کسی خاص موضوع پر؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''مسٹر مارٹن! میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔

میری سابقہ بیوی کیتھی ہر صورت مجھ سے میرے شیئر بھی ہتھیانا چاہتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے شیئر میں سے کچھ حصہ میرے نام کر دے تاکہ میرا بیٹا کم از کم کچھ جائداد کا مالک بن سکے۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ میرے بیٹے رونلڈ نے جو میری پہلی بیوی سے ہے، اس کمپنی کے لیے بہت محنت کی ہے۔ وہ بہت نیچے سے اوپر جا رہا ہے۔ اس کو کمپنی کے اصول بھی پتا ہیں اور وہاں کے لوگ بھی اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد وہ کمپنی کی مکمل باگ ڈور سنبھالے۔ لیکن یہ سب کچھ قانونی طور پر ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ کیتھی کمپنی کی بلاشرکت غیرے مالک بن جائے گی اور شاید اسے بیچ دے اور میرے بیٹے کو کچھ بھی نہ ملے... اور میں یہ بھی نہیں چاہوں گا لیکن ہمارا کنٹریکٹ یہی کہتا ہے جبکہ میرا وصیت نامہ کچھ اور کہتا ہے۔''
''مجھے دو سوالوں کے جواب چاہئیں۔'' میں نے کہا۔ ''جب آپ کہتے ہیں کہ آپ کے پاس وقت بہت کم ہے تو کیا آپ کو کوئی ناقابلِ علاج بیماری ہے؟ دوسرا آپ کی وصیت کے مطابق جائداد کا مالک کون ہو گا؟''
''ہاں، میں بہت بیمار ہوں۔ مجھے ڈاکٹروں نے ایک ماہ سے چار ماہ تک کا وقت دیا ہے۔ میری وصیت کے مطابق رونلڈ میری باقی پوری جائداد کا مالک ہو گا لیکن کارپوریشن کے اسٹاک اسی صورت میں اسے ملیں گے جب میری سابقہ بیوی دنیا میں نہ رہے۔ یعنی اس کی وفات ہو جائے۔'' وہ بہت پُراسرار طریقے سے ہلکا سا مسکرایا۔
''میں جانتا ہوں کہ کیتھی بے انتہا تیز عورت ہے۔ وہ کسی قسم کا رسک نہیں لے گی۔ وہ آج اپنے بوائے فرینڈ کو اسی لیے ساتھ لا رہی ہے کہ میں اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکوں۔''
اس کے بعد ہم کچھ دیر اور گفتگو کرتے رہے کہ دروازے کی گھنٹی بجنے کی... آواز آئی۔ ٹیرل اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔
اور کچھ ہی دیر میں کیتھی اسٹین اپنے نوجوان سیاہ بالوں والے ہینڈسم بوائے فرینڈ کے ساتھ میرے سامنے تھی۔ اس کے دوست کا نام ڈینو تھا۔
بظاہر سب ایک دوسرے سے مسکرا کر مل رہے تھے لیکن فضا میں نفرت آمیز تناؤ کی کیفیت بخوبی محسوس کی جا سکتی تھی۔
''ایکسکیوز می، میں آپ لوگوں کے لیے کچھ پینے کے لیے لاتا ہوں۔'' اچانک ٹیرل نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا گیا۔
خاموش رہنے کے بجائے میں نے بات کرنا ضروری سمجھا اور طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بھئی انہوں نے ہم سے پوچھا تک نہیں کہ ہم کیا پینا چاہتے ہیں؟''
''خواہ وہ کروڑوں کا مالک ہو لیکن ہے بہت گھٹیا... عقل سے عاری۔ دوسروں کا احساس نہ کرنے والا۔ وہ اپنے گھر میں صرف بار بن ہی رکھتا ہے وہی سب کو پیش کرتا ہے، خواہ آپ کو پسند آئے یا نہ آئے۔'' کیتھی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا لیکن چہرے پر ایک جھوٹی دلفریب مسکراہٹ تھی۔
کیتھی اسٹین بے حد خوب صورت عورت تھی۔ کوئی شخص بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ الفریڈ ٹیرل نے اپنے سے کافی کم عمر لڑکی سے شادی کی۔ میں نوٹ کر رہا تھا کہ کیتھی میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔ جب وہ مجھ سے بات کرتی تو بہت دلفریب مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں ہوتی۔ لگتا تھا جیسے وہ ایک ایکٹریس ہو جو اپنے چہرے کے تاثرات مختلف طریقوں سے استعمال کرتی ہے اور مجھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہی ہے۔
اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں، میں لوگوں کو بہت غور سے دیکھتا تھا۔ جو بظاہر نظر آتا تھا، باطن میں مختلف ہوتا تھا۔ ایک چہرے پر کئی اور چہرے تھے۔
''آپ کے سابقہ شوہر کا خیال ہے کہ آپ کارپوریشن کو بیچ دیں گی، اگر آپ کو اس کا کنٹرول مل جائے تو؟'' میرا سوال سن کر وہ چونک سی گئی۔
''میرا خیال ہے کہ میں شاید ایسا کر ہی دوں۔ دراصل میں کوئی بزنس وومین نہیں ہوں اور پھر بزنس بھی وہ جسے ایک ایسے شخص نے شروع کیا تھا جس سے نفرت میں میری کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کی اس بزنس میں شمولیت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گی۔'' کیتھی نے طنزیہ انداز میں کہا۔
ٹیرل ایک ٹرے میں چار گلاس اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور ہم سب کے سامنے ایک ایک گلاس رکھا۔
کیتھی نے صحیح کہا تھا۔ چاروں گلاس باربن سے بھرے ہوئے تھے۔
گلاس کی جانب متوجہ ہونے کے بجائے کیتھی نے اپنا موقف بیان کرنا شروع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ پوری کارپوریشن کے کنٹرول کی حق دار ہے۔ اس کے خیال میں رونلڈ ایک بے وقوف، نااہل شخص ہے جسے شراکت میں شامل کرنا کارپوریشن کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔
''ہم ایک مالی فنڈ کا انتظام کر سکتے ہیں جس کے ذریعے اسے ہر ماہ اتنی رقم مل جائے جس سے اس کا گزارہ

ٹھیک طرح سے ہو جائے... اور یہ اسی صورت میں ہوگا اگر تمام اسٹاک میرے نام لگا دیے جائیں۔" کیتھی نے حتمی انداز میں کہا۔

سب لوگوں کی ڈرنکس یونہی میز پر رکھی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی بھی اسے چھونے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔

اسی دوران میں اندر سے فون بجنے کی آواز آئی۔ ٹیرل اٹھا اور اندر فون سننے چلا گیا۔

کیتھی نے اپنا گلاس اٹھایا اور کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ "میں تو اسے نہیں پیوں گی... کیا پتا کہ اس کم بخت نے اس میں زہر ملا دیا ہو۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جلدی سے اپنا گلاس ٹیرل کی کرسی کے سامنے والے حصے میں میز پر رکھ کر اس کا گلاس اپنے سامنے رکھ لیا۔ اس کے بعد بہت خوب صورت آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی کرسی سے ٹیک لگالی۔

ڈینو نے اپنے سامنے رکھے گلاس کو ذرا شک سے دیکھا پھر میری طرف پلٹا۔ اس کی نظروں میں اضطراب سا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"یہ لیں۔ آپ میری ڈرنک لے لیں۔ اپنی مجھے دے دیں اگر آپ کو کوئی شک ہے۔"

وہ خوش ہو کر مجھے اپنی 'باربن' دے کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ فون سن کر ٹیرل واپس آیا تو سب نے یہی ظاہر کیا جیسے کچھ نہیں ہوا۔

گفتگو دوبارہ شروع ہوئی۔ ٹیرل کی بے معنی لمبی گفتگو سے کیتھی بور ہو کر اونگھنے لگی۔ اس کے دوست ڈینو کا بھی یہی حال تھا۔

دونوں اپنے اپنے گلاس خالی کر چکے تھے اور ڈینو تو اب باقاعدہ سو رہا تھا۔ ٹیرل بھی اپنی ڈرنک پی چکا تھا۔ صرف میں ہی پیچھے رہ گیا تھا۔

'کیا یہ سورج کی گرمی ہے جس سے سب کو نیند سی آرہی ہے؟' میں سوچ رہا تھا۔ میرا دماغ کیوں ہلکا ہلکا گھوم رہا ہے۔

"تم اپنی ڈرنک کیوں نہیں ختم کر رہے؟" ٹیرل نے میرے ایک چوتھائی بھرے گلاس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ڈینو اب اپنی کرسی پر بالکل جھکا ہوا تھا۔ عجیب سی پوزیشن میں... اور کیتھی آگے کی طرف جھکتی ہوئی کرسی سے پھسل کر وہیں برآمدے کے فرش پر لڑھک گئی تھی۔

"کیتھی کے کوئی وارث نہیں ہیں۔" ٹیرل نے ایک نظر زمین پر پڑی اپنی سابقہ بیوی پر ڈالی۔

"میں نے ایک ماہر وکیل سے مشورہ کیا تھا جو ان معاملات میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ چونکہ کیتھی کا آگے پیچھے کوئی نہیں تو میرا بیٹا رونلڈ ہی تمام کارپوریشن کا مالک ہو گا۔ یہی میں چاہتا تھا اور یہی ہوگا۔" اس نے توقف کیا اور عجیب ہولناک سے لہجے میں آگے بڑھا۔

"ہم سب مر رہے ہیں۔ یہ ایک نہایت کمیاب زہر تھا جو میں نے کیمسٹ سے ہزاروں کی قیمت میں خریدا تھا۔ عام لوگ تو اس کے بارے میں کچھ جانتے تک نہیں۔"

میں نے دیکھا۔ ان کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔

"اس زہر کا اثر ایک سلیپنگ گولی کی طرح ہے جو بہت دھیمے سے انداز میں نیند لاتا ہے اور پھر انسان اسی نیند میں چل بستا ہے۔ میں نے سب کی ڈرنکس میں یہ زہر ملا دیا تھا۔ سب کے لیے نہایت آسان موت۔" اس کے لبوں پر زہریلی... پراسراری مسکراہٹ تھی۔

وہ سچ کہہ رہا تھا... دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ بہت آہستگی سے اپنی ہی کرسی پر ڈھے گیا... بالکل ساکت، بے حس۔

بظاہر نیند میں ڈوبے ہوئے مگر ایک لمبی نیند میں جا چکے تھے۔

اس نے ہم سب کی ڈرنکس میں زہر ملا دیا تھا تاکہ اسے کسی کے گلاس تبدیل کرنے کا ڈر نہ ہو۔ اس کا ارادہ ہم سب کو قتل کرنے کا تھا۔

"واہ صاحب... کیا بات ہے؟" میں نے اپنی ڈرنک بھی ختم کر لی تھی۔

جب وہ سب لوگ گرما گرم بحث میں مصروف تھے، میں نے اپنی تین چوتھائی ڈرنک وہیں قریب پڑے گملے میں انڈیل دی تھی۔ اس قدر احتیاط سے کہ کوئی دیکھ نہ پائے اور اب باقی کی چوتھائی بھی گملے میں ڈال دی۔

ٹیرل نے اپنا منصوبہ بڑی ہوشیاری سے ترتیب دیا تھا۔ سب کے لیے ایک ہی طرح کی ڈرنک اور سب کے اندر زہر۔ اس کا منصوبہ سب کے لیے تو کامیاب تھا ہی مگر اس کے اس عمل سے میری زندگی بچ گئی تھی۔

میں نے پانچ سال قبل شراب نوشی سے توبہ کر لی تھی اور باربن تو مجھے ویسے ہی زہر لگتی تھی۔ اپنے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے نہایت اطمینان اور آسودہ بھری سانس لی۔

اشارہ

بشریٰ امجد

ہر ادارے کے اپنے قوانین ہوتے ہیں... ہر جگہ نئے آنے والوں کو اپنی جگہ اور پہچان بنانے کے لیے بہت محنت... بہت تردد اور کاوش کی ضرورت پڑتی ہے... وہ نیا اور بوکھلایا ہوا کانسٹیبل تھا... جسے آگے بڑھنے کے لیے کافی محنت درکار تھی...

اس مقتول کی حاضر دماغی جو مرتے مرتے اپنے قاتل کا سراغ دے گیا

خفیہ پولیس کا سب انسپکٹر قاسم اچانک ٹھٹک گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہ ہاتھا پائی کی آوازیں تھیں۔ اس کی سماعت پوری طرح آوازوں کی طرف تھی جو اتنی واضح نہیں تھیں۔ پھر اچانک ایک چیخ بلند ہوئی۔

قاسم اچھل پڑا۔ وہ تیز رفتاری سے قریبی گلی میں گھس گیا اور ہوائی فائر کیا۔ اسے نیم تاریکی میں دو سائے نظر آئے۔ ایک سایہ سر پر چوٹ کھا کر گرتا دکھائی دیا۔ گرنے والے کے زمین بوس ہونے کی آواز بھی واضح تھی۔

قاسم، حملہ آور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے محتاط انداز میں لپکا پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔ وہ جانتا تھا کہ گلی آگے سے بند ہے اور فرار کے راستے میں وہ حائل تھا۔ ملزم کو اسی کی طرف واپس آنا تھا۔

وہ آہستگی سے اندھی گلی میں آگے بڑھنے لگا۔ اسے بھاگتے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ پھر اندھیرے میں اسے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی چرچراہٹ سنائی دی۔

''یعنی ملزم یہیں کا رہنے والا ہے۔'' اس کے ذہن نے سوال کیا۔ گلی کے دونوں اطراف چھوٹے چھوٹے مکانات کا سلسلہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک نیم پسماندہ علاقہ ہے اور دونوں جانب تقریباً ایک ایک درجن مکانات ہیں۔ کل چوبیس مکانات۔ اسے جلدی کچھ کرنا تھا کہ مفرور کو مکان میں ہی دھر لے۔

قاسم تیزی سے واپس پلٹا اور گرنے والے آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے جلد ہی مضروب کو پہچان لیا۔ افسردگی کے ساتھ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ ایک نامور اور تجربہ کار سراغ رساں تھا۔ وہ حیرت کے عالم میں تھا کہ ایک ماہر سراغ رساں، عام سے چور کے ہاتھوں لٹ چکا تھا۔ قاسم اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ سراغ رساں کی گھڑی اور بٹوا غائب ہے۔ اس سے بڑھ کر تشویش ناک بات یہ تھی کہ اس کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ قاسم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

مضروب کسمسایا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نکلا۔

''انسپکٹر۔''

قاسم گھٹنوں کے بل جھکا تھا۔ زخموں سے چور سراغ رساں کا خون آلود چہرہ قاسم کی جانب نہیں مڑا۔ غالباً اس کی حالت کافی خراب تھی۔ قاسم دنگ رہ گیا کہ اس نے کیونکر اسے انسپکٹر کہا۔

یقیناً اس نے فائر۔۔۔ کی آواز سے اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کی عادات، مہارت اور تجربہ اس حالت میں بھی کام کر رہا تھا۔ وہ مرنے یا بے ہوش ہونے سے پہلے کوئی اشارہ دینا چاہتا تھا۔

''سر! آپ نے حملہ آور کو دیکھا؟ کیا اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' قاسم نے نرمی اور احترام سے سوال کیا۔

سراغ رساں ایک لفظ ''مکان'' بول سکا۔ قاسم کو مایوسی ہوئی۔ یہاں اور دوسری گلیوں میں بھی چھوٹے چھوٹے مکانات کا دورویہ سلسلہ تھا۔ گندی گلیاں اور تاریکی تھی یا پھر سناٹا۔ قاسم پہلے ہی جانتا تھا کہ حملہ آور اسی گلی کے کسی مکان میں روپوش ہوا ہے۔

قاسم نے ٹوپی اتار کر سراغ رساں کے سر کے نیچے رکھ دی۔

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں بھاگا ہے؟'' زخمی کے سر میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ قاسم کی امید نے انگڑائی لی لیکن سراغ رساں کا دم لبوں پر تھا۔

اس نے کسی طرح دو الفاظ کہے پھر اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ غم و غصے سے قاسم کا بُرا حال تھا۔ دوسری جانب وہ بُری طرح الجھ گیا تھا۔ سراغ رساں نے مرتے مرتے کہا تھا۔

''ایک مکان۔۔۔'' قاسم نے سوچا۔ ''لیکن کون سا مکان؟''

اس نے کھڑے ہو کر موبائل فون سے ہیڈ کوارٹر اطلاع دی۔ کچھ ہی دیر میں سائرن کی آواز آنے لگی۔

اطراف میں پھیلے ہوئے پولیس اہلکار، آہستہ آہستہ اس تک پہنچ گئے۔ شہر کا یہ علاقہ ویسے ہی وارداتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس لیے تقریباً ہر گلی پر کوئی نہ کوئی ڈیوٹی پر تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال پس منظر میں چلا گیا کہ معروف سراغ رساں زاہد وہاں کس مقصد کے تحت آیا تھا۔ فوری مسئلہ حملہ آور کو پکڑنے کا تھا۔ جو یقینی قاتل تھا اور اسی گلی کے مکانات میں سے کسی ایک میں روپوش ہوا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں قاسم نے وہ وزنی پتھر دیکھ لیا جس پر خون کا دھبا تھا۔ ایک قابل سراغ رساں ایک عام سے اٹھائی گیرے کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ مرتے وقت اس نے جو اشارہ دیا، اس کو سمجھنا مشکل تھا۔ تاہم قاسم اپنی پوری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

پہلا کام اس نے یہ کیا کہ ہدایات دے کر دو دو اہلکار واردات والی گلی کے دائیں بائیں والی گلیوں میں بھیج دیے۔ نیز تھانے سے مزید فورس منگوالی۔ متوقع گلی میں اس کے ساتھ دو پولیس اہلکار تھے۔

☆☆☆

قاسم کو یقین تھا کہ سراغ رساں نے اسے فضول اشارہ نہیں دیا ہے۔

''ایک مکان۔'' وہ بڑبڑایا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا لیکن اسے یہ نہیں سمجھ آرہا تھا کہ یہ الفاظ کیوں اس کے ذہن میں گونج رہے تھے؟

وہ سراغ رساں زاہد کو زیادہ نہیں جانتا تھا تاہم اس کی شہرت سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زاہد کی یہاں موجودگی خالی از علت نہیں ہو سکتی۔ اگر قاسم نے قاتل کو پکڑ لیا تو بہت سے انکشافات سامنے آنے کا امکان تھا اور قاسم کی فوری ترقی تو سامنے نظر آرہی تھی۔ تاہم سراغ رساں سے عقیدت کے باعث اس کا دھیان اپنی ترقی کی جانب نہیں جا رہا تھا۔ وہ اس مردود قاتل کو پکڑنے کے لیے بے قرار تھا۔

پولیس فورس کے ساتھ انسپکٹر فراز تھا۔ فراز کو دیکھ کر قاسم نے تمام صورتِ حال گوش گزار کر دی۔ فراز کی پیشانی بھی شکن آلود ہو گئی۔

''ایک مکان کا کیا مطلب ہے؟'' وہ بولا۔

''کوئی تو مطلب ہے جناب۔'' قاسم کی آواز لرز رہی تھی۔ دونوں الفاظ گھنٹی کی طرح اس کے ذہن میں بج رہے تھے۔

قاسم کے متواتر سوچتے ہوئے ذہن میں بجلی سی لہرائی اور وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انسپکٹر فراز کو سلیوٹ جھاڑا۔

''کیا بات ہے؟'' انسپکٹر نے اظہارِ حیرت کیا۔ خود اس کا دماغ اشارے میں الجھا ہوا تھا۔

''میں پہنچ گیا جناب۔'' قاسم کا چہرہ چمک اٹھا۔ پولیس موبائل کی تیز بتی نے گلی روشن کر دی تھی۔

''کیا مطلب؟'' انسپکٹر فراز نے دلچسپی سے فرض شناس قاسم کو دیکھا۔ قاسم نیا اور پُرجوش اہلکار تھا۔

''جناب! اس گلی کے کسی مکان پر ''A House'' لکھا ہے۔ اے کے بعد کچھ جگہ خالی ہے یعنی پہلا لفظ جو بھی ہو وہ A سے شروع ہوتا ہے جیسے آتش، اختر، انور وغیرہ۔۔۔ لیکن اب وہاں صرف...AHouse یعنی ایک مکان لکھا رہ گیا ہے۔'' قاسم کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

فراز نے ستائشی انداز میں اس کی پیٹھ ٹھونکی اور تیزی سے ہدایات جاری کرنے لگا۔

سیکرٹ ایجنٹ

سی آئی اے میں ایک قاتل کی اسامی خالی ہوئی۔ خفیہ ای میل پر بڑی تعداد میں درخواستیں آگئیں۔ ایجنٹوں نے بہت چھان بین کے بعد صرف تین امیدواروں کا انتخاب کیا۔ دو مرد اور ایک عورت!

ان تینوں کو بلا کر ان کے بہت سے امتحان لیے گئے اور انہیں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ انہیں جذبات سے یکسر عاری ہو کر کسی روبوٹ کی طرح احکام پر عمل کرنا ہوگا۔ اس میں کیوں اور کیسے کی گنجائش نہیں ہو گی۔

آخری امتحان کے لیے انہیں اپنے اپنے شریکِ حیات کے ساتھ طلب کیا گیا جنہیں الگ کمرے میں کسی افسر کے حوالے کر دیا گیا۔

پہلے مرد امیدوار کو ممتحن ایک بند آہنی دروازے کے پاس لے گیا اور اسے بڑے بور کا ایک پستول تھماتے ہوئے بولا۔ ''کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لینا۔ وہاں ایک کرسی پر تمہاری بیوی بیٹھی ہوگی۔ تمہیں اس کو ہلاک کرنا ہے۔''

امیدوار ''یہ کس قسم کا احمقانہ مذاق ہے۔ میں اپنی بیوی کو کیسے مار سکتا ہوں؟''

''سوال جواب کی گنجائش نہیں تھی۔ تم ناموزوں ہو، جاسکتے ہو۔'' ممتحن کا لہجہ سرد اور سخت تھا۔

پھر دوسرے امیدوار کو بلا کر وہی ہدایت کی گئی۔ وہ پستول لے کر کمرے میں گیا۔ پانچ منٹ تک گہرا سکوت رہا پھر وہ میاں بیوی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، نمناک آنکھوں کے ساتھ باہر آگئے۔ مرد نے کہا۔ ''میں نے اپنا دل بہت مضبوط کیا مگر میں اپنی بیوی کو نہیں مار سکتا۔''

اب عورت کی باری تھی۔ وہ مسلح ہو کر اندر گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی فائرنگ کی ہلکی آوازیں آئیں پھر دھما چوکڑی اور چیخ و پکار کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ چند منٹ بعد اندر سناٹا چھا گیا اور وہ عورت بکھرے بالوں اور زخمی چہرے کے ساتھ باہر آئی اور غصیلے لہجے میں بولی۔ ''پستول میں تو سب گولیاں نقلی تھیں۔ میں نے کرسی مار مار کر بہت مشکل سے اسے ٹھکانے لگایا ہے۔''

لاہور سے افشین کا تعاون

میاں بیوی کی پُرسکون زندگی میں در آنے والے طوفان کا شاخسانہ

سلیم انور

غمگسار

تکلیف دہ لمحات کٹھن ہی نہیں... طوالت کا بھی احساس دلاتے ہیں... ان غمگین گھڑیوں میں بعض اوقات قریبی ساتھی وہ کردار ادا نہیں کرتے... جو اچانک ہی ایک اجنبی... چند لمحوں کی ملاقات میں اپنی رفاقت کو دیرپا ثابت کر دیتا ہے... احساسات کے جذبوں سے گندھی پُراثر کہانی...

"میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔" ٹام نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "اس کتے کو بھونکنے سے باز رکھو ورنہ میں..."

دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگایا ایلیٹ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے طیش دلانے والے انداز میں مسکرا دیا۔ "پُرسکون رہو۔"

اس نے سر کو خفیف انداز میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "یہ ایسی کوئی بات نہیں جس پر تم اتنے اَپ سیٹ ہو رہے ہو۔"

"شاید تمہارے لیے نہ ہو۔ اگر یہ میرا کتا ہوتا اور اتنا ہنگامہ برپا کرتا... پھر تم اسے مختلف انداز سے دیکھتے۔"

ایلیٹ نے شانے اچکا دیے۔ "کتے تو بھونکتے ہی ہیں۔ وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

"یہ تمہارے لیے آخری وارننگ ہے۔ اسے خاموش کروا دو ورنہ میں اسے خاموش کروا دوں گا۔"

"تم خود کو پُرسکون رکھو۔ ٹام، میں حقیقت میں کہہ رہا ہوں۔ اگر تم اسی طرح ہیجان میں مبتلا رہے تو تم پر دورہ بھی پڑ سکتا ہے۔ تم اندر کیوں نہیں آ جاتے تاکہ کافی کا ایک کپ ہو جائے؟ پھر بیٹھ کر اس بارے میں بات..."

ٹام تلملا کر رہ گیا اور اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ دھوپ اس کی گردن اور شانوں پر پڑ رہی تھی اور اس کی جلد پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے لیکن اسے صرف اس گرمی کا احساس ہو رہا تھا جو اس کے اپنے غصے کے باعث اس کے وجود میں آگ سی لگا رہی تھی۔

"مجھے جو بات کرنی تھی، کہہ دی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "بس اس کم بخت کتے کو بھونکنے سے باز رکھو۔" پھر وہ ایڑیوں پر گھوما اور گیٹ سے نکل کر احاطے سے گزرتا ہوا اپنے گھر میں چلا گیا۔

جب وہ کچن میں داخل ہوا تو اس وقت بھی طیش میں تھا۔ اس کی بیوی کیتھی ناشتے کے برتن دھو رہی تھی۔ "کیا تم نے اس سے بات کی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں... آخر میں نے کہہ دیا۔"

"اچھا تو پھر اس نے کیا کہا؟"

"وہ لعنتی مجھے کافی کے لیے مدعو کر رہا تھا۔"

کیتھی نے اپنے شانے پر سے ایک نگاہ ٹام پر ڈالی اور بولی۔ "تم نے اس کی دعوت قبول کی؟"

"میں اپنی ہی کافی پیوں گا، تھینک یو۔" اس نے کافی پاٹ سے ایک کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اس کے ساتھ کافی پی لینی چاہیے تھی۔ اگر تم اس کے ساتھ میل جول قائم کر لیتے تو شاید اس معاملے کو مل جل کر حل کر لیتے۔" کیتھی نے مشورہ دیا۔

ٹام ڈائننگ میز کی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی کافی کے کپ میں چینی ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اس سے کوئی جان پہچان پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ میں بس کچھ سکون اور خاموشی چاہتا ہوں۔"

کیتھی نے تولیے سے اپنے ہاتھ خشک کیے اور اس کے مقابل آن بیٹھی۔ "تمہارے ساتھ ہمیشہ یہی مشکل رہی ہے ٹام۔ تم ہر بات اپنے انداز میں چاہتے ہو اور تم دوسرے فرد کی بات پر غور کرنا گوارا ہی نہیں کرتے ہو۔"

ناشتے میں تیار ہونے والی گوشت اور انڈے کی تیز بو اور کیتھی کے ڈیٹرجنٹ کی ہلکی مہک مل کر کمرے میں ایک بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی لیکن ٹام کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے ایلیٹ کے کتے کو اپنی گود میں اٹھا لیا ہو اور اب اس کے کپڑوں سے کتوں کی بو آ رہی ہو۔ اس نے قدرے بیزاری سے زور زور سے سانس لینی شروع کر دی۔

"تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟" ٹام نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے بیوی کو گھور کر دیکھا۔

"میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر تمہیں لوگوں سے کوئی کام نکالنا ہو تو ان کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے۔"

ٹام نے اپنے گھورنے پر محسوس کیا کہ گو اس کی بیوی کی آواز میں کپکپاہٹ کا عنصر شامل تھا لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی نے اس کی مخالفت کی ہمت کر لی تھی جو کہ وہ شاذونادر ہی کیا کرتی تھی۔ کیتھی کی اس سرکشی کی چنگاری نے ٹام کا موڈ بگاڑ دیا۔

کیتھی نے ٹام کے بگڑتے موڈ کو بھانپ لیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "آئی ایم سوری۔"

"میں نے مینجمنٹ میں تیس سال کام کیا ہے۔ مجھے یہ مت بتاؤ کہ مجھے نہیں معلوم لوگوں کے ساتھ کس طرح ڈیل کیا جاتا ہے۔"

کیتھی نے ایک بار پھر سر اٹھاتے ہوئے ٹام کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب خوف کے تاثرات کم ہو گئے تھے۔ "یہ وہ بات نہیں ہے۔" کیتھی نے پھر جرأت کی۔ "وہ اپنے اطراف میں لوگوں کا عادی نہیں ہے۔ ہمیں

ایک اچھا پڑوسی بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' کیتھی نے کہا۔
''میں اچھا پڑوسی ہوں۔ میں اسے تنگ نہیں کر رہا۔ پرابلم وہ کھڑا کر رہا ہے۔''
''لیکن...''
''مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں ہر وقت کتے کا بھونکنا پسند ہے؟'' ٹام نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔
''وہ ہر وقت نہیں بھونکتا اور حقیقت میں یہ بات اتنی بُری بھی نہیں ہے جتنا کہ تم نے اسے بنا دیا ہے۔ مسٹر ایلیٹ تنہا رہتا ہے۔ کتا ہی اس کا اکلوتا ساتھی ہے۔ اگر تم اس سے دوستی قائم کرنے کی کوشش کرو تو شاید وہ اس معاملے میں کوئی تدبیر ڈھونڈ نکالے۔'' کیتھی نے اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔
ٹام نے میز پر زور سے ہاتھ مارا اور بلند آواز سے بولا۔ ''میں اس کا دوست نہیں بننا چاہتا۔ مجھے پروا نہیں اگر اس کے پاس سو کتے بھی ہوں بہ شرط کہ وہ ان سب کو خاموش رکھے۔''
کیتھی کے ہونٹ ایک بار پھر کپکپانے لگے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی کپکپی کو چھپانے کے لیے ایک بار پھر تولیے سے ہاتھ پونچھنا شروع کر دیے۔
ٹام نے کافی کا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اب اس معاملے میں تمہاری کوئی دخل اندازی نہیں سننا چاہتا۔ میں نے اسے وارننگ دے دی ہے۔ اب باقی معاملہ اس پر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔
''تم کہاں جا رہے ہو؟''
''گھاس تراشنے۔''

☆☆☆

گھاس کاٹنے کی مشین کے شور سے ایلیٹ کے مطالعے میں بار بار خلل پڑ رہا تھا۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے اپنی کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اس کا کتا بیکر جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اٹھ کر کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس چلا گیا اور غرانے لگا۔
''ایزی بوائے۔'' ایلیٹ نے چمکارتے ہوئے کہا۔ ''واپس اِدھر آجاؤ۔'' کتے نے بھونکنا شروع کر دیا۔
ایلیٹ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اس نے پردہ ایک جانب کھسکاتے ہوئے باہر نگاہ ڈالی۔ جھاڑیوں کی باڑھ کے اوپر سے اسے ٹام کا نیلا کمبٹ ہیٹ اِدھر سے اُدھر یکساں حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیا۔ جو اپنے لان کی گھاس کاٹنے میں مصروف تھا۔

''اگر اس نے اب اپنے لان کی گھاس مزید تراشی تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گی۔'' ایلیٹ نے اپنے آپ سے کہا۔
اس نے اپنے کتے کے شانے کو تھپتھپایا تو اس کی انگلیوں نے بیکر کے مسلز کو تنتے ہوئے محسوس کیا۔ ''کم آن بوائے، جاؤ جا کر لیٹ جاؤ۔''
بیکر نے پیار سے اپنے مالک کی طرف دیکھا اور پھر ایک حتمی للکار کے مانند بھونکنے کے بعد آہستہ سے چلتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر آگیا۔ بیٹھنے کے باوجود اس کا سر اٹھا ہوا تھا اور وہ ایلیٹ کو کمرے میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایلیٹ کا ایک ہاتھ اس کی جیب میں تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے کریو کٹ بالوں پر نروس زدہ انداز میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔
ایلیٹ نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ کاش اس نے برابر کا یہ پلاٹ خرید لیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس لیے کہ ٹام بہ طور پڑوسی تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ اب اسے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا لیکن اب اس بارے میں سوچنا فضول تھا کیونکہ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔
ایلیٹ گزشتہ بیس سال سے یہاں رہ رہا تھا۔ اس نے یہ مکان اسی وقت خرید لیا تھا جب وہ ٹیچنگ کر رہا تھا۔ قصبے کے کنارے پر واقع یہ مکان اس فارم کا ایک حصہ تھا جسے بعد میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس ایک حصے پر ایلیٹ کا مکان تھا جبکہ دوسرے خالی حصے کو ٹام نے خرید کر اپنا مکان تعمیر کروایا تھا۔
ایلیٹ کے گھر کے مقابل ایک گرجا گھر واقع تھا چونکہ یہ کوئی رہائش گاہ نہیں تھی اس لیے ایلیٹ ایک عرصے تک پڑوسیوں سے بھی محروم رہا تھا۔ شادی نہ کرنے کے باعث وہ اکیلا ہی رہتا تھا اس لیے اسے لوگوں سے میل جول پسند نہیں تھا اور وہ اپنی تنہائی کو اہمیت دیتا تھا۔
پہلے رقم کی کمی اور پھر لیت و لعل نے اسے وہ پلاٹ خریدنے کا موقع فراہم نہیں کیا چونکہ اسے مزید اراضی کی ضرورت بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اسے پہلے سے اس بات کا اندازہ ہو سکا تھا کہ پڑوسیوں کی موجودگی سے کیا مسائل جنم لے سکتے ہیں بلکہ درحقیقت جب اس نے یہ سنا کہ اس کے برابر کا پلاٹ فروخت ہو چکا ہے تو پڑوس آباد ہونا اسے اچھا محسوس ہوا تھا لیکن یہ پہلے کی بات تھی۔
ٹام نہایت نامعقول اور گنوار ثابت ہوا تھا البتہ اس کی بیوی اتنی بری نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراتی تھی اور اسے دیکھ

کر ہاتھ لہرا دیا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ تو وہ اس کے پاس کافی پینے کے لیے بھی آچکی تھی۔
مسز ٹام نے اسے بتایا تھا کہ اس کا شوہر ایک ریٹائرڈ کارپوریٹ ایگزیکٹیو تھا۔ یہ مسز ٹام کا آبائی قصبہ تھا اور وہ اسی قصبے میں مستقل رہائش اختیار کرنے کی خواہش مند تھی۔
ٹام نے ریٹائرمنٹ کے بعد کیتھی کی خواہش کے مطابق یہیں آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا جیسا کہ مسز ٹام نے اسے بتایا تھا لیکن ایلیٹ نے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ٹام نے اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ رہی تھی کہ دیگر علاقوں کی نسبت یہاں زمین کی قیمت اور روزمرہ کی اشیا زیادہ سستی تھیں۔
پڑوس آباد ہونا ایلیٹ کے لیے اتنا بُرا نہیں ہوتا اگر ٹام اس قدر پریشان کن ثابت نہ ہوتا۔ اس نے ٹام کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ ایلیٹ نے اسے بتایا تھا کہ بیکر بوڑھا ہو رہا ہے اور وہ اپنے اطراف میں دیگر لوگوں کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک جرمن شیپرڈ تھا اور نگہبانی کرنے والی نسل میں سے تھا۔ اگر وہ کسی بات کو مداخلت تصور کرتا تھا تو بھونکنا اس کی فطری عادت تھی۔ وہ بھونکنا شروع کر دیتا تھا۔
اس کے علاوہ بھونکنے کی آواز ایسی ہی تھی جیسے چڑیاں چہچہاتی ہیں یا کوّے کائیں کائیں کرتے ہیں یا درختوں اور مکانوں کے درمیان چلنے والی ہوا کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ یہ تمام فطری آوازیں ہیں۔ ہر شخص کو اس قسم کی آوازیں سننے کا عادی ہونا چاہیے۔
البتہ ان آوازوں کو فطری نہیں کہا جا سکتا تھا جیسے کہ دن کے تمام اوقات میں لان ٹریکٹر چلنے کا مسلسل شور اور کرخت آوازیں یا صبح سویرے مکان کے سامنے اور پیچھے موجود نشانی کے درختوں کو کاٹنے والی آرا مشین کی چیختی آوازیں یا ٹام کی ورکشاپ میں رات گئے تک آرا مشین کی کرخت گونجتی آوازیں۔

☆☆☆

''سنو۔'' ٹام نے جھک کر اپنی بیوی کیتھی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ ایک ایسی دلکش مسکراہٹ تھی جو کیتھی نے اس سے قبل صرف اس وقت ٹام کے ہونٹوں پر دیکھی تھی جب اسے نائب صدر کا عہدہ ملا تھا۔ ''بالآخر سکون اور خاموشی ہو گئی، کیا زبردست نہیں ہوا؟''
''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے ایسا کیا ہوگا۔'' کیتھی نے دُھلے ہوئے گیلے کپڑوں کو بالٹی میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم ایسا کیونکر کر سکتے ہو؟''
''نہایت آسانی سے۔'' ٹام نے اپنے دونوں ہاتھ تولیے سے رگڑتے ہوئے کہا۔
''کوئی اور طریقہ بھی تو ہو سکتا تھا۔'' کیتھی نے کہا۔
''کیا... میں نے تو کوشش کی تھی۔ میں نے وارننگ بھی دی تھی۔ یہاں تک کہ میں شیرف کے پاس بھی گیا۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ اس گھامڑ نے کیا کہا تھا یا نہیں بتایا تھا؟ اس نے کہا کہ اس ملک میں کتوں کا بھونکنا ہمیں برداشت کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اسے اور بہت سے ضروری کام کرنا ہیں اس لیے میری بات کو اہمیت نہیں دی۔ اس کی گستاخی تو دیکھو کیا اسے معلوم نہیں کہ اس کی تنخواہ میرے ادا کردہ ٹیکس کی رقم سے دی جاتی ہے؟ بالآخر میں نے اس معاملے کو خود ہی نمٹا دیا۔''
کیتھی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ٹام جس انداز سے اترا

نصیحت کا اثر

ایک قافلہ سرزمین یونان پر سفر کر رہا تھا کہ ایک جگہ ڈاکوؤں کے ایک زبردست گروہ نے حملہ کر کے قافلے والوں کا سارا سامان لوٹ لیا۔ قافلے والوں نے بہت منت ساجت کی، خدا اور رسول کا واسطہ دیا لیکن ڈاکوؤں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس قافلے میں لقمان حکیم بھی شامل تھے۔ مسافروں نے ان سے کہا کہ ہماری آہ و زاری کا تو ان ظالموں پر کچھ اثر نہیں ہوتا، آپ ہی انہیں سمجھائیے شاید آپ کی نصیحت کا کچھ اثر ہو جائے۔ لقمان حکیم نے جواب دیا۔ ''میں انہیں ہرگز نصیحت نہیں کروں گا، نصیحت کرنا وہاں مناسب ہوتا ہے جہاں نصیحت قبول کرنے کی صلاحیت معلوم ہو۔''

کھا لیا ہو زنگ نے لوہے کو جب پوری طرح
اس کو صیقل کر کے چمکائے یہ ممکن ہی نہیں
سنگ دل پر ہو نہیں سکتا نصیحت کا اثر
کچھ بھی کیجیے کیل گڑ سکتی ہے پتھر میں کہیں؟

ہارون رشید آف کاٹلنگ کامردان سے انتخاب

رہا تھا۔ وہ یقیناً ایک سرد مہر شخص تھا لیکن یہ تو اس نے بہت زیادتی کر دی تھی اور حد سے بڑھ گیا تھا۔ ”ٹام، یہ تو تم نے بہت ظلم کیا۔ وہ بے چارہ...“
”اے سنو، اس بات کو بھول جاؤ۔ اس نے خود ہی یہ مصیبت مول لی تھی اور ہم نے اپنی خاطر اس کی مصیبت چکا دی۔“ ٹام نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”احمق کتا، مجھے یقین نہیں آرہا، وہ مجھ سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن زہر سے بھرا کوفتہ اس نے اس طرح قبول کر لیا جیسے کہ میں اس کا بہترین دوست ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ ”اچھا، اب تم کیا کر رہی ہو؟“
”میں ان دھلے ہوئے کپڑوں کو باہر لٹکانے کے لیے جا رہی ہوں۔“
”تم یہ کیوں کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں ڈرائر اسی کام کے لیے تو لا کر دیا تھا۔“
”جب تم ان کپڑوں کو باہر ہوا میں لٹکاتے ہو تو ان میں تازگی کی مہک آجاتی ہے۔“ کیتھی نے کپڑوں سے بھری بالٹی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔
”عورت عقل سے عاری ہوتی ہے چاہے انہیں جتنی بھی سہولتیں فراہم کر دو... وہ پرانے طرز پر کام کرنے پر مصر رہتی ہیں۔“ یہ کہہ کر ٹام تہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب چل پڑا۔ اس نے اخلاقاً بھی کیتھی سے بھاری بالٹی اٹھانے میں مدد دینے کو نہیں پوچھا۔
”ٹھیک ہے جو تمہاری مرضی تم کرو۔ میں ذرا ستانے کے لیے جا رہا ہوں۔ اگر یہ کپڑے میرے لان تراشنے سے پہلے خشک نہیں ہوئے اور ان پر گھاس کے ذرات چپک گئے تو مجھے الزام مت دینا۔“
جب کیتھی نے دھلے ہوئے تمام کپڑے الگنی پر لٹکا دیے تو اس کی نگاہ احاطے کی باڑ کی درمیانی خلا سے ایلیٹ کے گھر کی جانب اٹھ گئی۔ اس نے ایلیٹ کو اپنے گھر کے عقبی دروازے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ کیتھی نے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ اپنے گھر کی جانب ڈالی۔ وہ قدرے ہچکچائی پھر آہستہ قدموں سے باڑ کی درمیانی خلا کی جانب بڑھ گئی۔
اس نے دیکھا کہ ایلیٹ گھٹنوں کے بل جھکا گلاب کی ایک جھاڑی کی چھنٹائی کر رہا تھا۔ اس کی پیٹھ کیتھی کی جانب تھی۔
”یہ بہت خوب صورت ہیں۔“ کیتھی نے کہا۔ اس کی آواز میں قدرے کپکپاہٹ تھی۔ وہ امید کر رہی تھی کہ ایلیٹ نے اس پر دھیان نہیں دیا ہوگا۔
ایلیٹ نے دھیرے دھیرے گردن گھمائی اور پھر اپنی گھاس تراش قینچی سے پھولوں کی چند کٹی ہوئی ٹہنیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرے کتے کے لیے ہیں۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
کیتھی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ ”ہاں، ہاں۔“ اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ دھوپ میں مٹی اور کھاد کی تیز بو کے ساتھ پھولوں کی تیز مہک بے حد بھلی محسوس ہو رہی تھی۔
ایلیٹ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دستانوں میں بند ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے بولا۔ ”جانتی ہو وہ مر چکا ہے۔“
وہ کیتھی کے نزدیک آیا۔ اس کا سر جھکا ہوا اور شانے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کی سرخ آنکھوں میں نمی تھی اور کیتھی نے دیکھا کہ دھوپ میں اس کے گال تمتما رہے تھے۔
”میں نے تمہیں اسے دفن کرتے ہوئے دیکھا تھا۔“ کیتھی نے جواب دیا۔
ایلیٹ احاطے کے عقبی حصے کی جانب نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”وہاں، درختوں کے نیچے، بیگر کو وہ گوشہ ہمیشہ سے ہی پسند تھا۔ وہ اپنی کھانے کی ہڈیاں وہیں چھپایا کرتا تھا۔“ اپنے پالتو کتے کی مخصوص عادت کو یاد کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔
”کیا تمہیں معلوم ہے...“
ایلیٹ نے شانے اچکا دیے۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کا دل بند ہو گیا تھا۔“
”بے چارہ۔“ کیتھی نے سوچا۔ ”اسے کچھ پتا نہیں۔“
”وہ صبح سویرے مجھے بیدار کیا کرتا تھا۔“ ایلیٹ نے کہا۔ ”جب اس نے صبح مجھے نہیں اٹھایا تو میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے اسے کچن میں پڑے ہوئے پایا۔“ یہ کہہ کر وہ جھکا اور اپنے گھٹنے پر سے گھاس کا دھبا رگڑنے لگا تاکہ کیتھی اس کی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے۔
”میرا خیال ہے کہ تم دونوں کا طویل ساتھ رہا ہے۔“ کیتھی نے کہا اسے اپنے سینے میں ایک دباؤ سا محسوس ہو رہا تھا اور اسے الفاظ ادا کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔
ایلیٹ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک دستانہ اتار دیا اور اپنی انگلی اور انگوٹھے سے کان کی لو کھجاتے ہوئے بولا۔ ”لگ بھگ چودہ سال، لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف ایک جانور ہوتے ہیں لیکن جانتی ہو کہ جب آپ کسی کتے کے ساتھ اتنے عرصے زندگی گزاریں تو اس کی جدائی بالکل یوں

محسوس ہوتی ہے جیسے اپنے بچے کی جدائی۔ گو میری کوئی اولاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اولاد کے مرنے پر بھی کیفیت اور یہی احساسات ہوتے ہوں گے۔“
کیتھی سر ہلانے لگی۔ ”ہمارے یہاں بھی کبھی اولاد نہیں ہوئی لیکن میرا خیال ہے میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“
ایلیٹ کی نگاہیں اب کیتھی پر مرکوز ہو گئیں۔ ان میں ایک ایسا درد بھرا ہوا تھا جسے دیکھنے کی کیتھی میں تاب نہیں تھی۔ اس نے دکھ سے اپنی نگاہوں کا رخ دوسری جانب پھیر لیا لیکن اسے ایلیٹ کی غم زدہ نظریں اپنے چہرے پر مرکوز محسوس ہو رہی تھیں۔
”میں تمہاری ہمدردی کا ممنون ہوں۔“ ایلیٹ کہہ رہا تھا۔ ”میرے پاس کوئی ایسا نہیں جس کے ساتھ میں اپنا غم بانٹ سکتا...“
”آئی ایم سوری۔“ کیتھی نے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”سو سوری۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے گھومی اور اپنے گھر کی جانب دوڑ پڑی۔

☆☆☆

تقریباً ایک ہفتے بعد ایک حبس زدہ شب میں کیتھی ایک عزم کے ساتھ اپنے گھر کے عقبی دروازے سے ٹیک لگائے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی جو اپنی ورکشاپ کی جانب جا رہا تھا۔ قریب میں کوئی کوئل کوکی ساتھ ہی دوسرے پرندے کی بھی چہکار گونجی۔ جھاڑیوں پر جگنو منڈلا رہے تھے اور فضا میں تراشیدہ گھاس کی بھینی مہک پھیلی ہوئی تھی۔
یہ ایک پیاری سی شب تھی اور کیتھی کو خوشی سی محسوس ہو رہی تھی کہ اسے جس متوقع صورت حال سے دوچار ہونا تھا۔ اس کی تباہ کاری کا تصور اس کی خوشی کو برباد نہیں کر سکتا تھا۔
وہ پُرعزم تھی اور اب ارادے سے باز رہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور جب اس نے ٹام کو دروازہ کھولتے اور شیڈ کے اندر قدم رکھتے ہوئے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے بدن میں دھیمی آگ کے شعلے کی طرح تمتماہٹ پھیلنے لگی۔
ایک لمحے بعد اس کے کانوں میں ایک گھٹی ہوئی چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی لائٹیں اچانک مدھم ہونے کے بعد دوبارہ روشن ہو گئیں۔ کیتھی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
تمام تر غلطی ٹام ہی کی تھی۔ اس نے ٹام کو ندامت کے لیے ڈھیر سارا موقع دیا تھا لیکن اس کے بجائے اس کے کمینے پن اور اتراہٹ میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کیتھی کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے زخموں پر نمک چھڑکتا رہا ہو۔ اس نے تو خود برسوں تک اس درد کو سہا تھا لیکن ایک معصوم بے زبان جانور پر اپنا کینہ نکالنا ایک ایسی زیادتی تھی جو نا قابلِ برداشت تھی۔
وہ آہستہ قدموں سے شیڈ کی جانب چل پڑی۔ اسے اس بات کا خوف نہیں تھا کہ اس نے کیا، کیا ہے بلکہ ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں وہ ناکام نہ ہو گئی ہو۔
ٹام فرش پر ہاتھ پیر پھیلائے پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے بالوں کے جلنے کی سی بو اٹھ رہی تھی اور اسے چھوئے بغیر کیتھی کو علم ہو گیا تھا کہ اب وہ کبھی کسی کو تکلیف اور دکھ دینے کے قابل نہیں رہا۔
کیتھی کو خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اسے ٹام کو اس حالت میں دیکھ کر کسی قسم کی ندامت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بجائے اسے اپنی اس بھٹکی ہوئی خواہش کو دبانا پڑا کہ وہ قہقہے لگائے۔
کیتھی محتاط قدموں سے ٹام کی لاش کے گرد گھوم کر شیڈ کے عقبی حصے میں پہنچی اور اس پائپ کو شٹ آف کر دیا جس سے کنکریٹ کے فرش پر پانی کی ہلکی سی بوچھار نے فرش کی سطح کو چکنا کر دیا تھا جو ٹام کو بالکل بھی دکھائی نہیں دی تھی جب وہ اپنی آرا مشین کا پلگ لگانے کے لیے گھٹنوں کے بل جھکا تھا۔
کیتھی نے اپنے پسینے سے بھیگے ہاتھوں کو اپنے ایپرن سے رگڑ کر صاف کیا اور ایک بار پھر ایک اچٹتی نگاہ ٹام کے بے جان جسم پر ڈالنے کے بعد واپس گھر کی جانب چل دی۔
روش پر چلتے ہوئے اس پیاری سی شب کی خوشگوار شب میں کیتھی نے ایک گہری سانس لی تو اس نے برسوں بعد پہلی بار یہ محسوس کیا کہ وہ بے حد پُرسکون اور بے خوف ہے۔
ٹام کی لاش دریافت کرنے اور پیرامیڈیکل اسٹاف کو طلب کرنے سے قبل ابھی اسے بہت سے کام کرنا باقی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کیک بھی بیک کرنا پڑے کیونکہ صبح جب ایلیٹ تعزیت کے لیے اس کے پاس آئے گا اور وہ دونوں اپنے پیاروں کی جدائی پر ایک دوسرے کی غم گساری کریں گے اور دلوں کا بوجھ ہلکا کریں گے تو شاید کافی کے ساتھ اسے کیک بھی اچھا لگے... یہ سب سوچتے کیتھی کے لبوں پر بے حد آسودہ اور دلفریب مسکان تھی۔

تاریک سورج

سرور اکرام

زندگی کی کوئی بھی راہ گزر کسی نہ کسی خواب کو دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے... کچھ خواب پورے ہو جاتے ہیں اور بہت جلد ساتھ چھوڑ جاتے ہیں... مگر کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں کہ جو زندگی کا روپ دھار لیتے ہیں... ایسی کہانی بن جاتے ہیں جسے ہر صورت تکمیل تک پہنچانا... تعبیر سے ہم کنار کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے... ایسے ہی کم فہم ذہنوں کا احاطہ کرتی... دل کے تاروں کو الجھا دینے والی کہانی۔ جس کے کردار آپ کے آس پاس سانس لیتے محسوس ہوں گے...

زمانۂ حاضر کے فریب پرستوں کے لیے امیدوں کے نئے در وا کرتی تیکھی تحریر

ماسٹر حمید کے کانوں میں بچوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ”علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب۔“

اس کے قدموں تلے علم کی شمع بجھی ہوئی تھی۔ وہ اسکول کھنڈر بن چکا تھا جس اسکول میں دو دن پہلے تک بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔

چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں جب اسکول لگنے کے بعد قطاروں میں کھڑے ہو کر زور زور سے پڑھا کرتے... لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری... زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری... تو اس وقت کتنا اچھا لگتا تھا۔ ہر طرف چراغ روشن ہو جاتے۔ ننھے ننھے چراغ جو یقین دلاتے تھے کہ آنے والا کل بہت روشن اور خوب صورت ہو گا۔

لیکن اب ایک عظیم الشان ملبا اس کے سامنے تھا۔

گزشتہ رات اس پرائمری اسکول کو دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ اس دھماکے کی آواز دور بہت دور بہت دور تک چلی گئی تھی۔

شاید صدیوں کا سفر کرتی ہوئی اندلس پہنچ گئی تھی جہاں کے مدرسوں میں علم و آگہی کے چراغ روشن کیے جا رہے ہیں۔ جہاں کے مسلمان سائنس دانوں نے پوری دنیا کے علم فلکیات، ریاضی، طب اور نہ جانے کون کون سے علوم سکھا دیے تھے۔

اس دھماکے کی آواز ماسٹر حمید نے بھی سنی تھی۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں بے خبر سو رہا تھا۔ دھماکے کی آواز نے اس کے حواس معطل کر دیے۔ وہ کچھ دیر تک یونہی بستر پر بے سدھ پڑا رہا، سن ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر ہوش میں آتے ہی اسے اسکول کا خیال آیا۔ اس نے باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اسی وقت اس کا بیٹا گل زمان اس کی کمر سے آ کر لپٹ گیا۔ ”ابا! کہاں جا رہے ہو؟“

”بیٹا! میں اسکول دیکھنے جا رہا ہوں۔“ ماسٹر حمید نے خود کو گل زمان سے چھڑانے کی کوشش کی۔

”نہیں ابا، تم کو نہیں جانا۔ باہر خطرہ ہے۔“ گل زمان نے کہا۔

وہ بارہ تیرہ برس کا تھا لیکن ماسٹر حمید اس کی گرفت کا احساس کر کے اس لمحے بھی مسکرا دیا۔ اس کا بیٹا اب بڑا اور طاقتور ہوتا جا رہا تھا۔

اس دوران میں اس کی بیوی بھی ان دونوں کے پاس آ گئی... ”دیکھو اماں! ابا اس وقت اسکول دیکھنے جا رہا ہے۔“ گل زمان نے بتایا۔ ”میں تو نہیں جانے دوں گا۔“

”گل ٹھیک ہی کہہ رہا ہے ماسٹر حمید۔“ اس کی بیوی اس کو ماسٹر حمید ہی کہا کرتی تھی۔ ”جو کچھ ہونا تھا، وہ تو ہو چکا ہوگا۔ وہاں اب رہا کیا ہوگا۔ تم کس کو جا کر بچاؤ گے؟ اب صبح جا کر دیکھ لینا۔ اس وقت دعا کرو کہ خدا ہمیں عقل دے، حوصلہ دے۔“

بیوی کی بات ماسٹر حمید کی سمجھ میں آ گئی.... اس نے بہت نرمی اور پیار کے ساتھ گل کو خود سے علیحدہ کیا اور نڈھال سا بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

گل جلدی سے اس کے لیے پانی کا ایک گلاس لے آیا تھا۔ پانی سے شاید اس کے سینے میں لگی ہوئی آگ ذرا سی دیر کے لیے بجھ جاتی۔ لیکن جو آگ ہر طرف لگی ہوئی تھی، اسے کون بجھاتا؟

یہ آگ صرف اس کے علاقے، شہر یا صوبے میں نہیں تھی بلکہ پورے ملک میں تھی۔ وہ بھی کبھی اپنے گھر میں اخبار بھی لے آتا تھا۔ ان میں کچھ اس طرح کی خبریں ہوا کرتیں۔

”بیلجیم میں ایک ایسی دوا ایجاد کر لی گئی ہے جو کینسر کے مریضوں کے لیے بہت مفید ہے۔ فرانس کے سائنس دانوں نے ایک نیا سیارہ دریافت کر لیا ہے۔ برازیل میں موسم گرما کا فیسٹیول منایا جا رہا ہے۔“

اور جب وہ اپنے یہاں کی خبروں کی طرف آتا تو اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ یہ خبریں کچھ اس طرح کی ہوا کرتیں۔

”لاہور میں ایک شوہر نے اپنی بیوی پر تیزاب پھینک دیا۔ فلاں پہاڑی علاقے میں لڑکیوں کے دو اسکول دھماکے سے تباہ کر دیے گئے۔ کراچی میں گیارہ آدمی ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہو گئے۔ بلوچستان کے شہر پسنی میں گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ پکڑا گیا۔ سکھر جیل سے اتنے دہشت گرد فرار ہو گئے۔“ بس اسی قسم کی خبریں ہوا کرتیں اور وہ اس وقت خود بھی زیر لب پڑھنے لگتا۔ اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے۔

اس نے وہ رات بڑی بے چینی میں گزاری تھی۔ خدا کرے، اس کا اسکول محفوظ رہا ہو۔ وہ دھماکا کہیں اور ہوا ہو۔ اس پورے علاقے میں ایک ہی تو اسکول ہے۔ اگر وہ بھی نہ رہا تو بچے کہاں جائیں گے؟

وہ صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد ناشتے کے بغیر ہی اسکول کی طرف روانہ ہو گیا جو اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اسکول کے پاس پہنچ کر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔

اسکول تباہ ہو چکا تھا... مکمل تباہ۔ اب اس اسکول میں صبح بچوں کی اسمبلی نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی لب پہ آتی ہے دعا کی آوازیں سنائی دیتیں۔

ایک ہی رات میں بچوں کا علم سے رشتہ ختم کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے اپنی کاپی میں ایک کہانی لکھی۔

کہانی کچھ یوں تھی کہ ایک بوڑھا بہت سی کتابیں اٹھائے بازار سے گزر رہا تھا۔ اس کا لباس بہت شکستہ تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں لیکن اس کی آنکھوں میں چمک تھی... علم کی چمک۔

بازار سے گزرنے والوں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور اس کے احترام میں اِدھر اُدھر ہو کر اس کو راستہ دے دیا۔ اسی وقت اس بازار سے ایک دولت مند آدمی بھی گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو ملازم چل رہے تھے۔ اس کا لباس بہت بھڑکیلا اور قیمتی تھا لیکن لوگ اس کو دیکھ کر اس کے آگے احترام سے سر جھکانے کے بجائے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

پھبتی کس رہے تھے۔ "ارے واہ، دیکھو تو سہی۔ کیا زبردست لباس پہنا ہوا ہے۔"

"اوہو، بڑے میاں نے تو سونے کے بٹن لگا رکھے ہیں۔"

سرمایہ دار فخریہ طور پر سب کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔ پھر اس کی نگاہ اس بوڑھے پر گئی جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے جا رہا تھا۔ اس نے اس بدحال بوڑھے پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالی اور اچانک یہ دیکھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں کہ لوگ اس بوڑھے کا احترام کر رہے تھے۔ اسے سلام کر کے ایک طرف ہٹ جاتے تھے۔

"کون ہے یہ بوڑھا؟" سرمایہ دار نے اپنے ساتھ چلنے والے ملازم سے پوچھا۔

"سرکار! یہ شخص بچوں کو تعلیم دیتا ہے۔" ملازم نے بتایا۔

"دیکھو تو اس کی حالت کتنی خراب ہو رہی ہے۔ اس کے پاس ڈھنگ کا لباس بھی نہیں ہے۔ اس کے جوتے بھی بوسیدہ ہو رہے ہیں۔"

"جی سرکار! اس بے چارے کا ایسا ہی حال ہے۔"

"تو پھر لوگ کیا پاگل ہو گئے ہیں؟ کیوں اس کا احترام کر رہے ہیں؟"

"سرکار! لوگ اس کا نہیں، اس کے علم کا احترام کر رہے ہیں۔" ملازم نے بتایا۔

یہ تو ایک کہانی تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس نے اپنی کاپی میں اس قسم کی کئی کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔ اس لڑکی نے اپنی کہانیوں کے لیے خود اپنا نام رکھا تھا، گلاب۔ وہ اپنا اصلی نام زرین کے بجائے گلاب لکھا کرتی تھی۔ گلاب جو سب سے زیادہ خوب صورت ہوتا ہے... جس کی خوشبو سب سے اچھی ہوتی ہے۔

وہ دیکھنے میں بھی گلاب ہی تھی۔ گلابی رنگ، خوب صورت آنکھیں اور دمکتا ہوا چہرہ۔ اس کی آنکھوں میں ایک تلاش کی کیفیت ہوا کرتی... بہتر سے بہتر معلوم کرنے کی تلاش۔ اور بہت کچھ جان لینے کی اور علم حاصل کرنے کی تلاش۔ اس کے پاس بہت سی کتابیں تھیں۔ اس کا باپ جب اپنے کسی کام سے شہر کی طرف جاتا تو زرین اس سے صرف ایک فرمائش کیا کرتی۔ "بابا! یاد ہے نا میرے لیے کتابیں لے کر آنی ہیں۔"

"تیرے پاس اتنی کتابیں تو ہیں۔"

"وہ سب تو میں پڑھ چکی ہوں۔" وہ بتاتی۔

"تو لا سب کو ایک جگہ باندھ دے... میں شہر جا کر ان کے بدلے دوسری کتابیں لے آؤں گا۔"

"نہیں بابا! کتاب بھی پرانی نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ زندہ اور تازہ رہتی ہے۔ یہ کسی کو دینے کے لیے بھی نہیں ہوتی۔ آپ کسی کو اپنی سانسیں تو نہیں دے سکتے نا۔ تو یہ سانسیں میرے لیے میری کتابیں ہیں۔ ان کو میرے پاس ہی رہنے دو۔ تم شہر سے اور کتابیں لے آؤ۔"

اس کا باپ پیار سے اس کا گال تھپتھپا کر رہ جاتا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے تو آگے جا کر خود بھی کتابیں لکھنے لگے گی۔"

"ہو سکتا ہے بابا۔" وہ مسکرا کر کہتی۔ "دعا کرو کہ میں کتابوں کی خدمت کر سکوں۔"

زرین کے خاندان کا ایک بزرگ ہوا کرتا تھا۔ زرین کو نہیں معلوم تھا کہ اس خاندان سے اس بزرگ کا اصل رشتہ کیا ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟

سب اسے رحمان بابا کہا کرتے۔ وہ ایک سال میں کچھ دنوں کے لیے ان کے گھر آ جاتا۔ اس وقت زرین کا باپ یوسف اس کی بہت خاطر تواضع کیا کرتا، اس کی بہت خدمت کرتا۔ اس سے درخواست کرتا کہ وہ اس عمر میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے انہی کے پاس رہنا شروع کر دے۔

لیکن رحمان بابا ایک سیلانی قسم کا آدمی تھا۔ اس کے لیے کسی ایک جگہ رہ جانا بہت مشکل تھا۔ وہ ہفتہ دس دنوں میں اجازت لے کر کہیں اور چلا جاتا۔

لیکن وہ جتنے دنوں بھی رہتا، زرین اس سے لگی رہتی۔ وہ زرین کو بہت سی باتیں بتایا کرتا۔ وہ ستاروں کے بارے میں جانتا تھا۔ اسے چاند اور سورج کی گردشوں کا علم تھا۔

اس کی باتیں بہت معلوماتی ہوا کرتیں۔

ایک دن زرین نے اس سے پوچھا۔ "بابا! تم یہ باتیں جو بتاتے ہو تو کیا ہمارے لیے بھی جاننا ضروری ہے؟"

"ہاں، بہت ضروری... کیونکہ ہمارا دین یہ کہتا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے فرض ہے۔"

"لیکن بابا! ہماری بستیوں کی تو بہت سی لڑکیاں اسکول نہیں جاتیں۔"

"یہ دیکھنا ان کے ماں باپ کا کام ہے۔ یہ ان کی ذمے داری ہے۔" بابا رحمان کہتا۔

بابا رحمان کبھی کبھی زرین کو گھر سے باہر رات کے وقت کھلے آسمان کے نیچے لے آتا۔ اس بستی کا آسمان بہت صاف اور شفاف ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ وہاں کی آب و ہوا میں کارخانوں کی چمنیوں کا دھواں شامل نہیں ہوا تھا۔ رات کے وقت ستارے اس طرح جگمگا رہے ہوتے جیسے آسمان کی وسیع چادر میں نگینے جڑ دیے گئے ہوں۔

بابا رحمان اس وقت زرین کو ستاروں کی پہچان کرواتا۔ "وہ دیکھو، وہ ثریا ہے۔ اور وہ... وہ جو سنہری رنگ کا دکھائی دے رہا ہے اور تم اپنے سامنے شمال اور جنوب کی طرف کھڑی ہو جاؤ اور تمہارے چہرے کے سامنے جو ستارہ دکھائی دے رہا ہے، اسے قطب ستارہ کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بحری سفر کرنے والے انہی ستاروں کی راہنمائی میں آگے بڑھا کرتے تھے۔"

"بابا! آپ کو یہ سب باتیں کس نے سکھائی ہیں؟" زرین حیران ہو کر پوچھتی۔

"کتابوں نے۔" رحمان بابا جواب دیتا۔ "کتابیں استاد بھی ہیں اور ساتھی بھی۔ کتابیں راستہ بھی ہیں اور منزل بھی۔"

زرین نے رحمان بابا کی یہ باتیں اپنے دل میں اتار لی تھیں۔ اسی لیے اب اس کی زندگی کا محور صرف کتابیں تھیں۔ اس کے باپ نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے قریبی اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا۔

یہ وہی اسکول تھا جہاں ماسٹر حمید پڑھایا کرتا اور اس کا بیٹا گل زمان بھی پڑھا کرتا۔

زرین کے ماں باپ کو یہ دیکھ کر فخر کا احساس ہوا کرتا کہ ان کی بیٹی تعلیمی میدان میں بہت آگے جا رہی ہے۔ کتابوں سے اس کے شوق نے اسے ایسی ہزاروں باتیں بتا دی تھیں جن کو وہ اس عمر میں بھی نہیں جانتے تھے۔

وہ کہا کرتی۔ "بابا! ارشادِ ربانی ہے کہ جو زمین آسمان میں ہے، ہم انسانوں کو ان کی محنتوں کے نتیجے میں بطور اجر دیتے ہیں۔ لیکن جو انسان محنت نہیں کرتے (یعنی کائنات سے حقیقتیں تلاش کرنے کی جستجو نہیں کرتے) ان کو ان نعمتوں سے (بطور سزا) محروم کر دیتے ہیں۔" (مفہوم۔ 31-53)

وہ سمجھاتی کہ علم انسان کے لیے کتنا ضروری ہے اور خاص طور پر کائنات کا علم جس کے لیے خدا نے بار بار تاکید کی ہے۔ اتنی سی عمر میں ایسی باتیں سب کو حیران کر دیا کرتیں۔

لیکن ایک دور کے رشتے دار نواز خان کو زرین کی... باتیں پسند نہیں آتی تھیں۔ وہ اکثر زرین کے باپ یوسف سے کہا کرتا۔ "بھائی عاصم! تم اپنی بیٹی کو کیوں خراب کر رہے ہو؟"

"کیوں بھائی، اس میں کیا خرابی ہو گئی ہے؟"

"وہ اسکول جاتی ہے۔"

"تو اسکول جانے میں کون سی برائی ہے؟ وہ علم حاصل کر رہی ہے۔"

"کون سا علم؟ سائنس، انگلش اور پتا نہیں کیا کیا۔"

"بھائی نواز! اس نے قرآن شریف بھی پڑھ رکھا ہے اور شاید ہم دونوں سے زیادہ قرآن کا مطلب سمجھتی ہے۔"

نواز ایسی باتیں سن کر تلملا کر رہ جاتا۔

اس کی ایک چھوٹی بہن تھی۔ بارہ تیرہ برس کی۔ اس نے جب ایک بار تعلیم حاصل کرنے کو کہا تو نواز خان نے اتنی بری طرح اس پر تشدد کیا کہ وہ کئی دنوں تک چارپائی پر پڑی رہی۔

لیکن زرین پر اس کا بس نہیں چلتا تھا۔

وہ کسی اور کی بیٹی تھی۔ کسی اور گھر میں رہتی تھی۔ اگر خود اس کے گھر میں ہوتی تو وہ اسے ایسا سبق سکھاتا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتی۔

اس نے ایک بار زرین سے بھی بات کی۔ "بیٹا زرین! تو اسکول جانا چھوڑ دے۔"

"کیوں چاچا؟"

"سب بیکار کی باتیں ہیں۔" نواز نے کہا۔ "لڑکیوں کے لیے گھر میں رہنا بہتر ہے۔"

"یہ تو شاید تم ٹھیک کہتے ہو چاچا! ٹھہرو میں تمہیں ایک چیز دکھاتی ہوں۔" اس نے اپنے بیگ سے ایک پرچہ نکال کر نواز کی طرف بڑھا دیا۔ "دیکھنا چاچا! یہ پرچہ گل

مجھے دروازے پر ملا ہے۔ دیکھنا، اس میں کیا لکھا ہے؟"

نواز نے وہ پرچہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ نواز خان کو اردو بھی بس واجبی سی آتی تھی۔ انگریزی تو بہت دور کی بات تھی۔

"بتاؤ نا چاچا! اس میں کیا لکھا ہے؟" زرین نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔ یہ انگریزی میں ہے۔"

"بس چاچا! دیکھ لیا نا، یہی فرق ہے مجھ میں اور تم میں۔ میں یہ پڑھ سکتی ہوں۔ اس میں کہانیوں کی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ اب سمجھ لیا نا کہ میں اسکول کیوں جایا کرتی ہوں؟"

نواز خان ..... خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

اسی رات کو جب زرین نے یہ واقعہ اپنے باپ عاصم کو بتایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ "نہیں بیٹا! تو نے نواز کو غصہ دلا کر اچھا نہیں کیا۔ وہ آج کل نہ جانے کن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے۔ کہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

"بابا! اب تو کسی نقصان کا خوف مجھے کتابوں سے دور نہیں کر سکتا۔" زرین نے جواب دیا۔

☆☆☆

وہ ایک این جی او تھی۔

اس این جی او میں سات ارکان تھے۔ ان میں سے جمیل اور لبنیٰ بھی تھے۔ یہ دونوں منگیتر تھے اور چار چھ مہینوں کے بعد دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔

دونوں کا تعلق اسی این جی او سے تھا۔

انہیں یہ بتایا گیا کہ ایک ٹیم پہاڑی علاقوں میں تعلیم کے امکانات کا جائزہ لینے جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہاں کے بچوں کو کسی حد تک کچھ لکھنا پڑھنا بھی سکھانا تھا۔

لبنیٰ پرائمری اسکول ٹیچر بھی تھی۔ اس لیے اس نے فوراً اس ٹیم میں شمولیت کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ جمیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں لبنیٰ! تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ وہ علاقے زندگی کے لیے بہت سخت ہیں۔ تم وہاں کی پریشانیاں برداشت نہیں کر سکو گی۔"

"زیادہ فالتو بات نہیں۔" لبنیٰ نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم وہاں کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے چلے جاؤ اور میں اکیلی یہاں رہ جاؤں۔"

"اکیلی کہاں... این جی او کے دوسرے لوگ بھی تو یہیں رہیں گے نا۔"

"میں نہیں جانتی۔ میں بھی چلوں گی اور دوسری بات یہ ہے کہ بچوں کو پڑھانے کا تجربہ صرف میرے پاس ہے۔ تم لوگ وہاں جا کر کیا کرو گے؟"

اس کی یہ بات بھی معقول تھی۔ اس لیے اس ٹیم میں لبنیٰ کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ لبنیٰ کے علاوہ ایک اور لڑکی تھی، راشدہ۔ راشدہ کسی اسپتال میں نرس رہ چکی تھی۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے علاوہ عام امراض کی دوائیں بھی دے دیا کرتی تھی۔

ان لوگوں نے ان علاقوں میں زمان خان کی مدد سے کام شروع کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

زمان خان انہی علاقوں کا رہنے والا ایک ایسا مہذب اور روشن خیال انسان تھا جس نے کئی سال اس این جی او کے ساتھ بحیثیت ڈرائیور کے گزارے تھے۔ پھر اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے اپنے علاقے میں واپس آ گیا تھا۔

اپنے علاقے کی طرف زمان خان ہی نے فون کے ذریعے توجہ دلائی تھی۔ "صاحب! تم لوگ ادھر آ کر کام کرو۔ ہمارے یہاں کے بچے تعلیم سے بہت دور ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ تم لوگ ان کو تھوڑا سا بھی پڑھنا سکھا دو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔"

ایک طویل میٹنگ کے بعد آخر کار اس علاقے میں جا کر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔

زمان خان نے بتایا کہ اس نے ان لوگوں کے ٹھہرنے کا بندوبست ایک اسکول کی عمارت میں کر رکھا ہے۔ اس نے بتایا کہ چار پانچ کمروں کی یہ معمولی سی عمارت کچھ بچوں کی تعلیم کے کام آتی تھی لیکن اب بچوں نے اس طرف آنا چھوڑ دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کی وجہ سے یہ اسکول پھر سے آباد ہو جائے۔

یہ قافلہ دو جیپوں پر یہاں پہنچا تھا۔

زمان خان ایک مقام پر ان کے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھا۔ وہ سب بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔ سب بہت خوش تھے۔ انہیں یہاں کے دور تک پھیلے ہوئے پہاڑ اور صاف ستھری ہوا بہت پسند آئی تھی۔

لیکن خود زمان خان بہت پریشان سا دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا ہوا زمان خان؟" ٹیم کے لیڈر اشرف علوی نے پوچھا۔ "تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟"

"صاحب! ایسا لگتا ہے کہ میں نے آپ لوگوں کو

یہاں بُلا کر اچھا نہیں کیا۔" زمان خان نے کہا۔
"وہ کیوں؟"
"یہاں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں صاحب! یہاں ایک ہفتے میں کئی اسکول اڑا دیے گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "کچھ ایسے لوگ ہیں جنہیں بچوں کو تعلیم دینا پسند نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں زمان۔" اشرف نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "ہم کو ایسے حالات کا اندازہ تھا۔ اس کے باوجود ہم یہاں خلوصِ دل سے آئے ہیں۔ ہمارے ارادے نیک ہیں اور خدا ہمارا ساتھ دے گا۔"
"دیکھو صاحب! ہمیں اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں تمہارے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ تم لوگ ہمارا مہمان ہے۔ ہم تو یہ برداشت نہیں کر سکے گا۔"
"اول تو امید ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔" اشرف نے کہا۔ "اگر کچھ ہوا بھی تو ہم تم پر کوئی الزام نہیں لگائیں گے۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمارے مقدر میں ہی ایسا تھا۔"

اس وضاحت کے بعد زمان خان کے چہرے سے پریشانی کے بادل چھٹ گئے۔ "تو پھر چلو بسم اللہ۔ تم لوگوں کا کیمپ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"
دونوں جیپیں پھر چل پڑیں۔ اس بار زمان خان بھی ان کے ساتھ تھا۔
پہاڑی راستوں پر ایک دشوار سفر کے بعد دونوں جیپیں اس عمارت تک پہنچ گئیں جو کسی زمانے میں اسکول کا کردار ادا کر چکا تھا۔
لیکن اب وہاں نہ اسکول تھا، نہ طالب علم تھے اور نہ ہی وہ عمارت تھی۔ اس عمارت کو راتوں رات دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ صرف ملبا رہ گیا تھا۔ یہ سب اس ملبے کے پاس حیران اور پریشان کھڑے رہ گئے۔

☆☆☆

ماسٹر حمید بہت فاصلہ طے کر کے پولیس اسٹیشن آیا تھا۔
وہ اس وقت انچارج نوروز خان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس دن دھوپ بہت تیز تھی۔ ماسٹر حمید چونکہ پیدل ہی چلتا ہوا آیا تھا اس لیے اس مشقت نے اس کو نڈھال کر دیا تھا۔
نوروز خان، ماسٹر حمید کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ماسٹر حمید کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جب اس نے دیکھا کہ ماسٹر نے اپنی سانسیں بحال کر لی ہیں تو اس نے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے حمید صاحب! تم کیوں اتنی دور سے... گرمی میں چلتے ہوئے آ گئے ہو؟"
"میں تمہارے پاس ایک شکایت لے کر آیا ہوں۔"
"کیسی شکایت۔ بتاؤ، کسی نے تمہارے ساتھ کچھ کیا ہے؟"
"کچھ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ میں بچوں میں علم پھیلاؤں۔" ماسٹر حمید نے بتایا۔ "تمہیں تو معلوم ہے کہ ہمارے علاقے میں ایک چھوٹا سا اسکول ہے جہاں ہماری بستی کے علاوہ اِدھر اُدھر کی بستیوں کے بچے اور بچیاں بھی تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔"
"ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔"
"اب اس اسکول کو تباہ کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دھمکیاں مل رہی ہیں۔"
"تو پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"
"میں یہ چاہتا ہوں کہ تم پولیس والے ہو۔ تم قانون کی قوت سے کام لے کر ان لوگوں کو روک سکتے ہو۔"
"تم بہت ہی بھولے ہو ماسٹر حمید۔" نوروز خان نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ وہ لوگ کتنے طاقتور ہیں۔ ان لوگوں نے کتنے اسکول اڑا دیے ہیں۔ فوج بھی ان کے سامنے بے بس ہے۔ ہم بے چارے پولیس والے کیا کر سکتے ہیں۔"
"تمہارا مطلب ہے کہ میں خاموش ہو جاؤں؟"
"ہاں، تمہارے لیے یہی بہتر ہو گا۔"
"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا نوروز خان۔ میں نے جب تعلیم حاصل کی تھی تو اس وقت اپنے خدا اور رسول سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں اس علم کی روشنی کو دوسروں تک لے جاؤں گا۔ جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ آئندہ نسل کو دے جاؤں گا۔ یہ میرا مشن ہے نوروز خان۔ میرا عہد ہے، میرا فیصلہ ہے۔"
"اوہو، بہت جوش میں ہو۔ فرض کرو اگر اسکول نہیں رہا تو پھر کیا کرو گے؟"
"اس کے باوجود اپنا کام جاری رکھوں گا۔ بستی میں میرا اپنا ایک مکان خالی پڑا ہوا ہے۔ باپ دادا کی یادگار ہے وہ۔ بہت بڑا مکان ہے۔ میں اس مکان کو اسکول بناؤں گا۔ وہ بھی نہیں رہا تو کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر تعلیم دوں گا۔"
"بہت ہی خطرناک ارادے ہیں تمہارے۔"

"خطرناک نہیں، نیک اور سچے ارادے ہیں۔" ماسٹر حمید نے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔ میں نے اپنی بات تم تک پہنچا دی ہے۔ اب دیکھتا ہوں کہ تم کیا کرتے ہو۔"
ماسٹر حمید کے جانے کے بعد نوروز خان نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے تھانے والوں کو اپنی منزل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔
ماسٹر حمید بہت بددل ہو کر واپس آیا تھا۔ اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی بستی میں تاریکی پھیلنے والی ہے۔ کم علمی اور جہالت کی تاریکی۔
وہ اکیلا کتنی دیر تک اپنے چراغ کو ہواؤں سے بچائے رکھ سکتا تھا۔
بستی میں داخل ہوتے ہی اسے زرین دکھائی دے گئی۔ آٹھ نو برس کی ایک پیاری سی بچی جو اس کے اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔ ماسٹر حمید کو اس کی آنکھوں میں چراغ سے جلتے دکھائی دیتے تھے۔
وہ بہت ذہین تھی۔ ماسٹر حمید کبھی کبھی یہ سوچا کرتا کہ شاید زرین اس سے بھی زیادہ جانتی ہے۔ اس کی اردو بہت اچھی تھی۔ اس کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔
وہ جب انگریزی میں کوئی مضمون لکھ کر ماسٹر حمید کو دکھاتی تو وہ دنگ رہ جاتا۔ ان بے رحم اور سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان کیسا نور پھیلا ہوا تھا۔
ماسٹر حمید بہت شکستہ سا واپس آیا تھا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ زرین نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اپنی کسی دوست کے گھر سے اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ "کیا ہوا سر! خیریت تو ہے؟ آپ بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں؟"
ماسٹر حمید نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے زرین سے کہا۔ "بیٹا! تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"
"یس سر! چلیں۔"
ماسٹر حمید اسے اپنے گھر لے آیا جہاں سب سے پہلے ماسٹر حمید کی بیوی نے زرین کا استقبال کیا۔ "بیٹا! تم ہمارے یہاں آتی کیوں نہیں ہو؟" اس نے پیار سے پوچھا۔
"کیا بتاؤں خالہ، پڑھائی سے فرصت نہیں ملتی۔"
ماسٹر حمید ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھ جاؤ بیٹی، تم سے کچھ باتیں کر لوں۔"
زرین اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ ماسٹر حمید کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے کبھی اتنا ٹوٹا ہوا اور پریشان دکھائی نہیں دیا تھا۔
"بیٹا! تم جب تک باتیں کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتی ہوں۔" ماسٹر حمید کی بیوی نے کہا۔
"نہیں خالہ، رہنے دیں۔"
"یہ ہماری روایت نہیں ہے بیٹا، کچھ تو لینا ہی ہو گا۔"
"خالہ، گل زمان کہاں ہے؟" زرین نے پوچھا۔
"کچھ دیر پہلے تو یہیں تھا۔ اپنے دوستوں کے پاس گیا ہو گا۔"
"دیکھو بیٹا۔" اپنی بیوی کے جانے کے بعد ماسٹر حمید نے زرین کو مخاطب کیا۔ "ہمارے اسکول کو بھی تباہ کرنے کی بات ہو رہی ہے۔"
"او خدا!" زرین پریشان ہو گئی۔ "سر! یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔"
"یہ بہت اچھے لوگ ہیں بیٹا۔" ماسٹر حمید نے کہا۔ "اپنے مقصد میں نیک اور بے انتہا مخلص۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان تک صحیح پیغام نہیں پہنچا۔ ان پر ابھی اپنا مقصد ہی واضح نہیں ہے۔ اسی لیے وہ جو بھی کر رہے ہیں، اپنے طور پر پورے خلوص اور نیک نیتی سے کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں کھوٹ نہیں ہے۔ لیکن وہ غلط راہوں کے مسافر ہیں۔"
"تو پھر اب کیا ہو گا سر؟"
"اس لیے تو تم سے بات کر رہا ہوں۔" ماسٹر حمید نے کہا۔ "فرض کرو، اگر اسکول نہیں رہتا یا میرے ساتھ کچھ ہو جاتا ہے تو تم اس بستی میں علم کے سفر کو جاری رکھو گی۔"
"کیوں نہیں سر! لیکن میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟" زرین پریشان ہو گئی۔
"میں نہیں جانتا کہ تم کیا کر سکو گی لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم نے زندگی میں تعلیم کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تعلیم کتنی ضروری ہے۔ تمہاری پیشانی بتا رہی ہے کہ تم اس سفر میں بہت آگے، بہت آگے جاؤ گی۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر تمہیں ایسا سفر کرنا ہی پڑ جائے تو تم اکیلی نہیں جاؤ گی بلکہ اپنے ساتھ بستی کے دوسرے بچوں کو بھی لے جاؤ گی۔"
زرین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کچھ اندازہ نہ ہونے کے باوجود اس نے وعدہ کر لیا کہ اس سے جو کچھ ہو سکے گا، وہ ضرور کرے گی۔
اور اسی رات ماسٹر حمید کے خدشے درست ہو گئے۔

اس کے اسکول کو اڑا دیا گیا تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ملبے کا ڈھیر تھا اور وہ اس کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ آخر کب تک... کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا؟ کب تک نگاہوں کے سامنے اندھیرا رہے گا؟ کب روشنی پوری طرح اس کی بستی میں آئے گی؟

☆☆☆

اس نے اس رات اپنی کاپی میں پھر ایک کہانی لکھی۔

اس کہانی میں اس نے ایک لڑکی کو دکھایا تھا جس کے ہاتھ میں ایک شمع تھی اور ایک ایسی مخلوق تھی جنہیں روشنی پسند نہیں تھی۔

انہوں نے اس لڑکی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور شور کرنے لگے۔ ”کیا کر رہی ہے؟ پھینک دے یہ شمع... پھینک دے۔“

”نہیں، میں یہ شمع نہیں پھینکوں گی۔“ لڑکی نے مضبوط لہجے میں بتایا۔ ”شمع پھینک دی تو اندھیرا ہو جائے گا۔“

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”روشنی ہمیں پسند نہیں ہے۔ ہماری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ ہم بیمار ہو جاتے ہیں۔“

”خدا جانے تم کیسے لوگ ہو۔“

”ہم سے بحث مت کر... پھینک دے یہ شمع۔ ورنہ ہم تجھے کھا جائیں گے۔ تیرا خون چوس لیں گے۔“

وہ آہستہ آہستہ اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگے۔ لڑکی تیز اور پھرتیلی تھی۔ اسے آنے والوں کے درمیان سے ایک راستہ مل گیا۔ وہ ہوا کی سی تیزی کے ساتھ ان کے درمیان سے نکل گئی۔

وہ چیختے چلاتے شور کرتے اس کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ شمع کو اپنے سینے سے لگائے دشوار راستوں پر دوڑتی چلی جارہی تھی۔ وہ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اس لڑکی کو اپنی جان سے زیادہ شمع کی حفاظت کرنی تھی۔ وہ ایک نازک سی لڑکی تھی۔ اس کے باوجود اس کے حوصلے بلند تھے۔ شاید سنگلاخ پہاڑوں سے بھی زیادہ۔

وہ چیخ چیخ کر اسے لالچ دے رہے تھے کہ اگر اس نے شمع پھینک دی تو پھر اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اسے جانے دیا جائے گا۔ لیکن وہ ان کی آوازوں پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔

لیکن کب تک؟ وہ کب تک ان پتھروں کے درمیان دوڑ سکتی تھی؟ اس کے دونوں تلوے زخمی ہو گئے۔ ان سے خون رسنے لگا تھا۔

بالآخر اس نے ایک جگہ ٹھوکر کھائی اور لڑھکتی چلی گئی۔ وہ شمع اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک ایسی جگہ جا گری تھی جہاں تک نہ وہ خود پہنچ سکتی تھی اور نہ وہ مخلوق۔

اس نے دیکھا کہ اس کے باوجود بھی وہ شمع روشن رہی تھی۔ وہ گل نہیں ہو سکی تھی۔ وہ مخلوق ایک جگہ کھڑی ہو کر سینہ کوبی کرنے لگی کیونکہ شمع روشن تھی۔

اس کی لکھی ہوئی کہانیوں میں اس ایک نئی کہانی کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

جب اسے یہ پتا چلا کہ اس کے اسکول کو تباہ کر دیا گیا ہے تو اسی وقت سے اس کے ارادے اور مضبوط ہو گئے تھے۔ اس نے ماسٹر حمید کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، وہ اسے ہر حال میں پورا کرنا چاہتی تھی۔

اس نے اپنے باپ عاصم سے کہا۔ ”ابا! دیکھا، آخر وہی ہوا نا جس کا خطرہ تھا۔ اب بستی کے بچے کہاں جایا کریں گے پڑھنے کے لیے؟“

”ہاں، یہ بہت دکھ کی بات ہے بیٹا۔ لیکن تم اپنی تعلیم جاری رکھو۔ تمہارے پاس کتابیں تو ہیں نا۔ وہ تمہارا ساتھ دیں گی۔ اور علم کے لیے ڈگری یا سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ علم بذاتِ خود ڈگری ہے۔“

زرین کو اپنے باپ پر اسی لیے فخر تھا۔ اس کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ آنکھیں کھول دینے والی۔

”ابا! یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے پاس کتابیں ہیں۔ میں اپنی پڑھائی کرتی رہتی ہوں لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا کہ خود تو روشنی میں رہوں اور میری بستی کے بچے اندھیروں میں رہیں۔“

”تو پھر کیا چاہتی ہو؟“

”میں اپنے گھر میں ان بچوں کو بلا کر پڑھانا چاہتی ہوں۔“ زرین نے کہا۔

عاصم سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک روشنی سی تھی۔

”ٹھیک ہے بابا کی جان... حالانکہ اس میں بہت خطرے ہیں۔ پھر بھی تمہارا بابا نیکی کے اس کام میں تمہارا ساتھ دے گا۔“

”او بابا، آئی لو یو۔“ زرین اس سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

وہ ایک دم سے ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس وقت جمیل اور لبنیٰ دونوں اپنے کیمپ میں اکیلے تھے۔ اسکول کی تباہی کے بعد یہ ایک عارضی کیمپ بنا دیا گیا تھا۔ مٹی اور پتھروں کے دو کمرے۔

نوروز خان پوری طرح ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ ہر انجام سے بے خبر، بے پروا۔ ٹیم کے دوسرے افراد ارد گرد کی بستیوں میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے گئے ہوئے تھے کہ وہ اپنے اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے ان کے کیمپ میں بھیج دیا کریں۔ جمیل اور لبنیٰ دوسرے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے وہیں رک گئے تھے کہ وہ ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

دونوں ایک اجنبی کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”ڈرو نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں تم لوگوں کو نقصان پہنچانے نہیں آیا بلکہ تم لوگوں کو سمجھانے آیا ہوں۔“

”کیا سمجھانے آئے ہو؟“ جمیل نے پوچھا۔

”میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں نے یہاں آ کر جو تماشا شروع کیا ہے، اسے ختم کر کے واپس چلے جاؤ۔“

”کیا تماشا؟“ لبنیٰ بول پڑی۔ ”ہم یہاں تمہارے بچوں کو تعلیم دینے آئے ہیں اور تم اسے تماشا کہہ رہے ہو۔“

”تعلیم۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”کس کو تعلیم دو گے؟ کب سے یہاں ہو تم لوگ، یہ بتاؤ؟ کوئی ایک بچہ بھی آیا تمہارے پاس؟ جاؤ بھائی، جب بچے پڑھنا ہی نہیں چاہتے تو کیوں وقت برباد کر رہے ہو اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔“

”ایک بات بتاؤ، تمہارا لہجہ بہت صاف ہے۔ تم بہت اچھی اردو بول رہے ہو۔“ جمیل نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم نے تعلیم بھی حاصل کی ہوگی؟“

”ہاں۔ میں نے میٹرک کیا ہے۔“ اس نے فخریہ طور پر بتایا۔ ”اور دس سال شہر میں رہا ہوں۔“

”نام کیا ہے تمہارا؟“ لبنیٰ نے پوچھا۔

”نواز خان۔“ اس نے لبنیٰ کی طرف دیکھا۔ پھر اس طرح جیسے اس کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئی ہوں۔

لبنیٰ اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے ایک طرف ہٹ گئی۔

”ایک بات بتاؤ نواز خان۔“ جمیل نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ ”سچ سچ بتانا، کیا تم لوگوں نے ہم میں سے کسی کے پاس کوئی اسلحہ یا ہتھیار دیکھا ہے یا سنا ہے؟“

”نہیں، تم لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہے۔“ نواز خان کی نگاہیں بدستور لبنیٰ پر مرکوز تھیں۔

”تو پھر ہم نہتے لوگوں سے تمہیں کیا خطرہ ہے؟“ جمیل نے پوچھا۔ ”اگر ہم تمہارے بچوں کو تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سکھانے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ تو خوشی کی بات ہے کیونکہ ہمارا دین بھی یہی کہتا ہے۔“

”مجھے دین اور مذہب کی باتیں مت بتاؤ۔“ نواز خان درشت لہجے میں بولا ”ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔“

”افسوس کہ بہت سی باتیں نہیں جانتے۔“

”بس بس، جو کہہ دیا وہ کرو۔ ورنہ اپنے نقصان کے خود ہی ذمّے دار ہو گے۔“ نواز خان نے کہا پھر وہ لبنیٰ پر گہری نگاہ ڈالتا ہوا کیمپ سے باہر چلا گیا۔

اس کی آمد، اس کی نگاہوں اور اس کے رویے نے لبنیٰ کو بری طرح خوف زدہ کر دیا تھا۔ ”جمیل! اس آدمی کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ تم نے دیکھا، وہ مجھے کس طرح گھور رہا تھا۔“

”میں نے اسی لیے منع کیا تھا کہ تم ہمارے ساتھ نہ آؤ۔ یہاں عورتوں اور لڑکیوں کا کوئی کام نہیں ہے۔“

”لیکن اب تو آ ہی گئے ہیں۔“ لبنیٰ نے کہا۔ ”اور اپنا مشن مکمل کیے بغیر ہم جا بھی تو نہیں سکتے۔“

”بس یہی ہو سکتا ہے کہ ادھر ادھر آنے جانے میں احتیاط رکھو اور کبھی کیمپ سے اکیلی مت نکلو۔ کسی نہ کسی کا تمہارے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔“

اس دوران اس ٹیم کے افراد بھی تھکے ہارے واپس آ گئے تھے۔ نوروز بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ لبنیٰ نے فوراً سب کے لیے چائے تیار کر دی تھی۔

”ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم چٹانوں سے سر ٹکرانے چلے آئے ہوں۔“ ٹیم کے لیڈر اشرف نے کہا۔ وہ سخت مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ ”شاید یہاں والوں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ان کے بچے تعلیم حاصل کریں۔“

”ایسی بات نہیں ہے اشرف صاحب۔“ نوروز خان نے کہا۔ ”معاملہ کچھ اور ہے۔“

”اور وہ کیا ہے؟“

”وہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کو دھمکیاں ملی ہیں کہ اگر کسی نے بھی اپنے بچے کو کیمپ کی طرف بھیجا تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔“

اس انکشاف کے بعد ایک سناٹا سا چھا گیا۔

”پھر تو ہمارا یہاں جھک مارنا بیکار ہی ہے۔“ ٹیم کے ایک ممبر نے کہا۔ ”ہمیں واپس چلنا چاہیے۔“

”لیکن میں واپس جانے کے ارادے سے نہیں آیا۔“ اشرف کی آواز بلند ہو گئی۔ ”جب ہم چلے تھے، اس

وقت یہ سب کچھ ہمارے ذہنوں میں تھا۔ ہم سب جانتے تھے۔ پھر بھی ہم نے چیلنج قبول کیا۔ اب کیا ہم چیلنج ادھورا چھوڑ کر واپس چلے جائیں؟ یہ ہماری شکست ہوگی۔ تعلیم کی شکست ہوگی۔ کم از کم میں تو ابھی واپس نہیں جارہا۔ البتہ تم میں سے جو جانا چاہے، وہ چلا جائے۔ خاص طور پر دونوں لڑکیاں۔"

"نہیں اشرف صاحب! ہرگز نہیں۔" لبنیٰ بول پڑی۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ہم یہاں آکر سخت مایوس ہوئے ہیں اور مجھے ایک خطرہ اپنی طرف آتا ہوا محسوس ہورہا ہے۔ اس کے باوجود میں آپ لوگوں کا ساتھ دوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔"

اس وقت جمیل کو ایسا لگا جیسے اس کا دل بیٹھتا جارہا ہو۔

☆☆☆

ایک کمرے میں سات آٹھ بچے اور بچیاں تھے۔

وہ سب اس وقت مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان سُن رہے تھے۔

یہ کہانی سنانے والی زرین تھی جس نے کتابوں میں یہ داستان پڑھی تھی اور اب بچوں کو بتارہی تھی۔ جن کی سمجھ میں سب کچھ تو نہیں آرہا تھا لیکن اتنا ضرور اندازہ ہورہا تھا کہ ایک زمانے میں مسلمان بہت ترقی پر تھے۔ پھر وہ برباد ہوگئے۔ کس طرح؟ یہ تفصیل ان کے چھوٹے سے ذہنوں میں نہیں آسکی تھی۔

ماسٹر حمید کا اسکول تباہ ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے ایک مکان کی صفائی کا کام شروع کروا دیا تھا۔ وہ مکان بہت دنوں سے بند تھا۔ بستی کے بچے اور بچیاں اِدھر اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔

زرین نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں کچھ بچوں اور بچیوں کو پڑھانا شروع کردیا تھا۔ یہ سب اس کے گھر میں جمع ہوکر بلند آواز میں اپنے سبق یاد کرتے تو ان کی آوازوں سے پورا گھر بھر جاتا تھا۔

اس کے ماں باپ اس کام میں زرین کا پوری طرح ساتھ دے رہے تھے۔ اس نے ایک جگہ اپنی کاپی میں لکھا تھا۔ "میں نے بہت سے خوب صورت پرندوں کو اپنے گھر کے ایک کمرے میں بلا کر پڑھانا شروع کردیا ہے۔ کیونکہ تعلیم دینا شیوۂ پیغمبری ہے۔ نوحؑ اور داؤدؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ نے زندگی کے اس روشن پہلو پر بہت زور دیا ہے۔

"لیکن افسوس کہ آج کچھ لوگوں کو یہ روایت پسند نہیں ہے۔ وہ ہمارے راستے میں جہالت کے اندھیرے پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اپنی شمع لے کر آگے بڑھتی رہوں گی۔"

ایک بار نواز خان نے عاصم سے کہا۔ "بھائی عاصم! تم کیوں اپنی اور گھر والوں کی جانوں کے دشمن بنے ہوئے ہو۔"

"کیوں بھائی، میں نے ایسا کیا کردیا ہے؟"

"یہ تمہاری بچی کیا کرتی پھر رہی ہے؟"

"وہ تعلیم دے رہی ہے نواز خان۔" یوسف نے کہا۔ "اور میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تعلیم دینا کوئی برائی نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح اس کا ساتھ دے رہے ہو؟" نواز خان کا لہجہ درشت تھا۔

"ہاں، اس نیک کام میں اس کا ساتھ نہ دوں تو کیا کروں؟"

"ٹھیک ہے تو پھر اپنا نفع نقصان خود دیکھ لینا۔"

عاصم کو اس کے لہجے میں پہلی بار کوئی خطرناک بات محسوس ہوئی تھی۔ بہت برے تیور تھے اس کے۔ نواز نے تو پہلے بھی اس قسم کی باتیں کی تھیں لیکن اس کا انداز اتنا جارحانہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

زرین نے اپنے باپ اور یوسف کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو سن لی تھی۔ اسے خوف سا ہونے لگا تھا۔ اپنے سے زیادہ اپنے ماں باپ کے لیے۔

اس نے یہ گفتگو بھی اپنی کاپی میں لکھ لی تھی۔ اس نے اس کے بعد لکھا تھا۔ "کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ میں علم کے لیے اتنی جدوجہد کیوں کررہی ہوں؟ کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہی ہوں؟ اگر اس علاقے کے بچے تعلیم حاصل نہیں کرسکتے ہیں تو نہ کریں۔ میں نے کیوں ٹھیکا لے رکھا ہے۔

"میں سوچتی ہوں کہ یہ تعلیم دینا کیسا بھیانک معلوم ہوتا ہے۔ میں لالٹین کی مدھم روشنی میں پڑھایا کرتی ہوں اور میرا ابا گھر کے باہر چوکنا کھڑا رہتا ہے۔ اسے یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں کوئی اس طرف نہ آنکلے۔

"کاش! ہمارا ماحول شہروں کی طرح ہوتا۔ میں ایک دفعہ بابا کے ساتھ شہر جاچکی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ بچے بچیاں یونیفارم پہن کر بغیر کسی خوف کے اسکول جارہے ہیں۔ ان کے چہرے کھلے ہوئے ہیں۔ انہیں کوئی خوف نہیں

ہے۔ اسکولوں کی گاڑیاں بچوں کو لانے لے جانے کے لیے دوڑتی پھر رہی ہیں۔ "وہاں کوئی کسی کو تعلیم حاصل کرنے سے منع نہیں کرتا۔ کاش! ہم بھی ایسے ہوسکتے۔ ہمارے یہاں بھی ایسا ہوتا۔"

ایک رات اس کے ذہن میں آیا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے، اسے دوسروں تک پہنچایا جائے تاکہ دوسروں کو بھی ان کے حالات کا اندازہ ہوسکے۔

لیکن کیسے؟ شہر تو بہت دور تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اپنی داستان شہر والوں تک کس طرح پہنچائے گی۔ ماسٹر حمید کا بیٹا گل زمان اس کا ساتھی تھا۔ دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ گل زمان بھی اس کے گھر آکر اپنے پڑھنے کا شوق پورا کیا کرتا تھا۔

زرین نے ایک دن جب اس کے سامنے اپنا یہ مسئلہ رکھا تو گل زمان بول پڑا۔ "زرین! تیرا یہ کام تو ہوسکتا ہے۔"

"کیسے ہوسکتا ہے؟"

"اپنی بستی کے باہر شہر کے کچھ لوگوں نے ایک کیمپ لگا رکھا ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔"

"کیا کرتے ہیں کیمپ میں؟"

"ان کا کہنا ہے کہ وہ یہاں کے بچوں کو تعلیم دینے آئے ہیں۔" گل زمان نے بتایا۔ "لیکن بابا بتارہے تھے کہ ابھی تک ان کے پاس کوئی بچہ نہیں گیا ہے۔ سب ڈرتے ہیں۔"

"بھائی! یہ تو ہے لیکن وہ لوگ میرے کس کام آسکیں گے؟" زرین نے پوچھا۔

"وہ شہر کے لوگ ہیں۔ وہ سب جانتے ہوں گے۔ تم اپنی لکھی ہوئی باتیں ان تک پہنچاؤ گی تو وہ اسے آگے بڑھا دیں گے۔"

"شاباش۔" زرین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "یہ تم نے زبردست آئیڈیا دیا ہے لیکن وہاں تک کون لے جائے گا۔"

"میں لے جاؤں گا۔ سب سے چھپا کر۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کے لیے اس طرف تو جاتا ہی رہتا ہوں، اب تمہارے لیے بھی چلا جاؤں گا۔"

☆☆☆

ٹیم کے ارکان نے لبنیٰ اور شاہدہ کی نقل و حرکت محدود

کروادی تھی۔
انہیں اجازت نہیں تھی کہ وہ کیمپ سے باہر جایا کریں۔ یہ سب ان کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا۔ ٹیم کے ارکان جب ادھر ادھر کی بستیوں میں جاتے تو بھی کم از کم دو آدمیوں کو ان کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

اس صورتِ حال سے تنگ آکر لبنیٰ نے نوروز خان سے پوچھا۔ ”تم یہ بتاؤ، کیا ان علاقوں میں مہمان عورتوں کو بھی خطرہ ہوتا ہے؟“

”نہیں بی بی، بالکل نہیں۔ یہاں کے لوگ عورتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھتے۔“

”تو پھر ہم پر یہ کس قسم کی پابندی ہے؟“

”اس پابندی کو غلط مت سمجھو۔ خدا کی قسم! تمہاری عزتوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن تمہاری جانوں کو خطرہ ہے اور وہ بھی اس لیے کہ تم یہاں کچھ لوگوں کی مرضی کے خلاف کام کررہی ہو۔ ویسے کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“

”لیکن اس دن جو آدمی آیا تھا، وہ تو مجھے بہت گندی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔“

”ہاں بی بی، میں اس کے لیے شرمندہ ہوں۔ اگر میں ہوتا تو اس کی آنکھیں نکال دیتا۔ بات یہ ہے بی بی کہ اگر سو اچھے اور غیرت مند ہیں تو دس خراب بھی نکل آتے ہیں۔“

”ہاں، یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے۔“ لبنیٰ نے کہا۔

نوروز خان اسے تسلی دے کر چلا گیا۔ اس نے اطمینان دلایا تھا کہ اب اگر نواز خان جیسا کوئی آدمی اس طرف آیا تو اسے سبق سکھا دیا جائے گا۔

یہ سب تو تھا لیکن اب بے پناہ مایوسی نے لبنیٰ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہاں کوئی امید نہیں تھی۔ یہاں ان کا مشن ناکام ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

اسے انگریزی کی ایک کہاوت یاد آرہی تھی کہ اندھیرا وہیں ہوتا ہے جہاں لوگ روشنی میں رہنا نہیں چاہتے۔ یہاں روشنی کی کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ ان کی ٹیم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کررہی تھی۔

اسی وقت اس نے فیصلہ کرلیا کہ اور کوئی واپس جائے یا نہ جائے، وہ جمیل کو لے کر واپس چلی جائے گی۔ حالانکہ اس سے کئی بار کہا گیا تھا کہ وہ واپس چلی جائے لیکن وہ خود ہی انکار کرتی رہی تھی۔

لیکن اب یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ نوروز خان کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

”ہاں نوروز خان! میں نے چائے کا پانی چڑھا دیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ابھی دیتی ہوں۔“

”نہیں بی بی! چائے کی بات نہیں ہے۔ ایک بچہ ملنے کے لیے آیا ہے۔“ نوروز خان نے بتایا۔

”اچھا، میں آرہی ہوں۔“

لبنیٰ باہر آگئی۔ نوروز خان کے ساتھ دس گیارہ برس کا ایک بچہ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں ایک کاپی دکھائی دے رہی تھی۔

”اوہ۔“ لبنیٰ مسکرادی۔ ”تم پڑھنے کے لیے آئے ہو؟“

”نہیں مس... میں اپنی پڑھائی کررہا ہوں۔“ بچے نے بتایا۔ ”میں تو کسی اور کام سے آیا ہوں۔“

اس بچے کے مس کہنے اور مہذب انداز سے مخاطب کرنے سے لبنیٰ کو اندازہ ہوگیا کہ اس نے کسی اسکول میں تعلیم پائی ہے۔ اس کا لہجہ بھی بہت مہذب تھا۔

”ہاں بیٹا، بتاؤ کیا ہے؟“

”یہ لیں، آپ یہ کاپی پڑھ لیں۔“ بچے نے کاپی لبنیٰ کی طرف بڑھا دی۔ ”زرین نے کہا ہے کہ آپ لوگوں کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔“

”اور یہ زرین کون ہے؟“ لبنیٰ نے پوچھا۔

”جس نے یہ سب لکھا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی پڑھتا ہوں۔“ بچے نے اضافہ کیا۔ ”اور میرا نام گل زمان ہے۔“

”آؤ گل زمان... اندر آکر بیٹھ جاؤ۔ میں جب تک یہ کاپی پڑھ لیتی ہوں۔ دیکھوں تو سہی، تمہاری زرین بی بی نے کیا لکھا ہے۔“

”وہ مجھ سے بھی چھوٹی عمر کی ہے مس۔“ گل زمان نے بتایا۔

لبنیٰ اس بچے کو کمرے میں لے آئی۔ اس نے اس بچے کے سامنے چائے کی پیالی اور کچھ بسکٹ رکھ دیے اور اس کاپی کو دیکھنے لگی۔

اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔

زرین کی تحریروں نے اسے باندھ کر رکھ دیا تھا۔ جیسے کوئی باکمال ادیب خود پر گزرنے والی داستان لکھ رہا ہو۔ کتنی اچھی اردو تھی اس کی... اور اتنی ہی خوب صورت

تھی۔

اس نے بتایا تھا کہ یہاں تعلیم کی راہ میں کیسی رکاوٹیں ہیں۔ یہاں زندگی کا کیا مفہوم ہے۔ اس نے کچھ کہانیاں بھی تحریر کی تھیں۔ ایک بے مثال افسانہ نگار کی طرح۔ ارسطو سے لے کر بیکن اور مہاتما بدھ تک کے اقوال موتی کی طرح پرودیے گئے تھے۔

اس کاپی کو پڑھ لینے کے بعد لبنیٰ بہت دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے گل زمان سے پوچھا۔ ”گل زمان! تم یہ بتاؤ، زرین کو یہ سب کون لکھ کر دیتا ہے؟“

”کوئی نہیں مس، وہ خود لکھتی ہے۔“ گل زمان نے بتایا۔ ”اس کے پاس درجنوں کتابیں ہیں۔ اس کا کام صرف پڑھنا اور پڑھانا ہے۔“

”پڑھانا؟“ لبنیٰ چونک گئی۔ ”کس کو پڑھاتی ہے؟“

”بچوں کو۔“

پھر گل زمان نے بتایا کہ وہ کس طرح اپنے گھر کے کمرے میں لالٹین کی روشنی میں چھپ چھپ کر تعلیم دیا کرتی ہے۔

”میرے خدا!“ لبنیٰ چیخ اٹھی۔ پھر اس نے نوروز خان کو آواز دی۔ ”نوروز خان! آؤ، جلدی آؤ۔“

نوروز خان بوکھلایا ہوا اندر آگیا۔ ”کیا ہوا بی بی! خیریت تو ہے؟“

”نوروز خان! مبارک ہو۔“ لبنیٰ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”مبارک ہو، خدا نے تمہارے علاقے میں ایک سورج اتار دیا ہے جس کی روشنی بہت جلد پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔ یہ میں تمہیں لکھ کر دیتی ہوں۔“

☆☆☆

وہ چھ آدمی تھے۔

سنگلاخ پہاڑیوں کے درمیان۔ ان کے جسموں پر ہتھیار سجے ہوئے تھے۔ وہ سب ہی اس وقت سخت غصے اور وحشت کے عالم میں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

ان میں سے ایک ایسا تھا جس کی حیثیت دوسروں سے الگ اور ممتاز دکھائی دے رہی تھی۔ ”کون ہے یہ شہزادی؟“

وہ غرایا۔ ”کون ہے جس نے یہاں کی خبریں باہر تک پہنچائی ہیں؟“

”ابھی تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔“ دوسرے نے بتایا۔ ”ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ مرد ہے یا عورت۔“

”بے وقوف... اس کی ڈائری پوری دنیا کے اخباروں میں شہزادی کے نام سے چھپ رہی ہے۔“ ان کے سربراہ نے کہا۔ ”شہزادی کوئی مرد تو نہیں ہوسکتا۔“

”ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے شہزادی بن گیا ہو۔“

”ہوں... یہ بھی ہوسکتا ہے۔“ وہ غرایا۔ ”بہرحال وہ جو بھی ہے، اس کا پتا چلانا بہت ضروری ہے۔ یہ باہر والے ہمیں بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہوں نے پوری دنیا میں اس کی تحریروں کو پھیلا دیا ہے۔“

”سوال یہ ہے کہ ان لوگوں تک یہ تحریریں کس طرح پہنچ رہی ہیں؟ یہاں سے کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں ہے۔“

”کوئی نہ کوئی تو ایسا ضرور ہے جو ان تحریروں کو باہر بھیج رہا ہے۔ اس کا بہت خراب اثر پڑ رہا ہے۔ اس شہزادی کی تعریف کی جارہی ہے۔ اس کے لیے جلسے جلوس ہورہے ہیں۔“

وہ سب پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

ان کے لیے یہ صورتِ حال بہت خطرناک ہوگئی تھی۔ اس شہزادی نے پوری دنیا سے ہمدردیاں سمیٹنی شروع کردی تھیں۔ اس کی ہمت کو سلام کیا جارہا تھا۔

”تم لوگ آس پاس اپنے آدمیوں کو پھیلا دو۔“ سربراہ نے کہا۔ ”یہاں گنتی کی چند ہی بستیاں ہیں۔ جو بھی ہے، وہ یہیں ہوگا یا ہوگی۔ اس کا پتا چلانا بہت ضروری ہے۔“

”جناب! یہاں سے کچھ فاصلے پر کچھ لوگوں نے اپنا کیمپ لگا رکھا ہے۔ وہ شہر سے یہاں کے بچوں کو پڑھانے کے لیے آئے ہیں۔“

”ہاں، جانتا ہوں میں۔ ہم نے ان کو وارننگ دے دی ہے لیکن یہ کام ان لوگوں کا نہیں ہوسکتا۔ انہیں ہمارے اندر کے حالات کیسے معلوم؟ انہیں کیا معلوم کہ ہماری بستیوں میں کیا ہورہا ہے۔ یہ تو اندر کے کسی آدمی کا کام ہے۔“

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اندر کا کوئی آدمی ان لوگوں تک یہ تحریریں پہنچاتا ہو اور وہ اسے آگے روانہ کردیتے ہوں۔ ان کے پاس کمپیوٹر، لیپ ٹاپ بھی ہیں۔“

”ہاں، یہ بات سمجھ میں آرہی ہے۔“ سربراہ نے کہا۔ ”ایسا کرو، ان لوگوں کی نگرانی کرو۔ دیکھو، ہماری بستیوں سے ان کے پاس کون جاتا ہے۔“

”ہم کیوں نہ ان کو شہر واپسی پر مجبور کردیں۔“

"یہ تو کرنا ہی ہوگا لیکن ابھی نہیں۔" سربراہ نے کہا۔ "ابھی ان کو نہ چھیڑو۔ اسی طرح رہنے دو۔ ہمیں اس شہزادی کو بھی تو پکڑنا ہے۔ اگر یہ لوگ چلے گئے تو پھر یہ کہانی یونہی ختم ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے تو پھر یہ ڈیوٹی میں سنبھال لیتا ہوں۔" ایک نوجوان نے کہا۔ اس کا نام اسفند خان تھا۔ ایک دراز قامت صحت مند نوجوان۔ "میں ان بستیوں کے ہر آدمی کو پہچانتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ کون کس مقصد سے ان لوگوں کی طرف جا رہا ہے۔"

"تمہیں کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔"

"ایسا ایک راستہ ہے میرے پاس۔" اسفند مسکرا دیا۔ "میرا ایک دوست نوروز ان لوگوں کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ لوگ اسے بہت دنوں سے جانتے ہیں۔ شہر میں وہ انہی لوگوں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ میں نوروز خان کے پاس جا کر اس سے کہوں گا کہ مجھے کام کی ضرورت ہے۔ وہ تیم والوں سے سفارش کر کے مجھے اپنے ساتھ رکھ لے۔"

"کیا وہ نہیں جانتا کہ تم ہمارا ساتھ دے رہے ہو؟"

"نہیں، اسے یہ نہیں معلوم۔" اسفند نے کہا۔

"ٹھیک ہے تو پھر تم چلے جاؤ۔"

☆☆☆

زرین کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ اس کی تحریروں کو پذیرائی مل رہی ہے۔ اس کی باتیں دور دور تک پہنچ رہی ہیں۔ کتابوں سے محبت رکھنے والوں کو ان بچوں سے محبت ہوتی جا رہی ہے جن کے ہاتھوں سے کتابیں چھین لی جاتی ہیں۔

گل زمان اس کا پوری طرح ساتھ دے رہا تھا۔

وہ زرین کی کاپی ان لوگوں تک پہنچا دیتا اور وہ لوگ اسے اخبارات کو دے دیتے جن میں زرین کی تحریروں کا ذکر ہوتا۔ وہ جس طرح کاپی چھپا کر لے جاتا تھا، اسی طرح اخبارات بھی چھپا کر لایا کرتا۔

البتہ زرین کے باپ عاصم کے خدشات بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بچوں کو گھر میں تعلیم دینے کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اب زرین کی تحریریں... یہ آگ لگا سکتی تھیں۔

اس نے زرین سے کہا۔ "بیٹا! بچوں کو پڑھانے کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اب تم نے جو سلسلہ شروع کیا ہے، یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔"

"بابا! مجھے اس کا اندازہ ہے۔" زرین نے کہا۔

"لیکن یہ نہ بھولیں کہ ہم سب اس وقت جہاد کر رہے ہیں۔ یہ جہاد تعلیم کے لیے ہے، روشنی کے لیے ہے... اور بابا! جہاد میں سختیاں تو آتی ہیں۔ یہ راہ آسان تو نہیں ہے لیکن جو آپ کا حکم ہو۔ اگر آپ کہیں تو میں یہ سلسلہ بند کر دیتی ہوں۔"

"نہیں، میں یہ نہیں کہوں گا۔" عاصم مضبوط لہجے میں بولا۔ "بیٹا! مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ گرچہ تم بہت چھوٹی ہو لیکن خدا نے تمہیں ایک بڑے کام کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ تم تاریخ میں اپنا نام روشن کرنے جا رہی ہو۔ میں اس جہاد میں تمہارا ساتھ دیتا رہوں گا۔"

"او بابا۔"

عاصم نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ اس وقت بھی بہت کچھ سوچ کر اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔ "خدایا اس کی حفاظت کرنا۔" باپ نے دل کی گہرائیوں سے اپنی بیٹی کے لیے دعا کی۔

"بابا! اب تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔" زرین نے کہا۔

"کہو بیٹا۔"

"بابا! تم کو تو معلوم ہے کہ میری تحریریں کون لے کر جاتا ہے۔"

"ہاں، جانتا ہوں کہ یہ کام گل زمان کر رہا ہے۔"

"بابا! میں اب اس کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" زرین نے کہا۔ "اس کی عمر ہی کیا ہے۔ وہ خوف زدہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کسی کو بتا بھی سکتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔ تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

"بابا! میں یہ چاہتی ہوں کہ اب تم لے جایا کرو۔ تم پر کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔" زرین نے کہا۔

عاصم سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی بیٹی اسے ایک بہت بڑے کام کے لیے کہہ رہی تھی۔

"اگر میں لڑکی نہیں ہوتی بابا تو خود چلی جاتی۔" زرین نے کہا۔

"نہیں بیٹا، نہیں۔" عاصم تڑپ گیا۔ "تم فکر نہ کرو، میں جایا کروں گا۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم گل زمان کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ماسٹر حمید کو کیا جواب دیں گے۔ گل زمان ان کی اکلوتی اولاد ہے۔"

"ہاں بابا، میں اسی لیے کہہ رہی تھی۔ میں نے ایک دوسری کاپی بھی تیار کر لی ہے۔ اسے لے جاؤ۔"

"بہت جلدی جلدی لکھ رہی ہے میری بیٹی۔" عاصم

نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
"ہاں بابا! کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" زرین نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ کیمپ والے واپس چلے جائیں۔ پھر ہمارے پاس اپنی آواز پہنچانے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔"

☆☆☆

سورج پہاڑیوں کے پیچھے جاکر غروب ہوچکا تھا۔
اس وقت وہ سب کیمپ میں روزانہ کی پروگریس پر باتیں کررہے تھے۔ چائے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھی تھیں۔
"ہاں بھائی! کیا فرمایا تھا ہمارے علامہ اقبال نے۔" کیمپ لیڈر اشرف نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔
"نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔"
"تو اس بچی نے اس مٹی کی زرخیزی ثابت کردی ہے۔" اشرف نے کہا۔ "کیا تحریر ہے، کیا جذبہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کوئی بہت بڑی ادیبہ اپنی ڈائری لکھ رہی ہو۔"
"کاش، ہم اس سے مل کر اس کا انٹرویو لے سکتے۔ اس کی تصویریں شائع کرواسکتے۔" کسی نے کہا۔
"نہیں، ایسا کرنا خود اس کے حق میں خطرناک ہوگا۔" لبنیٰ نے کہا۔ "کیونکہ وہ یہ سارے کام بہت خاموشی اور رازداری کے ساتھ کررہی ہے۔ اگر ہم اسے سامنے لے آئے تو اس کی زندگی کو خطرہ بھی ہوسکتا ہے۔"
"یہ بات تو ہے۔ ہمیں خود اس کے تحفظ کے لیے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"
اس دوران میں نوروز خان اپنے ساتھی اسفند کے ساتھ سامان لے کر واپس آگیا۔ ان دونوں کو قریبی بازار کی طرف بھیجا گیا تھا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں ختم ہوگئی تھیں۔
اسفند ایک دن پہلے ان کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ نوروز خان نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ اس کا بچپن کا دوست ہے اور بہت بھروسے کا آدمی ہے۔
کیمپ والوں نے اس کی آمد کا خیر مقدم کیا تھا۔
"آؤ، تم دونوں بھی چائے پی لو۔" شاہدہ نے کہا۔ اس نے ایک ایک پیالی دونوں کے سامنے رکھ دی۔
اسفند نیا آدمی تھا اس لیے وہ سب اس کے سامنے باتیں کرنے سے گریز کرتے تھے۔
"ایک بات بتاؤ صاحب!" اسفند نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کو ہم لوگوں سے ایسی کون سی دلچسپی ہے کہ شہر کا آرام چھوڑ کر یہاں خوار ہونے کے لیے چلے آئے ہو؟"
"اسفند! ہمیں کسی بھی علاقے کے کسی شخص یا گروہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔" اشرف نے بتایا۔ "ہمیں دلچسپی صرف تعلیم سے ہے، علم سے ہے۔ خود سوچو، اس علاقے کے بچوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کو علم کی دولت سے محروم کردیا جائے۔"
"کیا انہیں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا حق نہیں ہے۔" جمیل نے کہا۔ "میرا ایمان ہے کہ اگر ان علاقے کے بچوں کو تعلیم مل جائے تو وہ پوری دنیا میں اپنی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔"
اسفند بہت دھیان سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔
"اسفند! ایک بات بتاؤ۔" لبنیٰ نے پوچھا۔
"جی بی بی! پوچھیں۔"
"تمہارے بچے ہیں؟"
"دو بچے ہیں بی بی۔" اسفند نے بتایا۔ "دونوں بیٹے ہیں۔ ایک دس سال کا اور دوسرا نو سال کا ہے۔"
"کیا وہ کچھ پڑھ رہے ہیں؟"
"نہیں بی بی، کچھ نہیں۔"
"تو کیا یہ تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ ان کے ہاتھوں میں کتابیں ہوں، وہ لکھنا جانتے ہوں؟ وہ تمہیں اخبار اور کتابیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں؟"
"اور اس سے بھی آگے یہ کہ وہ بڑے ہوکر ڈاکٹر یا انجینئر یا سائنس داں بن جائیں۔" جمیل نے کہا۔ "خود سوچو، وہ زندگی بہتر ہے یا ان پہاڑوں کے درمیان یونہی گھومتے رہنا؟"
اسفند نے اپنی گردن جھکالی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ "لیکن آج کی جو تعلیم ہے وہ تو ان کے لیے ٹھیک نہیں ہوگی، وہ بہک جائیں گے۔"
"اب ایک بات پوری ایمانداری اور سچائی سے بتاؤ۔" اشرف نے پوچھا۔ "کیا جو لوگ تعلیم حاصل نہیں کرتے، وہ بہکتے نہیں ہیں؟ کیا ان میں کسی قسم کی برائی یا خرابی نہیں ہوتی؟ تم تو خود ایسے بہت سوں کو جانتے ہوگے۔"
"یہ بات تو ہے۔ بہت سے ہیں۔" اسفند نے گردن ہلائی۔
"تو پھر تعلیم کو کیوں الزام دے رہے ہو؟" جمیل نے کہا۔ "میرے بھائی! یہ آدمی کی اپنی اپنی فطرت کی بات

ہوتی ہے... اور یاد رکھو، کتابیں کبھی برائی نہیں سکھاتیں۔ ہمیشہ بھلائی کی راہ بتاتی ہیں۔ اب یہ آدمی پر خود منحصر ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔"
"تم یہ بتاؤ، کیا تم نے تعلیم حاصل کی ہے؟"
"نہیں، میں نے کچھ نہیں پڑھا۔"
"لیکن تمہارا یہ دوست نوروز خان پڑھنا لکھنا جانتا ہے، ہے نا۔"
"جی ہاں۔"
"فرض کرو، تمہارے نام کوئی خط آتا ہے جس میں کوئی راز کی بات لکھی ہو... تم اس خط کو کیسے پڑھو گے؟ کسی ایسے کے پاس جاؤ گے نا جو پڑھنا جانتا ہو؟"
"ہاں جی، یہی کرنا ہوگا۔"
"تو پھر وہ راز کی بات تو کسی اور کے پاس چلی گئی نا۔" جمیل نے کہا۔
"یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن یہ لڑکیوں کی تعلیم سمجھ میں نہیں آئی۔"
"چلو، اس بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کیا کبھی تمہارے گھر میں کوئی عورت بیمار پڑی ہے؟"
"کیوں نہیں، پچھلے سال میری بیوی بیمار پڑگئی تھی۔ اس کا آپریشن ہوا تھا۔"
"کہاں ہوا تھا آپریشن؟"
"شہر کے اسپتال میں۔"
"کس نے کیا تھا؟"
"ایک لیڈی ڈاکٹر تھی اس نے کیا تھا۔"
"اب ذرا اپنی عقل سے کام لے کر یہ بتادو کہ ہم اگر لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی لگادیں تو پھر لیڈی ڈاکٹرز کہاں سے آئیں گی۔ ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو اگر آپریشن کرانا ہوا تو کس کے پاس جائیں گی۔ مرد ڈاکٹرز ہی کے پاس جائیں گی نا، تو پھر... اس وقت کیا کرو گے؟"
اسفند کی گردن جھک گئی۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

عاصم نے ایک چھوٹا سا گڑھا کھود لیا تھا۔
بہت محنت لگی تھی۔ اس کے پاس گڑھا کھودنے کا اوزار بھی نہیں تھا۔ زمین پتھریلی تھی۔ اس کے پاس ایک شکاری چاقو اور لکڑی کی ایک نکیلی ٹہنی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔
اس نے جہاں گڑھا کھودا تھا، وہ اس علاقے کا قبرستان تھا۔ آس پاس قبریں بنی ہوئی تھیں جن پر نشانی کے طور پر پتھر لگادیے گئے تھے۔
اپنے کھودے ہوئے گڑھے کی طرف سے مطمئن ہوکر اس نے پاس رکھی ہوئی کاپیاں اٹھائیں اور گڑھے میں پھینکنے والا تھا کہ کسی کی آواز نے اسے روک دیا۔
"کیا کررہا ہے تو؟"
عاصم نے پریشان ہوکر دیکھا۔ سامنے سے رحمان بابا چلا آرہا تھا۔ وہ پُراسرار شخص جو کبھی کبھی نمودار ہوتا اور سب کو علم اور دانش کی باتیں بتاکر غائب ہوجاتا۔
وہ بہت دنوں کے بعد دکھائی دیا تھا... وہ بھی اس قبرستان میں۔
رحمان بابا عاصم کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی چمکیلی نگاہیں عاصم پر لگی ہوئی تھیں۔ "بتا مجھے، کیا کررہا تھا؟"
عاصم رحمان بابا سے غلط بیانی نہیں کرسکتا تھا۔ "بابا! میری بیٹی نے کچھ چیزیں لکھی ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ میں اس کی تحریروں کو شہر والوں تک پہنچادوں۔"
"اور تو اس کی تحریروں کو دفن کرنے جارہا تھا... کیوں؟"
"اس لیے کہ وہ بیٹی ہے میری۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ کسی خطرے میں پڑ جائے۔"
"بے وقوف انسان... ایک ابھرتے ہوئے سورج کو بادلوں میں چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔" رحمان بابا نے کہا۔ "خدا نے اس کے نصیب میں بڑائی اور عظمت لکھ دی ہے۔ اس کے ماتھے کو روشن کردیا ہے۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے۔ تجھے تو اس جہاد میں اس کا ساتھ دینا چاہیے۔"
"لیکن بابا! مجھے اس کی طرف سے اندیشے بھی تو ہیں۔"
"کچھ نہیں ہوتا، وہ ہر امتحان میں سرخرو ہوگی۔ خود سوچ۔ جس نے اس کام کے لیے اس کا انتخاب کیا ہے، کیا وہ اس کی حفاظت کی طرف سے غافل ہوگا؟"
"نہیں بابا! ایسا تو نہیں ہوسکتا۔"
"تو بس، تجھے کس بات کی فکر ہے۔ وہی کر جو اس نے کہا ہے۔ پہنچادے اس کی تحریروں کو۔"
"لیکن بابا! ایک بات بتائیں۔ آپ اس وقت اچانک کیسے پہنچ گئے؟"
"بس اتنا جان لے کہ جس نے تیری بیٹی کو اس کام کے لیے چُنا ہے، اسی کی طرف سے مجھے اشارہ ملا تھا۔"

رحمان بابا نے کہا۔ ''اب تو جا۔ یہ تیرا فرض ہے۔ اپنا فرض پورا کر۔''

''بابا! آپ بستی کی طرف نہیں آئیں گے؟''

''نہیں، ابھی کچھ اور کام ہیں، ان کو انجام دینا بہت ضروری ہے۔ اور ہاں، اپنی بیٹی سے کہہ دینا کہ ابھی اس کے لیے ایک بہت سخت امتحان آنے والا ہے لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ وہ اس امتحان سے بھی نکل آئے گی۔ اس کے بعد اس کے لیے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔ جا، اسے میرا اسلام پہنچا دینا۔''

''ٹھیک ہے بابا۔''

عاصم نے بڑی عقیدت سے رحمان بابا کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کاپیاں لے کر چل پڑا۔ ابھی اسے بہت فاصلہ طے کرنا تھا جبکہ رحمان بابا وہیں اسی قبرستان میں رہ گیا تھا۔

عاصم بھی جانتا تھا کہ شہر والوں نے کہاں قیام کیا ہوا ہے۔ اس نے ماسٹر حمید کے بیٹے گل زمان سے پوری معلومات حاصل کرلی تھیں۔

وہ جب دو کمروں کے اس کیمپ کے پاس پہنچا تو اسے اپنی جان پہچان کا نوروز خان دکھائی دے گیا۔ نوروز خان انہی علاقے کا رہنے والا تھا اور کئی سال شہر میں گزار کر آیا تھا۔

نوروز خان اسے دیکھتے ہی اس کے پاس آگیا۔ ''کیا حال ہیں عاصم بھائی... ادھر کیسے آنا ہوا؟''

''نوروز! ایک بات بتا۔ میں نے سنا ہے کہ اس طرف شہر سے کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، لیکن تمہیں ان سے کیا کام ہے؟'' نوروز نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''پہلے میری بات کا جواب دو۔''

''ہاں، آئے ہوئے ہیں اور میں انہی لوگوں کے ساتھ کام کررہا ہوں۔''

''خدایا شکر ہے۔'' عاصم نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے ان لوگوں سے ملنا ہے۔''

''کیوں، کیوں ملنا ہے؟''

''ایک بہت ضروری کام ہے۔'' عاصم نے بتادیا۔ ''کسی ذمے دار آدمی سے میری ملاقات کروادو۔''

''ایک منٹ۔'' نوروز خان نے کہا۔ ''میں ان سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔''

نوروز خان کمرے کے اندر چلا گیا۔ وہ فوراً ہی واپس آیا تھا۔ ''چلو، وہ بلارہے ہیں۔''

عاصم کمرے میں آگیا۔

اس وقت پوری ٹیم وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ عاصم نے سلام کے بعد کہا۔ ''میں آپ لوگوں سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا آپ لوگ شہزادی نام کی کسی بچی کو جانتے ہیں؟''

سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

''آخر بات کیا ہے؟'' جمیل نے پوچھا۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں اس بچی کا باپ ہوں۔'' عاصم نے کہا۔ ''اس نے دو کاپیاں اور بھیجی ہیں۔'' اس نے دونوں کاپیاں ان کے سامنے کردیں۔ ''ان کو دیکھ لیں۔''

کاپی کے پہلے ہی صفحے پر زرین نے لکھا تھا کہ گل زمان چونکہ کم عمر ہے اس لیے اب اس کے بابا عاصم اس کی تحریریں لے کر آیا کریں گے۔

''مبارک ہو۔'' سب سے پہلے جمیل اٹھا۔ اس نے بہت گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا تھا۔ ''مبارک ہو عاصم صاحب کہ خدا نے آپ کو ایسی بیٹی کی صورت میں ایک انمول دیا ہے۔''

وہ سب باری باری اسے مبارک باد دے رہے تھے اور عاصم کی آنکھیں بھیگتی جارہی تھیں۔

☆☆☆

ماسٹر حمید نے اپنے مکان کی صفائی اور مرمت وغیرہ کروالی تھی۔

اس کا مکان اب اسکول بننے کے لیے تیار ہوچکا تھا۔ اس مکان میں فرنیچر نہیں تھا۔ صرف ماسٹر حمید کا جذبہ تھا جو آس پاس کے بچوں کو کھینچ کر اس کی طرف لے آیا تھا۔

بستی کے کچھ لوگوں نے فرنیچر کے نام پر بوریوں کا بندوبست کردیا۔ ماسٹر حمید اپنے پیسوں سے بلیک بورڈ وغیرہ خرید کرلے آیا تھا۔

اس نے اس علاقے کے حکام کو درخواست بھی دے دی تھی کہ اسکول کے باقاعدہ قیام میں اس کی مدد کی جائے کیونکہ اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے۔

لیکن ابھی تک اس کی درخواست کا جواب نہیں آیا تھا۔

اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ بچوں کو تعلیم دینے میں مصروف ہوگیا۔ گل زمان اور زرین پھر اس کے پاس آگئے تھے۔

ماسٹر حمید اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی علمی بساط اتنی نہیں ہے کہ وہ بچوں کو ایڈوانس تعلیم دے سکے۔ اس کے لیے باقاعدہ ٹیچرز کی ضرورت تھی۔

سوال یہ تھا کہ ٹیچرز کہاں سے لائے جائیں؟ ان کو پیسے کون دیا کرے گا؟ بستی کے لوگ بچوں کی معمولی فیسیں بھی بہت مشکل سے ادا کرپاتے تھے۔

اس کے بیٹے گل زمان نے اسے شہر سے آئے ہوئے کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں بتایا تھا جو اس علاقے میں تعلیم دینے آئے تھے۔ شاید وہ لوگ اس کی مدد کرسکتے تھے۔

اس نے اپنے بیٹے گل زمان کو اپنے ساتھ لیا اور ایک طویل فاصلہ طے کرکے ان لوگوں کے کیمپ پہنچ گیا لیکن اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

افراتفری سی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں کمروں سے باہر ڈھیر سا سامان تھا جس میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک غم انگیز سناٹے اور اداسی کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

''بابا! وہ لوگ کہاں چلے گئے؟'' گل زمان نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے ان کے ساتھ؟''

''پتا نہیں بیٹا! ویسے میں ایک بار پھر ایک تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔'' ماسٹر حمید نے کہا۔ ''ایک بار پھر دھواں اٹھ رہا ہے۔ ایک بار پھر سب کچھ تباہ ہوچکا ہے۔''

ایک آدمی ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ نوروز خان تھا جو بہت پریشان اور دکھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اور ماسٹر حمید ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

''کیا ہوا ہے نوروز خان؟'' ماسٹر حمید نے پوچھا۔ ''میں نے سنا تھا کہ یہاں شہر کے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ وہ کہاں چلے گئے؟''

''وہ سب یہاں سے چلے گئے۔'' نوروز خان نے بتایا۔

''لیکن کیوں... کیا ہوا؟''

''وہی ہوا جو اس علاقے کا مقدر ہوچکا ہے۔'' نوروز خان کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''ایسے لوگوں کی یہی سزا ہونی چاہیے جو تعلیم پھیلانے کا کام کریں۔ ماسٹر حمید! تم بھی اپنے آپ کو بچا کر رکھو، نہ جانے کس وقت کیا ہوجائے۔''

''چاچا! یہاں جو لوگ تھے، ان کے ساتھ کیا ہوا؟'' گل زمان نے پوچھا۔

''میں نے بتایا نا کہ وہ لوگ چلے گئے۔ سوائے ایک لڑکی کے۔''

''کون لڑکی؟''

''لبنیٰ بی بی!'' نوروز خان نے بتایا۔ ''وہ ایک بے رحم شخص نواز خان کا شکار ہوگئی۔ وہ ایک بار یہاں آیا تھا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ اس شخص کی نیت میں فتور ہے۔ میں اس وقت یہاں نہیں تھا۔ پرکل رات وہ کچھ لوگوں کے ساتھ آیا۔ انہوں نے آکر سب ملیامیٹ کردیا اور لبنیٰ بی بی کو اٹھا کرلے گئے۔''

''اوخدا! نوروز خان... یہ تو ہماری روایت اور ہماری تہذیب کے خلاف ہے۔'' ماسٹر حمید نے کہا۔

''لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں ماسٹر صاحب جن پر شیطان سوار ہوجاتا ہے۔ نواز خان بھی انہی میں سے ایک ہے۔''

''اور دوسرے لوگ، ان کا کیا ہوا؟''

''وہ بے چارے روتے اور ماتم کرتے ہوئے یہاں سے چلے گئے۔''

''انہوں نے رپورٹ تو کروائی ہوگی نا؟''

''ہاں، رپورٹ بھی ہوگئی ہے۔'' نوروز خان کا لہجہ اور بھی تلخ ہوگیا۔ ''لیکن بدقسمتی سے تھانہ انچارج انہی لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔''

''میں یہ آواز اوپر تک لے جاؤں گا۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہوگا ماسٹر صاحب۔'' نوروز خان نے کہا۔ ''سوائے مایوس ہونے کے کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنے آپ کو سنبھالو، اپنی اور اپنے بیٹے کی حفاظت کرو۔''

''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہوں گے؟'' ماسٹر حمید نے پوچھا۔

''ماسٹر صاحب! سب ہی جانتے ہیں کہ وہ اسے کہاں لے گئے ہوں گے لیکن کس میں ہمت ہے کہ اس طرف جائے؟''

☆☆☆

سربراہ زور زور سے دہاڑ رہا تھا۔ نواز خان اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تم... تم نے ہماری غیرت اور ہماری روایات کی دھجیاں اڑادی ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم کو ایک عورت پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آئی۔ کس نے کہا تھا کہ اس کو اٹھالو؟ کیا تمہارے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں۔ یاد رکھو عزت سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔''

''مجھ سے غلطی ہوگئی۔'' نواز خان بمشکل بول پایا۔

''غلطی نہیں، گناہ کیا ہے تم نے۔ بہت بڑا جرم کیا ہے۔ دیکھو، اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھو۔ ان سب کی

آنکھوں میں نفرت ہے تمہارے لیے۔ یہ سب تم پر تھوک دینا چاہتے ہیں۔"

"نواز خان! تم نے بہت برا کیا ہے۔" ایک ساتھی نے کہا۔ "ہم نہیں جانتے تھے کہ تم اتنے گھٹیا نکلو گے۔"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟" سربراہ نے پوچھا۔

"اسے ساتھ والی کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے۔" کسی نے بتایا۔

سربراہ نے نواز خان کی طرف دیکھا۔ "نواز خان! اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

نواز خان نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ان کے کڑے تیور دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

"جاؤ یہاں سے۔" سربراہ نے کہا اور اپنے ایک آدمی سے مخاطب ہوا۔ "اس سے اس کی بندوق چھین لو، ہتھیار مردوں کا زیور ہوتا ہے اور جو مرد اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے وہ مرد ہی نہیں ہے۔"

نواز خان سے اس کی بندوق چھین لی گئی تھی۔

اس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور پہاڑی سے اترتا چلا گیا۔

"بے غیرت انسان۔" سربراہ نے کہا۔ "اس لڑکی کو کچھ کھانے پینے کو دیا گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ صرف روئے جا رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں خود اس کے لیے کچھ لے کر جا رہا ہوں۔ اس سے معافی مانگنی ہے۔ اگر اس نے معاف نہیں کیا تو ہمارا خدا بھی ہمیں معاف نہیں کرے گا۔"

لبنیٰ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی

اس کے چہرے پر موت کی زردی تھی۔ روتے روتے اب اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

وہ اور اس کے ساتھی تو یہاں بھلا کرنے آئے تھے۔ پھر بھلائی کا بدلہ ایسا کیوں مل رہا تھا؟ اسے ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ وہ لوگ کس طرح اس کے کیمپ میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے اشرف اور جمیل کو کتنا مارا تھا۔ ان لوگوں میں نواز خان بھی تھا۔ شاید وہی ان لوگوں کو چڑھا کر لے آیا تھا۔

اس شخص کے ارادے لبنیٰ کو شروع ہی سے گھناؤنے لگ رہے تھے۔ جب وہ پہلی بار ان کے پاس آیا تو اس کی نگاہوں میں لبنیٰ کو دیکھ کر کتنی ہوس انگڑائیاں لینے لگی تھیں۔

اور جب وہ دوسری بار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ طوفان بن کر آیا تو سب کچھ بہا لے گیا تھا۔ اس نے زبردستی لبنیٰ کو اٹھا کر جیپ میں ڈال لیا تھا۔

اس کے بعد لبنیٰ کو ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں سن ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ ہوش میں ہے یا بے ہوش ہے۔ صرف اتنا جانتی تھی کہ کچھ اجنبی اسے اپنے ساتھ کسی نامعلوم مقام تک لے جا رہے ہیں۔

ان میں وہ شخص بھی تھا جس کی نگاہوں میں اس نے پہلی بار ہی بے پناہ ہوس دیکھی تھی۔ شاید اس کی مرضی سے اسے اٹھایا گیا تھا۔

اسے پہاڑیوں کے درمیان ایک کمرے میں لا کر قید کر دیا گیا۔ یہاں عورت نام کی کسی مخلوق کا وجود نہیں تھا۔ ہر طرف مردانہ آوازیں گونج رہی تھیں۔

غصے سے بھری ہوئی آوازیں۔ ہنستی ہوئی آوازیں اور کبھی کبھی بندوقوں کی تڑتڑ۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ بہت دیر بعد اس کے سامنے کچھ کھانے کو بھی لایا گیا تھا لیکن کچھ کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی موت اور اس کی عزت کی لاش دکھائی دے رہی تھی۔

وہ اس وقت چونک اٹھی جب دروازہ کھلا اور ایک آدمی ایک ٹرے لیے اندر آیا۔ لبنیٰ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"لو بہن، کچھ کھا لو۔" اس آدمی نے بہت ہی نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"کیا؟" لبنیٰ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ "تم نے بہن کہا ہے مجھے؟"

"ہاں، بہن کہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنا بھائی سمجھو۔" اس نے کہا۔

"پھر تم کیسے بھائی ہو جو اپنی بہن کو اٹھا کر لے آیا ہے؟"

"جس نے یہ گھٹیا حرکت کی تھی، اس کو سزا مل چکی ہے۔" اس نے بتایا۔ "ہم نے اسے یہاں سے دھکے دے کر نکال دیا ہے۔ میں یہاں کا سربراہ ہوں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ پہلے کچھ کھا لو پھر ہم تمہیں کراچی بھیج دیں گے۔"

"تم، تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟" لبنیٰ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں تمہیں بہن کہہ رہا ہوں اور بہنوں سے جھوٹ نہیں بولا جاتا۔" اس نے کہا۔ "کیا میں اپنی بہن کا نام

پوچھ سکتا ہوں؟"

"لبنیٰ ہے میرا نام۔"

"اور میں ابراہیم ہوں۔" اس نے بتایا۔ "چلو، اب میرے کہنے پر کچھ کھا لو۔ پھر تمہارے لیے جیپ تیار ہے۔ تم جہاں جانا چاہو وہاں جا سکتی ہو۔"

شکر گزاری کے احساس سے لبنیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ رونے لگی۔ ابراہیم نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ارے، یہ آنسو کس لیے؟"

"ایسی جگہ ایک بھائی پا کر کیا مجھے خوش نہیں ہونا چاہیے؟" لبنیٰ نے کہا۔ "یہ خوشی کے آنسو ہیں۔"

ابراہیم اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

ماسٹر حمید کی مدد سوائے بستی والوں کے اور کسی نے بھی نہیں کی تھی۔

اور اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے اس کے اسکول میں پہنچا دیا تھا۔

ایک دن ماسٹر حمید نے بستی والوں کو جمع کر کے کہا۔

"میرے بھائیو! میں نہیں جانتا کہ میری زندگی کتنی ہے یا میں اور کتنی دیر تک تم لوگوں کی خدمت کر سکوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ کل میں نہ رہوں۔ ہر ایک کو چلے جانا ہے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ خدا کے لیے اپنے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ مت ختم کرنا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں تمہارے بچوں کو اونچے پیمانے کی تعلیم دلانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے لیکن میں انہیں تعلیم کے میدان میں اتار تو دوں گا نا۔ اب آگے آگے دوڑنا ان بچوں کا کام ہوگا اور تمہارا کام ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگا۔"

"ہم نے اس لیے تو اپنے بچوں کو تمہارے پاس بھیجا ہے ماسٹر صاحب۔" ایک شخص نے کہا۔

"ٹھیک ہے تو پھر تم سب کے سب امتحان کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تم میں سے ہر کوئی آج یہ وعدہ کرے کہ اسے ہر حال میں بچوں کو تعلیم دلوانا ہے۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں ماسٹر صاحب۔"

ماسٹر حمید کی آنکھیں اس وقت خوشی سے چمک رہی تھیں۔ اسے اپنے خواب پورے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ خواب جو اس نے برسوں پہلے دیکھے تھے۔ پڑھا لکھا محلہ، پڑھا لکھا شہر، صوبہ اور پورا ملک۔

اسے فخر تھا اپنی بستی کی زرین پر... جس نے ذرا سی عمر میں کمال کر دکھایا تھا۔ اس بچی نے اسکول تباہ ہو جانے کے باوجود تعلیم کے سلسلے کو ختم نہیں ہونے دیا تھا۔ خود بھی پڑھتی رہی اور دوسروں کو بھی پڑھاتی رہی تھی۔

ماسٹر حمید کو توانائی مل گئی تھی۔

یہ توانائی پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کے روشن چہروں کی صورت میں تھی۔ ان سب کی آنکھوں میں اچھے مستقبل کے خواب انگڑائیاں لے رہے تھے۔

اس رات کو دو اجنبی اس سے ملنے اس کے گھر آ گئے۔ وہ دونوں ماسٹر حمید کے لیے اجنبی تھے۔ وہ ان دونوں کو نہیں جانتا تھا۔

ماسٹر حمید نے انہیں روایت کے مطابق اپنی بیٹھک میں لے جا کر بٹھا دیا تھا جو گھر سے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی تھی۔

"بتاؤ مجھ سے کیا کام ہے؟" اس نے ان دونوں سے پوچھا۔

"ماسٹر صاحب! کل صبح آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"چلنا ہے، کہاں چلنا ہے؟"

"آپ کو بلایا گیا ہے۔" دوسرے نے بتایا۔

"کھل کر بتاؤ۔ کس نے بلایا ہے؟"

"ہمارے سربراہ نے۔" پہلے نے جواب دیا۔ "اب تو آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہم کون ہیں اور کس نے بھیجا ہوگا ہمیں؟"

ماسٹر حمید کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"لیکن کیوں... تمہارے سربراہ کا ایک ماسٹر سے کیا کام؟"

"تم ہی سے تو کام ہے ماسٹر صاحب۔" دوسرے نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں، جس طرح تم جاؤ گے اسی طرح واپس بھی آ جاؤ گے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"دیکھو دوستو۔" ماسٹر حمید نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ "میں یہاں بچوں کو تعلیم دے رہا ہوں اور علم دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے... اور جو سچائی کے راستے پر چلتے ہیں انہیں کسی سے خوف نہیں ہوتا۔ مجھے بھی کسی سے خوف نہیں ہے اور فرض کرو اگر مجھے کچھ ہو بھی جاتا ہے تو کیا تم تیزی سے بڑھنے والی روشنی کو روک سکو گے؟"

"ہم اتنی باتیں نہیں جانتے ماسٹر صاحب! ہم سے جو کہا گیا ہے، وہ ہم نے تم کو بتا دیا۔"

"ہوں۔" ماسٹر حمید نے ایک ہنکارا ابھرا۔ "فرض کرو اگر میں ساتھ چلنے سے انکار کر دوں تو؟"

''تو پھر بہت نقصان میں رہو گے۔'' ایک نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔ بتاؤ کہاں چلنا ہوگا۔''
''قبرستان کے پاس آجانا۔ ہم وہاں سے تمہیں اپنے ساتھ لے چلیں گے۔'' دوسرے نے بتایا۔ ''لیکن تم کسی کو بتاؤ گے نہیں۔''
''اس کی طرف سے بے فکر رہو۔'' ماسٹر حمید نے کہا۔ ''میں ان میں سے نہیں ہوں جو اپنے ساتھ ساتھ گھر والوں کو پریشان کرے۔ اب تک ساری مصیبتیں برداشت کرتا آیا ہوں تو ایک یہ بھی سہی۔''
وہ دونوں چلے گئے تو وہ اپنی بیٹھک سے گھر میں آگیا۔ اس نے اپنی بیوی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بے چاری یہ سب سن کر پریشان ہوجائے گی۔
اسے اکیلے ہی سب کچھ کرنا تھا۔
لیکن کوئی تو ہو جس سے اس موضوع پر بات کی جائے۔ کوئی تو ہو جو اس کے بعد اس مشن کو آگے بڑھا سکے۔
پھر اسے زرین کا خیال آگیا۔
لیکن وہ بچی کیا کر سکتی تھی؟ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی؟ نہیں، زرین نہیں کوئی اور۔ اور کوئی اور کون ہوسکتا تھا؟ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اس نے خدا سے اپنی حفاظت کی دعا مانگی اور بستر پر لیٹ گیا۔
دوسری صبح وہ اسکول جانے کے بجائے قبرستان کی طرف جارہا تھا جہاں اسے وہ دو آدمی ملنے والے تھے جو اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔
وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں۔ ان سے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ ان کا سامنا... کرنے میں عافیت تھی۔
وہ دونوں ایک جیپ لیے قبرستان کے پاس ہی اس کا انتظار کررہے تھے۔
''واقعی ماسٹر صاحب! آپ ایک بہادر انسان ہیں۔'' ایک نے اس کی تعریف کی۔ ''اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ نہیں آتا۔''
''میری لگن اور میرے جذبے نے مجھے بہادر بنا دیا ہے۔'' ماسٹر حمید نے کہا۔ ''ورنہ میں تو بہت کمزور انسان ہوں۔ اب بتاؤ کہاں چلنا ہے؟''
''بس تھوڑی دور۔'' دوسرے نے کہا۔ ''ہمارا سربراہ آپ کا انتظار کررہا ہے۔''
انہوں نے ماسٹر حمید کو جیپ میں بٹھالیا۔

ماسٹر حمید نے ایک نگاہ دور معدوم ہوتی ہوئی اپنی بستی پر ڈالی۔ اب وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے واپس آنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔

☆☆☆

یہ پوری ٹیم بہت دل شکستہ واپس آئی تھی۔
جمیل کسی طرح آنے کو راضی ہی نہیں تھا۔ اس کی زندگی، اس کی محبت، اس کی لبنیٰ وہیں رہ گئی تھی۔ اسے اٹھا کر لے جایا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔
ان لوگوں نے واپس آکر حکام سے ملاقاتیں کیں۔ اپنی پوری صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ لیکن ان سب کا یہی کہنا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔
''حکومت کم از کم آپریشن تو کرسکتی ہے نا۔'' جمیل نے کہا۔
''آپریشن تو کئی برسوں سے چل رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ لوگ بھی بغیر سوچے سمجھے اس قسم کے حالات میں کود پڑتے ہیں۔ جب آپ کو یہ معلوم تھا کہ وہاں کے حالات صحیح نہیں ہیں تو این جی او کی ٹیم لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟''
''جناب! ہم تو وہاں خدمت کا جذبہ لے کر گئے تھے۔''
''خدمت اس طرح نہیں ہوتی جناب۔ پہلے حالات دیکھے جاتے ہیں۔''
''تو پھر آپ ہی بتائیں، ہم کیا کریں؟''
''کچھ نہیں، وقت کا انتظار۔ ہوسکتا ہے ان کی طرف سے کوئی مطالبہ سامنے آئے۔ اس کے بعد ہی کچھ سوچا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے ہم کیا کرسکتے ہیں؟''
یہ لوگ جہاں جہاں گئے، وہاں سے اسی قسم کی باتیں سننے کو ملتی رہیں۔ پوری ٹیم پریشان تھی لیکن جمیل پر جنون سا سوار ہوگیا تھا۔
''میں واپس جارہا ہوں۔'' اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''میں لبنیٰ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''
''پاگل مت بنو، تمہارے جانے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔''
''تو پھر یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟''
''دعاؤں کے ذریعے۔ دعا کرو کہ خدا اسے اپنی امان میں رکھے اور اسے لے جانے والوں کے دلوں میں اس کی طرف سے رحم آجائے۔ بس یہی ایک راستہ ہے۔''

"آخر کیوں ہوا ایسا؟" جمیل چلّانے لگا۔ "اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟"

"ان لوگوں نے نہیں، صرف ایک یا دو آدمیوں کی سازش ہو سکتی ہے۔" اشرف نے کہا۔ "خود سوچو، کیا لڑکیوں کو اغوا کرنے جیسے حادثے شہروں میں نہیں ہوتے؟ یہاں بھی ہوتے ہیں۔ اچھائی برائی تو ہر جگہ ہے میرے دوست۔ ہر جگہ انسانیت روتی بھی ہے اور انسان اپنے انسان ہونے پر فخر بھی کرتا ہے۔ ہر جگہ ایک جیسا ماحول ہے۔"

"کاش، ایسا کہیں نہیں ہو۔"

"یہ تو ازل سے چلا آرہا ہے، ہابیل اور قابیل کے زمانے سے۔ شر اور نیکی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ ویسے ہم نے اپنی آواز ہر جگہ پہنچادی ہے۔ دعا کرو کوئی راستہ نکل آئے۔"

☆☆☆

ابراہیم نے لبنیٰ کو بہت عزت کے ساتھ رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "میری بہن! تم اپنے لوگوں میں جاؤ تو وہاں بتا دینا کہ ہم عورتوں کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ نواز خان نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا، اس کے لیے ہمیں معاف کردو۔ اس کی اس حرکت نے ہمارے سر جھکا دیے ہیں۔"

"نہیں، اس کی یہ حرکت ایک طرح سے مبارک بھی ثابت ہوئی ہے۔" لبنیٰ نے کہا۔

"وہ کس طرح؟"

"تم جیسا بھائی جو مل گیا ہے۔"

ابراہیم نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بس اب جاؤ، خدا حافظ۔ ہمارے لیے دعا کرتی رہنا۔"

لبنیٰ کو لے جانے کے لیے ایک جیپ کھڑی تھی جس میں دو آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور اور دوسرا محافظ کے طور پر ساتھ چل رہا تھا۔ ابراہیم نے اس دوسرے کا نام حیات بتایا تھا۔ "یہ بہت بھروسے کا آدمی ہے۔"

"ہاں، یہ میرے لیے کھانا لے کر آیا کرتے تھے۔" لبنیٰ نے بتایا۔ "اور اس شریف آدمی نے میری طرف گردن اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"

"میں نے بتایا نا بہن کہ ہر جگہ نواز جیسے لوگ نہیں ہوتے۔" ابراہیم نے کہا۔ "بس اب تم جاؤ۔"

لبنیٰ بھیگی آنکھوں کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئی۔

ابراہیم کے خلوص، پیار اور شرافت نے اس پر بہت اثر کیا تھا۔ اس شخص نے اگر لبنیٰ کو بہن کہا تو اسے ثابت بھی کر کے دکھا دیا تھا۔

جیپ اپنے سفر پر روانہ ہوگئی۔ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں نے جس پہاڑ پر اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا، وہ پہاڑ آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہونے لگا۔

اب حدِ نگاہ تک سنگلاخ اور بے رحم زمینی راستے تھے۔ ایسے راستے جن پر انسانوں کی گزر بہت کم ہوا کرتی۔ راستے میں اچانک پہاڑیاں آجاتیں اور ان پہاڑیوں کو عبور کرنے کے بعد پھر حدِ نگاہ تک بنجر اور سوکھی زمین کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

لبنیٰ سوچ رہی تھی کہ ان علاقوں میں رہنے والوں کی زندگی کتنی دشوار ہوتی ہوگی۔

ڈرائیور اور محافظ حیات باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ جیپ کا اگلا پہیا برسٹ ہو چکا تھا۔

لبنیٰ کا رنگ زرد ہو گیا۔

ڈرائیور اور محافظ حیات نے اپنی بندوقیں سیدھی کرلیں۔

کوئی خطرہ تھا جو ان پہاڑیوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔

اچانک پتھروں کے عقب سے کچھ لوگ بندوقیں لہراتے ہوئے سامنے آگئے۔ وہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اور لبنیٰ نے سب سے آگے والے شخص کو پہچان لیا تھا۔ وہ نواز خان تھا۔

"بہن۔" حیات خان نے لبنیٰ کو مخاطب کیا۔ "تم بالکل بے فکر رہنا۔ نواز نے مکاری کی ہے۔ اس مکاری کا جواب میں مکاری سے دوں گا۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

نواز خان اور اس کے ساتھی اس دوران میں جیپ کے قریب آچکے تھے۔ وہ چار عدد تھے۔ ایک نواز اور تین دوسرے۔

"اوہ، حیات! تو یہ تم ہو۔" نواز نے قریب آکر کہا۔

"ہاں یارا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اس کو حفاظت سے شہر پہنچا دوں لیکن میں تو جانتا تھا۔"

"کیا جانتے تھے؟"

"یہی کہ یہ لڑکی اپنے دوست کی پسند ہے۔" حیات نے کہا۔ "اس لیے میں نے جیپ کی رفتار کم رکھی۔ مجھے یقین تھا کہ راستے میں کہیں نہ کہیں تم سے ضرور ملاقات ہو جائے گی۔"

"حیات! تم کوئی دھوکے والی بات تو نہیں کر رہے؟"

"کیا پاگل ہو گئے ہو... کیسا دھوکا؟ میں دوست ہوں تمہارا۔" حیات خان نے کہا۔ "تم اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں ابراہیم کو جواب دے لوں گا۔"

"اور یہ۔" نواز خان نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کرم خان بھی اپنا ہی آدمی ہے۔" حیات نے بتایا۔ "یہ وہی کہے گا جو میں کہوں گا۔ جاؤ، اس کو ساتھ لے جاؤ۔ تم لوگوں نے خوامخواہ جیپ کا ٹائر برباد کر دیا۔ اب دوسرا ٹائر لگانا ہوگا۔"

نواز خان نے اپنی بندوق کاندھے پر ڈالی اور سہمی ہوئی لبنیٰ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اور اچانک دو گولیاں چلیں اور نواز خان ایک مکروہ چیخ کے ساتھ ایک طرف لڑھک گیا۔ حیات خان نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی جیب سے آٹومیٹک ریوالور نکال کر نواز خان پر گولیاں چلا دی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے سناٹا ہو گیا۔ صرف گولیوں کی بازگشت تھی۔ نواز خان کے ساتھی سکتے میں رہ گئے۔ پھر جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے حیات خان پر فائر کھول دیا۔

☆☆☆

زرین نے پھر اپنی کاپی میں لکھا تھا۔

"شہزادی کے راستے میں پھر رکاوٹیں تھیں۔ وہ ایک پہاڑ عبور کرتی تو دوسرا پہاڑ اس کے سامنے آجاتا۔ لیکن وہ باہمت تھی۔ اس نے منزل تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"اس نے ایک رات خواب دیکھا تھا کہ وہ جن اندھیروں میں ہے، اس سے نجات کا راستہ یہ ہے کہ وہ سات پہاڑوں کو عبور کر کے ایک جزیرے پر پہنچ جائے۔ اس جزیرے پر ایک شمع روشن ہے صدیوں سے۔ اسے وہ شمع حاصل کرنی ہے۔ بس اس شمع کے ہاتھ آتے ہی اندھیرے دور ہو جائیں گے۔"

نیند سے بیدار ہو کر وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ پھر خدا کا نام لے کر ایک طرف چل پڑی۔

بہت دشوار سفر تھا اس کا۔ دشوار اور خطرناک۔ لیکن وہ چلتی جا رہی تھی۔ ہر قسم کے خطروں سے بے نیاز ہو کر۔ اسے ہر حال میں وہ شمع حاصل کرنی تھی۔ ورنہ اندھیرے اس کا مقدر ہو کر رہ جاتے۔

بالآخر سات پہاڑوں کو عبور کر لینے کے بعد اسے وہ جزیرہ دکھائی دے گیا جس کے چاروں طرف خون تھا۔ وہ جزیرہ خون کے دریا کے درمیان تھا۔

اور اسے خون کا یہ دریا عبور کر کے اس جزیرے تک پہنچنا تھا۔

آدھی کہانی لکھنے کے بعد اس نے اپنی کاپی بند کر دی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ جن لوگوں کی معرفت اپنا پیغام باہر کی دنیا تک پہنچا رہی ہے، وہ لوگ جا چکے ہیں۔

کیونکہ ان پر تشدد کیا گیا تھا اور گل زمان جس لڑکی کو اس کی کاپیاں لے جا کر دیا کرتا، اس لڑکی کو اغوا کر لیا گیا تھا۔

زرین کو یہ سب سُن کر بہت دکھ ہوا تھا۔

وہ سوچتی رہ گئی تھی کہ آخر انسان کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پاتا؟ کیوں ظلم کرتا ہے؟

اس نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ جب خدا نے انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا۔ "اے اللہ! تو کس مخلوق کو پیدا کر رہا ہے۔ جو زمین پر جا کر فساد برپا کرے گی۔"

تو آج فرشتوں کی یہ بات کتنی سچ ثابت ہو رہی تھی۔ یوسف کبھی کبھی اس کے لیے اخبار لے کر آیا کرتا جن میں سوائے موت کی خبروں کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

انسان، انسان کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ کاٹ رہا تھا۔ مار رہا تھا۔

ماسٹر حمید کا اسکول تو دوبارہ شروع ہو چکا تھا لیکن ابھی اس میں اسکولوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بس ایک ٹیوشن سینٹر جیسا تھا لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ اس ماحول میں ماسٹر حمید نے علم کا چراغ جلائے رکھا تھا۔

اس کی ماں اس وقت کھانا بنانے میں مصروف تھی جبکہ وہ خود اپنی لکھی ہوئی کاپیوں اور اپنی کتابوں کے درمیان الجھی ہوئی تھی۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔

اس کا باپ یوسف شہر گیا ہوا تھا۔ اتنی جلدی اس کے واپس آنے کا امکان نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہ کون تھا؟ اس نے دروازہ کھولا۔ گل زمان چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے دروازے پر کھڑا تھا جیسے وہ دوڑتا ہوا چلا آرہا ہو۔

"کیا بات ہے گل زمان؟ تم اتنا پریشان کیوں ہو؟"

"زرین! ہمارے گھر میں وہی آئی ہیں۔" گل زمان نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

"کون آئی ہیں؟"

"وہی جن کو میں تمہاری کا پیاں دیا کرتا تھا۔ جو کیمپ میں تھیں۔"

حیات خان کی لاش کے ساتھ اور بھی کئی لاشیں تھیں۔ نواز خان اور اس کے تینوں ساتھیوں کی۔ نواز خان کے ساتھی جب حیات کی طرف متوجہ تھے تو اس وقت ڈرائیور کرم خان نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔

اس نے بہت خاموشی اور تیزی کے ساتھ اپنا ریوالور نکالا اور ان تینوں کو مہلت دیے بغیر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

اس ویرانے میں اب لاشیں تھیں اور خون تھا۔

موت نے اپنا رقص دکھا دیا تھا۔ ایک بھیانک اور وحشت انگیز رقص!

لبنیٰ سکتے کے عالم میں تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ وہ اپنے سامنے لاشیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے یہ زندہ لوگ تھے لیکن اب لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔

"ایسے بے غیرتوں کا مر جانا بہتر ہے۔" ڈرائیور کرم خان کی آواز آئی۔ "بس حیات خان کی موت کا افسوس ہے بی بی۔ لیکن وہ بہادر آدمی تھا۔ اس نے شہادت کی موت پائی ہے۔"

"ہاں۔" لبنیٰ نے غیر ارادی طور پر گردن ہلا دی۔

"حیات خان نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اس مرحوم کے وعدے کو میں نبھاؤں گا۔ تم بالکل اطمینان رکھو۔ لیکن ہمارا ٹائر پنکچر ہو چکا ہے۔ اب ایک کام ہو سکتا ہے۔ پہلے یہ بتاؤ، تم کو مجھ پر بھروسا ہے یا نہیں؟"

"ہاں، ہاں بھروسا ہے۔" لبنیٰ نے پھر لاشعوری طور پر گردن ہلا دی۔

"تو میرے ساتھ چلو۔ کچھ پیدل چلنا پڑے گا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ماسٹر حمید کی بستی ہے۔ تم وہاں آرام کر و گی۔ تم کو وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا، آؤ۔"

لبنیٰ بڑی مشکلوں سے جیپ سے اتری تھی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس کے لیے ان لاشوں کی طرف دیکھنا بھی محال ہو رہا تھا۔ یہ خاک اور خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں تھیں۔

انسان اور انسان میں بھی کتنا فرق ہوا کرتا ہے۔ ایک نواز تھا جو اس کی عزت تاراج کرنا چاہتا تھا اور ایک ابراہیم، حیات خان اور یہ ڈرائیور کرم خان تھے جو اس کی عزت کے محافظ بنے ہوئے تھے۔

"چلو بی بی۔" کرم خان نے کہا۔ "تھوڑی ہمت کرو۔ بستی زیادہ دور نہیں ہے۔"

لبنیٰ اس کے ساتھ چل پڑی۔

ایک نئے سفر میں۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ لیکن بہت دیر سفر کے بعد جب ایک بستی کے آثار دکھائی دیے تو اس کی جان میں جان آگئی۔

اور بستی میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے گل زمان کو دیکھا جو پاگلوں کی طرح شور کرتا ہوا اس سے آکر لپٹ گیا تھا۔

☆☆☆

"باجی، آپ نے مجھے پہچانا؟" ایک پیاری سی بچی نے لبنیٰ کو مخاطب کیا۔

لبنیٰ کی حالت اب سنبھل چکی تھی۔ کرم خان اسے ماسٹر حمید کے گھر پہنچا کر واپس چلا گیا تھا۔ ماسٹر حمید اور اس کے گھر والوں نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا تھا۔

سب سے پہلے اسے نئے کپڑے دیے گئے تاکہ وہ نہا کر کپڑے بدل کر تازہ دم ہو جائے۔ اس کے بعد اسے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا گیا۔

اس دوران میں ماسٹر حمید اس سے اس کے حالات معلوم کرتا رہا تھا۔ پھر ماسٹر حمید نے اپنی جدوجہد کے بارے میں بتایا کہ کس طرح اسکول کی تباہی کے بعد اس نے بچوں کی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

لبنیٰ اس سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

اس دوران میں ایک پیاری سی بچی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ "باجی، آپ نے مجھے پہچانا؟"

"نہیں بیٹا۔"

"میرا نام زرین ہے لیکن آپ مجھے شہزادی کے نام سے جانتی ہیں۔"

"کیا؟" لبنیٰ اچھل پڑی۔ "تم... تم ہو شہزادی؟"

"جی باجی۔"

لبنیٰ نے اپنی بانہیں کھول دیں۔ زرین اس کے بازوؤں میں سمٹ آئی تھی۔ لبنیٰ نے اس کی پیشانی کو چومنا شروع کر دیا۔

وہ رو رہی تھی۔ زرین رو رہی تھی۔ ماسٹر حمید رو رہا تھا۔

"میری بچی، جب تک ان علاقوں میں تم جیسا نیا سورج طلوع ہوتا رہے گا، یہاں کبھی اندھیرا نہیں ہوگا... کبھی نہیں۔"

مہنگی بھول

کاشف زبیر

واقعات و حالات کی اپنی منطق ہوتی ہے... انہیں بدلنا... اپنی مرضی سے موڑ دینا انسان کے بس کی بات نہیں... ایسی ہی بھول بھلیوں میں الجھ کر راستہ بھٹک جانے والی دوشیزہ کی داستان... دوسروں کی خامیوں اور اپنی لغزشوں نے اس کی زندگی کو ایسے راستوں پر پہنچا دیا... جہاں پہنچنے کے بعد واپسی کے راستے نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں... اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب تباہی کے سوا کوئی اختتام نہیں... دائرے در دائروں کا سفر... خدشات و اندیشوں کی سبیل کا انتظار

اس مہنگی بھول کا نفع و نقصان...... جو

یادداشت میں گرہ بن کر اٹک گئی تھی

ساحل کے ساتھ ذرا بلندی سے گزرنے والے زیر تعمیر برج پر ایک کار آکر رکی اور اس میں سے دو افراد اترے۔ اپنے خدوخال سے وہ جنوبی ایشیا کے لگ رہے تھے۔ موسم کسی قدر سرد تھا۔ شاید اسی لیے وہ ہلکی جیکٹوں میں تھے۔ ایک طویل قامت جوان تھا۔ اس کی عمر تیس کے آس پاس تھی جبکہ دوسرا چالیس کا تھا۔ وہ درمیانے قد مگر بہت مضبوط باڈی بلڈرز جیسے جسم کا مالک تھا۔ طویل قامت نے سگریٹ سلگایا اور آس پاس کا جائزہ لیا۔ برج روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ دور شہر کی روشنیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ برج شہر سے باہر تھا اور یہ اصل میں دو ریاستوں کو ملانے کے لیے تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اس چھوٹی سی خلیجی ریاست میں تعمیرات کا کام بڑے پیمانے پر جاری تھا۔ سڑکیں، پل اور عمارات تعمیر ہو رہی تھیں۔ ساری دنیا سے پیسا کھنچ کر یہاں آرہا تھا اور ساری دنیا سے لوگ روزگار کے لیے یہاں کا رخ کر رہے تھے۔ مضبوط جسم والے نے طویل قامت سے کہا۔

"کوئی نہیں ہے، آؤ اپنا کام کریں۔"

طویل قامت نے جیب سے ایک سرنج نکالی۔ اس میں نیم شفاف محلول پہلے سے موجود تھا اور سوئی پر کیپ لگی ہوئی تھی۔ اس نے سر ہلایا تو مضبوط جسم والے نے کار کی ڈکی کھولی۔ اس میں ایک لڑکی گٹھری بنی پڑی تھی۔ لڑکی کے بدن پر جینز اور شرٹ تھی۔ جیسے ہی مضبوط جسامت والے نے اسے اٹھانا چاہا، اس نے اچانک گھومتے ہوئے ہاتھ گھمایا تو مضبوط جسم والا لڑکھڑا کر پیچھے آیا۔ لڑکی کے ہاتھ میں دبا پانا اس کے سر پر لگا تھا۔ طویل قامت بوکھلایا اور لڑکی ڈکی سے کود کر بھاگی۔ پانا زیادہ بڑا نہیں تھا اور وار بھی ٹھیک سے نہیں لگا تھا اس لیے مضبوط جسم والا جلد سنبھل گیا۔ وہ دونوں لڑکی کے پیچھے بھاگے۔ لڑکی جوان اور صحت مند تھی۔ وہ بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ اس کے لائٹ براؤن بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ دونوں بھی پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ لڑکی کا رخ زیرِ تعمیر حصے کی طرف تھا، وہاں سے ایک سیڑھی نیچے جا رہی تھی۔

دونوں جان توڑ بھاگ رہے تھے لیکن لڑکی ہر لمحے ان سے دور ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ان سے بچ کر نکل جائے گی۔ وہ بہت اچھی رنر تھی مگر جب وہ سیڑھیوں کے پاس تھی، اچانک اس کا پاؤں کسی چیز پر آیا۔ وہ نیچے گری اور لڑھکتی ہوئی تاریک خلا میں چلی گئی۔ پھر اس کی چیخ سنائی دی۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے کنارے تک پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکی نیچے گر گئی ہوگی مگر وہ ایک نکلے ہوئے سریے کے سہارے لٹک رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”پلیز... پلیز...“

طویل قامت کنارے پر بیٹھ کر آگے جھکا اور اس نے اچانک سرنج کی سوئی لڑکی کی گردن میں اتار دی۔ وہ چلائی مگر اس نے سریا نہیں چھوڑا۔ نیچے زمین سو فٹ دور تھی اور وہاں پتھر ہی پتھر تھے۔ ان پر گرنے کا مطلب سوائے اذیت ناک موت کے اور کچھ نہیں تھا۔ طویل قامت نے سرنج کیپ لگا کر واپس جیب میں رکھ لی۔ مضبوط جسم والا لڑکی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور وہ خود پر قابو رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انجکشن میں موجود محلول اس پر اثر کر رہا تھا۔ بالآخر اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور ہوئی اور وہ بے جان انداز میں نیچے گرتی چلی گئی۔ چند لمحے بعد دھپ کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز آئی۔ انہوں نے نیچے جھانکا۔ ایک بڑے پتھر پر لڑکی کا جسم بے جان انداز میں پڑا ہوا تھا۔ دونوں پلٹ کر کار کی طرف چل پڑے۔

☆☆☆

برج کے نیچے دن کی روشنی نمودار ہوئی اور زندگی کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ اب وہاں پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور چاروں طرف پھیلے پولیس والے شواہد جمع کر رہے تھے۔ لڑکی کی چادر سے ڈھکی لاش کے پاس کچھ پولیس والے موجود تھے۔ اتنے میں ایک کار وہاں آ کر رکی اور اس سے سادہ لباس میں ایک شخص اتر کر آگے آیا۔ اس نے پولیس والوں کو اپنا کارڈ دکھایا۔ ”عابد روزالی... شعبۂ قتل۔“

پولیس والے مستعد ہو گئے۔ ایک نے لاش کے چہرے سے کپڑا الٹ کر دکھایا۔ منہ کے بل گرنے کی وجہ سے چہرہ شدید متاثر ہوا تھا۔ عابد نے لاش کا معائنہ کیا اور پوچھا۔ ”کوئی شناختی چیز ملی ہے؟“

پولیس والے نے شاپر میں موجود وہ چیزیں اس کی طرف بڑھا دیں جن میں لڑکی کے پاس سے ملنے والی تمام چیزیں تھیں۔ ایک جاب کارڈ تھا جس پر سائٹ میرین انٹرنیشنل لکھا تھا۔ کارڈ پر سیما رضی لکھا ہوا تھا۔ تصویر کے مطابق وہ خوش شکل لڑکی تھی۔ عمر چوبیس سال تھی اور تعلق پاکستان سے تھا۔ اس کے علاوہ چابیوں کا ایک گچھا تھا۔ اس میں کار اور کسی گھر کی چابیاں تھیں۔ موبائل یا کوئی اور چیز نہیں ملی تھی۔ عابد روزالی نے سامان اپنے قبضے میں کر لیا اور لاش اٹھانے کا حکم دے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ یہ اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ وہ آئے دن لاشیں دیکھتا تھا اور ان میں سے اکثر غیر ملکیوں کی ہوتی تھیں کیونکہ اس کے ملک میں مقامی لوگوں سے دس گنا زیادہ تعداد میں غیر ملکی رہتے تھے۔

☆☆☆

شاکر رضی اٹھا تو اس کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ رات دیر سے سویا تھا۔ شاکر پینتالیس برس کا صحت مند اور سنجیدہ مزاج شخص تھا۔ اس کے بال کن پٹیوں سے سفید ہو چلے تھے مگر یہ بھی اچھے لگ رہے تھے۔ چہرہ اس عمر میں بھی بے داغ اور جھریوں سے پاک تھا۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ دارالحکومت کے انڈسٹریل ایریا میں اس کی ایک گارمنٹ فیکٹری تھی۔ فیکٹری میں تیار ہونے والا مال مکمل طور پر ایکسپورٹ ہوتا تھا اور مغربی ممالک کو بھیجا جاتا تھا۔ وہ صبح سے رات گئے تک مصروف رہتا تھا۔ مگر کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ وہ کس کے لیے اتنی تگ و دو کر رہا ہے۔ وہ اکیلا تھا۔ پچیس برس پہلے اس نے شادی کی تھی اور یہ محبت کی شادی

تھی۔ وہ اور کرن ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے اور تقریباً ہم عمر تھے۔ نوعمری کی اس محبت نے انہیں ایسا مغلوب کیا کہ وہ کورٹ میرج کر بیٹھے۔

کرن کا تعلق کراچی سے تھا۔ وہ پڑھنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے خاندان سے تھا جبکہ شاکر مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ماں باپ ایک حادثے میں گزر گئے تھے اور اس کی پرورش اس کے دادا نے کی تھی۔ شادی کے دو سال بہت مشکل گزرے تھے۔ ابتدائی رومان ہوا ہونے کے بعد اب وہ بات بات پر لڑتے تھے اور ایک دوسرے سے بیزار تھے۔ ایک سال بعد بیٹی ہوئی اور اس کے چند مہینے بعد کرن بیٹی کو لے کر ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل گئی۔ جب اسے کراچی کی ایک عدالت سے خلع کا نوٹس آیا تو اس نے طلاق بھجوا دی۔ اب اسے خیال آتا تھا کہ اس نے اس معاملے میں شروع سے حماقت کی تھی۔ اول تو دورانِ تعلیم محبت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر یہ جواز مان لیا جائے کہ محبت پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا، تب بھی اسے کورٹ میرج نہیں کرنی چاہیے تھی۔

اصل میں اسے کرن نے مجبور کیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے گھر والے نہیں مانیں گے اس لیے وہ کورٹ میرج چاہتی تھی۔ جب خمارِ محبت اترا اور زندگی کے تلخ حقائق سامنے آئے تو ان میں لڑائیاں شروع ہو گئیں اور بالآخر رشتے کے خاتمے پر ختم ہوئیں۔ اس صدمے نے شاکر کے واحد رشتے دار یعنی دادا کی جان لے لی تھی۔ اسے شادی کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ پھر وہ غمِ روزگار میں مبتلا ہو گیا۔ اتفاق سے اس نے پہلی ملازمت ہی ہوزری کی فیلڈ میں کی اور دس سال تک اس کے ہر شعبے میں کام کرنے کے بعد اس نے کچھ جمع پونجی اور کچھ قرض لے کر اپنا پہلا یونٹ لگایا۔ یہ بارہ سال پرانی بات تھی اور اس کے بعد اس نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ آج وہ خراب ترین کاروباری حالات میں بھی کامیاب تھا مگر اس صبح وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ کامیاب ہے؟ اس کے پاس سوائے دولت کے اور کیا تھا؟ اس کے پاس اپنے لیے وقت بھی نہیں تھا۔

اسے بے اختیار کرن اور اپنی بیٹی یاد آئیں۔ اس نے آخری بار سیما کو چھ سال پہلے دیکھا تھا جب اس نے آئی ٹی میں بیچلر کی ڈگری بہت اعزاز سے حاصل کی تھی۔ پورے بورڈ میں اس کی پوزیشن نویں آئی تھی اور ڈگری کی تقریب میں وہ بھی شامل ہوا تھا۔ اسے اطلاع دینا مجبوری تھی کیونکہ یونیورسٹی کی شرط تھی کہ اگر باپ موجود ہے تو اسے لازمی اس تقریب میں شریک ہونا ہے اور یونیورسٹی کے ریکارڈ میں وہ زندہ تھا۔ سیما، کرن کی دوسری تصویر تھی۔ وہ اس سے کسی قدر سرد انداز میں ملی تھی۔ دونوں باپ بیٹی کے درمیان بس چند الفاظ کا تبادلہ ہوا۔ ان کے رشتے میں بہت فاصلہ حائل تھا۔ اس سے پہلے اس نے بس دو بار سیما کو دیکھا تھا۔ اس ملاقات میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ سیما کی زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے اس نے دوبارہ سیما سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی کرن کو پسند نہیں تھا کہ سیما اس سے ملے۔ اس نے خود ملازمت کر کے سیما کی پرورش کی تھی اور اس معاملے میں اپنے بھائی کا احسان نہیں لیا تھا۔ تین سال پہلے اسے کسی اور ذریعے سے اطلاع ملی کہ کرن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسے ڈینگی ہو گیا تھا جو بروقت تشخیص نہ ہونے سے بگڑ گیا۔ شاکر نے کرن کے بھائی سے رابطہ کرنا چاہا تاکہ اپنی بیٹی کے بارے میں معلوم کر سکے۔ جواب میں اسے سیما کا ایک خط ملا جس میں اس نے صرف ایک سطر میں اپنا پیغام لکھا تھا۔

”میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

اس واضح جواب کے بعد وہ پھر رابطے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اب اسے نہیں معلوم تھا کہ سیما کہاں اور کیا کر رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا تو حالت بہتر ہوئی۔ ایک ناکام تجربے کے بعد اس نے دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔ کئی بار سوچا اور بس سوچ کر رہ گیا۔ ایک پوش بستی میں اس کی کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کے لیے کافی تھی۔ وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو باورچی امان ناشتا بنا چکا تھا۔ اس نے میز پر ناشتا لگایا اور اس کے سامنے آج کا اخبار رکھا۔ فرنٹ پیج پر ایک چھوٹی خبر تھی۔ خلیجی ریاست میں ایک پاکستانی لڑکی پراسرار حالات میں ہلاک۔ خبر میں نہ تو تصویر تھی اور نہ ہی کوئی تفصیل... اس لیے وہ سرسری نظر سے دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ فیکٹری میں اپنے دفتر میں تن دہی سے کام میں مصروف تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”شاکر رضی...؟“ دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔

”بات کر رہا ہوں۔“

”میں محکمۂ خارجہ سے نایاب حسن بات کر رہا ہوں۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دینی ہے۔ آپ کی بیٹی سیما رضی بیرونِ ملک ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی ہیں اور ان کی لاش جلد پاکستان لائی جا رہی ہے۔“

شاکر کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا۔

☆☆☆

مردہ خانے میں شاکر، نایاب حسن کے ساتھ موجود تھا۔ اس کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ لاش چند گھنٹے پہلے ایک پرواز سے تابوت میں بند آئی تھی۔ اسے اس سرکاری اسپتال کے مردہ خانے میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والی رپورٹ کے مطابق اس کی موت نشے کی حالت میں بلندی سے گرنے سے ہوئی تھی۔ اس کے خون میں ہیروئن خاصی مقدار میں پائی گئی تھی۔ خلیجی پولیس نے اسے حادثہ قرار دیا تھا۔ لاش لکڑی کے سادہ تابوت میں تھی اور پلاسٹک کے کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ کیونکہ لاش کئی دن پہلے کی تھی اس لیے اسے خراب ہونے سے بچانے کے لیے سردخانے میں رکھا گیا تھا۔ مردہ خانے کے انچارج نے چہرے کی طرف سے کفن کی زپ اتارنی شروع کی تو نایاب حسن نے اسے خبردار کیا۔ ''زیادہ نیچے تک مت کھولنا... بس چہرہ نمایاں ہو۔''

نایاب حسن کا مقصد تھا کہ لڑکی کا جسم نمایاں نہ ہو کیونکہ کفن کے اندر اور کچھ نہیں تھا۔ انچارج نے احتیاط سے بس چہرے سے پلاسٹک ہٹایا۔ جو سامنے آیا، وہ کوئی اچھا نظارہ نہیں تھا۔ شاکر نے دیکھا نہیں، اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر نایاب حسن اور انچارج بھی پیچھے ہوگئے۔ نایاب حسن نے شاکر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اگر تم چاہو تو اکیلے میں دیکھ سکتے ہو۔''

''پلیز۔'' شاکر نے آہستہ سے کہا تو وہ دونوں باہر چلے گئے۔ تابوت فرش پر رکھا تھا۔ شاکر جھکا اور اس نے پلاسٹک ہٹایا۔ ایک لمحے کو اسے چکر آگیا۔ چوٹوں کی وجہ سے چہرہ رر ہو رہا تھا۔ پھر اس نے آنسو صاف کر کے دیکھا۔ چھ سال ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے اور پھر نقوش بھی واضح نہیں تھے۔ البتہ بالوں کا رنگ وہی تھا۔ رنگت بھی سیما جیسی تھی۔ اس نے ہمت کر کے اس کا سر دائیں طرف گھمایا اور پھر اس کے بائیں کان کے پیچھے والا حصہ دیکھا۔ شاکر نے ایک گہری سانس لی اور کھڑا ہوگیا۔ وہ مردہ خانے کے سرد ماحول سے نکل کر باہر آیا۔ نایاب حسن اور مردہ خانے کا انچارج باہر موجود تھے۔ شاکر ان کے پاس آیا۔ ''کیا یہی لاش باہر سے آئی ہے؟''

''سوفیصد۔'' نایاب نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم دیکھ سکتے ہو، تابوت پر ائرلائن کا مارک ہے اور پرچی بھی لگی ہے۔ کفن بھی باہر کا ہے۔''

''یہ میری بیٹی کی لاش نہیں ہے۔'' شاکر نے کہا تو اس بار دونوں چونک گئے۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' انچارج بولا۔ ''غلطی کا سرے سے امکان نہیں ہے کیونکہ یہ واحد لاش ہے جو کسی لڑکی کی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں صرف ایک عورت کی لاش ہے جو بہت بوڑھی ہے اور اس کے بچوں کی باہر سے آمد کے انتظار میں اسے یہاں رکھا گیا ہے۔''

شاکر اور نایاب حسن نے انچارج کی بات پر قائل ہونے کے بجائے اپنا اطمینان کیا۔ پھر نایاب حسن نے شاکر سے سوال کیا۔ ''تم کس بنا پر اسے اپنی بیٹی ماننے سے انکار کر رہے ہو؟''

شاکر اسے لاش تک لایا اور اس کے بائیں کان کے پیچھے والا حصہ دکھایا۔ ''سیما کے کان کے پیچھے یہاں ایک سرخ رنگ کا تل تھا اور اس لڑکی کے کان کے پیچھے نہیں ہے۔''

نایاب حسن نے گہری سانس لی۔ ''میں انکوائری کرواتا ہوں کہ ایسی غلطی کیوں ہوئی۔''

''انکوائری سے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔'' شاکر نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خود وہاں جانا ہوگا۔''

☆☆☆

ائرپورٹ پر کسٹم اور امیگریشن کے مراحل سے گزر کر وہ باہر آیا اور اس نے ایک ٹیکسی والے سے پولیس ہیڈکوارٹر چلنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ہیڈکوارٹر کے سامنے اتر رہا تھا۔ بہت خوب صورت شیشوں اور ماربل سے بنی اس عمارت سے تحفظ اور قانون کی بالادستی کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاکر کو اپنے وطن کے تھانوں کا خیال آیا جن سے خوف آتا تھا۔ جن کے در و دیوار سے بے حسی اور سفاکی ٹپکتی تھی۔ یہاں لوگ یوں بے فکری سے آ جا رہے تھے جیسے یہ کوئی عام سرکاری دفتر ہو۔ وہ اندر آیا۔ استقبالیہ پر ایک عورت تھی۔ اس نے بھی مقامی پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔ شاکر نے پاسپورٹ سامنے کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ''مجھے عابد روزالی سے ملنا ہے۔''

''کس سلسلے میں؟'' عورت نے پاسپورٹ دیکھ کر پوچھا۔

''سیما رضی کیس کے سلسلے میں۔''

''آپ وہاں بیٹھیں۔'' عورت نے فون اٹھاتے ہوئے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ شاکر کو دس منٹ انتظار کرنا پڑا پھر عورت نے اسے اشارہ کیا۔ وہ

اٹھ کر آگے آیا۔ عورت نے اسے ایک چٹ دی۔ ''بارہ نمبر میں چلے جائیں۔ سامنے سے دائیں طرف ہے سیدھے ہاتھ پر۔''

اس نے بارہ نمبر پر دستک دی تو عابد نے خود دروازہ کھولا۔ شاکر نے چٹ سامنے کر دی۔ اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ ''اندر آؤ۔''

شاکر میز کے دوسری طرف بیٹھا تو عابد نے بلا تمہید کہا۔ ''پاکستان سے اس سلسلے میں انکوائری آئی تھی اور یہاں سے اس کا جواب بھی گیا تھا۔''

''میں نے دیکھا ہے۔'' شاکر نے کہا۔ ''لیکن میں مطمئن نہیں ہوں اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔''

عابد نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم کیوں مطمئن نہیں ہو مسٹر رضی؟''

''سیما کے بائیں کان کے پیچھے ایک سرخ تل تھا۔ لاش کے کان کے پیچھے وہ تل نہیں ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اسے سیما کی لاش کیوں تسلیم کیا؟''

''کیونکہ اس کے پاس سے سیما رضی کا جاب کارڈ ملا تھا۔ اس کی ملازمت کا بیج جو اس نے واپس نہیں کیا تھا اور اس کے علاوہ اس کے فلیٹ اور گاڑی کی چابیاں ملیں۔''

شاکر چونکا۔ ''وہ یہاں جاب کرتی تھی؟''

''بالکل... وہ آئی ٹی پروفیشنل تھی۔'' عابد نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تمہاری بات سے لگ رہا ہے کہ تم اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔''

شاکر نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے اور سیما کے بارے میں بتایا۔ عابد نے تعجب سے کہا۔ ''تب اس نے اپنے ماموں کے بجائے وارث میں تمہارا نام کیوں دیا؟''

''میں نہیں جانتا، وہ کہاں جاب کرتی تھی؟''

''سائٹ میرین انٹرنیشنل نامی فرم میں... یہ شپنگ فرم ہے۔ اتفاق سے اس کا مالک بھی ایک پاکستانی ہے۔ سیما نے تین مہینے پہلے یہاں سے ملازمت چھوڑ دی تھی۔''

''تب اس کے پاس کمپنی کا کارڈ کیوں تھا؟''

عابد نے شانے اچکائے۔ ''ممکن ہے اس نے واپس نہ کیا ہو۔''

''ان دنوں وہ کیا کر رہی ہے؟''

''کر رہی تھی۔'' عابد نے تصحیح کی۔ ''مسٹر رضی، پولیس اس کیس کو بند کر چکی ہے۔''

''میری بیٹی زندہ ہے اور وہ یہیں ہے۔'' شاکر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تم صرف ایک تل کی بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہو جبکہ آج کل لڑکیاں اور عورتیں اپنے اس قسم کے تل با آسانی ختم کرا سکتی ہیں۔ بس چند منٹ لگتے ہیں۔ کیا سیما ایسا نہیں کر سکتی ہے؟'' عابد نے کہا۔ ''پولیس نے صرف کاغذات کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس کی سابق کمپنی اور اس کے گھر تک گئی۔ اس کا گھر خالی ہے، مطلب وہاں کوئی نہیں ہے۔ البتہ اس کا سامان پورا تھا۔ اگر یہ لاش سیما کی نہیں تھی تو وہ کہاں گئی؟ اپنے تمام کاغذات چھوڑ کر وہ کہاں چلی گئی اور اس کا جاب کارڈ اس لڑکی کے پاس کیوں ہے؟ اس کا پاسپورٹ اور یہاں رہائش و ملازمت کا اقامہ اس کے گھر میں موجود تھا جو تابوت کے ساتھ بھجوایا گیا ہے۔ وہ یہاں آزاد ویزے پر رہ رہی تھی۔ اس کی تمام تصاویر لاش سے میچ کر رہی تھیں۔''

شاکر خاموشی سے سن رہا تھا، اس نے مزید بحث سے گریز کیا اور پوچھا۔ ''پولیس رپورٹ میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ وہ کہاں رہتی تھی؟''

''اس کے پاس سے پتا نہیں ملا تھا۔ پولیس نے کمپنی سے اس کا پتا لیا۔ ایک منٹ...'' عابد نے دراز سے ایک شاپر نکالا جس میں سیما کا جاب کارڈ اور چابیوں کا گچھا تھا۔ ''لاش کے پاس سے یہ چیزیں ملی تھیں۔''

شاکر نے غور سے دیکھا۔ ''کوئی پرس یا رقم نہیں ملی؟''

عابد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔''

''رپورٹ کے مطابق وہ ہیروئن کے زیرِاثر تھی... کیا اس کے پاس سے ایسی کوئی چیز ملی جس سے یہ بات ثابت ہو؟''

''نہیں... اس نے انجکشن سے ہیروئن انجیکٹ کی تھی۔ یہ اہم بات نہیں ہے۔ اکثر نشے باز نشہ کر کے سامان ضائع کر دیتے ہیں ورنہ پکڑے جانے کی صورت میں یہ سامان ان کے خلاف فرد جرم بن جاتا ہے۔''

شاکر سوچ میں پڑ گیا۔ اسی اثنا میں عابد نے کیس کی فائل اس کے سامنے رکھی۔ ''اس میں سب کچھ ہے... تصاویر بھی ہیں۔''

شاکر نے فائل دیکھی۔ اس میں پوسٹ مارٹم اور پولیس رپورٹ تھی۔ آخر میں لاش کی کئی زاویوں سے کھینچی ہوئی تصاویر بھی تھیں۔ شاکر کو دیکھ کر تکلیف ہوئی کہ ان میں جسم کے پوشیدہ حصوں کی تصاویر بھی تھیں جہاں زخم آئے تھے۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کی لاش تابوت میں بند ہو کر

پاکستان آئی تھی اور اس وقت سرد خانے میں پڑی ہوئی تھی۔ موت کی وجہ بلندی سے گرنے پر سر کی شدید چوٹ تھی۔ اس کی چند پسلیاں اور ایک ہاتھ کی ہڈیاں بھی ٹوٹی تھیں مگر موت کی وجہ سر کی چوٹ تھی۔ خون میں شامل ہیروئن کی مقدار بھی غیر مہلک تھی۔ عابد اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”لڑکی ہیروئن کی عادی تھی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ شاکر کھڑا ہو گیا۔ ”کیا تم مجھے اس کا پتا دو گے؟“

عابد نے ایک کاغذ پر پتا لکھ دیا۔ ”پولیس نے وہاں کی تلاشی لی تھی مگر وہاں سے کچھ نہیں ملا۔“

”پولیس نے وہاں سے کچھ اٹھایا تھا؟“

”میں نے کہا نا، وہاں سے کچھ نہیں ملا اس لیے کچھ اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ عابد اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ شاکر نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

شاکر باہر نکل آیا۔ اس نے عابد کے رویے سے محسوس کر لیا تھا کہ پولیس اپنے طور پر کیس بند کر چکی ہے اور وہ اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ وہ یہاں غیر ملکی تھی اور اس کی لاش وطن بھیج کر پولیس نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اگر وہ مقامی ہوتی تو شاید پولیس زیادہ تن دہی سے کیس کی تفتیش کرتی مگر اب سیما کی تلاش میں اسے جو کرنا تھا، خود کرنا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے؟ وہ ٹیکسی لے کر سیما کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ عمارت اسی شہر کے ایک پوش حصے میں تھی اور یقیناً یہاں رہائش خاصی مہنگی تھی۔ عمارت کثیر المنزلہ تھی۔ وہ لفٹ سے بارھویں فلور پر آیا۔ اسے یہاں بارہ سو بیس نمبر فلیٹ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ شاپر میں چابیوں کا گچھا تھا اس میں فلیٹ کی چابی بھی تھی۔ اصل میں فلیٹ کی صرف ایک چابی تھی اور یہ بیرونی دروازے کی تھی۔ وہ لاک کھول کر اندر آیا۔ دروازہ ایک بڑے لاؤنج میں کھلا۔ اس کے ایک طرف خوب صورت اوپن کچن تھا اور دوسری طرف نشست کا اہتمام تھا۔ یہاں ہر چیز بہت ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ فرنیچر اور دوسری چیزیں اعلیٰ درجے کی تھیں۔

وہ اندر آیا۔ لاؤنج کے برعکس بیڈ روم کباڑ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بیڈ کی چادر الٹی ہوئی تھی اور گدا بھی بے ترتیب تھا۔ درازیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور الماری کے تمام پٹ کھلے ہوئے تھے۔ پولیس نے نہایت بے پروائی سے تلاشی لی تھی اور اس کے بعد جو چیز جہاں تھی، وہیں چھوڑ دی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز پر سیما کی تصویر تھی اور یہ سیما کی ہی تھی۔ اس نے فریم سے تصویر نکال کر جیب میں رکھ لی۔ پاسپورٹ جو لاش کے ساتھ آیا تھا، وہ بھی سیما کا تھا اور یہ دونوں شناختی کاغذات بھی سیما کے تھے۔ مگر اسے پورا یقین تھا کہ وہ لاش سیما کی نہیں تھی۔ پولیس نے اگرچہ پوری تلاشی لی تھی مگر شاید وہ کوئی چیز مس کر گئے ہوں، یہ سوچ کر وہ تلاشی لینے لگا۔ ساتھ ہی وہ سامان اٹھا اٹھا کر اپنی جگہ رکھ رہا تھا کیونکہ عابد نے اسے کچھ چھیڑنے سے منع نہیں کیا تھا۔

اس نے درازیں اپنی جگہ کیں کپڑے اٹھا کر الماری میں رکھے۔ گدا...... اور بستر کی چادر درست کر کے تکیے اپنی جگہ لگا رہا تھا کہ اس کے غلاف سے ایک موبائل نکل کر بستر پر گرا۔ موبائل غلاف کے اندر چلا گیا تھا شاید اسی لیے پولیس کو نہیں ملا۔ پولیس نے صرف بے پروائی نہیں بلکہ نااہلی کا ثبوت بھی دیا تھا ورنہ یہ موبائل ان کی نظروں سے نہ بچتا۔ اس نے اٹھا کر اسے چیک کیا۔ آن کرتے ہی اس پر سیما کی تصویر ابھر آئی، وہ مسکرا رہی تھی۔ شاکر کچھ دیر محویت سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے سب سے پہلے میسج چیک کیے ...... یہ سارے میسج دو ہفتے پہلے کے...... یعنی لاش ملنے کے دو دن بعد کے تھے۔ اس سے پہلے کے میسج ضائع کیے جا چکے تھے۔ تمام میسج دو نمبروں سے تھے۔ ان میں سیما سے استفسار کیا گیا تھا کہ وہ کہاں ہے اور جواب کیوں نہیں دے رہی تھی۔ پھر اس نے کالز ریکارڈ چیک کیا۔ مس کالز ان ہی دو نمبروں سے تھیں۔ مگر ڈائل نمبر مختلف تھا۔ یہ لینڈ لائن نمبر لگ رہا تھا۔ اس نے اسی موبائل سے نمبر ڈائل کیا۔ تھوڑی دیر بعد ریکارڈ شدہ آواز آئی۔

”سائٹ میرین انٹرنیشنل... ہماری آفس ٹائمنگ صبح نو سے شام چھ تک ہوتی ہے، شکریہ۔“

اس نے گھڑی دیکھی، چھ بج کر تین منٹ ہو رہے تھے۔ موبائل جیب میں رکھ کر اس نے مزید تلاشی لی لیکن یہاں بھی اسے کوئی چیز نہیں ملی۔ اسے سب سے مشکوک بات جو لگی، وہ پرس اور رقم کا نہ ہونا تھا۔ یہی نہیں کسی قسم کا کریڈٹ یا ڈیبٹ کارڈ بھی نہیں تھا اور ان چیزوں کی ضرورت صرف زندہ انسانوں کو ہوتی ہے، مر جانے والوں کو نہیں۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس نے تکیہ اٹھا کر سینے سے لگایا۔ اس میں اس کی بیٹی کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ وہ نہ جانے کہاں تھی اور کس حال میں تھی؟ پھر وہ چونکا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بہر صورت اپنی بیٹی کو تلاش کر کے واپس جائے گا۔ چاہے اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے اور کیسی ہی مشکل کیوں نہ پیش آئے۔ وہ فلیٹ بند کر کے باہر نکل آیا

اور اس نے نیچے عمارت کے منیجر سے سیما کے فلیٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے ریکارڈ کے مطابق اس فلیٹ کا اگلے تین مہینے تک کا کرایہ ادا کیا جا چکا تھا۔ منیجر نے اسے بتایا کہ اگر وہ چاہتا ہے تو ادا شدہ کرایہ کچھ کٹوتی کے ساتھ واپس لے سکتا ہے۔ شاکر نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”فی الحال اس کی ضرورت نہیں... یہ میری بیٹی کا فلیٹ ہے۔ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیا میں اسے استعمال کر سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں، بس آپ کو اس فارم کو فل کرنا ہو گا اور اپنے پاسپورٹ اور ویزے کی کاپی دینا ہو گی۔“

شاکر نے یہ کارروائی اسی وقت نمٹا لی۔ وہ زیادہ سامان لے کر نہیں آیا تھا۔ اس کے پاس بس ایک بریف کیس تھا۔ اس میں اس کا ایک جوڑا اور کچھ چیزیں تھیں۔ البتہ ڈالرز کی صورت میں وہ اچھی خاصی رقم لایا تھا۔ اب اسے کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے طیارے میں لنچ نہیں کیا تھا اور اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے منیجر سے نزدیک کسی اچھے ہوٹل کا پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اسی سڑک پر ذرا آگے کئی اچھے ہوٹل ہیں۔ فلیٹ کی چابی کے ساتھ کسی گاڑی کی چابی بھی تھی۔ اس نے منیجر سے سیما کی گاڑی کا پوچھا۔ یہاں دو فلور پارکنگ کے لیے مخصوص تھے مگر پارکنگ میں سیما کی گاڑی نہیں تھی۔ منیجر نے پارکنگ میں صفائی کرنے والے سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ سیما رضی ایک سفید کار استعمال کرتی تھی اور وہ یہاں نہیں تھی۔ یہاں گاڑیوں کی آمد و رفت کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا اس لیے کہنا مشکل تھا کہ گاڑی خود سیما لے گئی تھی یا پھر کوئی اور لے گیا تھا۔ وہ باہر نکلا اور پیدل ایک ریستوران تک آیا۔

یہ چھوٹا اور بہت صاف ستھرا خوب صورت فیملی ریستوران تھا جو چمکتے ٹائلوں اور شیشوں سے سجا ہوا تھا۔ فرنیچر بھی بہترین اور جدید انداز کا تھا۔ اکیلے افراد کے لیے کاؤنٹر کے ساتھ کرسیاں رکھی تھیں۔ جب تک اس کا آرڈر آیا، وہ آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ وہاں لڑکیوں کے بھی کئی گروپ تھے جو کھانے پینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر سرو کرنے والی لڑکی شاید فلپائنی تھی۔ اس نے ٹرے شاکر کے سامنے رکھی تو اس نے پیشگی دس ڈالر کا ایک نوٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ خوش ہو گئی۔ ”تھینک یو سر۔“

”تم انگریزی جانتی ہو؟“

”یس سر۔“ وہ بولی اور پھر کسی قدر دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کیا میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“

شاکر اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ اسے کیا آفر کر رہی تھی مگر اس نے اپنا انداز سپاٹ رکھا۔ ”ہاں، تم میری ایک طرح سے مدد کر سکتی ہو۔“ اس نے کوٹ کی جیب سے سیما کی تصویر نکال کر اس کے سامنے کی۔ ”یہ لڑکی اسی سڑک پر ایک فلیٹ میں رہتی ہے ممکن ہے وہ یہاں بھی آتی ہو... کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟“

لڑکی نے غور سے تصویر دیکھی اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے نہیں دیکھا۔“

”پلیز! تم معلوم کر سکتی ہو۔“ اس بار شاکر نے سو ڈالر کا نوٹ اس کے سامنے رکھا۔ ”میں بہت شکر گزار ہوں گا اگر تم اپنی ساتھی لڑکیوں سے معلوم کرو۔“

اس سے پہلے کہ لڑکی نوٹ اٹھاتی، کاؤنٹر کا نگران وہاں آ گیا۔ وہ مقامی لگ رہا تھا۔ اس نے کڑی نظروں سے لڑکی اور شاکر کی طرف دیکھا پھر درشت لہجے بولا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”مجھے اس لڑکی کی تلاش ہے۔“ شاکر نے تصویر اس کے آگے کی۔ ”یہ یہیں رہتی ہے اور یقیناً یہاں بھی آتی ہو گی۔“

”یہ ریستوران ہے۔ یہاں لڑکیاں نہیں تلاش کی جاتیں۔“ کاؤنٹر والے نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اپنا کھانا کھاؤ اور یہاں سے جاؤ... تم جا کر اپنا کام کرو۔“ اس نے ویٹریس سے کہا اور واپس چلا گیا۔ لڑکی نے بے بسی سے اسے دیکھا اور چلی گئی۔ شاکر نے نوٹ واپس پرس میں رکھا اور ٹرے کی طرف متوجہ ہوا۔ ابھی ساڑھے سات بجے تھے اور ریستوران میں رش کا آغاز تھا۔ جب تک اس نے اپنا ڈنر مکمل کیا، خاصے لوگ آ چکے تھے۔ کھانے کے دوران میں اسے ایک خیال آیا اور اس نے اس پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے ادائیگی کی اور کھڑے ہو کر اچانک بلند آواز سے بولا۔

”خواتین و حضرات... میری طرف متوجہ ہوں۔“

سب نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ شاکر نے تصویر بلند کی۔ ”یہ میری بیٹی سیما رضی ہے۔ مجھے اس کی تلاش ہے۔ میں پاکستان سے یہاں آیا ہوں۔ اگر کوئی اس کے بارے میں جانتا ہے تو پلیز مجھے بتائیے۔ میں اسے ایک ہزار ڈالرز دوں گا۔“ اس نے پرس سے ڈالرز نکال کر دکھائے۔ ”کوئی جانتا ہے اسے؟“

کاؤنٹر والا پیچھے سے نکل کر اس کی طرف بڑھا۔ ”اے... یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

"میں اپنی بیٹی کی تلاش میں ہوں۔"

"اگر تمہاری بیٹی غائب ہوگئی ہے تو پولیس کے پاس جاؤ یہاں تماشا لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تماشا نہیں لگا رہا، صرف ان لوگوں سے مدد مانگ رہا ہوں کیونکہ میری بیٹی اسی علاقے میں رہتی ہے اور ممکن ہے ان میں سے کسی نے اسے دیکھا ہو۔"

"اگر کسی نے دیکھا ہوتا تو اب تک بتا چکا ہوتا۔" کاؤنٹر والے نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہاری تسلی ہوگئی ہے، اب تم جاسکتے ہو۔"

شاکر باہر نکلا تو مایوس تھا کیونکہ کسی نے تصویر اور انعام کے اعلان پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی سیما سے واقف نہیں تھا یا پھر جانتا بھی تھا تو کسی وجہ سے خاموش تھا۔ شاکر جذباتی ہوگیا تھا۔ وہ واپس چل پڑا، اس کا رخ فلیٹ کی طرف تھا۔ فلیٹ میں آکر اس نے لائٹس آن کیں اور صوفے پر گر کر سیما کا موبائل نکالا۔ پھر اس نے ایس ایم ایس کرنے والوں سے رابطے کا سوچا، اس نے پہلا نمبر ملایا۔ یہ نمبر موبائل میں محفوظ نہیں تھا۔ البتہ دوسرا نمبر محفوظ تھا مگر اس کے آگے صرف ایس اے لکھا تھا۔ بیل جارہی تھی، چند لمحے بعد کسی عورت نے کال ریسیو کی اور بولی۔ "کون بات کررہا ہے؟"

"شاکر رضی... میں سیما رضی کا باپ ہوں۔ آپ کون بات کررہی ہیں؟"

"میں صائقہ اکبر بات کررہی ہوں، سیما سے میری دوستی تھی۔"

شاکر بے چین ہوگیا۔ "آپ کی اس سے دوستی تھی اور آپ کا نمبر اس کے پاس محفوظ نہیں ہے؟"

"اس کی وفات سے چند دن پہلے اس کا موبائل سفر کے دوران غائب ہوگیا تھا۔ پھر اس نے دوسرا موبائل لیا تھا۔ شاید اسی لیے میرا نمبر محفوظ نہیں ہے۔"

"میں کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے آپ سے ملنا ضروری ہے۔"

صائقہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے... آپ آجائیں، میں گھر پر ہوں۔"

صائقہ پاس ہی رہتی تھی اور شاکر کا خیال تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہوگی۔ اس کے گھر والے بھی ہوں گے۔ ورنہ وہ یوں اسے نہ بلاتی... صائقہ بھی فلیٹ میں رہتی تھی اور کال بیل کے جواب میں اس نے دروازہ کھولا۔ شاکر نے جلدی سے تعارف کرایا۔ "شاکر رضی..."

وہ حیران ہوئی۔ "رضی؟"

جواب میں شاکر نے اپنا پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ نکال کر سامنے کردیا۔ صائقہ نے غور سے دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ "اندر آیئے... میں نے شناخت نہیں پوچھی تھی۔ اصل میں آپ کو دیکھ کر حیران ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپ خاصے ایجڈ ہوں گے۔"

"میں پینتالیس برس کا ہوں۔" شاکر نے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ سیما سے دوستی کا دعویٰ کرنے والی اسی کی عمر کی... ہوگی مگر اس کے سامنے جو عورت تھی، اس کی عمر کم سے کم تیس برس تھی۔ البتہ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ خاصی حسین تھی۔ نفاست سے بنی بھوؤں تلے سرمئی رنگ کی آنکھیں اچھی لگ رہی تھیں۔ ناک ستواں اور ہونٹ خوب صورت تھے۔ سامنے کے دانت کسی قدر نمایاں تھے مگر اس وقت جب وہ ہونٹ کھولتی تھی۔ بال آنکھوں سے ذرا گہرے رنگ کے تھے۔ انہیں سمیٹ کر اس نے ڈھیلے جوڑے کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ کانوں میں موتی کے ٹاپس تھے۔ اس نے براؤن شیڈ کا ڈھیلا سا کرتہ نما پہن رکھا تھا۔ جینز کے ساتھ وہ دوپٹے کے تکلف سے آزاد تھی اور یقیناً ماڈرن تھی۔ شاکر کے غور کرنے سے اس کی سرخ رنگت شہابی ہوگئی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"اندر آیئے۔" وہ شاکر کو چھوٹے مگر خوب صورتی سے سجے ڈرائنگ روم میں لائی۔ اس کا فلیٹ بڑا تھا۔

"آپ کیا لیں گے... چائے، کافی یا کولڈ ڈرنک؟"

"آپ تکلف نہ کریں۔" شاکر نے کہا۔ "میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"نہیں، آپ سیما کے پاپا ہیں۔" وہ بولی۔ "بلا تکلف بتادیں۔"

"ٹھیک ہے اگر زحمت نہ ہو تو میں چائے لوں گا۔"

"میں ابھی آئی۔" وہ چلی گئی۔ اتنی دیر میں شاکر کو احساس ہونے لگا کہ اس فلیٹ میں وہ اکیلی رہتی ہے یا اس وقت اکیلی تھی۔ یہ کم سے کم دو بیڈ روم والا فلیٹ تھا۔ صائقہ دس منٹ میں دو کپ لے آئی۔ شاکر نے پوچھا۔

"آپ اکیلی رہتی ہیں؟"

"ہاں... ایک مہینے پہلے میری ایک کولیگ رہتی تھی پھر وہ واپس پاکستان چلی گئی۔ اب میں کوئی چھوٹا فلیٹ تلاش کروں گی۔ اس کا کرایہ زیادہ پڑتا ہے۔"

"آپ کا تعلق پاکستان سے ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں یہاں ایک آئی ٹی فرم میں کام کرتی ہوں۔ سیما سے دوستی بھی اسی وجہ سے ہوئی۔ اس سے پہلی ملاقات ایک آئی ٹی کی نمائش میں ہوئی تھی۔"

شاکر نے چائے کا گھونٹ لیا۔ "آپ اچھی چائے بناتی ہیں۔"

"شکریہ۔" وہ خوش ہوگئی۔

شاکر مطلب کی بات پر آگیا۔ "آپ کی سیما سے آخری ملاقات کب ہوئی؟"

"اس حادثے سے تین دن پہلے... وہ جاب تلاش کررہی تھی اور اسی سلسلے میں میرے پاس بھی آئی تھی۔ میں نے اسے کچھ کانٹیکٹس دیے تھے۔"

"اس کے بعد آپ نے اسے کال یا ایس ایم ایس کیا؟"

"اس حادثے کے بعد... اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا۔ دو دن بعد مجھے اخبار سے پتا چلا۔"

"آپ نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا؟"

"کس سلسلے میں؟" اس نے حیرت سے شاکر کی طرف دیکھا۔

"اس کی موت کے سلسلے میں؟"

"نہیں، رابطے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ایک حادثہ تھا۔"

"کیا آپ جانتی ہیں کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کے خون میں ہیروئن شامل تھی اور پولیس کے خیال میں وہ نشے کی کیفیت میں اوپر سے گری تھی؟"

صائقہ اچھل پڑی... "میرے خدا... یہ غلط ہے' وہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔ میں نے تو کبھی اسے بیئر پیتے نہیں دیکھا' نشہ تو دور کی بات ہے۔"

"پوسٹ مارٹم کی رپورٹ حقیقی ہے۔" شاکر نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صائقہ کو اصل بات بتانی چاہیے یا نہیں۔ وہ غور سے اسے دیکھ رہی تھی اور غالباً اس نے بھانپ لیا۔

"کوئی بات ہے جو آپ بتانا چاہ رہے ہیں؟"

"ہاں لیکن پہلے میں ایک سوال کروں گا۔ کیا آپ نے سیما کی لاش دیکھی تھی؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے سوچا تھا لیکن پھر میری ہمت نہیں ہوئی۔"

شاکر نے گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہاں سیما کے کسی جاننے والے نے وہ لاش نہیں دیکھی۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"یہی کہ وہ لاش سیما کی نہیں تھی۔"

صائقہ ایک بار پھر اچھل پڑی۔ "سیما کی نہیں تو پھر کس کی تھی؟"

"یہی معلوم کرنے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ لاش کس کی ہے اور سیما کہاں غائب ہے۔ اس حادثے کے بعد سے اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کی ساری چیزیں موجود ہیں اور وہ غائب ہے۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لاش سیما کی نہیں ہے؟"

"آپ جانتی ہیں کہ سیما کے بائیں کان کے پیچھے سرخ رنگ کا تل ہے؟"

صائقہ نے سر ہلایا۔ "جانتی ہوں۔"

"جو لاش مجھے بھیجی گئی، اس کے کان کے پیچھے تل نہیں تھا۔ مقامی پولیس کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے سیما نے تل ریموو کرادیا ہو۔"

صائقہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا نہیں خیال کہ اس نے ایسا کوئی کام کرایا تھا۔ دو مہینے پہلے میں اس سے ملنے گئی تھی اور بالوں میں برش کرتے ہوئے میں نے یہ تل دیکھا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا یقین درست ہے۔" شاکر خوش ہوگیا۔ "میں نے اسے سیما کی لاش تسلیم نہیں کیا۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ پھر وہ کہاں گئی؟"

شاکر نے کپ خالی کرکے میز پر رکھا۔ "میں اسے تلاش کررہا ہوں۔ آپ کے علم میں اور ایسا کوئی فرد ہے جس سے سیما ملتی تھی؟"

صائقہ پھر ہچکچائی اور اس نے سر ہلایا۔ "ایک فرد ایسا ہے۔ زیب شاہد... وہ کمپیوٹر آرٹ ڈیزائنر ہے۔ دو بار ہماری باہر ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات چار مہینے پہلے ہوئی تھی اور دوسری تین مہینے پہلے ہوئی تھی۔"

شاکر جھجکا۔ "زیب سے سیما کا تعلق کس نوعیت کا تھا؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن ان میں شاید پسند کا تعلق تھا۔ سیما نے ایک بار پوچھنے پر بس اتنا کہا تھا کہ زیب شاہد سے اس کی دوستی ہے۔"

"آپ جانتی ہیں یہ شخص کہاں رہتا ہے؟"

صائقہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔"

"اس کا کوئی فون نمبر ہے؟"

صائقہ کا جواب اس بار بھی نفی میں تھا۔ شاکر گہری سانس لے کر کھڑا ہوگیا۔ "آپ کے تعاون کا شکریہ... میں

سیما کے فلیٹ میں ٹھہرا ہوا ہوں اور میرے پاس اس کا موبائل ہے۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسی بات آئے جس سے سیما کا پتا چل سکے تو پلیز...''

''آپ درخواست نہ کریں، یہ میرا معاملہ بھی ہے۔ اب تک میں اسے ایک عام سا واقعہ سمجھ رہی تھی مگر آپ نے تو بالکل دوسری تصویر سامنے رکھ دی ہے۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گی۔ آپ کو میرے کسی تعاون کی ضرورت ہو تو... بلاجھجک مجھ سے کہیے گا۔''

شاکر کو خیال آیا۔ ''ایک سوال اور ہے... سیما کے پاس گاڑی تھی؟''

''ہاں، اس کے پاس آف وائٹ کرولا ہے۔ دو سال پرانا ماڈل ہے۔''

''تب اس کے پاس یہاں کا ڈرائیونگ لائسنس بھی ہوگا۔'' شاکر نے کہا۔ ''اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی غائب ہے۔''

''لازمی بات ہے کہ اس کے بغیر یہاں گاڑی چلانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میرے پاس بھی لائسنس ہے، تب میں گاڑی لے سکی ورنہ اس سے پہلے مجھے بہت مشکل ہوتی تھی۔ ٹیکسی اور بس سسٹم اتنا اچھا نہیں ہے یہاں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہاں پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم اتنا اچھا نہیں ہے۔ مجھے بھی مشکل سے ٹیکسی ملی تھی۔''

''میں آپ کو ڈراپ کر دیتی ہوں۔ یہاں سے ٹیکسی مشکل سے ملتی ہے۔''

شاکر نے منع کیا مگر جب صائقہ نے اصرار کیا تو وہ مان گیا۔ صائقہ کے پاس نئے ماڈل کی کار تھی۔ بیس منٹ میں اس نے شاکر کو عمارت کے سامنے اتار دیا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کر کے شاکر اوپر آیا۔ وہ تھک گیا تھا... چار بجے وہ گھر سے نکلا تھا اور اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ صائقہ کے گھر اتنی دیر رہا تھا۔ بیٹی کے کمرے میں لیٹتے ہوئے اسے جھجک ہو رہی تھی اس لیے وہ لاؤنج میں صوفے پر آگیا۔ تھکن کے باوجود اسے آسانی سے نیند نہیں آئی۔ اس کے ذہن میں سیما سے متعلق خیالات چکراتے رہے تھے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اور اس وقت وہ کہاں تھی؟ زیب شاہد نامی شخص سے اس کا تعلق کس نوعیت کا تھا اور کیا وہ سیما کی تلاش میں اس کی مدد کر سکتا تھا؟ رات اسے کئی بار ایسا لگا جیسے فلیٹ میں کوئی اور ہو۔ کبھی اسے لگتا سیما اسے پکار رہی ہے۔ آخری بار اس نے عجیب سا خواب دیکھا کہ سیما کسی تاریک سی جگہ قید ہے اور اسے مدد کے لیے پکار رہی ہے۔

''پاپا! مجھے یہاں سے نکالیں... پلیز پاپا۔''

شاکر ہڑبڑا کر اٹھا تو بیڈروم کی طرف سے صبح کی روشنی جھلک رہی تھی۔ وہاں کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ دھوپ کا ایک سرا لاؤنج تک آرہا تھا۔ وہ اٹھا تو اس کا سر درد سے بھاری ہو رہا تھا اور جسم ٹوٹ رہا تھا۔ رات خاصی ٹھنڈی تھی اور وہ بغیر کچھ لیے سو گیا تھا۔ گرم پانی سے نہا کر اور چائے کے ساتھ پین کلر دوا لینے سے وہ خود کو خاصا بہتر محسوس کرنے لگا۔ اس نے وقت دیکھا اور سائٹ میرین انٹرنیشنل کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے آپریٹر نے کال ریسیو کی۔ ''سائٹ میرین انٹرنیشنل... مے آئی ہیلپ یو؟''

''مجھے سیما رضی نامی آپ کی ایک ورکر کے بارے میں معلوم کرنا ہے؟''

''سر! اپنی شناخت کرائیں گے؟''

''میرا نام شاکر رضی ہے اور سیما رضی میری بیٹی ہے۔''

''اوہ... مجھے یاد آگیا۔ کچھ دن پہلے پولیس نے انکوائری کی تھی۔ مجھے اس کی موت کا افسوس ہے سر! میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

''وہ یہاں ملازم تھی؟''

''تین مہینے پہلے مس سیما رضی نے یہاں سے استعفا دے دیا تھا۔ اس کے بعد سے کمپنی سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔''

''استعفے کی وجہ؟''

''سوری سر! میرے پاس اس قسم کی معلومات نہیں ہوتیں، اس کے لیے آپ کو ہمارے دفتر آنا ہوگا۔''

''مجھے کس سے ملنا ہوگا؟''

''ایچ آر آفیسر مسٹر جوزف شرما سے سر۔''

شاکر تیار ہو کر باہر آیا۔ اس نے ایک کیفے سے ناشتا کیا اور ٹیکسی لے کر سائٹ میرین انٹرنیشنل کے دفتر روانہ ہوگیا۔ پتا سیما کے کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ یہ دفتر ساحل اور بندرگاہ کے قریب ایک خوب صورت کئی منزلہ عمارت میں تھا۔ اس عمارت کا تیسرا فلور مکمل طور پر سائٹ میرین انٹرنیشنل کے پاس تھا۔ اس سے شاکر کو اندازہ ہوا کہ یہ بہت بڑی کمپنی تھی۔ آغاز میں وہی ٹیلی فون آپریٹر بیٹھی تھی۔ دلکش نقوش والی اس لڑکی نے اسکرٹ، بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے شاکر کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے کیا۔

''شاکر رضی... کچھ دیر پہلے میری آپ سے بات ہوئی تھی۔''

''یس سر... لیکن مجھے افسوس ہے کہ مسٹر شرما آج آفس نہیں آئے ہیں۔ وہ چھٹی پر ہیں۔''

''اس کمپنی کا مالک کون ہے؟''

''راشد سعید یہاں کے آنر ہیں۔''

''وہ دفتر میں ہوتے ہیں؟'' شاکر نے کہا تو لڑکی نے بے ساختہ دائیں طرف دیکھا جہاں سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔

''وہ بغیر اپائنٹ منٹ کے کسی سے نہیں ملتے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ اوپر ہیں۔'' شاکر نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ لڑکی نے اسے آواز دی۔

''سر! آپ اس طرح نہیں جاسکتے... سر! میری بات سنیں... سر پلیز... میرے خدا...'' وہ اٹھ کر شاکر کے پیچھے لپکی جو تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ راشد سعید کا دفتر اسی فلور پر ذرا اوپر کر کے بنایا گیا تھا۔ شاکر اندر داخل ہوا تو وہ دو افراد سے بات کر رہا تھا۔ شاکر نے اندازہ لگایا کہ میز کے دوسری طرف موجود شخص ہی راشد سعید ہے۔ تقریباً پچاس برس کا یہ شخص جھریوں زدہ چہرے اور حلقوں والی آنکھوں سے اپنی عمر سے بڑا لگ رہا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں اور ان کے نیچے لٹکتا ہوا گوشت بتا رہا تھا کہ وہ عادی شرابی ہے۔ اس نے نہایت مہنگا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لڑکی پیچھے آئی۔ اس نے اندر آتے ہی کہا۔ ''سوری سر! میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن یہ...''

''کوئی بات نہیں ڈیئر۔'' راشد نے نرمی سے کہا۔ ''تم جاؤ۔''

لڑکی پلٹ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد راشد سعید نے سوالیہ نظروں سے شاکر کی طرف دیکھا۔ ''مسٹر! تم یقیناً کسی وجہ سے اس طرح اندر آئے ہو؟''

شاکر نے معذرت کی۔ ''سوری مسٹر سعید... آپ نے ٹھیک کہا... میں شاکر رضی ہوں اور میری بیٹی سیما رضی یہاں ملازمت کرتی تھی۔''

''سیما رضی۔'' راشد سعید نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ نام سنا ہوا لگ رہا ہے۔''

''دو ہفتے پہلے ایک حادثے میں اس کا انتقال ہوگیا تھا۔''

''اوہ۔'' راشد سعید نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''مجھے یاد آگیا...'' پھر اس نے اپنے سامنے بیٹھے دونوں

آدمیوں سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے بعد میں بات کروں گا۔''

دونوں خاموشی سے اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد راشد سعید نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''مجھے بہت افسوس ہوا تھا جب پولیس انکوائری کے لیے آئی تھی مگر سیما رضی تین مہینے پہلے ریزائن دے چکی تھی۔''

''ریزائن کی وجہ؟''

راشد سعید نے شانے اچکائے۔ ''کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''یہاں اس کی کسی سے واقفیت تھی... دفتر میں کولیگ ہوتے ہیں۔''

''مسٹر رضی۔'' راشد سعید کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''پولیس اس بارے میں مکمل انکوائری کر چکی ہے۔ سیما رضی یہاں ایک سال ملازم رہی اور پھر اس نے جاب چھوڑ دی... یہاں کسی سے اس کی جان پہچان نہیں تھی... وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔''

''مجھے شبہ ہے... جس لڑکی کی لاش کو سیما رضی سمجھ لیا گیا ہے، وہ کوئی اور ہے۔'' شاکر نے اصل بات بتا دی۔ راشد سعید بری طرح چونکا اور اس کا سرد خول جیسے چٹخ گیا۔ اسے خود پر قابو پانے میں خاصی کوشش کرنا پڑی۔ اس نے پوچھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ایسا ہی ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے سیما زندہ ہے اور میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔''

''پولیس نے اس سلسلے میں مکمل انکوائری کی ہے۔''

''لاش والی لڑکی بڑی حد تک سیما سے ملتی ہے لیکن وہ سیما نہیں ہے۔''

راشد سعید سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''سوری مسٹر رضی! میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تم پولیس کے پاس جاؤ۔''

''پولیس اپنے طور پر یہ کیس ختم کر چکی ہے۔''

''تب میں کیا کر سکتا ہوں۔'' راشد سعید نے میز کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک پوشیدہ بٹن دبایا اور فوراً ہی شیشے کا دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آئے۔ ان میں ایک طویل قامت تھا اور دوسرا درمیانے قد کا مگر باڈی بلڈر جیسی جسامت والا تھا۔ ''مسٹر رضی کو باہر تک چھوڑ آؤ۔''

''مسٹر سعید، پلیز... میری بات سنیں۔''

''وقت ختم ہو گیا ہے۔'' تنومند گارڈ نے اس کا بازو پکڑا تو شاکر اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ دفتر سے باہر کھڑا تھا۔ ان دونوں نے اسے مہذب انداز میں جتا دیا تھا کہ وہ اب دوبارہ یہاں نظر نہ آئے ورنہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔ شاکر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ سیما کو کہاں تلاش کرے؟ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایسی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا۔ اسے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا کہ وہ سیما کی تلاش کس سمت میں کرے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ عام حالات میں غائب نہیں ہوئی تھی۔ اس کی گم شدگی نہایت پراسرار تھی۔

وہ پیدل چلتا رہا اور جب تھک گیا تو ایک پارک میں بینچ پر آ بیٹھا۔ وہاں بچے کھیل رہے تھے اور فیملی والے آئے ہوئے تھے۔ موسم اچھا ہوتے ہی یہاں کی رونقیں دوبالا ہو جاتی تھیں مگر شاکر کے اندر ویرانی تھی۔ اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر سیما کا خیال آ رہا تھا۔ وہ بہت امید لے کر یہاں آیا تھا کہ اپنی بیٹی کو تلاش کر لے گا مگر یہاں جب اسے لوگوں کا سامنا کرنا پڑا تو اسے پتا چلا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا اس نے سوچا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں اس کی ساری امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ پولیس اور سیما کے واقف کاروں سے اسے صرف مایوسی ملی تھی۔ صائقہ اچھی عورت تھی مگر وہ خود بے خبر تھی، اس کی مدد کہاں سے کرتی؟ لیکن نہیں، اس نے کسی زیب شاہد کا بتایا تھا جس سے سیما کا ملنا جلنا تھا۔ اسے تلاش کیا جا سکتا تھا۔ شاید وہ کچھ جانتا ہو۔ زیب کا خیال آتے ہی شاکر نے سیما کا موبائل نکالا۔ اس نے وہ دوسرا نمبر دیکھا جس سے ایس ایم ایس آیا تھا۔ میسیج کرنے والے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مرد ہے۔ شاکر نے نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی۔ چند لمحوں بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو۔''

''زیب شاہد؟'' شاکر نے کھنکارا جو شانے پر لگا۔

''بات کر رہا ہوں۔''

''میں شاکر رضی بات...''

''سیما کے پاپا؟'' زیب نے بات کاٹ کر بے یقینی سے کہا۔

''ہاں، میں سیما کا باپ ہوں۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں نہیں...''

''میں تم سے کہاں ملاقات کر سکتا ہوں؟''

"آپ میرے گھر پر آجائیں۔" زیب نے کہا اور اسے اپنا پتا سمجھایا۔ شاکر فوری روانہ ہوگیا۔ زیب زیادہ دور نہیں رہتا تھا۔ اتفاق سے اس کی رہائش بھی فلیٹ میں تھی اور یہ اسٹوڈیو فلیٹ تھا جو ایک ہی ہال نما کمرے پر مشتمل تھا۔ یہ پورا کمرا کمپیوٹرز، بڑے سائز کے پرنٹرز، پرنٹر کاغذ کے رول، کارٹریجز اور اسی قسم کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا... جابجا دیواروں پر پرنٹر سے نکالی تصاویر لگی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں زمین پر گدا بچھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ کچھ سامان تھا جو زیب کے ذاتی استعمال کا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور گرم جوشی سے شاکر سے ہاتھ ملایا۔ وہ تقریباً تیس برس کا خوش رو نوجوان تھا۔ اس نے جدید فیشن کی موٹے فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ اندر لا کر اس نے شاکر کو ٹوسیٹر صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ اس فلیٹ میں واحد چیز تھی جس پر بیٹھا جاسکتا تھا۔ اس نے معذرت کی۔ "سوری، میں خانہ بدوشوں کے انداز میں رہتا ہوں۔ یہاں کسی سے میرا ملنا جلنا نہیں ہے۔ عام طور سے باہر ہی ملتا ہوں۔"

"تم گھر میں ہی کام کرتے ہو؟" شاکر نے چاروں طرف دیکھا۔ "صائقہ نے بتایا تھا کہ تم کمپیوٹر آرٹ کے ماہر ہو۔"

"جی، آپ نے ٹھیک جانا۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ سب میرے کام کے لیے ہیں۔ میں ٹھیکے لیتا ہوں۔"

"تمہاری سیما سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟"

"چار مہینے پہلے..." زیب نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس نے کچھ پرنٹ لینے کے لیے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔"

"کس قسم کے پرنٹ؟"

"یہ تو اس نے نہیں بتایا کیونکہ وہ خود آئی تھی اور اس نے خود پرنٹ آؤٹ نکالے تھے۔"

"اس کے بعد بھی تم ملے؟"

"کئی بار... اس حادثے سے پہلے ہماری تقریباً ہر ہفتے ملاقات ہوتی تھی؟"

"یہاں؟"

"نہیں... ہم باہر ملتے تھے، کسی ریستوران یا تفریح گاہ میں۔"

"تم... سیما کو پسند کرتے تھے؟"

وہ ہچکچایا۔ "ان معنوں میں نہیں... اور نہ ہی ہمارے درمیان کبھی کوئی بات ہوئی تھی... لیکن مجھے اس سے ملنا اچھا لگتا تھا۔"

"تمہیں اس کی وفات کا علم کب ہوا؟"

"جب اخبار اور ٹی وی پر خبر آئی۔" اس نے صائقہ والا جواب دیا۔

"یعنی تمہیں علم نہیں ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق سیما کے خون میں ہیروئن کی خاصی مقدار تھی؟"

زیب دنگ رہ گیا۔ "نہیں، بالکل نہیں... میں تو اسے حادثہ سمجھ رہا تھا۔"

"بات یہ نہیں ہے کہ یہ حادثہ تھا یا کوئی سازش... بات یہ ہے کہ وہ لاش سیما کی نہیں تھی۔"

اس بار زیب نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے شاکر کی دماغی کیفیت پر شک ہو۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟... ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہی ہوا ہے۔" شاکر نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے بتایا کہ اصل میں کیا ہوا تھا۔ زیب حیران ہو کر سن رہا تھا پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ تو فلمی کہانی یا ڈراما لگ رہا ہے۔"

"اصل زندگی ان دونوں سے کہیں زیادہ ڈرامائی ہوتی ہے۔" شاکر نے کہا۔ "میں بھگت رہا ہوں... مجھے یقین ہے کہ سیما زندہ ہے اور وہ کسی مشکل میں ہے جس کی وجہ سے وہ منظرِ عام پر نہیں آسکتی ہے۔"

"لیکن وہ ہے کہاں؟"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔" شاکر نے اس کی طرف دیکھا۔ "میں مدد کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"میں آپ کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوں۔" اس نے خلوص سے کہا۔ "کاش مجھے پتا ہوتا کہ سیما پر کیا گزری ہے؟"

"ہم کوشش کریں تو پتا چلایا جاسکتا ہے۔" شاکر نے اسے بتایا۔ "میں آج سائٹ میرین انٹرنیشنل گیا تھا۔ کمپنی کے مالک نے تسلیم کیا کہ سیما اس کے پاس تین مہینے پہلے تک ملازم تھی مگر اس نے مجھ سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر میں اس کا رویہ کچھ دھمکی آمیز ہوگیا تھا اور اس نے مجھے دوبارہ وہاں آنے سے منع کیا ہے۔"

زیب شاہد نے گہری سانس لی۔ "اب مجھے بتانے میں آسانی رہے گی۔ سیما اس جگہ سے مطمئن نہیں تھی۔"

"مطمئن نہیں تھی؟" شاکر نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

"ہاں، اس کا کہنا تھا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ جب وہ پہلی بار میرے پاس پرنٹ کرانے آئی تو یہ بھی اسی سلسلے میں تھا۔ اس نے جو چیز پرنٹ کی تھی، وہ سائٹ میرین انٹرنیشنل سے متعلق تھی۔"

"اس نے تمہیں بتایا نہیں؟"

"نہیں۔" زیب نے نفی میں سر ہلایا۔ "البتہ وہ فکر مند تھی۔"

"کیا کمپنی کسی غیر قانونی کام میں ملوث تھی یا سیما کو ذاتی طور پر کوئی خطرہ تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ دونوں ہی باتیں تھیں کیونکہ خفیہ پرنٹ آؤٹ کا مطلب ہے اندر کی کوئی بات تھی۔ اس میں سیما کو ذاتی طور پر خطرہ نہیں ہوسکتا مگر وہ کمپنی کے مالک راشد کا ذکر بہت نفرت سے کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کردار کا خراب آدمی ہے اور بہت کم لڑکیاں اور عورتیں اس کی کمپنی میں ٹک کر کام کرتی ہیں۔"

"مجھے بھی وہ کچھ ایسا ہی شخص لگا۔" شاکر بولا۔ "اس کی جاب چھوڑنے کے بعد بھی سیما کی کئی بار تم سے ملاقات ہوئی، تب اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے اسے لاحق خطرے کی نشان دہی ہوتی؟"

"درحقیقت اس نے ایک بار بھی یہ خدشہ ظاہر نہیں کیا۔ یہی وجہ تھی کہ حادثے کے باوجود میرا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ اس کی موت غیر طبعی ہوسکتی ہے... اور یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ لاش اصل میں کسی اور کی ہوسکتی ہے۔"

"تم کئی بار سیما سے ملے، اس دوران میں صائقہ کے علاوہ کوئی اور شخصیت تمہارے علم میں آئی جو سیما سے متعلق ہو؟"

زیب شاہد سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ دو تقریبات میں گیا۔ ایک نئے سال کی پارٹی تھی جو ایک ہوٹل میں ہورہی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا میزبان کون تھا۔ وہاں سیما نے میرا تعارف رفیع جاوید نامی ایک شخص سے کرایا تھا۔ ہمارے درمیان مشکل سے ایک دو منٹ بات ہوئی تھی پھر وہ شخص چلا گیا۔ سیما اور اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"یہ شخص کیا کرتا ہے اور کیا پاکستانی تھا؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ بھی آئی ٹی سے متعلق تھا اور شاید کسی سافٹ ویئر ہاؤس کے لیے کام کرتا ہے۔"

"کیا اس شخص کو تلاش کرنا ممکن ہے؟"

"میں کوشش کرتا ہوں، میرے کچھ جاننے والے ہیں جو سافٹ ویئر ہاؤسز کے لیے کام کرتے ہیں۔"

☆☆☆

راشد سعید ساحل پر واقع اپنے عالی شان بنگلے میں تھا۔ اس وسیع کمرے میں ایک طرف بار بنا ہوا تھا۔ شیشے کی ایک بڑی دیوار کے پار ساحل اور اس کے ساتھ بنی جیٹی پر کھڑی سفید رنگ کی لانچ دکھائی دے رہی تھی۔ رات کی تاریکی کو بے پناہ روشنیوں نے دن میں تبدیل کر دیا تھا۔ راشد نے بار پر کھڑی لڑکی کو اشارہ کیا تو اس نے گلاس میں ایک مشروب ڈال کر اس کے سامنے رکھا۔ لڑکی خدوخال سے مشرقِ بعید کی لگ رہی تھی اور اس نے نہایت مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ راشد سعید ریشمی گاؤن میں تھا۔ اس کی آنکھوں سے تفکر جھلک رہا تھا۔ طویل قامت اور تنومند شخص وہاں آئے تو راشد سعید نے لڑکی کی طرف دیکھا اور وہ اس کی آنکھوں کا اشارہ سمجھ کر لہراتی بل کھاتی وہاں سے چلی گئی۔ طویل قامت شخص کا چہرہ ساکت تھا مگر تنومند شخص کسی قدر پریشان لگ رہا تھا۔ راشد سعید اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے تنومند شخص کی طرف دیکھا۔

"تمہارا خیال تھا جس لڑکی کو تم لوگوں نے قتل کیا، وہ سیما رضی تھی؟"

"باس، وہ بالکل ویسی تھی جیسی آپ نے بتائی تھی۔ وہ اسی فلیٹ سے نکلی تھی اور تمام نشانیوں پر پوری اتر رہی تھی۔ پھر پولیس نے بھی اسے سیما رضی کی لاش تسلیم کیا۔"

"اس کے باپ نے تسلیم نہیں کیا ہے۔" راشد کا لہجہ مزید سرد ہوگیا۔ "میں نے تصدیق کرلی ہے کہ سیما رضی کے بائیں کان کے پیچھے سرخ رنگ کا تل تھا جبکہ مرنے والی لڑکی کے کان کے پیچھے یہ تل نہیں تھا۔ اس بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

تنومند کا رنگ اڑ گیا۔ "باس، میں بے قصور ہوں۔"

"تم کب سے میرے پاس کام کر رہے ہو؟"

"تین... تین سال ہوگئے ہیں باس۔"

"اس دوران میں تمہیں نہ صرف ایک لاکھ ڈالرز سے اوپر معاوضہ ادا کیا گیا بلکہ رہائش اور کھانے پینے کے ساتھ ساتھ عیاشی کے تمام لوازمات بھی مہیا کیے گئے۔"

"یہ ٹھیک ہے باس..."

"میری بات سنو..." راشد غرایا۔ "ان تین سالوں میں میں نے تم سے مشکل سے ایک درجن کام لیے ہوں گے۔ یہ واحد کام تھا جس میں کسی انسان کو قتل کرنا تھا۔ تمہیں اے ٹو زیڈ سب سمجھا کر بھیجا اور تم جا کر غلط لڑکی کو قتل کر

آئے۔'' راشد سعید نے آخری الفاظ گرج کر ادا کیے اور اس کا ہاتھ گاؤن کی جیب سے باہر آیا تو اس میں دبے چھوٹے سے پستول کا رخ تنومند شخص کی طرف تھا۔ وہ اچھل کر بھاگا مگر اسے دوسرا قدم اٹھانے کی مہلت نہیں ملی۔ پستول سے نکلنے والا شعلہ اس کی پشت میں عین دل کے مقام پر اتر گیا۔ وہ منہ کے بل گرا اور ذرا سا کسمسا کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ طویل قامت کا چہرہ بدستور ساکت تھا۔ راشد نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ اسے سمندر میں ڈال دو اور لڑکی کو تلاش کر کے ٹھکانے لگا دو۔ اگر اس بار کوتاہی ہوئی تو تمہاری لاش مجھے خود ٹھکانے لگانی پڑے گی۔''

☆☆☆

شاکر دو گھنٹے زیب کے فلیٹ میں رکا تھا پھر وہ وہاں سے نکلا۔ ایک جگہ اس نے لنچ کیا اور واپس جانے کا سوچ رہا تھا کہ صائقہ کی کال آ گئی۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

شاکر نے اسے بتایا کہ وہ کہاں تھا اور اس نے زیب شاہد کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ ''یہ تو اچھا ہوا... اس نے کچھ بتایا؟''

''اس نے کسی رفیع جاوید نامی شخص کے بارے میں بتایا ہے۔ زیب کا یہ بھی کہنا ہے کہ سیما کے خیال میں سائٹ میرین انٹرنیشنل میں کوئی گڑبڑ تھی اور ممکنہ طور پر اسی وجہ سے اس نے جاب چھوڑی تھی۔''

''رفیع جاوید۔'' صائقہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یہ نام مجھے جانا پہچانا لگ رہا ہے۔ میں آپ کو کچھ دیر بعد کال کرتی ہوں۔''

شاکر نے گھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ ایک قریبی شاپنگ مال میں داخل ہوا۔ روشنیوں اور خوب صورتی سے سجا ہوا شاپنگ مال خریداروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک ٹوائے شاپ کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک اصلی نظر آنے والے کھلونا پستول پر پڑی۔ اس نے دکان کے اندر آ کر اس کا معائنہ کیا۔ یہ بالکل اصلی لگ رہا تھا۔ اس نے سیلز مین سے قیمت پوچھی اور ادائیگی کر کے باہر آ گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی چکر میں شامل ہو گیا ہے اور اس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔ یہ پستول اگرچہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا تھا مگر اس کی مدد سے ڈرایا ضرور جا سکتا تھا۔ وہ شاپنگ سینٹر میں گھومتا رہا۔ اسے پیاس لگی تو اس نے مشین سے اپنے لیے کولڈ ڈرنک ٹن نکالا۔ ابھی ٹن کھولا تھا کہ موبائل نے بیل دی۔ صائقہ کال کر رہی تھی۔ اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''میں نے رفیع جاوید کا پتا چلا لیا ہے۔ آپ ابھی کہاں ہیں؟''

شاکر نے اس شاپنگ مال کا نام بتایا تو وہ بولی۔ ''میں سمجھ گئی، میں آ رہی ہوں... آپ وہیں رکیں۔''

''یہاں دوسرے فلور پر ایک اوپن فوڈ ایریا ہے، میں وہاں ملوں گا۔''

''مجھے بیس منٹ لگ سکتے ہیں۔'' صائقہ نے بتایا۔

شاکر نیچے فوڈ ایریا میں آیا اور دو افراد کے لیے مخصوص سیٹ سنبھال لی۔ یہ کوئی کیفے یا ریستوران نہیں تھا بلکہ یہاں مختلف فوڈز شاپس تھیں جو مختلف اشیا مہیا کر رہی تھیں۔ سیلف سروس تھی اور لوگ کھانے پینے کا سامان لے کر میزوں پر آ جاتے تھے۔ صائقہ بیس منٹ سے پہلے آ گئی۔ اسے دیکھ کر شاکر کھڑا ہو گیا تاکہ وہ اسے دیکھ لے۔ صائقہ اس کی طرف آئی۔ اس نے اسکرٹ اور شرٹ پر کوٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ سے اس کی شفاف پنڈلیاں جھلک رہی تھیں۔ یہ فارمل آفس ڈریس تھا۔ اس کے پاس بڑا سا ہینڈ بیگ تھا۔ جوش اور شاید جلدی کی وجہ سے اس کا سانس کسی قدر پھولا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شاکر نے کہا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ کیا کھانے یا پینے کا ارادہ ہے؟''

''میں لنچ کر چکی ہوں اس لیے کوئی پینے والی چیز ہو جائے۔''

شاکر نزدیک کی دکان سے جوسز کاک ٹیل لے آیا۔

''تم رفیع جاوید کو کیسے جانتی ہو؟''

''وہ ایک سافٹ ویئر ہاؤس کے لیے کام کرتا تھا اور اسی حوالے سے مجھے یاد رہ گیا۔ میں نے اس کے سابق آفس کال کی اور اس کا پتا معلوم کر لیا۔''

''یہ کنفرم ہے کہ وہ اسی پتے پر ملے گا؟''

''نہیں مگر مجھے سیما نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ رفیع جاوید کو جانتی ہے یا اس سے ملتی ہے۔''

شاکر نے اسٹرا سے گھونٹ لیا۔ ''صائقہ! مجھے اعتراف ہے کہ میں سیما کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں جانتا کہ وہ میری بیٹی ہے۔ وہ یہاں کیا کر رہی تھی، اس کی سرگرمیاں کیا تھیں اور اس کا کن لوگوں سے ملنا جلنا تھا، میں اس سے قطعی لاعلم ہوں۔''

''یہ آپ دونوں کے درمیان دوری کی وجہ سے ہوا۔'' صائقہ نے اسے تسلی دی۔ ''لیکن میں آپ کو بتا دوں۔ سیما کچھ خاموش اور کسی قدر پراسرار لڑکی ہے مگر میں نے اس میں یا اس کے کردار میں کوئی خرابی محسوس نہیں کی۔ اس کا رہن سہن، کھانا پینا اور ملنا جلنا سب شریف لڑکیوں والا رہا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہاں آنے کے بعد مجھ میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ میری ڈریسنگ بدلی ہے۔ یہ آفس ڈریس ہے مگر سیما میں میں نے ایسی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ وہ پینٹ شرٹ پہنتی تھی یا مشرقی سوٹ۔ دونوں میں اس کا جسم پوری طرح ڈھکا ہوتا تھا۔ اسی طرح اس کا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں تھا۔ زیب شاہد سے اس کا ملنا جلنا ایک محدود دائرے میں تھا۔ مگر کمپنی کے بارے میں جو آپ نے بتایا ہے، یہ میرے علم میں نہیں ہے۔ اسی طرح میں رفیع جاوید سے اس کے رابطے سے بھی لاعلم ہوں۔''

''رفتہ رفتہ معلومات سامنے آ رہی ہیں۔'' شاکر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے یہ شخص رفیع جاوید ہماری کوئی مدد کر سکے۔ تم جانتی ہو یہ کس قسم کا شخص ہے؟''

صائقہ اس کے طرزِ تخاطب سے خوش ہوئی۔ ''شکر ہے آپ نے آپ کے بجائے تم کہا۔ ہاں، میں نے کچھ معلوم کیا ہے۔ رفیع جاوید آئی ٹی اور خاص طور سے نیٹ ورکنگ کا ماہر ہے۔ وہ پاکستان سے پڑھ کر یہاں آیا ہے اور ایک اچھے سافٹ ویئر ہاؤس سے منسلک تھا مگر پندرہ دن پہلے اس نے اچانک جاب چھوڑ دی۔''

''وجہ؟''

''بغیر کسی وجہ کے استعفا دے دیا۔ اس کے پاس ذاتی ویزا ہے اس لیے وہ سیما یا میری طرح محتاج نہیں ہے۔ جب چاہے جاب چھوڑ کر جا سکتا ہے۔''

''اس کا کوئی کانٹیکٹ نمبر؟''

''آفس کی طرف سے جو نمبر دیا گیا ہے، وہ بند جا رہا ہے لیکن آپ نوٹ کر لیں۔'' صائقہ نے اپنا موبائل نکال کر اسے رفیع جاوید کا نمبر نوٹ کرایا۔ ''پتا دوسری ریاست کا ہے۔ کل چھٹی ہے، میں آپ کو لے چلوں گی۔''

شاکر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں کل تک انتظار کر لوں گا۔''

صائقہ ہچکچائی۔ ''آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو...''

''تمہیں زحمت ہو گی۔''

''بالکل نہیں۔'' صائقہ نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے خوشی ہو گی، سیما کے ناتے آپ سے تعلق بنتا ہے۔''

شاکر کو صائقہ اچھی لگی تھی۔ کرن کے بعد اس نے جب شادی کا سوچا تو اسے کوئی عورت ایسی نہیں ملی جو اس کے دل کو بھی لگتی۔ بہت عرصے بعد اسے ایسی عورت نظر آئی تھی مگر ایک تو وہ اس سے عمر میں بہت چھوٹی تھی۔ اگر وہ تیس سال کی تھی تو اس سے پورے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ دوسرے وہ اس کی بیٹی کی دوست تھی اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی شاکر کو جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ دوسری طرف وہ محسوس کر رہا تھا کہ صائقہ کے انداز میں موجود دلچسپی صرف اس لیے نہیں تھی کہ وہ اس کی دوست کا باپ ہے۔ اس کے انداز میں ایک الگ انہماک تھا۔ مگر شاکر یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا شاید یہ اس کی غلط فہمی ہوتی... اس کا پہلا اور آخری مقصد سیما کو تلاش کرنا تھا۔ وہ صائقہ کے ساتھ اس کے فلیٹ تک آیا۔ اس نے چائے بنائی اور اسی دوران میں اس نے اپنے بارے میں بتایا۔

''میرے بابا پولیس میں تھے۔ کھرے، ایمان دار اور حرام سے بچنے والے... اس لیے جب وہ ایک ریڈ میں شہید ہوئے تو ہمارے پاس اپنا گھر تک نہیں تھا۔ اس وقت میں صرف انیس سال کی اور بی سی ایس کر رہی تھی۔ گھر کی سب سے بڑی میں ہی تھی۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں اور پھر دو بھائی تھے۔ جب تک میں نے بی سی ایس مکمل کیا، ہم نے بہت مشکل وقت دیکھا۔ پھر خوش قسمتی سے مجھے فوراً ہی جاب مل گئی۔ میں نے اپنی بہنوں اور بھائیوں کو پڑھایا۔ اسی دوران میں ایم سی ایس کیا۔ سافٹ ویئر انجینئرنگ کے کچھ کورس بھی کیے۔ اس کی بنا پر مجھے اس کمپنی میں جاب مل گئی۔ اب تک تو بس گھر چل رہا تھا مگر یہاں آنے کے بعد میں اس قابل ہوئی کہ اپنی بہنوں کی شادیاں کر سکوں اور بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکوں۔ میری بہنیں اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ ایک بھائی ڈاکٹر ہے، آج کل ہاؤس جاب کر رہا ہے۔ دوسرا ایم بی اے کر کے جاب کر رہا ہے۔ شاید کچھ عرصے میں وہ بھی یہیں آ جائے۔ امی دو سال پہلے گزر گئیں۔''

''تم نے اپنے لیے کچھ نہیں سوچا؟''

''آپ کی مراد شادی سے ہے تو ایک وقت میرا بھی ارمان تھا کہ میرا گھر ہو اور وہ سب ہو جو ایک شادی شدہ عورت کے پاس ہوتا ہے۔ جب تک میں اپنی ذمے داریاں پوری کرتی میرا دل بجھ گیا۔ اب میرا دل نہیں چاہتا۔''

شاکر نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''حالانکہ ابھی وقت نہیں گزرا ہے۔ تم جوان اور خوب صورت ہو۔ اب بھی تمہیں سب مل سکتا ہے۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''اصل میں جنہیں یہ خیال

کرنا چاہیے تھا، انہوں نے کیا ہی نہیں۔ وہ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں۔ ان کے خیال میں مجھے شادی کی ضرورت ہی نہیں۔‘‘

’’یہ ہماری معاشرتی بے حسی ہے۔‘‘ شاکر نے کہا۔ ’’ہمارے معاشرے میں آدمی کو کچھ پانے کے لیے ازخود کوشش کرنا ہوتی ہے۔ دوسرا اس کا خیال نہیں کرتا ہے۔‘‘

صائقہ نے موضوع کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ ’’آپ نے کیوں نہیں کی شادی؟‘‘

اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ’’کئی بار مجھے خیال آیا مگر کوئی ایسی عورت نہیں ملی جس پر میرا دل بھی راضی ہوتا۔ شادی ایک فطری اور معاشرتی ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی اس میں دل کی رضا بھی لازمی ہونی چاہیے۔ خاص طور سے جب انسان نے اپنے لیے خود فیصلہ کرنا ہو۔‘‘

صائقہ مسکرائی۔ ’’آپ کی طرح میں بھی دل کے کہنے پر چلتی ہوں۔‘‘ وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ ’’آپ بیٹھیں، میں ڈنر کی تیاری کروں۔‘‘

’’اگر تم محسوس نہ کرو تو میں ہاتھ بٹا سکتا ہوں، اکیلے رہتا ہوں کبھی کبھی ملازم نہیں ہوتا تو خود پکانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے باہر کھانا اچھا نہیں لگتا اس لیے سوائے مجبوری کے باہر نہیں کھاتا۔ کچن کے خاصے کام آتے ہیں۔‘‘

’’کیوں نہیں، آپ بور بھی نہیں ہوں گے۔‘‘ صائقہ کا کچن صاف ستھرا اور بہت سجا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ’’آپ کو شاشلک اور چائنیز رائس پسند ہیں؟‘‘

شاکر خوش ہوگیا۔ ’’بالکل، میرا ملازم اس کا ماہر ہے۔ ہفتے میں دو بار میں چائنیز ہی کھاتا ہوں۔ یہ صحت کے لیے بھی اچھے ہوتے ہیں۔‘‘

صائقہ نے چکن اور سبزیاں نکالیں اور ڈنر کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ اس دوران میں وہ باتیں کر رہے تھے۔ دو گھنٹے میں ڈنر کی تیاری سے لے کر وہ کھانے تک کے مراحل سے گزر چکے تھے۔ بہت عرصے بعد شاکر اتنی دیر کسی عورت کے ساتھ رہا تھا اور اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مزید رکے مگر اسے جانا تھا اس لیے وہ دل پر جبر کرکے وہاں سے نکل آیا۔ اس نے صائقہ کی لفٹ کی پیشکش مسترد کر دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس وقت ٹیکسی مشکل سے ملے گی اور اسے بہت چلنا پڑے گا۔ ’’میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہوں اس لیے کچھ دور پیدل چلنا بہتر ہوگا۔ پھر ٹیکسی مل جائے گی۔‘‘

ٹیکسی اسے خاصی آگے جا کر ملی۔ جب وہ بلڈنگ کے سامنے اترا تو اس نے سڑک پر ایک سیاہ وین کھڑی دیکھی۔ اس کے شیشے تاریک تھے اس لیے وہ نہیں جان سکا کہ اس میں دو آدمی بیٹھے تھے اور وہ اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ آج سارا دن چلتا پھرتا رہا تھا اور اب بھی اس نے پیدل خاصا سفر کیا تھا۔ تھکن اتارنے کے لیے اس نے گرم پانی کا شاور لیا اور کمبل لے کر سو گیا۔ یہ سیما کا کمبل تھا اور اس سے اس کی خوشبو آ رہی تھی۔ یک دم اس کا دل بوجھل ہوگیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’مجھے معاف کر دینا میری بچی... میں یقیناً اچھا باپ ثابت نہیں ہوا۔ مگر میں اس کی تلافی ضرور کروں گا ایک بار تم مجھے مل جاؤ۔‘‘

اگلی صبح اس کی آنکھ کال بیل سے کھلی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے صائقہ کھڑی تھی۔ وہ جھینپ گیا کیونکہ وہ صرف پتلون میں لیٹ کر سو گیا تھا۔ ’’آؤ، اندر آؤ...‘‘ وہ بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ وہ شرٹ پہن کر آیا تو صائقہ کمبل تہ کر رہی تھی۔ اس نے شاکر کی طرف دیکھا۔

’’جلدی سے تیار ہو جائیں... ناشتا ہم راستے میں کریں گے۔ میں نے بھی نہیں کیا۔‘‘

شاکر نے منہ دھویا، جوتے پہنے اور کوٹ پہن کر تیار ہوگیا۔ وہ باہر آئے اور صائقہ کی کار میں روانہ ہوئے تو سڑک پار کھڑی سیاہ وین حرکت میں آ گئی۔ اس کے اگلے حصے میں دو افراد بیٹھے تھے جن میں ایک طویل قامت تھا۔

صائقہ اسے ایک ریستوران میں لائی۔ یہاں انہوں نے پہلے ناشتا کیا۔ شاکر نے ناشتے کے بعد منہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ ’’ہمیں کہاں جانا ہے؟‘‘

صائقہ ایک نقشہ لائی تھی۔ وہ اس نے میز پر پھیلایا اور ایک چھوٹے قصبے پر انگلی رکھی۔ ’’ہمیں اس جگہ تک جانا ہے اور اس وقت ہائی وے پر بہت رش ہوتا ہے۔ چند منٹ کا سفر بعض اوقات گھنٹے میں ہوتا ہے۔‘‘

’’زیادہ دور تو نہیں ہے۔‘‘ شاکر نے نقشے پر دیے ہوئے پیمانے کے مطابق فاصلہ دیکھا۔ ’’شاید تیس میل دور ہے۔‘‘

’’اگر راستہ صاف ہوا تو ایک گھنٹے میں پہنچ سکتے ہیں۔‘‘ صائقہ نے نقشہ لپیٹ کر رکھا۔

’’تم نقشہ ہمیشہ ساتھ رکھتی ہو؟‘‘

’’رکھنا پڑتا ہے کیونکہ میں باہر سے آئی ہوں۔‘‘

وہ روانہ ہوئے۔ شاکر نے کھلونا پستول کوٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے راستے میں صائقہ کو نکال کر دکھایا تو وہ خوف زدہ ہوگئی۔ ’’میرے خدا... آپ پستول لے کر گھوم

رہے ہیں۔ یہاں یہ سنگین جرم ہے۔‘‘

’’کھلونا ہے، یہ دیکھو۔‘‘ شاکر نے اسے کھول کر دکھایا۔

’’شکر ہے، میں تو ڈر گئی تھی۔‘‘ صائقہ نے سکون کا سانس لیا۔ ’’مگر کیوں لیا ہے؟‘‘

’’حفاظت کے لیے... ڈرانے کے کام تو آئے گا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ہمارا واسطہ شاید کسی خطرناک آدمی سے پڑے اس لیے یہ لیا ہے۔‘‘

’’مجھے بھی لگ رہا ہے۔‘‘ صائقہ نے اعتراف کیا اور اپنے بڑے سے بیگ سے ایک چھوٹا پستول نما آلہ نکالا۔ ’’میں نے یہ رکھا ہے... یہ دس فٹ کے فاصلے تک کسی کو کرنٹ لگا سکتا ہے۔‘‘

آلے سے ایک چپک جانے والی ڈسک جو تار سے منسلک تھی، ٹریگر دباتے ہی نکل کر دس فٹ کے فاصلے تک کسی کے جسم سے چپک جاتی اور اسے شدید نوعیت کا کرنٹ لگتا۔ دو سیکنڈ کا کرنٹ اسے ناکارہ کرنے کے لیے کافی ہوتا لیکن یہ ہلاک نہیں کرتا تھا۔ شاکر نے کہا۔ ’’اچھی چیز ہے۔‘‘

’’اب اکثر اکیلی یا کام پر جانے والی عورتیں رکھتی ہیں تاکہ کسی ناگہانی صورت حال میں استعمال کر سکیں۔ حکومت کی طرف سے بھی اجازت ہے اور یہ دکانوں پر عام مل جاتا ہے۔‘‘

دونوں شہر سے نکل کر ہائی وے پر آئے تو وہاں بدترین ٹریفک جام تھا۔ اس ملک کی ریاستیں اور شہر پاس پاس تھے اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ باہر سے آنے والے ملازمت تو ایک ریاست یا شہر میں کرتے تھے مگر ان کی رہائش دوسری ریاست یا شہر میں ہوتی تھی اور وہ روز دفتر آتے جاتے تھے اس لیے ہائی ویز پر ٹریفک کا رش ہوتا تھا۔ صائقہ نے کہا۔ ’’اب یہاں پر متبادل شاہراہوں اور ٹرین سروس پر کام ہو رہا ہے، اس کے بعد یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔‘‘

شاکر نے سر ہلایا۔ ’’یہاں عوامی سہولتیں بہت اچھی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے جو ایک بار یہاں آتا ہے، وہ واپس نہیں جاتا۔‘‘

صائقہ کی کار ٹریفک میں رینگتی رہی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ اس قصبے کے پاس تھے۔ یہ اصل میں کمرشل ایریا تھا اور یہاں زیادہ تر چھوٹے صنعتی یونٹ اور گودام تھے۔ جب وہ قصبے کی طرف مڑے تو ایک سیاہ وین ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی اور جب تک وہ ہائی وے سے قصبے جانے والی سڑک پر آتی، صائقہ کی کار غائب ہو چکی تھی۔ شاکر اور صائقہ اس وقت قصبے کی ایک سڑک پر موجود تھے۔ پتا ایک گودام نما تین منزلہ عمارت کا ثابت ہوا۔ اس کا بڑا دروازہ بند تھا اور اس پر زنجیر کے ساتھ تالا لگا ہوا تھا۔ شاکر نے کہا۔ ’’یہ تو بند ہے۔‘‘

’’جگہ بھی ویران لگ رہی ہے۔‘‘ صائقہ فکرمند ہوگئی۔

شاکر نے اردگرد دیکھا تو اسے گودام کے ساتھ ایک گلی اندر جاتی دکھائی دی۔ ’’تم یہیں رکو، میں دیکھتا ہوں۔‘‘

’’آپ اکیلے نہیں جائیں۔‘‘

’’میں اندر جا کر دیکھتا ہوں اگر کوئی ہوا تو میں تمہیں بھی بلا لوں گا۔ اگر تمہیں کوئی خطرہ محسوس ہو تو تم پولیس کو کال کر سکتی ہو۔‘‘

مجبوراً صائقہ رک گئی۔ شاکر اتر کر گودام کی طرف بڑھا۔ اس نے اندر جانے والا ایک چھوٹا دروازہ آزمایا تو وہ بند نکلا۔ وہ گھوم کر بائیں طرف موجود چھوٹی گلی میں آیا۔ یہاں اسے ایک دروازہ کھلا ہوا مل گیا۔ دروازہ گلی کے آخری حصے میں تھا۔ شاکر نے اندر آ کر آواز دی۔ ’’کوئی ہے؟‘‘

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ جگہ رہائش کے لیے نہیں تھی پھر رفیع جاوید نے یہاں کا پتا کیوں دیا تھا؟ نیچے بڑا سا ہال تھا مگر خالی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔ اس نے نیچے کا پورا حصہ دیکھ لیا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک طرف لکڑی اور دھات سے بنی سیڑھی اوپر جا رہی تھی۔ شاکر نے کھلونا پستول نکال لیا اور اسے پشت کی طرف چھپاتے ہوئے اوپر آیا۔ یہاں بہت زیادہ خاموشی تھی۔ جیسے ہی وہ اوپر گیلری میں آیا، اچانک کسی شخص نے اس پر حملہ کیا اور اسے لیتا ہوا فرش پر جا گرا۔ وہ اس پر اندھا دھند گھونسے برسا رہا تھا۔ شاکر اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جلد اسے احساس ہوگیا کہ حملہ کرنے والا بھی اس کی طرح عام آدمی اور اناڑی ہے۔ شاکر نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ وہ دور جا گرا اور پھر ہانپتا ہوا اٹھا تھا کہ شاکر نے پستول تان لیا۔ وہ رک گیا۔ شاکر کے سامنے ایک سانولے رنگ اور کسی قدر بڑھی ہوئی شیو والا آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس کے آس پاس تھی اور صورت سے وہ نرم خو لگ رہا تھا۔ شاکر نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

’’کون ہو تم... اور مجھ پر حملہ کیوں کیا؟‘‘

"تم کون ہو، یہاں کیوں گھسے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

شاکر کی پشت راہداری کی طرف ہوگئی تھی اس لیے وہ اس لڑکی کو آتے نہیں دیکھ سکا، اس نے عقب سے وار کیا۔ شاکر زمین پر گرا اور لرزنے لگا۔ وہ پشت کے بل گرا اور تب اس نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ تڑپ گیا مگر اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ لڑکی نے اس پر کرنٹ مارنے والے آلے سے حملہ کیا تھا۔ لڑکی بھی اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحے سیڑھیوں کی طرف سے صائقہ نمودار ہوئی اور وہ شاکر کو گرے دیکھ کر چلائی۔ "شاکر! کیا ہوا آپ کو؟"

"پاپا..." بالآخر لڑکی نے کہا، وہ سیما تھی۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد وہ اس چھوٹے ہال نما کمرے میں تھے جہاں ایک طرف میز پر دو کمپیوٹرز رکھے تھے۔ یہاں لیدر صوفے تھے اور فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف بڑی سی میز پر شاکر بیٹھا ہوا تھا اور صائقہ اسے پانی پلا رہی تھی۔ کرنٹ بہت شدید تھا اور اب کہیں جا کر شاکر کے اعصاب قابو میں آئے تھے۔ سیما سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ رفیع جاوید کمپیوٹر ٹیبل سے ٹکا ہوا تھا۔ اسی نے شاکر پر حملہ کیا تھا۔ بالآخر شاکر کی حالت سنبھلی تو سیما نے کہا۔ "پاپا! آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ بھجوائی جانے والی لاش کسی اور لڑکی کی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" سیما کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ "میں بہت پہلے آپ کے لیے مرگئی تھی۔"

"ایسا مت کہو۔" شاکر جذباتی ہوگیا۔ "ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہوئی، تمہاری طرف سے بے پروائی برتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔"

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نہیں کرتے، یہ سب ماضی کا حصہ بن گیا ہے۔" سیما سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اس سے میرے حال اور مستقبل پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

"کیوں نہیں پڑے گا؟ تم مشکل میں ہو اور میں تمہیں اس سے نکالنے آیا ہوں۔"

"مجھے آپ کی یا کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" سیما رکھائی سے بولی۔ "میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔"

"تمہیں کس سے خطرہ ہے؟" صائقہ نے پوچھا۔ وہ اب تک خاموش تھی کیونکہ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ سیما اسے نظرانداز کررہی ہے۔ اسے صائقہ کی آمد یہاں اچھی نہیں لگی تھی۔ "تم اس طرح سے کیوں چھپ رہی ہو جبکہ پولیس تمہیں مردہ قرار دے چکی ہے؟"

"مجھے سائٹ میرین انٹرنیشنل کے مالک راشد سعید سے خطرہ ہے۔"

"کس قسم کا خطرہ؟... کیا وہ تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟"

سیما نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے ذاتی طور پر خطرہ نہیں ہے۔"

"ایک منٹ..." رفیع جاوید نے مداخلت کی۔ "کیا ان لوگوں کو بتانا مناسب ہوگا؟"

"تم چپ رہو۔" شاکر نے خراب لہجے میں کہا۔ "میں اپنی بیٹی سے بات کررہا ہوں۔"

"پلیز۔" سیما نے رفیع کی طرف دیکھا۔ "مجھے ان پر اعتبار ہے۔"

سیما سائٹ میرین انٹرنیشنل میں آئی ٹی پروفیشنل کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس کی ذمے داری ڈیٹا بیس کو محفوظ بنانا تھا اور اسے ہر ممکن طریقے سے خفیہ رکھنا تھا۔ دورانِ کام اسے محسوس ہوا کہ کمپنی کچھ غیر قانونی کاموں میں بھی ملوث ہے۔ اس کا اندازہ اسے یوں ہوا کہ مختلف ملکوں سے آنے والی شپ منٹس اور روانہ ہونے والی شپ منٹس میں تعداد کا فرق آتا تھا۔ یہ شپ منٹس کنٹینرز میں آتی جاتی تھیں۔ ایک دن اتفاق سے سیما نے ایک خفیہ لاگ بک دیکھ لی اس میں ان کنٹینرز کا ریکارڈ تھا جو باہر سے آتے تھے اور پھر پورٹ پر اتر کر بغیر چیک ہوئے کسی اور ملک کو روانہ کردیے جاتے تھے۔ ایک تجسس کے تحت سیما نے اس سارے معاملے کو چیک کیا اور اس پر انکشاف ہوا کہ خلیجی ممالک سے گزشتہ سات سال کے عرصے میں کم سے کم سو کنٹینرز ان کی کمپنی کے توسط سے گزرے ہیں جن کی آمد کا ریکارڈ تو ہے مگر وہ کہاں روانہ ہوئے، اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ یہ ریکارڈ اصل میں خفیہ لاگ بک میں تھا۔ یہ سو کنٹینرز اصل میں انڈیا اور چین بھیجے گئے تھے۔ ان میں موجود سامان کی تفصیل بھی نہیں تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ تمام ہی کنٹینرز ایک بڑے خلیجی ملک کے فری پورٹ سے آئے تھے اور یہاں بھی یہ فری پورٹ پر ہی اترے تھے۔

جن دنوں سیما یہ سب چیک کررہی تھی، ان ہی دنوں اسے پتا چلا کہ ایک کنٹینر شپ پر یہاں آرہا ہے۔ اس کا ذکر کمپنی کے عام ریکارڈ میں نہیں تھا۔ سیما نے خفیہ لاگ بک

میں اس کنٹینر کی تفصیلات بدل دیں۔ یہ کنٹینر ایک مہینا پہلے بندرگاہ پر پہنچا تھا کیونکہ کمپنی کی طرف سے بندرگاہ حکام کو اس بارے میں کوئی اطلاع یا معلومات فراہم نہیں کی گئی تھی، اس لیے آف لوڈ کیا جانے والا کنٹینر بندرگاہ کے کسی نامعلوم یارڈ میں پڑا ہوا تھا۔ سیما نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی۔ اس دوران میں اسے محسوس ہوا کہ کمپنی میں اس پر شک کیا جا رہا ہے۔ خفیہ لاگ بک کا پاس ورڈ بدل دیا گیا تھا اور ایسا صرف راشد سعید کر سکتا تھا۔ پھر اس کا کام چیک کیا جانے لگا۔

سیما ڈر گئی کیونکہ اس دوران میں اسے پتا چل گیا تھا کہ راشد سعید خطرناک آدمی ہے اور اس نے ایسے بدمعاش پالے ہوئے ہیں جو اس کے اشارے پر کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے کچھ عرصے بعد سائٹ میرین انٹرنیشنل سے استعفا دے دیا تھا۔ ان دنوں اس کے فلیٹ میں ایک لبنانی لڑکی روما آبیل ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کی نوکری ختم ہو گئی تھی اور وہ مالی مشکلات کا شکار تھی۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی مگر یہاں مہنگی رہائش برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ سیما سے اس کی ملاقات کچھ عرصے پہلے اسی سڑک پر واقع ایک ریستوران میں ہوئی تھی جہاں سیما اکثر کھانے کے لیے جاتی تھی۔ اس نے سیما سے مدد مانگی تو وہ انکار نہیں کر سکی۔ اس نے سیما کو یقین دلایا تھا کہ وہ جاب حاصل کرتے ہی اپنی رہائش کا بندوبست کر لے گی۔ اب وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس صبح روما جاب انٹرویو کے لیے جا رہی تھی۔ اتفاق سے اسے سائٹ میرین انٹرنیشنل کے دفتر والی بلڈنگ میں ہی جانا تھا۔ سیما نے اسے اپنا کارڈ دیا۔ ”یہ میں واپس کرنا بھول گئی تھی، تم اسے کاؤنٹر پر دے دینا۔“

روما نے کارڈ لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور روانہ ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی لاش ملی تو اس کارڈ کی وجہ سے پولیس نے اسے سیما کی لاش سمجھ لیا۔ شاکر نے سوال کیا۔ ”پولیس کو صرف تمہارا کارڈ کیوں ملا؟... اس کے پاس اس کی دستاویزات بھی تو ہوں گی؟“

”روما کے پاس ہینڈ بیگ تھا اسی میں اس کی ساری چیزیں تھیں، صرف میرا کارڈ اس نے جیب میں رکھا تھا۔“ سیما نے سوچ کر کہا۔ ”کیا اس کے سامان میں ہینڈ بیگ شامل تھا جو پولیس کو اس کے پاس سے ملا تھا؟ براؤن کلر کا اسنیک اسکن اسٹائل کا تھا؟“

شاکر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسی کوئی چیز پولیس نے مجھے نہیں دی اور نہ لاش کے ساتھ بھجوائی۔“

”ممکن ہے اس سے پرس کہیں گر گیا ہو۔“

”وہ منشیات کی عادی تھی؟“ صائقہ نے پوچھا۔

”بالکل نہیں... وہ ایک ہفتے سے میرے ساتھ تھی اور میں نے اس میں ایسی کوئی برائی نہیں دیکھی۔ ہاں آزاد خیال ضرور تھی۔ اس کے کئی دوست تھے جن کے فون آتے تھے مگر میں نے اسے کبھی کسی سے ملتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی میرے فلیٹ میں آیا۔“

”جب اس کی لاش ملی اور پولیس کو غلط فہمی ہوئی تو تم نے پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

سیما نے گہری سانس لی۔ ”اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک میں سمجھ گئی تھی کہ روما میرے دھوکے میں ماری گئی ہے۔ دوسرے مجھے اس کنٹینر کا پتا لگانا تھا۔ اگر میں پولیس سے رابطہ کرتی تو منظرِ عام پر آ جاتی اور قاتل دوبارہ کوشش کرتے۔ پھر میں اتنی آسانی سے کنٹینر تلاش بھی نہیں کر سکتی تھی۔“

”وہ کنٹینر تمہاری زندگی سے زیادہ ضروری نہیں ہے۔“

”میرے لیے وہ کنٹینر بہت ضروری ہے۔“ سیما ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ ”میں نے اس کی خاطر بہت بڑا خطرہ مول لیا اور اپنا بہت وقت ضائع کیا ہے۔“

اب تک شاکر سیما کو اس طرح تلاش کر رہا تھا جیسے کوئی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئی ہو۔ مگر جب اس نے اسے تلاش کر لیا تو اس نے محسوس کیا سیما اتنی سیدھی اور معصوم نہیں جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ کوئی سیدھی اور معصوم لڑکی اس قسم کے کھیل میں شامل نہیں ہو سکتی تھی جبکہ وہ اپنے ایک ساتھی کا انجام بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ بے چاری لڑکی اس کی وجہ سے ماری گئی تھی۔ سیما یہاں ایک مرد کے ساتھ اکیلی تھی مگر وہ پُراعتماد تھی۔ اس نے شاکر کو دیکھ کر کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا بلکہ اس کے انداز سے لگا تھا کہ اسے شاکر اور صائقہ کی آمد اچھی نہیں لگی۔ صائقہ نے کہا۔

”یہ کیا چکر ہے... آخر اس کنٹینر میں کیا ہے؟“

”سونا۔“ سیما نے جواب دیا۔ ”یہ سونا انڈیا اسمگل کیا جا رہا ہے۔“

”سونا سائٹ میرین انٹرنیشنل اسمگل کر رہی ہے؟“ صائقہ نے کہا۔ ”مگر کیوں...؟ یہاں کوئی چیز بھی لانے لے جانے پر پابندی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ گولڈ اور کرنسی بھی لا اور لے جا سکتے ہیں۔“

”مگر انڈیا میں پابندی ہے۔“ شاکر نے کہا۔ ”گولڈ

کی بے تحاشا برآمد ملک کے زرمبادلہ کے ذخائر پر اثر ڈالتی ہے اور سونا عام طور سے نجی ملکیت میں جاتا ہے، اس سے حکومت کو نقصان ہوتا ہے۔ زرمبادلہ بہرصورت حکومت کو ملتا ہے لیکن سونے پر حکومت قابو نہیں کر سکتی۔ پاکستان میں بھی ایسا ہوتا ہے مگر ہماری گولڈ کی درآمد بہت زیادہ نہیں ہے۔ انڈیا اور چین کے دولت مند جو بہت زیادہ فارن ایکسچینج رکھتے ہیں، وہ ڈالرز اور دوسری کرنسی کے مقابلے میں گولڈ اور جواہرات پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔ ایک تو ان کو رکھنا اور چھپانا آسان ہوتا ہے، دوسرے مستقبل میں وہ کرنسی کی ڈی ویلیو سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ چین اور بھارت کی حکومتیں پابندی لگاتی ہیں اس لیے اب یہ چیزیں اسمگل ہو کر جاتی ہیں۔ لیکن یہ بہت خطرناک کھیل ہے، اس میں شامل لوگ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ روما کی موت سے یہ بات ثابت بھی ہو گئی ہے۔“

”یہ شپ منٹ بہت بڑی ہے۔“ رفیع جاوید نے کہا۔ ”کم سے کم بھی کروڑوں میں سمجھ لو... ممکن ہے یہ کروڑوں ڈالرز میں ہو۔“

شاکر اور صائقہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر شاکر اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لایا اور آہستہ سے بولا۔ ”سیما... میں نہیں جانتا کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ لیکن یہ بہت خطرناک معاملہ ہے اور تم اس میں ملوث ہو رہی ہو... تمہیں اندازہ ہے کہ اگر تم ان لوگوں سے بچ بھی گئیں، تب بھی تم یہاں کی پولیس سے کیسے بچو گی... ایک بار تم گرفت میں آ گئیں تو بہت سارے سوالوں کے جواب دینا پڑیں گے۔ اگر سونا مجرموں کا ہے تو اس سے تم بھی قانون کی گرفت میں آ سکتی ہو۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

”پاپا! وہ سونا ایک کنٹینر میں ہے اور اس پر کسی کا نام نہیں ہے۔ بھلا پولیس کو کیسے پتا چلے گا کہ وہ سونا مجرموں کا ہے۔“

”لیکن وہ تمہارا بھی نہیں ہے۔ راشد سعید جیسا خطرناک شخص اسی وجہ سے تمہارے پیچھے ہے اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم اس کے آدمیوں سے بچ گئیں۔ وہ تمہاری تلاش میں ہوں گے۔“

”اگر میں اسے تلاش کر لیتی ہوں تو اس صورت میں اس سونے پر میرا حق بنتا ہے۔“ سیما بولی۔

شاکر نے اس کا بازو پکڑا۔ ”میں تمہیں کسی حماقت کی اجازت نہیں دوں گا۔“

سیما نے ایک جھٹکے سے اس سے بازو چھڑا لیا۔ ”مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“

شاکر نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”سیما! میں تمہارا باپ ہوں۔“

”یہ بات آپ کو اس وقت کیوں نہیں یاد آئی جب میں اور ماما اکیلے تھے؟ آپ کو پتا ہے انہوں نے میری پرورش اور تعلیم کے لیے کتنی محنت کی؟ اپنے آپ کو مٹا دیا میری خاطر۔ وہ بیمار ہو گئیں اور پھر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔“ کہتے ہوئے سیما کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ نے احساس کیا اس وقت؟ اور اب آپ باپ بن کر آ گئے ہیں۔“

”میری بچی... مجھ سے غلطی ہوئی، تم کہو تو گناہ ہوا۔“ شاکر نے عاجزی سے کہا۔ ”لیکن تم جو کر رہی ہو اس کے جواز میں یہ سب نہیں کہہ سکتی ہو۔ آج اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی تو کیا وہ تمہاری حمایت کرتی؟“

سیما چپ ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ”پاپا! بات آگے بڑھ چکی ہے۔ اگر ہم نے سونا حاصل نہیں کیا تو مجھے خود کو پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا اور اس کے بعد میں زندہ نہیں رہوں گی۔“

”اگر مسئلہ دولت کا ہے تو میرے پاس دولت ہے۔ تمہیں اس کے لیے سونا حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سیما ہچکچا رہی تھی جیسے اس نے کچھ چھپایا ہو پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”پاپا! ایک مسئلہ اور ہے... ہم نے اس سونے کا سودا ایک پارٹی سے کر لیا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ راشد سعید سے کم نہیں ہے۔ اگر اسے سونا نہ ملا تو وہ بھی ہماری دشمن ہو جائے گی۔“

شاکر پریشان ہو گیا۔ ”میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم نے کیا کیا ہے۔ کیا تمہیں کوئی سمجھانے والا نہیں تھا؟“

”نہیں پاپا! میں ہمیشہ سے اکیلی رہی ہوں۔“

”تمہیں اس شخص نے مس گائیڈ کیا ہے۔“ شاکر نے رفیع کی طرف دیکھا۔

”پاپا! یہ میری مدد کر رہا ہے۔“

”مدد کر رہا ہے یا تمہیں جرم کی دلدل میں پھنسا رہا ہے؟“ شاکر نے تلخی سے کہا۔ ”دوسری پارٹی سے رابطہ کیسے ہوا؟“

”رفیع جانتا ہے۔“

”وہ سونے کے بدلے کیا دے رہے ہیں؟“

”ایک ملین ڈالرز۔“ سیما نے کہا۔

"تمہیں کیا ملے گا؟"

"آدھا۔"

"پانچ لاکھ ڈالرز... یعنی تقریباً پونے پانچ کروڑ پاکستانی روپے۔" شاکر نے کہا۔ "سیما! صرف میری فیکٹری کی مالیت اس سے چار گنا زیادہ ہے۔ چھوڑو ان چکروں کو اور میرے ساتھ چلو۔"

سیما نے اسے برہمی سے دیکھا۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ آپ کے پاس کتنی دولت ہے۔ مجھے اپنی زندگی خود بنانی ہے۔ آپ مجھے لالچ دے رہے ہیں؟"

"میرا یہ مطلب نہیں سیما... میں کہہ رہا ہوں کہ تم میری وارث ہو اور میرا سب کچھ تمہارا ہوگا۔ تمہیں دولت کے لیے کوئی غلط کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"آپ کا سب کچھ میرا ہوگا لیکن ابھی میرا کچھ نہیں ہے۔" سیما نے کہا اور پلٹ کر چلی گئی۔ صائقہ دور سے دیکھ رہی تھی، وہ شاکر کے پاس آئی۔

"کیا ہوا... وہ مان نہیں رہی ہے؟"

"نہیں، وہ بہ ضد ہے۔" شاکر نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ "وہ نادان ہے، اسے اندازہ نہیں ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

"مجھے یہ شخص ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔" صائقہ آہستہ سے بولی۔ "اگر آپ نے سیما کو اس کے ساتھ چھوڑا تو یہ اسے دھوکا دے سکتا ہے... کسی مشکل میں پھنسا سکتا ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" شاکر نے کہا۔ "اگر وہ نہیں مان رہی ہے، تب بھی میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔"

"آپ کیا کریں گے... اس جرم میں ان لوگوں کا ساتھ دیں گے؟" صائقہ نے حیرت سے کہا۔

"اگر ایسا کرنا پڑا تو کروں گا۔ میں اب سیما کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" شاکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور صوفے کی طرف آیا جہاں سیما بیٹھی تھی۔

وہ نازک نقوش والی خوب صورت لڑکی تھی، جسم متناسب اور کسی قدر مضبوط تھا۔ پینٹ اور شرٹ میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔ شاکر نے اس کے برابر میں بیٹھ کر کہا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔"

سیما نے کسی قدر حیرت سے باپ کو دیکھا۔ "ابھی تو آپ مجھے منع کر رہے تھے؟"

"ہاں، جب تم نہیں مانیں تو میں نے فیصلہ کیا کہ اس کھیل میں میں تمہارے ساتھ ہوں... چاہے اس کا انجام جو بھی ہو۔"

سیما پہلی بار مضطرب ہوئی۔ "پلیز پاپا! میں آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"سیما! میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" شاکر نے کہا۔

رفیع جاوید اب تک خاموشی سے سن رہا تھا، اس نے کہا۔ "اس میں اتنا خطرہ نہیں ہے کیونکہ ہمیں عملی طور پر کچھ نہیں کرنا ہے۔"

"تم لوگوں کو کیا کرنا ہے؟" شاکر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں صرف وہ کنٹینر تلاش کرنا ہے، اس کے بعد ہمارا کام ختم ہو جائے گا۔"

"پارٹی ایک ملین ڈالرز کی بھاری رقم تم لوگوں کو صرف ایک کنٹینر کا پتا بتانے کے عوض دے رہی ہے؟" شاکر کے انداز میں طنز تھا۔

"ہاں کیونکہ ہمیں اور پارٹی کو یقین ہے کہ اس کنٹینر میں اس سے کہیں زیادہ مالیت کا سونا موجود ہے۔" رفیع جاوید نے کہا۔

"لیکن وہ سونا تمہیں نہیں ملے گا۔" دروازے کی طرف سے آواز آئی تو انہوں نے چونک کر دیکھا۔

وہاں طویل قامت اور اس کے ساتھ ایک سیاہ فام کھڑا تھا۔ دونوں کے ہاتھ میں پستول تھے اور ان کا رخ ان کی طرف تھا۔ وہ چاروں بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔

"کون ہو تم؟" رفیع جاوید نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ راشد سعید کے آدمی ہیں۔" شاکر نے مطلع کیا اور طویل قامت کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اسے اس کے دفتر میں دیکھ چکا ہوں۔"

"اس لیے دوست، تم ہمارے ساتھ چلو گے۔" طویل قامت نے آگے آتے ہوئے کہا۔ اس کی گھنی بھوؤں کے درمیان گڑھا سا تھا۔

"میں کیوں چلوں گا؟"

"کیونکہ تم ہمیں دیکھ چکے ہو۔ اے لڑکی! تم بھی ادھر آؤ۔" طویل قامت نے سیما کی طرف دیکھا۔ "تم نے ہمیں بے وقوف بنایا۔ تمہارے دھوکے میں ہم نے اس لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا۔"

صائقہ شاکر کی آڑ میں تھی اس لیے وہ دونوں نہیں دیکھ سکے تھے اور اس نے پرس سے اپنا کرنٹ مارنے والا آلہ نکال کر پرس کی آڑ میں کر لیا تھا۔ جیسے ہی طویل قامت

نزدیک آیا، صائقہ نے فائر کیا اور تار نکل کر طویل قامت تک گیا۔ وہ جھٹکا کھا کر گرا۔ سیاہ فام سمجھ نہیں سکا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ اس کی طرف جھکا تھا کہ طویل قامت کے پستول سے یکے بعد دیگرے فائر ہونے لگے۔ پہلی دو گولیاں سیاہ فام کے سینے میں اتر گئیں اور وہ جھٹکے سے گرا۔ باقی سب فائرنگ سے بچنے کے لیے نیچے گر گئے۔ مسلسل کرنٹ لگنے سے طویل قامت کی انگلی ٹریگر دبا رہی تھی حتیٰ کہ میگزین ختم ہو گیا اور کلک کی آوازیں آنے لگیں۔ شاکر نے جلدی سے اٹھتے ہوئے سیاہ فام کا گرا ہوا پستول اٹھا لیا۔ وہ ساکت تھا اور اس کے سینے سے خون ابل رہا تھا۔ ایک سوراخ عین دل کے مقام پر تھا۔ وہ مر چکا تھا یا مرنے والا تھا۔ صائقہ کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے بھی ایسی سچویشن کا سامنا نہیں کیا تھا۔ سیما کی حالت بھی اچھی نہیں تھی مگر رفیع خوش ہو گیا۔ اس نے صائقہ سے کہا۔

"تم نے ہمیں بچا لیا۔"

"خطرہ ٹلا نہیں ہے۔" شاکر نے طویل قامت کی طرف اشارہ کیا جو ساکت پڑا تھا مگر اس کی کھلی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ہوش میں ہے البتہ وہ کرنٹ کھا کر حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ "پتا نہیں اس کے اور کتنے ساتھی باہر ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ آئیں، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

سیما اور رفیع نے عجلت میں اپنا سامان سمیٹا۔ کمپیوٹرز کا پورا سسٹم لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے رفیع نے دونوں سی پی یو ساتھ لے لیے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس معمولی سامان تھا۔ شاکر نے سیاہ فام کے کوٹ سے پستول کے دو میگزین اور نکال لیے تھے۔ سیما نے پوچھا۔ "آپ کو پستول چلانا آتا ہے؟"

"ہاں لیکن نشانہ اچھا نہیں ہے۔"

"میرا نشانہ اچھا ہے، پستول مجھے دے دیں۔"

شاکر نے پستول اس کے حوالے کر دیا۔ وہ باہر آئے تو صائقہ کی کار کے ساتھ سیاہ وین کھڑی ہوئی تھی۔ وہ خالی تھی۔ انہوں نے سامان کار کی ڈکی میں رکھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ صائقہ نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"انہیں کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟"

"یہ فلیٹ سے ہمارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہوں گے۔" شاکر نے یقین سے کہا۔ "راشد سعید سیما کے فلیٹ کا پتا جانتا ہوگا۔ وہ اس کی فرم میں جاب کرتی رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ قاتل روما کے پیچھے فلیٹ سے گئے ہوں گے۔ اس سے بھی انہیں یقین آ گیا ہوگا کہ وہی سیما ہے۔"

"اب ہم کہاں جائیں گے؟" رفیع جاوید نے پریشانی سے کہا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی اور ٹھکانا نہیں ہے؟" شاکر نے پوچھا۔

"نہیں، میرے پاس یہی جگہ تھی۔ ایک افغانی تاجر کا گودام ہے، اس نے مجھے رہائش کے لیے دیا ہوا ہے لیکن وہ خود چھ مہینے سے غائب ہے۔ واپس گیا تو آیا ہی نہیں۔ اس کا دو مہینے کا کرایہ بھی باقی ہے۔ میں نے سوچا تھا دو مہینے بعد خالی کر دوں گا۔"

"سیما میرے ساتھ رہے گی۔" صائقہ نے کہا۔

"اس کے فلیٹ میں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"وہاں جانا بالکل مناسب نہیں ہوگا۔" شاکر نے کہا۔ "ہم کسی ہوٹل میں رکیں گے۔"

"میں کسی ہوٹل میں نہیں رک سکتا۔" رفیع نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ "میرا ویزا ایکسپائر ہو گیا ہے۔"

شاکر نے گہری سانس لی۔ "تم پہلے ہی قانون شکنی کے مرتکب ہو رہے ہو۔"

"یہ مسئلہ نہیں ہے، میرے پاس دولت آ جائے تو میں کسی بھی طریقے سے پاکستان واپس چلا جاؤں گا۔"

شاکر نے سوچا۔ "ایک جگہ ہے... لیکن پہلے اس سے پوچھنا ہوگا۔"

سیما نے چونک کر پوچھا۔ "کون سی جگہ پاپا؟"

"تم جانتی ہو، میں زیب شاہد کی بات کر رہا ہوں۔" شاکر نے کہا اور شہر قریب آنے پر اس نے زیب کو کال کی۔

"ہم مشکل میں ہیں، ہمیں پناہ چاہیے۔"

زیب چونکا۔ "ہم... کیا سیما مل گئی ہے؟"

"ہاں، اللہ کا شکر ہے وہ زندہ سلامت ہے لیکن پناہ مجھے اور ایک آدمی کو چاہیے۔ ساری بات فون پر نہیں بتا سکتا۔"

"آپ میرے پاس آ جائیں۔" زیب نے جلدی سے کہا۔

شاکر نے موبائل رکھ کر صائقہ سے کہا۔ "پہلے ہمیں زیب کے گھر جانا ہوگا۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ زیب شاہد کے فلیٹ پر تھے۔ وہ سیما کو دیکھ کر خوش ہوا مگر جب سیما نے اسے دیکھ کر کوئی خاص ردعمل نہیں دکھایا تو اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا پھر شاکر نے اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بتائے اس کا

چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے تو یہ مافیا والے لگ رہے ہیں۔ میرے خدا! اتنے بڑے پیمانے پر جرم...''

''مافیا ہی ہیں... اس سارے چکر میں ایک بے گناہ لڑکی اور راشد سعید کا ایک آدمی اس کے دوسرے آدمی کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔''

''اس مسئلے کا حل پولیس کے پاس ہے۔'' زیب نے کہا۔

سیما کھڑی ہو گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم نے یہاں آ کر غلطی کی۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' زیب نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے یہ معاملہ بہت خطرناک لگ رہا ہے۔ جو لوگ ایک ملین ڈالرز دے سکتے ہیں، وہ کسی کی جان بھی لے سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' رفیع نے درشت لہجے میں کہا۔

''مطلب یہ کہ اگر کنٹینر سے سونا نہ نکلا تو...''

سیما چونکی اور رفیع نے اس کی طرف دیکھا۔ ''سیما نے یقین دلایا ہے کہ کنٹینر میں سونا ہے۔''

''اس نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔'' زیب بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کون لوگ ہیں جو اَن دیکھے سودا کر رہے ہیں۔''

''ایک افغان پارٹی ہے۔'' رفیع نے کہا۔

''یہاں آنے والے اکثر افغان مجرم ہوتے ہیں۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ اور دوسرے غیر قانونی کاموں میں ملوث ہوتے ہیں۔'' زیب نے کہا۔ ''ستم ظریفی یہ ہے کہ اکثر کے پاس پاکستانی پاسپورٹ ہوتا ہے اور بدنام ہمارا ملک ہوتا ہے۔''

''یہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔'' شاکر نے خبردار کیا۔ ''تم نے ان پر اعتماد کیسے کر لیا؟ اس سے کم خطرہ تو اس میں ہے کہ تم خود کنٹینر تلاش کر کے اس کا سونا اوپن مارکیٹ میں فروخت کر دو۔''

رفیع پریشان نظر آ رہا تھا۔ ''جب سیما نے مجھے بتایا تو مجھے یہی ایک راستہ نظر آیا۔''

شاکر فکر مند ہو گیا۔ پہلے ہی راشد سعید جیسا خطرناک آدمی پیچھے تھا، اب یہ خطرہ سامنے آ گیا تھا۔ اسے زیب کی تجویز ٹھیک لگنے لگی تھی کہ پولیس سے رجوع کیا جائے۔ بے شک انہیں بھی پریشانی ہوتی اور امکان تھا کہ انہیں ڈی پورٹ کر دیا جائے گا مگر جان کے خطرے کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ گودام میں پیش آنے والے واقعے کے بعد سیما بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ شاکر نے ایک بار پھر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ رفیع کو زیب شاہد کے پاس چھوڑ کر وہ روانہ ہوئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی شاکر نے سیما سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ زیب ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''پاپا! آپ کا خیال ہے اگر میں اس معاملے سے پیچھے ہٹ جاتی ہوں تو کیا ہوگا؟ کیا راشد اور دوسرے ہمیں چھوڑ دیں گے؟''

''ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''راشد اور افغانی، دونوں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ وہ وہاں بھی آ سکتے ہیں۔'' سیما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پاپا! آپ بلا وجہ اس میں شامل ہو رہے ہیں۔ ابھی آپ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ آپ واپس چلے جائیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' شاکر نے انکار کیا۔ ''میں کسی صورت تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا اور تم بھول رہی ہو کہ میں راشد سعید سے مل چکا ہوں اور اس کے آدمی نے بھی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ میں بھی کسی صورت نہیں بچ سکتا۔''

سیما خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر فکر کے تاثرات تھے۔ صائقہ خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے باپ بیٹی کی گفتگو میں دخل دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

زیب سوچ رہا تھا۔ رفیع نے کہا۔ ''کیا میں اپنا سسٹم یہاں لگا سکتا ہوں؟''

''ہاں لیکن تم کیا کرو گے؟''

''میں مختلف ٹرمنل کمپنیوں کے سسٹم میں گھس کر اس کنٹینر کو تلاش کر رہا ہوں۔''

اگرچہ یہ زیب کا شعبہ نہیں تھا مگر اسے دلچسپی محسوس ہوئی۔ ''کیوں نہیں، تم لگا سکتے ہو۔'' اس نے کہا تو رفیع حرکت میں آ گیا۔ اس نے ایک سی پی یو سیٹ کیا اور زیب کا مانیٹر، کی بورڈ، ماؤس اور انٹرنیٹ اس سے منسلک کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنا کام کر رہا تھا۔ زیب اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہیکنگ کے لیے رفیع چند سافٹ ویئر استعمال کر رہا تھا۔ وہ زیب کو زبانی بتا بھی رہا تھا کہ وہ کس طرح یہ کام کر رہا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک ٹرمنل کمپنی کے سسٹم میں تھا۔ وہ کنٹینر کو اس کیٹیگری میں تلاش کر رہا تھا جس میں نامعلوم کنٹینرز ریکارڈ کیے جاتے ہیں۔ اس کے پاس مذکورہ کنٹینر کی کچھ نشانیاں تھیں اور وہ ہر سسٹم میں جا کر نامعلوم کنٹینرز سے یہ نشانیاں میچ کرتا تھا۔ اس نے مذکورہ صفحہ کھولا تو ایک کنٹینر کا نمبر دیکھ کر چونکا۔ اس نے اس کا صفحہ کھولا تو اس میں کنٹینر کی نشانیاں درج تھیں۔ رفیع نے جوش سے کہا۔

''مل گیا۔''

''تمہیں یقین ہے کہ یہی کنٹینر ہے؟'' زیب نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے۔ دیکھو ساری نشانیاں میچ کر رہی ہیں۔ نمبر، کلر، سائز، ڈینٹ اور دوسری نشانیاں مل رہی ہیں۔'' رفیع نے کہا۔ ''اب ہمیں یارڈ میں جا کر دیکھنا ہوگا۔''

''اس میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟'' زیب نے پوچھا۔ وہ کچھ فکر مند تھا۔

''نہیں، وہاں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ بندرگاہ بہت بڑی ہے اور ہزاروں لوگ وہاں ہوتے ہیں۔ پھر کسی کو کیا معلوم کہ ہم وہاں جائیں گے۔''

''ہم؟'' زیب چونکا۔

''ہاں پلیز! تم بھی ساتھ چلو... ممکن ہے ہمیں چھپ کر دیکھنا پڑے تو دو افراد ہونے چاہئیں۔ میں دیکھوں گا اور تم دیکھنا کہ کوئی آ تو نہیں رہا ہے۔''

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ زیب تیار ہو گیا۔ رفیع نے سیما کو کال کر کے اطلاع دی کہ کنٹینر مل گیا ہے اور اب انہیں اس کی تصدیق کرنا ہوگی۔ سیما خوش ہو گئی۔ اس نے رفیع سے کہا۔ ''میں بھی چلوں گی۔ لیکن بہتر ہے رات کو چلا جائے۔ رات میں وہاں کم لوگ ہوں گے اور تاریکی میں نظروں میں آنے کا خطرہ بھی کم ہوگا۔ لیکن جب تک تصدیق نہ ہو جائے، تم پارٹی کو اطلاع نہیں دو گے۔''

☆☆☆

شاکر کے سامنے سیما نے رفیع سے بات کی تھی۔ اس سے بات کر کے سیما نے پُر جوش لہجے میں اطلاع دی۔ ''کنٹینر مل گیا ہے، وہ ایک کمپنی کے یارڈ میں موجود ہے۔''

شاکر اب تک ذہنی طور پر راضی نہیں ہوا تھا، اسے یہ کام غلط لگ رہا تھا۔ بے شک سونا مجرموں کا تھا اور اس سرزمین پر اس کی موجودگی جرم نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ جرم ہی ہوتا۔ کسی دوسرے کی چیز ہتھیا لینا جرم ہی ہوتا ہے۔ شاکر نے محسوس کیا کہ سونے کی لالچ نے سیما کو اندھا کر دیا تھا اور وہ اس سونے کے ساتھ جڑے خطرات دیکھنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ انتقاماً باپ کی بات ماننے سے انکار کر رہی ہو۔ مگر اسے سوچنا چاہیے تھا کہ وہ سونا حاصل کرنے کے بعد کیا کرتی؟ کیا راشد سعید جیسا طاقتور شخص اسے معاف کر دیتا؟ اس کا بھی پورا امکان تھا کہ وہ جس پارٹی سے سودا کر رہی تھی، وہی اسے دھوکا دے جاتی۔ ایک ملین ڈالرز کے مقابلے میں چند گولیاں یقیناً بہت سستی پڑتی ہیں۔ شاکر نے سر ہلایا۔ ''اچھی بات ہے لیکن ہو سکتا ہے، وہاں کچھ لوگ اور بھی ہوں جو منتظر ہوں کہ کون کنٹینر کو دیکھنے آتا ہے۔''

سیما نے نفی میں سر ہلایا۔ ''راشد کو علم ہوتا تو اب تک کنٹینر وہاں نہیں ہوتا۔ دوسری پارٹی کو علم ہوتا تو انہیں ہم سے تلاش کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''میرا اشارہ راشد کی طرف ہے۔ ایک کنٹینر اس کے لیے اتنا اہم نہیں ہوگا جتنا تمہاری زندگی ہے کیونکہ تم اس کے خفیہ جرم سے واقف ہو اور تمہارا وجود اس کے لیے خطرے کی علامت ہے۔ اس نے تمہارے دھوکے میں ایک بے گناہ لڑکی کو بے دریغ مروا دیا۔''

شاکر کو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ وہ کسی سوچ میں گم تھی۔ پھر اس نے چونک کر کہا۔ ''ایک منٹ پاپا۔''

اس نے موبائل نکالا اور کسی کو کال کی۔ ''میں بات کر رہی ہوں... سنو، میں نے فیصلہ کیا ہے... پارٹی سے سودا کینسل کر دو... ہاں کہہ دو کہ کنٹینر نہیں مل سکا... ہاں، ہم کنٹینر خود حاصل کریں گے... یہ میرا پروجیکٹ ہے اس لیے فیصلہ بھی میرا ہوگا۔'' اس نے موبائل بند کر دیا۔

''سیما! یہ کیا کر رہی ہو تم؟''

''پاپا پلیز! مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کریں۔'' سیما نے ترش لہجے میں کہا۔ ''آپ کو میرا ساتھ دینا ہے تو چپ چاپ دیں۔ اگر اعتراض کرنا ہے تو بہتر ہے ہم الگ ہو جاتے ہیں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے مگر اس طرح کنٹینر خود حاصل کرنا اور بندرگاہ سے نکالنا آسان نہیں ہوگا۔''

''مجھے معلوم ہے یہ کام کیسے کرنا ہے۔ آخر اتنے عرصے میں نے میرین کمپنی میں کام کیا ہے۔'' سیما بولی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''پاپا! مجھے یقین ہے سونا بہت بڑی مالیت کا ہے۔''

''ہاں، کم سے کم دو انسانی جانوں کی مالیت کا ہو گیا ہے۔'' شاکر نے گہری سانس لی۔ ''ساتھ ہی لگ رہا ہے کہ اصل مالیت مزید کئی اور جانوں کے برابر ہے۔''

☆☆☆

راشد سعید کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اسے بے دریغ ستا رہا تھا۔ طویل قامت اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ فام ساتھی کی موت اور ناکامی کی اطلاع دی تھی اور اب سر جھکائے کھڑا تھا۔ جب راشد بول چکا تو اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''باس، ایک اچھی خبر بھی ہے... گم شدہ کنٹینر بندرگاہ پر موجود ہے۔ میں نے خود ان لوگوں کو بات کرتے سنا تھا۔''

راشد چونک گیا۔ ''کیا ٹھیک کہہ رہے ہو؟''

''میں قسم کھاتا ہوں باس...''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اپنے آدمی بندرگاہ پر پھیلا دو۔ وہ وہیں آئیں گے اور اب کسی کو بچ کر جانا نہیں چاہیے ورنہ تم بھی سمندر کی تہ میں پہنچ جاؤ گے۔''

طویل قامت نے اطمینان کا سانس لیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ اس کا بھی اپنے ساتھی والا حشر نہ ہو۔ لیکن اسے ایک موقع اور مل گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس موقع کو گنوائے گا نہیں۔

☆☆☆

بندرگاہ کی عمومی پارکنگ میں دونوں گاڑیاں رکیں۔ رات کا وقت تھا اور بندرگاہ کی روشنیوں کا عکس سمندر تک جا رہا تھا۔ رفیع اور زیب دوسری گاڑی میں آئے تھے۔ رفیع نے سیما سے کہا۔ ''تم جو سوچ رہی ہو، وہ آسان نہیں ہے۔ اوّل تو ہم کنٹینر یہاں سے نہیں نکلوا سکتے کیونکہ ہمارے پاس کاغذات نہیں ہیں۔''

''نکلوا سکتے ہیں۔'' سیما بولی۔ ''میں جانتی ہوں کاغذات کیسے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ میرے پاس ڈھیروں نمونے ہیں۔ زیب ان کو تبدیل کرے گا ہم ان پر ضروری سائن اور مہریں پرنٹر سے لگائیں گے اور یوں کاغذات تیار ہو جائیں گے۔ کیوں زیب! یہ کام ناممکن تو نہیں ہے؟''

''وہ تو ہے۔'' زیب نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''لیکن خطرہ ہے۔''

''خطرہ تو یہاں آنے میں بھی ہے۔'' سیما نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں یہاں آنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔''

''کیا ہم اندر جا سکیں گے؟'' شاکر نے پوچھا۔

''اندر جانے کا اجازت نامہ ہوتا ہے۔'' سیما نے کہا اور ایک بیج نکال کر گلے میں لٹکا لیا۔ یہ بھی سائٹ میرین انٹرنیشنل کا تھا۔ ''آپ سب لوگ میرے ساتھ ہیں۔''

وہ اندر کی طرف بڑھے۔ ایک طرف بہت بڑے رقبے پر درآمدی اور برآمدی کنٹینرز رکھے ہوئے تھے اور ان کی تعداد بلاشبہ لاکھوں میں تھی۔ اوپر تلے پانچ پانچ کنٹینرز بھی رکھے تھے۔ ایک ہی جگہ کنٹینرز کا پورا بلاک تھا جس میں چھپے ہوئے کنٹینر کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ رفیع نے کہا۔ ''یہ سب ایک ہی کمپنی کے کنٹینرز ہیں اس لیے اس طرح رکھے ہیں۔ ہمیں جس کنٹینر کی تلاش ہے، وہ الگ یا اس طرح سے رکھا ہو گا کہ اسے فوری اٹھایا جا سکے۔''

''کنٹینر کس یارڈ میں ہے؟''

''ڈیکن یارڈ میں۔'' رفیع نے کاغذ دیکھا جس پر کنٹینر کی لوکیشن لکھی تھی۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ آخر میں ہے۔''

رات کا وقت اور چھٹی کا دن تھا اس لیے بندرگاہ کے اس حصے میں چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی ورنہ کام کے دنوں میں یہاں چوبیس گھنٹے کنٹینرز ہینڈلنگ ہوتی تھی۔ اب بھی بعض جگہوں پر کنٹینرز رکھے یا اٹھائے جا رہے تھے مگر مجموعی طور پر کام تقریباً رکا ہوا تھا۔ وہ پانچوں جان بوجھ کر تاریک حصوں سے گزر رہے تھے۔ شاکر اور صائقہ ذرا پیچھے تھے۔ صائقہ نے آہستہ سے کہا۔ ''یہ پاگل پن ہے، ہم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔''

شاکر نے گہری سانس لی۔ ''اسی لیے میں تمہیں ساتھ آنے سے منع کر رہا تھا۔''

''نہیں، میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔'' شاکر نے ایک لمحے کو رک کر اسے دیکھا۔

''مجھے اب تمہاری فکر بھی لگ گئی ہے۔''

''جب تک میں آپ کے ساتھ ہوں، مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔''

شاکر نے غور سے اسے دیکھا اور پھر بولا۔ ''اگر کوئی غیر متوقع بات ہو تو تم اپنے آپ کو بچانا۔''

''میں کسی صورت آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔'' صائقہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئی۔ سیما اور رفیع سب سے آگے تھے۔ زیب ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ اچانک وہ رک گیا، شاکر نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔'' زیب بولا۔

''تم چاہو تو واپس جا سکتے ہو۔'' شاکر نے کہا۔

''میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ تم کیوں چلے آئے؟''

''سونے کا سن کر۔'' رفیع نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''سونے کا سن کر یہ خطرہ بھول گیا تھا مگر یہاں آکر اسے خطرے یاد آرہے ہیں۔''

زیب کھسیا گیا۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔''

''ایسا کرو تم گاڑی میں بیٹھ کر ہمارا انتظار کرو۔'' شاکر نے کہا اور صائقہ کی طرف دیکھا۔ ''یہی مشورہ تمہارے لیے ہے۔''

''میں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔'' صائقہ بولی تو سیما نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی دوست اس کے باپ میں دلچسپی لے رہی تھی۔ زیب وہیں سے پلٹ گیا اور وہ آگے بڑھے۔ رفیع یارڈز کے نام چیک کر رہا تھا۔ بالآخر ایک جگہ اسے ڈیکن یارڈ کی تختی نظر آگئی۔ یہاں چار دیواری نہیں تھی بلکہ کھلی جگہ پر نشانات سے حد بندیاں کی ہوئی تھیں۔ ڈیکن یارڈ خاصا بڑا تھا۔ یہ کم سے کم ایک ہیکٹر رقبے پر تھا اور اس میں ہزاروں کنٹینرز موجود تھے۔ یہاں زیادہ روشنی نہیں تھی۔ وہ پریشان ہوگئے۔ سیما نے کہا۔

''اتنے کنٹینرز میں مطلوبہ کنٹینر کیسے ملے گا؟''

''میرے پاس لوکیشن ہے لیکن مجھے ان کا زیادہ پتا نہیں ہے۔'' رفیع نے کہا تو سیما نے کاغذ اس سے لے لیا۔

''پہلے بتانا تھا نا۔'' وہ کاغذ دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں ساؤتھ اینڈ پر دیکھنا ہے۔''

وہ جنوبی حصے کی طرف بڑھے۔ یہاں زیادہ تر سنگل کنٹینرز رکھے تھے۔ انہیں بائیس بارہ ستائیس نمبر کا کنٹینر تلاش کرنا تھا جس کی الفابیٹ سیریز سی ڈی اے تھی۔ شاکر نے کہا۔ ''ہمیں الگ الگ تلاش کرنا چاہیے، اس سے وقت بچے گا۔''

''ہاں، ایک آدمی نظر میں نہیں آئے گا۔'' رفیع بولا۔ ''زیادہ ہوئے تو کوئی نہ کوئی دیکھ کر پوچھنے آجائے گا۔''

وہ چاروں منتشر ہو کے کنٹینر تلاش کرنے لگے۔ شاکر نے صائقہ سے کہا۔ ''تم اس طرف جاؤ۔''

صائقہ کو اکیلے ان گلیوں میں گھستے ہوئے ڈر لگ رہا تھا مگر وہ خود شاکر کا ساتھ دینے کا اعلان کر چکی تھی اس لیے مجبوراً ہمت کرنا پڑی۔ شاکر کنٹینرز کے درمیان سے گزرتے ہوئے مطلوبہ سیریل کا کنٹینر تلاش کر رہا تھا۔ اچانک اسے لگا کہ کہیں کوئی آہستہ سے بولا ہے۔ یہ آواز اس طرف سے آئی تھی جہاں صائقہ گئی تھی۔ وہ دبے قدموں اس طرف بڑھا۔ اس نے ایک گلی میں جھانک کر دیکھا تو اسے صائقہ کے پاس ایک شخص نظر آیا اور پھر شاکر نے اس کے طویل قد سے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی طویل قامت تھا، راشد سعید کا آدمی۔ اس نے صائقہ کو پستول کی زد میں لے رکھا تھا اور اس سے باقی لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ صائقہ نے جواب دیا۔ ''وہ سب اس طرف ہیں۔'' اس نے جس سمت اشارہ کیا تھا، وہاں صرف رفیع تھا۔ گویا صائقہ اسے اور سیما کو بچا رہی تھی۔

''فکر مت کرو حسین گڑیا... میرے ساتھ اس بار بہت لوگ ہیں اور ہم یہاں سے فارغ ہو جائیں پھر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا اور بتاؤں گا کہ کرنٹ کیسے لگاتے ہیں۔''

صائقہ لرز گئی۔ وہ پیچھے ہٹی مگر طویل قامت نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا پستول تھا۔ شاکر سمجھ گیا کہ اس پر سائلنسر لگا ہوا ہے۔ شاکر نے اپنا پستول نکالا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے سیما سے پستول لے لیا تھا۔ وہ آگے بڑھنے سے پہلے طویل قامت کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس گلی میں شاکر فوراً نظر میں آجاتا۔ یہ سن کر وہ پریشان ہو گیا تھا کہ طویل قامت کے ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ جیسے ہی طویل قامت صائقہ کو لے کر وہاں سے نکلا، شاکر دبے قدموں اس کے پیچھے بڑھا۔ رفیع اور سیما ابھی آزاد تھے۔ شاکر سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو اور خود کو کیسے بچائے۔ اچانک اسے عابد روزالی کا خیال آیا۔ اس نے شاکر کو اپنا کارڈ دیا تھا۔ شاکر نے پرس سے کارڈ نکالا اور اس کا موبائل نمبر ملایا۔ وہ ایک چھوٹی سی گلی میں آگیا تھا۔ کچھ دیر بعد عابد نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو، کون بات کر رہا ہے؟''

''میں شاکر رضی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے آواز دباتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت بندرگاہ کے کنٹینر یارڈ میں ہوں اور یہاں میرے ساتھ سیما اور کچھ ساتھی اور ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں، تم وہاں کیا کر رہے ہو اور سیما کہاں سے آگئی؟''

''وہ زندہ اور میرے ساتھ ہے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہاں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس لڑکی کو قتل کر کے برج سے نیچے پھینکا تھا جس کی لاش تم سیما کی قرار دے رہے تھے۔ اگر تم انہیں گرفتار کرنا چاہتے ہو تو فوراً اپنی فورس لے کر یہاں آجاؤ۔ دیر کی تو وہ ہمیں مار کر فرار ہو جائیں گے۔''

''کون ہیں یہ؟''

''یہ میرین سائٹ انٹرنیشنل کے مالک راشد سعید کے آدمی ہیں۔ اس سارے قصے کے پیچھے وہی اصل شخص ہے۔''

عابد نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا... پولیس کچھ دیر میں پہنچ جائے گی۔ تم لوگ خود کو بچائے رکھو۔''

خود کو بچائے رکھنا ہی اصل کام تھا۔ پولیس کتنی بھی تیزی دکھاتی، وہ آدھے گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں آسکتی تھی۔ شاکر گلی سے نکلنے لگا تھا کہ ایک سایہ مخالف سمت سے نمودار ہوا۔ شاکر تیزی سے گلی میں واپس آگیا۔ سایہ اسی طرف آرہا تھا اور وہ گلی تک آجاتا تو اسے دیکھ لیتا۔ یہاں بچنے اور فرار ہونے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ شاکر مضطرب انداز میں آس پاس دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر کنٹینرز کے ساتھ لگی لوہے کی سیڑھی پر گئی۔ یہ چھت تک جارہی تھی۔ دوسرے لمحے وہ اس پر چڑھنے لگا۔ جب تک سایہ گلی تک آتا، وہ اوپر چڑھ کر لیٹ چکا تھا۔ اس نے دیکھا سائے کے ہاتھ میں بھی سائلنسر لگا پستول تھا۔ شاکر جس کنٹینر کی چھت پر لیٹا ہوا تھا، اس سے ایک گلی پیچھے سیما دبکی ہوئی تھی، وہ مسلح افراد کو دیکھ چکی تھی۔ انہوں نے رفیع کو قابو کر لیا تھا۔ البتہ سیما کو یہ معلوم نہیں تھا کہ صائقہ اور شاکر کس حالت میں تھے۔ طویل قامت کو دیکھ کر وہ جان گئی تھی کہ راشد سعید کے آدمی یہاں پہنچ گئے ہیں۔

سیما دبے قدموں اس گلی سے باہر آئی اور پھر دوسری گلی سے ہوتی ہوئی یارڈ کے بیرونی حصے تک آگئی۔ یہاں پہنچ کر اس نے پارکنگ کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ وہاں جا کر وہ پولیس سے مدد طلب کر سکتی تھی۔ یہاں رک کر کال کرتی تو شاید وہ بھی پکڑی جاتی۔ ویسے بھی یہ کھلی جگہ تھی اور یہاں اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے باپ کی بات کیوں نہیں مانی۔ وہ دوڑتی ہوئی پارکنگ تک آگئی جہاں زیب کار سے ٹکا کھڑا تھا۔ سیما نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''راشد کے آدمی یہاں تک آگئے ہیں، ہمیں پولیس کو کال کرنی ہوگی۔''

جواب میں زیب بت بنا کھڑا رہا۔ اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ سیما کسی قدر تیز لہجے میں بولی۔ ''کیا تم سن نہیں رہے ہو؟''

''یہ نہیں سنے گا۔'' زیب کے عقب سے ایک مسلح شخص نکل آیا اور اس نے پستول کا رخ سیما کی طرف کر دیا۔ ''اپنا پرس میرے حوالے کر دو... کوئی چالاکی مت دکھانا... یہ پستول بے آواز ہے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور تم دونوں مر جاؤ گے۔''

سیما نے مجبوراً پرس اس کے حوالے کیا۔ اس کا موبائل اسی میں تھا۔ اب اسے خیال آرہا تھا کہ وہ بلاوجہ یہاں دوڑی آئی۔ وہیں سے پولیس کو کال کر سکتی تھی۔ اب اس کا آسرا بھی نہیں رہا تھا۔ مسلح آدمی ان دونوں کو واپس لایا تو کنٹینرز کے درمیان ایک جگہ رفیع اور صائقہ کے ساتھ تین آدمی اور تھے۔ ان میں طویل قامت بھی تھا۔ اس نے ان چاروں کو دیکھا۔ ''پانچواں آدمی کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں پتا، میں اکیلی تھی۔'' صائقہ نے کہا۔

''ہم سب الگ الگ کنٹینر تلاش کر رہے تھے۔'' رفیع جاوید نے کہا۔ ''ہمیں نہیں معلوم کہ دوسرے کہاں ہیں؟''

''اسے تلاش کرو۔'' طویل قامت نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا تو وہ تینوں پھیل کر مختلف سمتوں میں روانہ ہوگئے۔ طویل قامت نے صائقہ اور سیما کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں بہت خوب صورت ہو... اگر تمہیں مارنا پڑا تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔''

''بہتر ہے تم اپنی زبان بند رکھو۔'' سیما نے سرخ چہرے کے ساتھ کہا۔ وہ طویل قامت کا مطلب سمجھ رہی تھی۔

''نہیں، بہتر ہوگا تم اپنے باپ کو یہاں بلاؤ...'' اس نے سیما پر پستول تان لیا۔ ''اگر وہ ایک منٹ کے اندر سامنے نہیں آیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

سیما کے ساتھ صائقہ کا چہرہ بھی سفید پڑ گیا۔ صائقہ بولی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''میں ایسا ہی کروں گا اور اس کے بعد تمہارا نمبر آئے گا۔'' طویل قامت نے گھڑی دیکھی۔ ''آدھا منٹ رہ گیا ہے۔''

''نن... نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' سیما ہکلائی۔ ''فائر کی آواز سے سب کو پتا چل جائے گا۔''

طویل قامت ہنسا۔ ''بے بی! یہ جو پستول پر لگا ہے اسے سائلنسر کہتے ہیں اور میں نے تمہیں شوٹ کیا تو بس اتنی آواز آئے گی جتنی ببل گم کا غبارا پھٹنے پر آتی ہے۔''

''تم لوگ ویسے ہی مجھے مارنا چاہتے ہو۔ اگر پاپا نے خود کو تمہارے حوالے کر دیا، تب بھی تم مجھے مار دو گے۔''

''نہیں، تب میں سوچوں گا۔'' طویل قامت نے عیاری سے کہا۔ ''مگر افسوس وقت پورا ہو گیا ہے۔''

شاکر کنٹینر کے اوپر لیٹا ہوا سب دیکھ اور سن رہا تھا۔ جیسے ہی طویل قامت نے پستول سیما کی طرف اٹھایا، اس نے عجلت میں طویل قامت پر فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ ہی طویل قامت پلٹ کر گرا۔ شاکر چلایا۔ ''بھاگو۔''

وہ چاروں بھاگے۔ طویل قامت نے پلٹ کر شاکر پر گولی چلائی جو اس کے قریب کنٹینر پر لگی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ شاید طویل قامت بچ گیا تھا یا معمولی زخمی ہوا تھا۔ شاکر پیچھے سرکا اور پھر اٹھ کر بھاگا۔ یہاں کنٹینر سے کنٹینر ملے ہوئے تھے۔ طویل قامت نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو اسے مارنے کا حکم دیا۔ وہ مختلف سمتوں سے اوپر دوڑتے شاکر پر گولیاں برسانے لگے۔ طویل قامت سیما کی تلاش میں تھا کیونکہ اسے لازمی مارنا تھا، دوسری صورت میں وہ خود مارا جاتا۔ راشد اسے دھمکی دے چکا تھا اور وہ جانتا تھا کہ راشد اپنی دھمکی پر عمل بھی کرتا ہے۔ سیما ایک طرف بھاگی تھی۔ وہ بھی اسی سمت میں گیا۔ ایک بڑا پاتھ وے عبور کر کے وہ بندرگاہ کے دفاتر والے حصے میں داخل ہوا۔ یہاں انتظامیہ کے دفاتر تھے اور اس وقت تقریباً سارے دفتر بند تھے۔ پچھلے دنوں یہاں کوئی تقریب ہوئی تھی اور اس کے لیے یہاں بڑے سائز کی اسکرینز پر لگی تصاویر لگائی گئی تھیں۔ اب وہ تصاویر اتار کر ایک طرف رکھی ہوئی تھیں۔ طویل قامت ان کے پیچھے جھانک جھانک کر دیکھنے لگا کہ سیما ان کے پیچھے نہ چھپی ہو۔

سیما کچھ دور ایک بکس کے پیچھے چھپی تھی، وہ طویل قامت کو دیکھ رہی تھی اور اس کا بدن لرز رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر اس نے اسے پالیا تو فوراً قتل کر دے گا۔ وہ سر نیچے کر کے بیٹھی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ سر اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ ایک بار اس نے سر اٹھایا تو اسے طویل قامت نظر نہیں آیا۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ وہ نظر نہیں آیا۔ سیما کچھ دیر بعد اٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ طویل قامت کہیں اور جا چکا ہے، اسے موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ وہ بکس کے پیچھے سے نکلی تھی کہ ایک اسکرین کا کاغذ پھٹا اور اس کے پیچھے سے طویل قامت کا چہرہ پستول سمیت نمودار ہوا۔ پستول کا رخ سیما کی طرف تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے واپس آئی اور بکس کے پیچھے گری۔ اسی لمحے دو گولیاں آ کر بکس پر لگیں تو سیما نے چیخ ماری۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتی تو ماری جاتی۔ اب بھی وہ بال بال بچی۔ طویل قامت اسکرین سے باہر نکل آیا۔ وہ بکس کی طرف بڑھا۔ اسے سیما کی چیخ سنائی دی تھی مگر وہ اس کی موت یقینی بنانا چاہتا تھا۔

شاکر کنٹینرز کے اوپر بھاگ رہا تھا۔ اس کی نظر دور جاتی سیما پر پڑی پھر اس نے طویل قامت کو دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ شاکر نے پریشانی سے آس پاس دیکھا۔ طویل قامت کے ساتھی اسے تلاش کر رہے تھے۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اب تک وہ بچا ہوا تھا مگر اب اسے اپنے بجائے سیما کی فکر تھی۔ وہ ایک جگہ دیکھ کر کنٹینر سے اترا تھا کہ ایک مسلح بدمعاش نمودار ہوا۔ شاکر نے اسے دیکھتے ہی فائر کیا اور وہ بچنے کے لیے تیزی سے واپس گیا۔ شاکر عمارتوں کی طرف دوڑا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ طویل قامت نے سیما کو پالیا تو بے دریغ شوٹ کر دے گا۔ شاکر پاتھ وے پار کر کے عمارتوں کے پاس پہنچا تو اس نے طویل قامت کو پستول بدست ایک بکس کی طرف بڑھتے دیکھا۔ شاکر نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔ اسے اپنے نشانے پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے سانس روکی۔ طویل قامت بکس کے پاس پہنچ گیا تھا اور اس نے عقب میں دیکھتے ہوئے پستول سیدھا کیا تھا کہ شاکر نے گولی چلا دی۔ ایک لمحے کو طویل قامت ساکت رہا۔ شاکر کو لگا کہ اس کا نشانہ خطا گیا ہے۔ وہ پھر فائر کرنے والا تھا کہ طویل قامت لڑکھڑایا اور منہ کے بل گر کر ساکت ہو گیا۔ اس کا رک جانے والا سانس بحال ہوا۔ اسی دوران میں سیما بکس کے پیچھے سے نکلی اور پھر شاکر کی طرف دوڑی۔ وہ اس سے

لپٹ گئی تھی۔

''پاپا... پاپا!''

''یہاں سے نکلو۔'' شاکر نے حواس برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اس کے تین ساتھی اور ہیں، وہ سب بھی مسلح ہیں۔''

''صائقہ کہاں ہے؟'' سیما کو پہلی بار اس کی فکر ہوئی۔

''میں تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دوں پھر اسے بھی دیکھتا ہوں۔'' شاکر نے کہا۔ وہ عمارتوں کے درمیان گھوم رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کوئی دروازہ کھلا ہو مگر تمام دروازے لاک تھے۔ بالآخر ایک دروازہ کھل گیا۔ یہ باتھ روم کا تھا۔ شاکر نے سیما کو اندر دھکیلا۔ ''دروازہ اندر سے بند کر لو اور جب تک میری آواز نہ سنو، دروازہ مت کھولنا۔''

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ بے چین ہو گئی۔

''میں صائقہ کو دیکھتا ہوں۔'' شاکر نے کہا اور روانہ ہو گیا۔ سیما نے عقب میں دروازہ بند کر لیا۔ شاکر واپس آیا لیکن اس بار وہ روشن حصے کے بجائے ایک تاریک جگہ سے کنٹینرز یارڈ میں داخل ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ راشد سعید کے آدمی سائلنسر لگے ہتھیار لے کر آئے تھے۔ اگر انہوں نے کسی پر گولی چلائی ہو گی تو اس کی آواز بھی نہیں آئی ہو گی۔ وہ دبے قدموں کنٹینرز کے درمیان خالی جگہوں سے گزر رہا تھا۔ ایک جگہ اسے آہٹ محسوس ہوئی تو وہ رک گیا۔ ایک راہداری سے کوئی آ رہا تھا۔ شاکر نے پستول سامنے کر لیا اور وہ گولی چلانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ مگر جیسے ہی وہ سامنے آیا، شاکر نے پستول جھکا لیا۔ وہ صائقہ تھی۔ وہ پہلے بھڑکی اور پھر شاکر کو دیکھ کر غیر متوقع طور پر اس سے لپٹ گئی۔ شاکر گڑبڑا گیا۔ صائقہ کے انداز میں والہانہ پن اور گرم جوشی تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' شاکر نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''زیب اور رفیع کہاں ہیں؟''

''میں نہیں جانتی، میں تو خود چھپتی پھر رہی تھی۔ ایک بار تو ایک آدمی میرے بہت پاس آ گیا تھا مگر پھر اسے دوسری طرف سے آواز آئی تو وہ چلا گیا۔ میں بال بال بچی۔''

''میرے ساتھ چلو۔'' شاکر نے کہا اور صائقہ کو اپنی اوٹ میں لیے آگے بڑھا تھا کہ سامنے سے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ پستول ان کی طرف کرتا، شاکر صائقہ کو کھینچتے ہوئے قریبی گلی میں داخل ہو گیا۔ آدمی کی چلائی ہوئی گولیاں ان کے پاس کنٹینر پر لگی تھیں۔ شاکر نے جوابی فائرنگ کی تاکہ وہ آگے آنے کی کوشش نہ کرے۔ یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ شاکر اور صائقہ دوسری طرف بھاگے تھے کہ سامنے سے ایک اور آدمی نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی شاکر نے لگاتار گولیاں چلائیں۔ بچنے کے لیے وہ پیچھے ہوا مگر کوئی گولی اسے لگی تھی کیونکہ اس نے ہلکی سی چیخ ماری تھی۔ مگر اب وہ دونوں طرف سے گھر گئے تھے۔ پہلا شخص عقب سے نمودار ہوا تو صائقہ اسے دیکھ کر شاکر سے لپٹ گئی۔ شاکر نے مڑ کر اس پر فائر کرنا چاہا مگر پستول سے صرف کلک کی آواز آئی۔ اس کا میگزین خالی ہو گیا تھا۔ شاکر نے عجلت میں دوسرا میگزین نکالنا چاہا مگر وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ یہ دیکھ کر مسلح شخص مسکرایا اور اس نے پستول سیدھا کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا، فضا پولیس سائرن کی آواز سے گونجنے لگی۔ کئی پولیس گاڑیاں سائرن بجاتی اور روشنیاں چمکاتی ہوئی بندرگاہ میں داخل ہو رہی تھیں۔

مسلح شخص انہیں بھول کر بھاگا۔ زخمی ہونے والا شخص بھی آڑ سے نکل کر باہر کی طرف دوڑا۔ پستول خالی پا کر اور پھر میگزین ہاتھ سے چھوٹا تو شاکر نے صائقہ کو اپنی آڑ میں لے لیا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ شاکر کے سینے میں چھپا لیا تھا۔ وہ کانپ رہی تھی۔ ان لوگوں کے بھاگنے کے بعد شاکر نے نرمی سے صائقہ کو الگ کیا۔ ''ہم بچ گئے ہیں۔''

''میں تو نہیں بچی۔'' صائقہ نے تمتماتے چہرے کے ساتھ کہا۔

شاکر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کچھ کہنے والا تھا کہ سیما کی آواز آئی۔ ''پاپا... آپ کہاں ہیں؟''

شاکر اور صائقہ باہر آئے۔ پولیس، برتھ کے آخر میں بھاگنے والے مسلح افراد کو روک رہی تھی اور انہیں گرفتار کر رہی تھی۔ سیما باپ سے لپٹ گئی۔ ''سوری پاپا! مجھے آپ کی بہت فکر تھی اس لیے میں وہاں نہ رہ سکی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' شاکر نے اس کا سر تھپکا۔ ''پولیس آ گئی ہے اور ان لوگوں کو گرفتار کر رہی ہے۔''

طویل قامت کے تینوں ساتھی گرفتار ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک معمولی زخمی تھا۔ گولی اس کے بازو میں چھید کرتی گزر گئی تھی۔ کچھ دیر میں پولیس وہاں بھی آ گئی۔ مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے رفیع اور زیب بھی باہر نکل آئے۔ پولیس کے آنے سے پہلے شاکر نے ان سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ بات کرے گا اور کوئی نہ بولے۔ جو وہ کہے، وہی بعد میں سب کہیں۔ ورنہ سب خود ذمے دار ہوں گے۔

سب سے آگے عابد روزالی تھا۔ اس نے شاکر سے ہاتھ ملایا اور سب کو صحیح سلامت دیکھ کر بولا۔ ”میرا خیال ہے پولیس... بروقت آگئی۔“

”بالکل، ورنہ گرفتار ہونے والے بدمعاش ہمیں قتل کرنے کے درپے تھے۔ ایک وہاں پڑا ہے، اسے میں نے گولی ماری تھی۔“ شاکر نے عمارتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ میری بیٹی کو شوٹ کرنے والا تھا۔ پستول بھی اسی بدمعاش کا تھا جو اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔“

عابد شاکر کو لے کر عمارتوں کی طرف آیا جہاں طویل قامت بکس کے پاس اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ پولیس کی گاڑیوں کے ساتھ ایک ایمبولینس بھی آئی تھی۔ عابد نے طویل قامت کو چیک کیا اور زندہ پا کر فوری ایمبولینس کو آگے بلالیا۔ دس منٹ میں طویل قامت اور گرفتار شدگان وہاں سے روانہ ہوگئے۔ جب تک عابد ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا، شاکر ذہن میں ایک اسٹوری بنا چکا تھا۔ عابد فارغ ہو کر اس کے پاس آیا۔ ”اب بتاؤ مسٹر رضی، یہ کیا چکر ہے؟“

”میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ وہ لاش میری بیٹی کی نہیں ہے۔ اس سے ملو، یہ ہے سیما رضی۔“ شاکر نے سیما کو آگے کیا۔ ”میری بیٹی۔“

عابد روزالی نے غور سے سیما کو دیکھا۔ ”یہ کہاں تھی اور اس نے پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

”یہ خوف سے اپنی ایک دوست کے پاس چھپی ہوئی تھی۔“ شاکر نے صائقہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”خوف کی وجہ سے یہ پولیس سے رابطہ کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔“

”کس کے خوف سے؟“

جواب میں شاکر نے راشد سعید کے بارے میں بتایا۔ اس نے بتایا کہ سیما وہاں کام کرتی تھی اور اسے لگا کہ راشد کی کمپنی کسی غیر قانونی کام میں ملوث ہے۔ اس نے کھوج لگایا تو اسے ایسے کنٹینرز کی پراسرار ہینڈلنگ کا پتا چلا جو بغیر کسی ریکارڈ کے منگوائے اور یہاں سے روانہ کیے جاتے تھے۔ سیما کو شبہ تھا کہ ان کنٹینرز میں کوئی غیر قانونی چیز اسمگل کی جارہی ہے۔ اس دوران میں اسے شبہ ہوا کہ آفس میں اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔ اس نے ڈر کر استعفا دے دیا مگر ان لوگوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ پھر اس کی دوست روما اس کے دھوکے میں ماری گئی تو یہ ڈر کر روپوش ہوگئی۔ اس کے پاس کمپنی کی کچھ خفیہ دستاویزات تھیں جن سے پتا چلا کہ بندرگاہ پر ایک ایسا ہی کنٹینر موجود ہے جس کا بہ ظاہر سائٹ میرین انٹرنیشنل سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر وہ اسی کا ہے۔ ہم سب اسی کنٹینر کی تلاش میں یہاں آئے تھے کہ راشد سعید کے آدمیوں نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی۔

عابد نے غور سے اس کا بیان سنا اور پھر سوالات کیے۔ شاکر نے تمام سوالوں کے مناسب جوابات دیے۔ عابد نے صائقہ، زیب اور رفیع کے بارے میں پوچھا۔ شاکر نے بتایا کہ صائقہ سیما کی دوست ہے اور وہ اسی کے گھر میں چھپی ہوئی تھی۔ زیب بھی اس کا دوست تھا اور رفیع سے جان پہچان تھی۔ وہ آئی ٹی کا ماہر ہے اور اسی نے ہیکنگ کر کے یارڈ میں موجود یہ کنٹینر تلاش کیا ہے۔ عابد جواب تک شک کر رہا تھا، کنٹینر کی بات سنتے ہی چونک گیا۔ اس نے کہا۔ ”کنٹینر کہاں ہے؟“

”ہم اسے تلاش کر رہے تھے کہ یہ لوگ آگئے۔“ رفیع نے جلدی سے کہا۔ ”لیکن وہ کنٹینر ہے یہیں۔“

عابد نے یارڈ کے سپروائزر اور بندرگاہ حکام کو بلوا لیا تھا۔ اس بار کنٹینر ایک گھنٹے میں مل گیا۔ خلاف توقع یہ بہت سارے کنٹینرز کے نیچے دبا ہوا تھا اور اسے اتنی جلدی نکالنا ممکن نہیں تھا۔ کرین آپریٹر چھٹی پر تھے اس لیے کام اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ عابد نے ان سب کو پابند کیا کہ وہ بغیر اطلاع کے کہیں نہیں جائیں گے اور ملک سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں کیونکہ ان پر پابندی لگ چکی ہوگی۔ ایسی کسی کوشش کے نتیجے میں وہ گرفتار ہو جائیں گے۔ شاکر نے اسے یقین دلایا کہ وہ اور سیما ایسی کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ اس نے کہا۔ ”لیکن ہمیں راشد سعید سے خطرہ ہے۔“

”پولیس تمہیں تحفظ دے گی۔“

”تم دونوں میرے ساتھ چلو۔“ صائقہ نے اصرار کیا۔ ”وہاں تم محفوظ رہو گے۔ میں بلڈنگ سیکیورٹی سے کہہ دوں گی تو کوئی غیر متعلقہ فرد اندر نہیں آسکے گا۔“

”یہ بہتر رہے گا۔“ عابد نے بھی اس کی تائید کی۔

رفیع کی حالت زیادہ خراب تھی کیونکہ اس کا ویزا ایکسپائر ہو گیا تھا۔ اگر عابد کو پتا چل جاتا تو وہ فوراً گرفتار ہو جاتا۔ واپسی میں شاکر نے اسے سمجھایا۔ ”تم رضا کارانہ خود کو پولیس کے حوالے کردو... اگر راشد سعید مجرم نکل آیا اور کنٹینر سے سچ مچ کچھ ایسا نکل آیا جو یہاں کے قانون کے منافی ہو تو تمہیں اس کا فائدہ ہوگا۔ کنٹینر تم نے ہی تلاش کیا ہے۔ اس طرح تم نے قانون کی مدد کی ہے۔“

رفیع جاوید نے سرد آہ بھری۔ ”شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔“

”دوسری صورت میں صرف تم پھنسو گے۔“ شاکر

نے اسے خبردار بھی کیا۔ ”کیونکہ ہم تمہیں نہیں جانتے اور گودام کا بھول کر بھی ذکر مت کرنا ورنہ وہاں موجود لاش تمہارے گلے پڑ جائے گی۔“

رفیع کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بھول کر بھی گودام کا ذکر نہیں کرے گا۔ یہ خیال تو انہیں آیا ہی نہیں کہ طویل قامت بچ گیا تو وہ پولیس کو ساری حقیقت بتا دے گا۔ عابد نے ایک پولیس کار ان کے ساتھ کر دی تھی جو انہیں صائقہ کے فلیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ سیما کا انداز بالکل بدل گیا تھا۔ جب شاکر نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ پاکستان جائے گی تو وہ فوراً تیار ہوگئی۔ اس واقعے...... نے اس کا دماغ بالکل درست کر دیا تھا۔

☆☆☆

عابد نے رات میں ہی راشد سعید کے آفس اور بنگلے کی نگرانی شروع کرادی تھی۔ اسپتال میں طویل قامت کا آپریشن ہوا اور اس کی جان بچ گئی لیکن ڈاکٹروں نے ابھی چوبیس گھنٹے بات کرنے سے منع کیا تھا۔ اس کے تین ساتھیوں نے اپنی زبان بند رکھی تھی اور صرف اتنا کہا تھا کہ وہ مکرم کو جانتے ہیں، وہی انہیں ہائر کر کے لایا تھا۔ مگر عابد کو یقین تھا کہ وہ تینوں بھی راشد کے بارے میں جانتے ہیں اور زبان کھولنے سے گریز کر رہے تھے۔ صبح دس بجے عابد بندرگاہ پر موجود تھا۔ اس نے وہاں بھی پولیس کا پہرا لگا دیا تھا کہ صبح سے پہلے کوئی کنٹینر نہ کھولے۔ جس وقت کرین اوپر رکھے کنٹینر ہٹا رہی تھی، رفیع اور شاکر بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ رفیع نے عابد کے سامنے اعتراف کرلیا کہ اس کا ویزا ایکسپائر ہو گیا تھا اور وہ اب چھپ کر یہاں رہ رہا تھا۔ عابد نے کہا۔

”اگر تمہاری بات درست نکلی اور کنٹینر سے غیر قانونی اشیا نکل آئیں تو تم چھوٹ جاؤ گے ورنہ تم اور سیما رضی دونوں کو قانون کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔“

شاکر چونکا۔ ”سیما کیوں؟“

”یہ سارا کھیل اسی نے شروع کیا ہے۔ اسے کچھ نہ کچھ تو جواب دینا پڑے گا۔“

شاکر نے بحث کی۔ ”کنٹینر سے قطع نظر سیما، راشد سعید کا نشانہ رہی ہے اور اسے اپنی جان بچانے کے لیے روپوش ہونا پڑا۔ وہ خود مدعی ہے، کوئی مجرم نہیں ہے۔“

”پولیس بھی اسے مجرم کی نظر سے نہیں دیکھ رہی لیکن اس سے تفصیلی بیان لیا جائے گا۔ تب فیصلہ ہوگا کہ وہ کس حد تک مدد کی مستحق ہے۔“

کچھ دیر میں کرین نے کنٹینر کے آس پاس کے سارے کنٹینرز ہٹا دیے۔ عابد، شاکر اور رفیع سمیت وہاں آیا۔ رفیع نے سیریل نمبر اور نشانات دیکھ کر تصدیق کی کہ یہ وہی کنٹینر ہے۔ بندرگاہ حکام نے اس کی سیل کھولی اور اس کا لاک کاٹ کر الگ کیا۔ کنٹینر کھولا تو اس میں چائنا میڈ کھلونے اور ٹیڈی بیئر بھرے ہوئے تھے۔ جب ان کھلونوں کو توڑا اور ٹیڈی بیئرز کو پھاڑا گیا تو ان کے اندر سے بیس بیس گرام گولڈ کے سکے نکلے۔ یہ خالص سونا تھا جس میں پوائنٹ ون پرسنٹ ملاوٹ بھی نہیں تھی۔ سونا دیکھتے ہی عابد نے باقی کام روک دیا۔ سارا سامان واپس کنٹینر میں ڈال کر اسے دوبارہ سیل کرا دیا گیا اور پولیس ہیڈ کوارٹر روانہ کر دیا گیا جہاں اس کی مکمل تلاشی لی جاتی۔ رفیع اور شاکر خوش تھے کہ ان کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ بھی پولیس ہیڈ کوارٹر ساتھ گئے تھے۔ وہاں کنٹینر سے مجموعی طور پر دو سو کلو گرام سونا برآمد ہوا جو ان کھلونوں اور ٹیڈی بیئرز میں چھپایا گیا تھا اور اس کی مالیت ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالرز سے زیادہ تھی۔

اسی شام راشد سعید کو گرفتار کر لیا گیا۔ رات گئے طویل قامت مکرم سعاد نے پولیس کو بیان ریکارڈ کرا دیا تھا۔ اس نے نہ صرف روما کے قتل کا اعتراف کیا بلکہ یہ انکشاف بھی کیا کہ راشد سعید کے اشارے پر اس نے اور اس کے مارے جانے والے ساتھی سلال نے کئی افراد کو قتل کیا تھا اور خود سلال کو راشد سعید نے قتل کیا تھا۔ اس کی لاش نزدیکی سمندر میں بھاری پتھر باندھ کر پھینکی گئی تھی۔ غوطہ خوروں نے بڑی کوشش کر کے اس کی لاش برآمد کرلی تھی۔ راشد سعید نے اعتراف جرم کرنے میں دو دن لگا دیے تھے اور بالآخر اس نے مان لیا کہ وہ سونے کی غیر قانونی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ وہ سونا، انڈیا اور چائنا بھیجتا تھا جہاں اسے بلیک منی رکھنے والے مارکیٹ سے زیادہ داموں خرید لیتے تھے۔ وہ گزشتہ سات سال سے یہ دھندا چلا رہا تھا اور اب تک دسیوں ٹن سونا منتقل کر چکا تھا۔ سونے کی اسمگلنگ یہاں اتنا بڑا جرم نہیں تھا مگر کیے جانے والے قتل راشد سعید کے گلے پڑ چکے تھے اور امکان تھا کہ اسے سزائے موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

عابد روزالی نے اپنے وعدے کا پاس کیا اور رفیع جاوید کو ویزے کی میعاد ختم ہونے کے بعد بھی قیام کے الزام سے بری قرار دیا اور اسے دوبارہ ویزا جاری کر دیا گیا۔ سیما رضی کو روما کے قتل کے بارے میں حقائق چھپانے

کے الزام سے بری کیا گیا تھا۔ اس کی لاش پاکستان سے واپس منگوا کر لبنان اس کے گھر والوں کو بھیج دی گئی۔ بین الاقوامی مجرموں کی گرفتاری میں تعاون اور بھاری مالیت کے سونے کی برآمدگی پر سیما، رفیع جاوید اور شاکر کو قانون سے تعاون کرنے پر خصوصی سرٹیفکیٹ اور شیلڈ سے نوازا گیا۔ انہیں یہاں کا تاحیات ویزا دیا گیا تھا۔ اب وہ جب چاہتے، یہاں آسکتے تھے اور جتنے عرصے چاہتے یہاں رہ سکتے تھے۔ اس کے لیے انہیں کسی اضافی ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ رفیع خوش تھا کیونکہ وہ کسی صورت واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

جس دن شاکر اور سیما کی روانگی تھی، صائقہ ان سے ملنے آئی تھی۔ وہ ان کے لیے کچھ تحفے بھی لائی۔ سیما کے لیے ایک بریسلیٹ اور شاکر کے لیے کف لنکس تھے۔ سیما اب پُرجوش تھی۔ اس نے شاکر سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کام کرے گی۔ شاکر کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی بیٹی اسے واپس مل گئی تھی۔ صائقہ اداس تھی۔ شاید اس لیے کہ شاکر نے اس سے توقع کے مطابق کچھ کہا نہیں تھا جو وہ اس سے سننا چاہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔ سیما نے صائقہ سے کہا۔ ”آپ بھی پاکستان چلیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں وہاں کیا کروں گی... یہاں تو اتنی اچھی جاب ہے۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ شاکر نے تائید کی۔ ”وہاں تو ملازمتوں کا کال ہے، اچھی ملازمت قسمت سے ملتی ہے۔“

صائقہ اس بار سچ مچ مرجھا گئی۔ وہ زیادہ دیر نہیں رکی۔ سیما نے کہا کہ وہ ان کے ساتھ ائرپورٹ تک چلے مگر اس نے انکار کر دیا۔ ”نہیں، مجھے ذرا کام ہے... ورنہ ضرور چلتی۔“

سیما نے فلیٹ کے مالک کو اطلاع کر دی تھی کہ وہ فلیٹ خالی کر رہی ہے۔ کچھ ایڈوانس باقی تھا لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ فلیٹ فرنشڈ تھا اور سیما کا ذاتی سامان بس اتنا تھا کہ دو سوٹ کیسوں میں آگیا۔ وہ طیارے میں سوار ہوئے اور جب طیارے نے پرواز کی تو سیما نے کہا۔ ”پاپا! ایک بات بتائیں؟“

شاکر کافی پیتے ہوئے اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پوچھو بیٹا!“

”آپ کو صائقہ کیسی لگتی ہے؟“

شاکر چونکا تو کچھ کافی چھلک گئی۔ اس نے جلدی سے ٹشو سے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”بس پاپا! مجھے لگا جیسے وہ آپ میں دلچسپی لے رہی ہے۔“

کوئی عام پاکستانی لڑکی ہوتی تو شاید اپنے باپ سے اس سوال کی جرأت نہ کرتی۔ مگر سیما باہر رہ چکی تھی۔ اس نے بلا جھجک پوچھ لیا۔ شاکر جھینپ گیا۔ ”محسوس تو میں نے بھی کیا ہے۔“

”اسی لیے پوچھ رہی ہوں پاپا... وہ آپ کو کیسی لگی؟“

”پہلے تم بتاؤ، وہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟“ شاکر نے الٹا سوال کیا۔

”پاپا! وہ بہت اچھی عورت ہے۔ کیئر کرنے والی اور پُرخلوص... پاپا! اسی لیے عمروں کے فرق کے باوجود میری اس سے دوستی ہو گئی۔ اس نے اپنے بہن بھائیوں کے لیے بہت کیا اور اب اکیلی ہے۔ کسی کو اس کی پروا نہیں ہے۔“

شاکر نے گہری سانس لی۔ ”بیٹا! وہ مجھے بھی ایسی ہی لگی اور سچی بات ہے کہ مجھے اچھی لگی... مگر بیٹا اب میرے لیے آپ سب سے اہم ہو اور مجھے بڑی مشکلوں سے ملی ہو۔ میں کسی صورت آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔“

سیما نے باپ کو دیکھا اور اس کے شانے پر سر رکھ لیا۔ ”پاپا! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے اتنا دور کیوں رہی۔ پاپا! مجھے احساس ہے اگر میں اکیلی رہی تو آپ مجھ سے زیادہ اکیلے رہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اب آپ اکیلے نہ رہیں۔“

شاکر خوش ہو گیا۔ ”اور میں چاہتا ہوں کہ اب تمہارا گھر بسا دوں۔“

”ابھی نہیں پاپا۔“ سیما شرمائی۔ ”ابھی میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

”یہ زیب شاہد کیسا شخص ہے؟“ شاکر نے بھی پوچھ لیا۔

”صرف ایک اچھا دوست ہے پاپا۔“ سیما نے جلدی سے بات واضح کی۔ ”اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہے۔“

شاکر نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ زیب شاہد اسے اپنی بیٹی کے لیے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ واپس جاتے ہی وہ صائقہ کو کال کر کے پروپوز کرے گا اور اسے یقین تھا کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔